تہذیبوں کا تصادم

اور عالمی نظام کی تشکیل نو

سیموئیل پی ہنٹنگٹن

اوکسفرڈ

تہذیبوں کا تصادم

اور

عالمی نظام کی تشکیل نو

تہذیبوں کا تصادم
اور
عالمی نظام کی تشکیل نو

سیموئیل پی ہنٹنگٹن

ترجمہ: سہیل انجم

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

گریٹ کلیرنڈن اسٹریٹ، اوکسفرڈ OX2 6DP

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے جو دنیا بھر میں
درج ذیل مقامات سے بذریعہ اشاعت کتب تحقیق، علم وفضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے
مقاصد کے فروغ میں یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے۔

اوکسفرڈ نیویارک
اوکلینڈ بینگ کوک بیونس آئرس کیپ ٹاؤن
چنائے دارالسلام دہلی ہونگ کونگ استنبول
کراچی کولکتہ کوالالمپور میڈرڈ میلبرن میکسیکو سٹی ممبئی
نیروبی ساؤپالو شنگھائی تیپی ٹوکیو ٹورونٹو

Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے۔

پہلی اشاعت ۲۰۰۳ء

یہ کتاب بچ اسٹون، نیویارک سے
THE CLASH of CIVILIZATIONS and the REMAKING of WORLD ORDER
کے نام سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی۔

ISBN 0 19 579896 1

پاکستان میں کاغذی پرنٹرز کراچی میں طبع ہوئی۔
امینہ سید نے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
۵- بنگلور ٹاؤن، شارع فیصل،
پی۔او بکس ۱۳۰۳۳، کراچی۔ ۷۵۳۵۰، پاکستان سے شائع کی۔

نینسی کے نام

جس نے 'تصادم' کو مسکرا کر جھیلا



ترتیب

جداول، اشکال اور نقشہ جات کی فہرست ۱۱

پیش لفظ ۱۳

حصہ اول: تہذیبوں کی دُنیا

۱۔ عالمی سیاست میں نیا دور ۱۹

تعارف: جھنڈے اور ثقافتی شناخت ۱۹

کثیر قطبی، کثیر تہذیبی دنیا ۲۱

دوسری دنیائیں؟ ۳۱

دنیاؤں کا موازنہ: حقیقت پسندی، کفایت اور پیشگوئیاں ۳۹

۲۔ تہذیبیں تاریخ اور عصرِ حاضر میں ۴۵

تہذیبوں کی ماہیت ۴۵

تہذیبوں کے مابین روابط ۵۵

۲۔ آفاقی تہذیب؟ جدیدیت اور مغربیت ۶۵
آفاقی تہذیب: مفاہیم ۶۵
آفاقی تہذیب: ماخذ ۷۸
مغرب اور جدیدیت ۸۱
مغربیت اور جدیدیت کے ردعمل ۸۶

حصہ دوم: تہذیبوں کا بدلتا توازن

۴۔ مغرب کا زوال: طاقت، ثقافت اور مقامیانا ۹۷
مغربی طاقت: بالادستی اور زوال ۹۷
مقامیانا: غیر مغربی ثقافتوں کا احیا ۱۱۱
خدائی انتقام ۱۱۶
۵۔ معاشیات، آبادیات اور چیلنج کرنے والی تہذیبیں ۱۲۵
ایشیائی اثبات ۱۲۶
اسلامی احیا ۱۳۴
بدلتے ہوئے چیلنج ۱۴۸

حصہ سوم: تہذیبوں کا ابھرتا ہوا نظام

۶۔ عالمی سیاست کی ثقافتی تشکیلِ نو ۱۵۳
گروہ بندی کی کوششیں: شناخت کی سیاست ۱۵۳
ثقافت اور اقتصادی تعاون ۱۶۰
تہذیبوں کی ساخت ۱۶۶

مقطوع ممالک: تہذیب کی تبدیلی میں ناکامی ۱۷۱

۷۔ مرکزی ریاستیں، ہم مرکز دائرے اور تہذیبی نظام ۱۹۲
تہذیبیں اور نظام ۱۹۲
مغرب کی حد بندی ۱۹۴
روس اور اس کا قریب بیرون ملک ۲۰۲
عظیم تر چین اور اس کا ہم خوشحالی دائرہ ۲۰۸
اسلام: اتحاد کے بغیر آگاہی ۲۱۶

حصہ چہارم: تہذیبوں کے تصادم

۸۔ مغرب اور دیگر: بین التہذیبی مسائل ۲۲۵
مغربی آفاقیت ۲۲۵
ہتھیاروں کا پھیلاؤ ۲۲۹
انسانی حقوق اور جمہوریت ۲۳۷
نقل مکانی ۲۴۵

۹۔ تہذیبوں کی عالمی سیاست ۲۵۷
مرکزی ریاستیں اور رخنہ تنازعات ۲۵۷
اسلام اور مغرب ۲۶۰
ایشیا، چین اور امریکا ۲۷۱
تہذیبیں اور مرکزی ریاستیں: ابھرتے روابط ۲۹۷

١۔ عبوری جنگوں سے رخنہ جنگوں تک ٣٠٧
عبوری جنگیں: افغانستان اور خلیج ٣٠٧
رخنہ جنگوں کی خصوصیات ٣١٤
تعدد: اسلام کی خونیں سرحدیں ٣١٨
اسباب: تاریخ، آبادیات، سیاست ٣٢٤

١۔ رخنہ جنگوں کی حرکیات ٣٣٣
شناخت: تہذیبی احساس کی بیداری ٣٣٣
تہذیبی گروہ بندی: قرابت دار ممالک اور منتشر آبادیاں ٣٤١
رخنہ جنگوں کو روکنا ٣٦٥

حصہ پنجم: تہذیبوں کا مستقبل

١۔ مغرب، تہذیبیں اور تہذیب ٣٧٧
مغرب کا احیا؟ ٣٧٧
مغرب دنیا میں ٣٨٦
تہذیبی جنگ اور نظام ٣٩١
تہذیبوں کے مشترک خواص ٣٩٨

حواشی ٤٠٥

اشاریہ ٤٥٧

جداوِل، اَشکال اور نقشہ جات کی فہرست

جداوِل

۱ء۲۔ اصطلاحات کا استعمال: ''آزاد دنیا'' اور ''مغرب'' ۶۲

۱ء۳۔ بڑی زبانوں کے بولنے والے ۷۰

۲ء۳۔ اہم چینی اور مغربی زبانیں بولنے والے ۷۱

۳ء۳۔ اہم مذہبی روایات سے وابستہ عالمی آبادی کا تناسب ۷۶

۱ء۴۔ تہذیبوں کے سیاسی مقبوضات ۱۹۰۰ء تا ۱۹۹۳ء ۱۰۱

۲ء۴۔ دنیا کی بڑی تہذیبوں سے متعلق ممالک کی آبادی، ۱۹۹۳ء ۱۰۲

۳ء۴۔ تہذیبوں کے زیر اقتدار عالمی آبادی کے تناسب، ۱۹۰۰ء تا ۲۰۲۵ء ۱۰۳

۴ء۴۔ عالمی مصنوعاتی پیداوار میں حصہ بلحاظ تہذیب یا ملک، ۱۷۵۰ء تا ۱۹۸۰ء ۱۰۴

۵ء۴۔ عالمی مجموعی اقتصادی پیداوار میں تہذیبوں کا حصہ، ۱۹۵۰ء تا ۱۹۹۲ء ۱۰۵

۶ء۴۔ عالمی فوجی افرادی قوت میں تہذیبوں کا حصہ ۱۰۷

۱ء۵۔ مسلمان ممالک میں نوجوان آبادی کی کثرت ۱۴۶

۱ء۸۔ چین کی جانب سے اسلحے کی منتقلی، منتخب واقعات، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۱ء ۲۴۳

۸ء۲۔ امریکی آبادی بلحاظ نسل اور نسلیت ۲۵۵
۱۰ء۱۔ نسلی سیاسی تنازعات، ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۴ء ۳۲۱
۱۰ء۲۔ نسلی تنازعات، ۱۹۹۳ء ۳۲۲
۱۰ء۳۔ مسلم و مسیحی ممالک کی عسکریت پسندی ۳۲۳
۱۰ء۴۔ مسلمانوں میں تنازعے کے میلانات کے ممکنہ اسباب ۳۲۹

اشکال

۲ء۱۔ مشرقی نصف کرے کی تہذیبیں ۵۵
۳ء۱۔ مغرب کے اثرات کے مختلف ردعمل ۹۰
۳ء۲۔ جدیدیت اور ثقافتی احیا ۹۱
۵ء۱۔ اقتصادی چیلنج: ایشیا اور مغرب ۱۲۷
۵ء۲۔ آبادیاتی چیلنج: اسلام، روس اور مغرب ۱۴۴
۵ء۳۔ نوجوان مسلم آبادی کی کثرت بلحاظ خطہ ۱۴۷
۹ء۱۔ تہذیبوں کی عالمی سیاست: ابھرتے ہوئے روابط ۳۰۵
۱۰ء۱۔ سری لنکا: سنہالی اور تامل نوجوان آبادی کی کثرت ۳۲۵
۱۱ء۱۔ ایک پیچیدہ رخنہ جنگ کا ڈھانچا ۳۴۳

نقشہ جات

۱ء۱۔ مغرب اور دیگر: ۱۹۲۰ء ۲۲
۱ء۲۔ سرد جنگ کی دنیا: ۱۹۶۰ء کی دہائی ۲۴
۱ء۳۔ تہذیبوں کی دنیا: ۱۹۹۰ء کے بعد ۲۶
۷ء۱۔ مغربی تہذیب کی مشرقی سرحد ۱۹۶
۷ء۲۔ یوکرین: ایک شکستہ ملک ۲۰۶
۸ء۱۔ امریکا ۲۰۲۰ء میں: ایک شکستہ ملک ۲۵۳

پیش لفظ

۱۹۹۳ء کے موسمِ گرما میں جریدے فارن افیئرز نے میرا ایک مضمون بعنوان ''تہذیبوں کا تصادم؟'' شائع کیا۔ اُس مضمون پر فارن افیئرز کے مدیروں کے مطابق تین برسوں میں جس قدر بحث ومباحثہ ہوا وہ ۱۹۴۰ء کے عشرے سے اب تک کسی اور مضمون پر نہیں ہوا تھا۔ تین برسوں میں اس پر جتنی بحث ہوئی یقیناً اتنی میری کسی اور تحریر پر نہیں ہوئی تھی۔ اس پر تبصرے اور جوابات ہر براعظم سے اور بیسیوں ممالک سے موصول ہوئے ہیں۔ لوگ میرے اس استدلال سے کہ ابھرتی ہوئی عالمی سیاست کی مرکزی اور خطرناک ترین جہت مختلف تہذیبوں کے گروہوں کے درمیان تنازع ہوگا، متاثر، متجسس، برہم، خائف اور پریشان ہوئے ہیں۔ اس مضمون نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، ہر تہذیب کے لوگوں کی کسی دکھتی رگ کو ضرور چھیڑا ہے۔

مضمون سے دلچسپی، غلط توضیحات اور تنازعے کے پیش نظر مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان مسائل پر مزید تحقیق کی جائے جو اس میں اٹھائے گئے ہیں۔ کوئی سوال اٹھانے کا ایک تعمیری طریقہ یہ ہے کہ ایک مفروضہ بیان کردیا جائے۔ یہ مضمون جس کے عنوان میں موجود سوالیہ نشان کو عموماً نظرانداز کردیا گیا، ایسی ہی ایک کوشش تھی۔ زیر نظر کتاب کا مقصد مضمون میں اٹھائے گئے سوال کا زیادہ بھرپور، زیادہ گہرا اور زیادہ مفصل دستاویزات سے آراستہ جواب دینا ہے۔ یہاں میں نے مضمون میں پیش کردہ نظریات کی تشریح، کتر بیونت یا اضافہ کرنے اور بعض اوقات مشروط کرنے کی کوشش کی ہے اور بیشتر ایسے خیالات کو سامنے لانا اور موضوعات کا احاطہ کرنا چاہا ہے جن پر مضمون میں بحث نہیں

کی گئی یا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں یہ موضوعات شامل ہیں: تہذیبوں کا تصور، ایک عالمی تہذیب کا مسئلہ، طاقت اور ثقافت کا رشتہ، تہذیبوں کے مابین طاقت کا بدلتا توازن، غیر مغربی معاشروں میں ثقافت کا مقامی رنگ میں ڈھلنا، تہذیبوں کی سیاسی ساخت، مغربی آفاقیت، مسلم شدت پسندی اور چینی اثبات کے پیدا کردہ تنازعات، چینی قوت کے عروج کا مقابلہ اور نقالی کی کوششیں، رخنوں (fault line) کی جنگوں کے اسباب و حرکیات اور مغرب اور تہذیبوں کی دنیا کا مستقبل۔ ایک بڑا موضوع جو آبادی میں اضافے کے عدم استحکام اور طاقت کے توازن پر اثرات سے متعلق ہے، مضمون میں موجود نہ تھا۔ ایک اور اہم نکتہ جس کا مضمون میں تذکرہ نہ تھا، اس کا خلاصہ کتاب کے عنوان اور آخری جملے میں ہے: ''تہذیبوں کے تصادم امن عالم کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور عالمی جنگ سے تحفظ کا سب سے یقینی طریقہ تہذیبوں کی بنیاد پر ایک عالمی نظام کا قیام ہے۔''

یہ کتاب معاشرتی سائنس کے مقالے کے طور پر نہیں لکھی گئی۔ اس کا مقصد سرد جنگ کے بعد عالمی سیاست کے ارتقا کی توضیح کرنا ہے۔ اس میں عالمی سیاست کی تفہیم کے لیے ایک ایسا ڈھانچا یا خاکہ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اہل علم کے لیے بامعنی ہو اور پالیسی سازوں کے لیے مفید۔ اِس کی معنویت اور افادیت کا پیمانہ یہ نہیں کہ آیا یہ عالمی سیاست میں ہونے والی ہر بات کی وضاحت کرتی ہے۔ ظاہر ہے نہیں کرتی۔ پیمانہ یہ ہے کہ آیا یہ بین الاقوامی حالات کو دیکھنے کے لیے کسی اور خاکے کی بہ نسبت زیادہ بامعنی اور مفید عدسہ فراہم کرتی ہے۔ مزید برآں، کوئی بھی خاکہ ہمیشہ صحیح نہیں رہتا۔ اگر تہذیبی نقطہ نگاہ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل کی عالمی سیاست کو سمجھنے کے لیے مددگار ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بیسویں یا اکیسویں صدی کے وسط میں بھی اتنا ہی مددگار ہوگا۔

وہ خیالات جو بالآخر مذکورہ مضمون اور زیر نظر کتاب کی صورت میں ڈھل گئے، سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۹۲ء میں واشنگٹن میں امریکن انٹر پرائز انسٹی ٹیوٹ میں دیے گئے بریڈ لے لکچر میں ظاہر کیے گئے اور پھر اولن انسٹی ٹیوٹ کے منصوبے ''سلامتی کا بدلتا ہوا ماحول اور امریکی قومی مفادات'' کے لیے، جو اسمتھ رچرڈسن فاؤنڈیشن نے ممکن بنایا، تیار کردہ ایک Occasional Paper میں بیان ہوئے۔ میں ''تصادم'' پر ہونے والے لاتعداد سیمیناروں، اجلاسوں میں شریک ہوا جو علمی، سرکاری اور تجارتی اور دیگر گروپوں نے امریکا بھر میں منعقد کیے تھے۔ علاوہ ازیں خوش قسمتی سے مجھے مضمون اور اس کے موضوع پر دوسرے بہت سے ممالک بشمول ارجنٹینا، بیلجیئم، چین، فرانس، جرمنی،

برطانیہ، کوریا، جاپان، لکسمبرگ، روس، سعودی عرب، سنگاپور، جنوبی افریقہ، اسپین، سویڈن، سوئٹزرلینڈ اور تائیوان میں بحث و مباحثے میں شرکت کا موقع ملا۔ ان بحثوں سے مجھے ہندومت کے سوا تمام بڑی تہذیبوں کا تجربہ ہوا اور میں نے بحثوں کے شرکا کے موقف اور نقطہ ہائے نظر سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء میں میں نے ہارورڈ میں مابعد سرد جنگ کی دنیا کی نوعیت پر ایک سیمینار سے خطاب کیا اور سیمینار کے طلبہ کے تبصرے جو ہمیشہ زوردار اور بعض اوقات تنقیدی ہوتے ہیں، اضافی محرک ثابت ہوئے۔ اس کتاب پر میری تحقیق کو ہارورڈ کے جان ایم اولن انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرے ٹجک اسٹڈیز اور سینٹر فار انٹرنیشنل افیئرز کے علمی اور مددگار ماحول سے بھی بہت فائدہ ہوا۔

مائیکل سی ڈیش، رابرٹ او کیوہین، فرید زکریا اور آر اسکاٹ زمرمین نے پورا مسودہ پڑھا اور ان کے تبصروں کے طفیل کتاب کے مواد اور تنظیم میں خاصی بہتری ہوئی۔ کتاب تحریر کیے جانے کے دوران شروع سے آخر تک اسکاٹ زمرمین نے تحقیقی معاونت فراہم کی جو ناگزیر ہوتی ہے۔ ان کی محنت، مہارت اور لگن کے بغیر یہ کتاب اس وقت ہرگز مکمل نہ ہو پاتی جب ہوئی۔ ہمارے انڈر گریجویٹ معاونین پیٹر جن اور کرسٹینا برگس نے بھی تعمیری انداز میں مدد کی۔ گریس ڈی میجسٹرس نے مسودے کے ابتدائی حصے ٹائپ کیے اور کیرول ایڈورڈز نے بے حد محبت اور زبردست مہارت سے مسودے میں اتنی بار کاٹ چھانٹ کی کہ اسے طویل اقتباسات ازبر ہوگئے ہوں گے۔ جارجز بورشارٹ میں ڈینس شینن اور لن کوکس نے اور سائمن اینڈ شسٹر میں رابرٹ اساہینا، رابرٹ بینڈر اور جوہانا لی نے بڑی خوشدلی اور پیشہ ورانہ انداز سے اشاعت کے عمل سے مسودے کو گذارا۔ میں ان تمام افراد کا انتہائی شکرگذار ہوں کہ اس کتاب کو وجود میں لانے میں انہوں نے مدد کی۔ انہوں نے اسے کہیں بہتر بنادیا اور جو کوتاہیاں رہ گئی ہیں ان کی ذمے واری مجھ پر ہے۔

اس کتاب پر میرا کام جان ایم اولن فاؤنڈیشن اور اسمتھ رچرڈسن فاؤنڈیشن کے مالی تعاون کے باعث ممکن ہوا۔ ان کی مدد کے بغیر کتاب کی تکمیل برسوں تک کے لیے مؤخر ہوجاتی اور میں اس فراخدلانہ معاونت پر ان کا شکرگذار ہوں۔ اس صورتحال میں جبکہ دوسری فاؤنڈیشنوں کی توجہ ملکی مسائل پر مرکوز ہوتی جارہی ہے اولن اور اسمتھ رچرڈسن ستائش کی حقدار ہیں کہ انہوں نے جنگ، امن اور قومی و بین الاقوامی سلامتی سے دلچسپی برقرار رکھی اور ان موضوعات پر تحقیق میں مدد فراہم کی۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن

حصہ اول

تہذیبوں کی دُنیا

پہلا باب

عالمی سیاست میں نیا دور

تعارف: جھنڈے اور ثقافتی شناخت

۳رجنوری ۱۹۹۲ء کو ماسکو کی ایک سرکاری عمارت کے آڈیٹوریم میں روسی اور امریکی دانشوروں کا ایک اجلاس ہوا۔ دو ہفتے قبل سوویت یونین کا وجود ختم ہوگیا تھا اور روسی فیڈریشن ایک آزاد ملک بن گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر لینن کا مجسمہ جو پہلے آڈیٹوریم کے اسٹیج پر آراستہ تھا غائب ہوگیا اور اس کی بجائے سامنے والی دیوار پر روسی فیڈریشن کا پرچم لگا ہوا تھا۔ ایک امریکی کے مطابق واحد مسئلہ یہ تھا کہ جھنڈا الٹا لٹکایا گیا تھا۔ جب روسی میزبانوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی تو پہلے ہی وقفے کے دوران انہوں نے خاموشی سے بسرعت اس غلطی کی اصلاح کر لی۔

سرد جنگ کے بعد کے برسوں میں لوگوں کی شناخت اور اس شناخت کی علامات میں ڈرامائی تبدیلیاں آئیں۔ عالمی سیاست ثقافتی خطوط پر ازسرنو استوار ہونے لگی۔ الٹے جھنڈے عبوری دور کی علامت تھے لیکن زیادہ سے زیادہ پرچم صحیح انداز میں اور بلندی پر لہرائے جانے لگے اور روسی اور دیگر اقوام اپنی اپنی نئی ثقافتی شناخت کی ان اور دیگر علامات سے تحریک پارہی ہیں اور ان کے پیچھے چل رہی ہیں۔

۱۸راپریل ۱۹۹۴ء کو سرائیوو میں دو ہزار افراد جمع ہوئے جو سعودی عرب اور ترکی کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اقوام متحدہ، نیٹو یا امریکا کی بجائے یہ پرچم لہرا کر سرائیوو کے ان باشندوں

نے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ خود کو شناخت کیا اور دنیا کو بتایا کہ کون ان کے حقیقی دوست ہیں اور کون اتنے حقیقی نہیں۔

۱۶/اکتوبر ۱۹۹۴ء کو لاس اینجلس میں ۷۰,۰۰۰ افراد نے ''میکسیکن جھنڈوں کے سمندر'' کے نیچے مارچ کیا۔ وہ تجویز ۱۸۷ پر احتجاج کر رہے تھے جو ریفرنڈم سے متعلق تھی اور جس سے غیر قانونی تارکین اور ان کی اولاد بیشتر سرکاری فوائد سے محروم ہو جاتی۔ مبصرین کا سوال تھا کہ یہ لوگ کیوں ''میکسیکو کا جھنڈا لیکر سڑک پر مارچ اور یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ ملک انہیں مفت تعلیم دے؟ انہیں امریکی جھنڈا لہرانا چاہیے۔'' دو ہفتے بعد مزید مظاہرین نے سڑک پر مارچ کیا جو امریکی جھنڈا لیے ہوئے تھے—الٹا۔ پرچموں کے ان مظاہروں سے تجویز ۱۸۷ کی جیت یقینی ہو گئی جو کیلیفورنیا کے ۵۹ فیصد ووٹروں نے منظور کر لی۔

مابعد سرد جنگ کی دنیا میں پرچموں کی اہمیت ہے اور اسی طرح ثقافتی شناخت کی دوسری علامتیں بشمول صلیبیں، ہلال حتیٰ کہ اوڑھنیاں بھی اہم ہیں کیونکہ ثقافت کی اہمیت ہے اور بیشتر لوگوں کے لیے ثقافتی شناخت سب سے زیادہ بامعنی شے ہوتی ہے۔ لوگ نئی لیکن اکثر پرانی شناخت دریافت کر رہے ہیں اور نئے لیکن اکثر پرانے پرچموں کے سائے تلے مارچ کر رہے ہیں جو نئے لیکن اکثر پرانے دشمنوں سے جنگ کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس نئے دور کے ایک بے رحم فلسفے کا اظہار مائیکل ڈبڈن کے ناول ڈیڈ لیگون میں وینس کے قوم پرست جذبات انگیز رہنما نے بہت اچھی طرح کیا ہے: ''حقیقی دشمنوں کے بغیر حقیقی دوست نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہم اس سے نفرت نہ کریں جو کچھ ہم نہیں ہیں ہم اس سے محبت نہیں کر سکتے جو کچھ ہم ہیں۔ یہ پرانی سچائیاں ہیں جو ہم ایک صدی سے زائد عرصے کی جذباتی نعرہ بازی کے بعد دریافت کر رہے ہیں۔ جو لوگ ان کو نہیں مانتے وہ اپنے خاندان، اپنے ورثے، اپنی ثقافت، اپنے پیدائشی حق، اپنی ذات ہی سے انکار کرتے ہیں۔ انہیں آسانی سے معاف نہیں کیا جائے گا۔'' اہل سیاست اور دانشور ان پرانی سچائیوں میں موجود افسوسناک صداقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ شناخت کی خواہاں اور نسلیت کو از سر نو پیدا کرنے والی اقوام کے لیے دشمن ازبس ضروری ہیں اور ممکنہ طور پر خطرناک ترین دشمنیاں دنیا کی بڑی تہذیبوں کے درمیان رخنوں☆ (fault lines) پر واقع ہیں۔

اس کتاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ثقافت اور ثقافتی شناخت، جو وسیع ترین سطح پر تہذیبی

☆ نوٹ از مترجم: رخنے (fault lines)، تہذیبوں یا ثقافتوں کے درمیان حائل خلیجیں جو ان کے نقصانات کا باعث بنیں۔

شناخت ہوتی ہے، مابعد سرد جنگ کی دنیا میں اتحاد، انتشار اور تصادم کے تانے بانے بن رہی ہے۔ اس کتاب کے پانچ حصوں میں اس بنیادی قضیے کے ضمنی نتائج کی تشریح کی گئی ہے۔

حصہ اول: تاریخ میں پہلی بار عالمی سیاست کثیر قطبی بھی ہے اور کثیر تہذیبی بھی؛ جدیدیت مغربیت سے مختلف وممتاز ہے اور نہ تو کسی بامعنی حوالے سے کسی آفاقی تہذیب کو جنم دے رہی ہے نہ ہی غیر مغربی معاشروں کو مغربی بنا رہی ہے۔

حصہ دوم: تہذیبوں کے درمیان طاقت کا توازن بدل رہا ہے؛ مغرب کا اثر ورسوخ نسبتاً زوال پذیر ہے؛ ایشیائی تہذیبیں اپنی معاشی، فوجی اور سیاسی طاقت کو توسیع دے رہی ہیں؛ آبادی کے اعتبار سے اسلام پھیل رہا ہے جس سے مسلمان ممالک اور ان کے ہمسایوں کے لیے عدم استحکام میں اضافہ ہو رہا ہے؛ اور غیر مغربی تہذیبیں بالعموم اپنی ثقافتوں کی قدر وقیمت جتلا رہی ہیں۔

حصہ سوم: تہذیبوں کی بنیاد پر ایک عالمی نظام ابھر رہا ہے: ثقافتی قرابت داریاں رکھنے والے معاشرے ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں؛ معاشروں کو ایک تہذیب سے دوسری میں منتقل کرنے کی کوششیں ناکام ہوئی ہیں؛ اور ممالک اپنی تہذیب کی رہنما یا مرکزی ریاستوں کے گرد اکٹھا ہو رہے ہیں۔

حصہ چہارم: مغرب کے آفاقیت کے دعوے اسے دوسری تہذیبوں اور سب سے بڑھ کر اسلام اور چین سے زیادہ سے زیادہ متصادم کر رہے ہیں؛ مقامی سطح پر رخنہ جنگیں، جو بیشتر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہیں، "قرابت دار ملک کے گرد اجتماع" لڑائی کے بڑھنے کے خطرے اور اس کے نتیجے میں مرکزی ریاستوں کی ان جنگوں کو رکوانے کی کوششوں کا سبب بن رہی ہیں۔

حصہ پنجم: مغرب کی بقا کا انحصار اس پر ہے کہ اہلِ امریکا اپنی مغربی شناخت کا ادعا کریں اور اہلِ مغرب تہذیب کو آفاقی نہیں، منفرد سمجھیں اور غیر مغربی معاشروں کے چیلنجوں کے خلاف اس کی تجدید اور تحفظ کے لیے متحد ہو جائیں۔ تہذیبوں کی عالمی جنگ سے بچاؤ اس بات پر منحصر ہے کہ دنیا کے رہنما عالمی سیاست کے کثیر تہذیبی کردار کو قبول کریں اور اسے برقرار رکھنے کے لیے تعاون کریں۔

کثیر قطبی، کثیر تہذیبی دنیا

مابعد سرد جنگ کی دنیا میں تاریخ میں پہلی بار عالمی سیاست کثیر قطبی اور کثیر تہذیبی ہو گئی ہے۔ جب سے انسان وجود میں آیا ہے زیادہ تر عرصے کے دوران تہذیبوں کے مابین روابط وقتاً فوقتاً یا معدوم رہے۔

مغرب اور دیگر: ۱۹۲۰ء



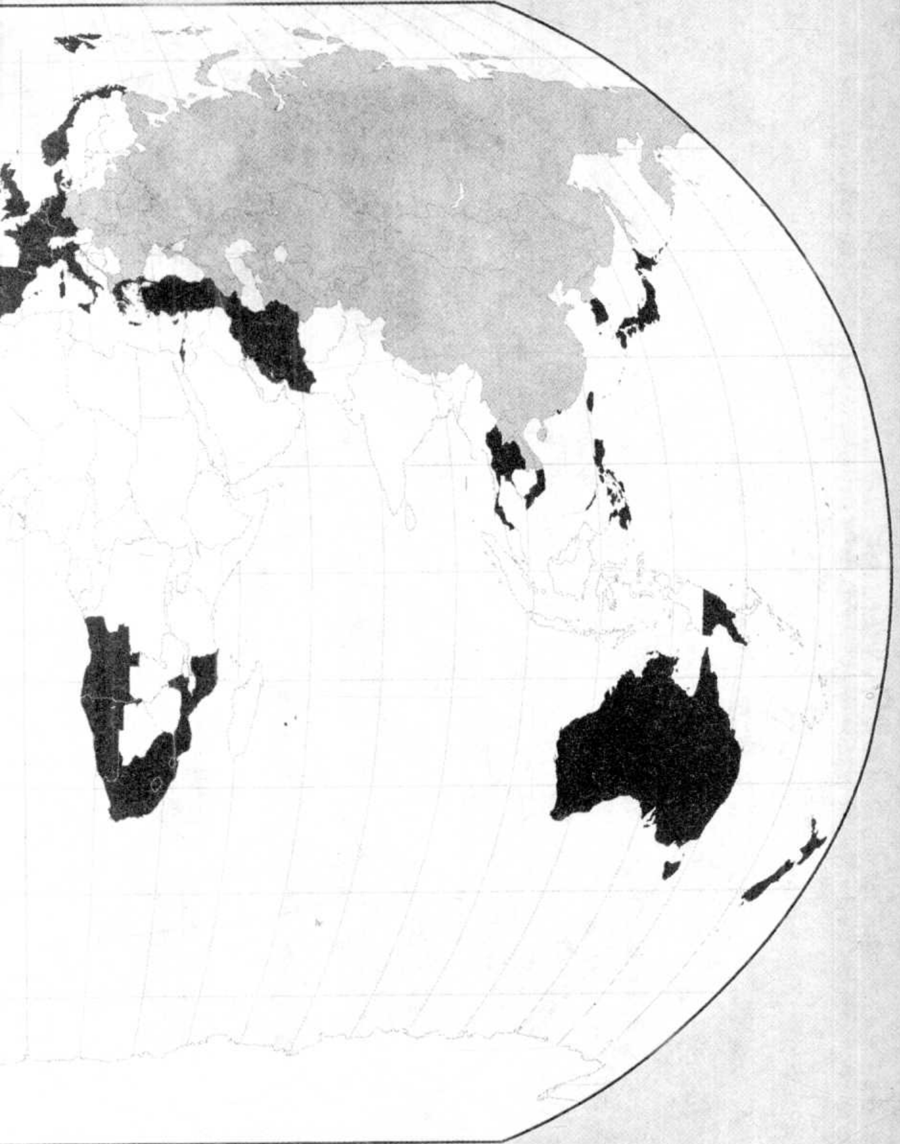
نقشہ ۱ء۱



مغرب کے زیر نگیں

مغرب سے حقیقتاً یا برائے نام آزاد

سرد جنگ کی دُنیا: ۱۹۶۰ء کی دہائی



نقشہ ۲ء۱

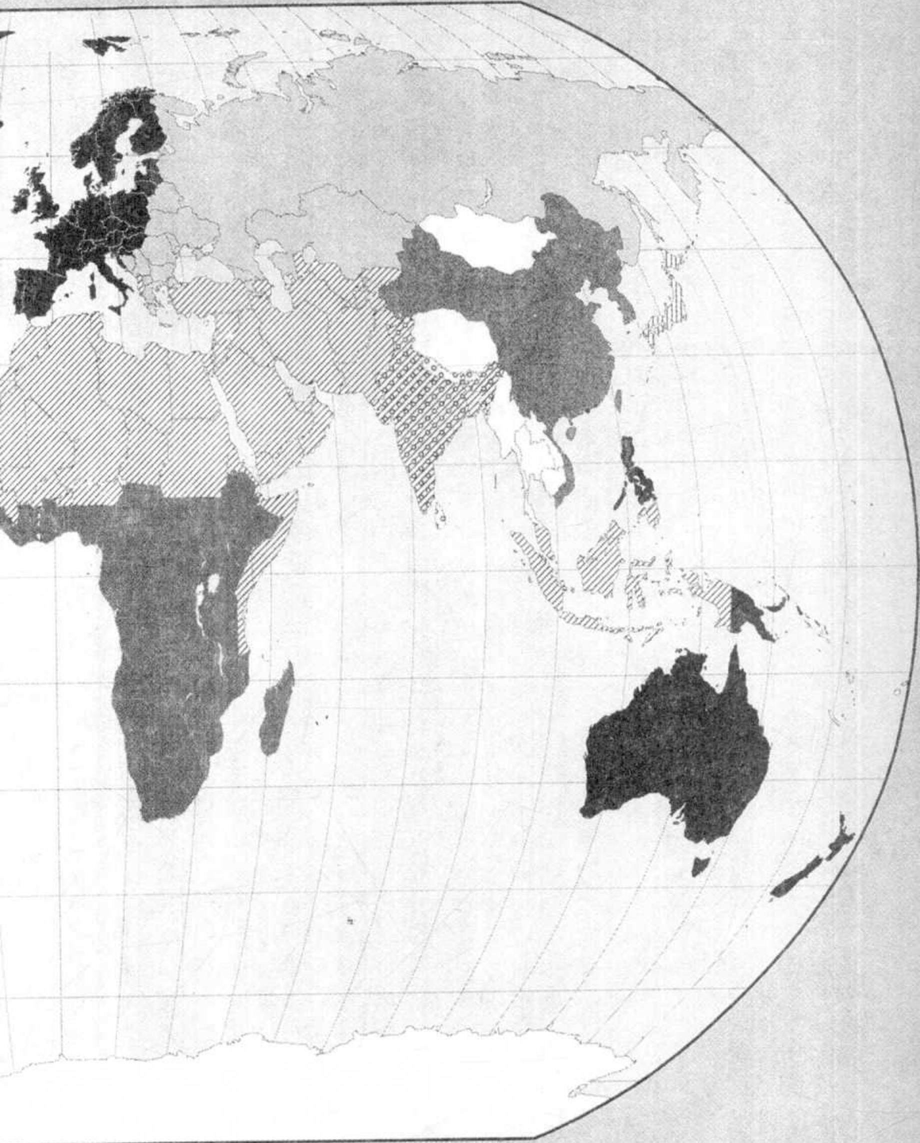


آزاد دُنیا

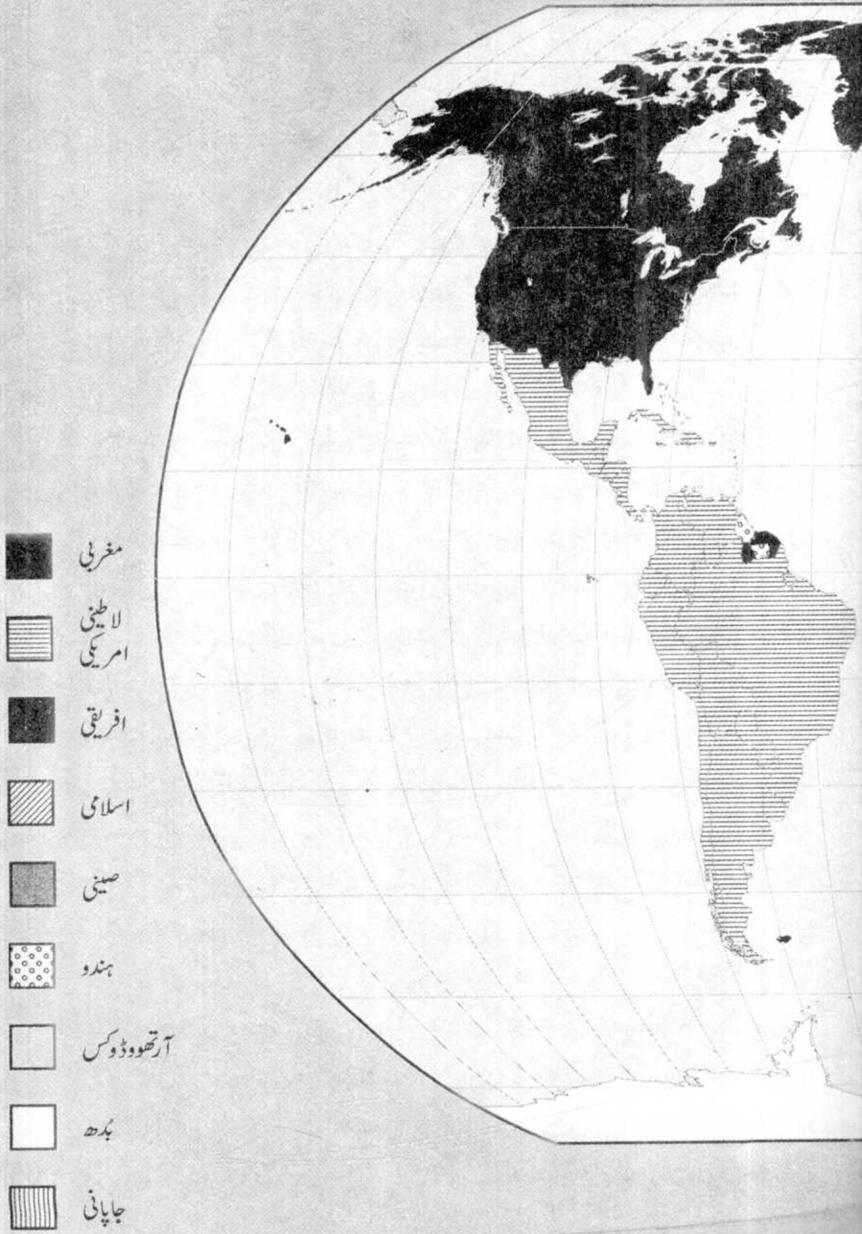
کمیونسٹ بلاک

ناوابستہ اقوام

تہذیبوں کی دُنیا: ۱۹۹۰ء کے بعد



نقشہ ۳ء۱


مغربی
لاطینی امریکی
افریقی
اسلامی
صینی
ہندو
آرتھوڈوکس
بدھ
جاپانی

پھر لگ بھگ ۱۵۰۰ء میں دور جدید کے آغاز کے ساتھ عالمی سیاست نے دو سمتیں اختیار کرلیں۔ چار سو سال سے زائد عرصے تک مغرب کی قومی ریاستیں برطانیہ، فرانس، اسپین، آسٹریا، پرشیا، جرمنی، امریکا اور دیگر ممالک مغربی تہذیب کے اندر ایک کثیر قطبی بین الاقوامی نظام کا حصہ تھے اور ان کا آپس میں ربط ضبط، مسابقت اور جنگیں لڑنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ساتھ ہی مغربی اقوام میں توسیع آئی، انہوں نے فتوحات کیں، نوآبادیاں قائم کیں اور ہر تہذیب پر فیصلہ کن اثر ڈالا (نقشہ ۱ء۱)۔ سرد جنگ کے دوران عالمی سیاست دو قطبی ہوگئی اور دنیا تین حصوں میں بٹ گئی۔ امریکا کی قیادت میں بیشتر دولتمند اور جمہوری معاشرے نسبتاً غریب کمیونسٹ معاشروں سے جن کی قیادت سوویت یونین کررہا تھا ایک وسیع نظریاتی، سیاسی، اقتصادی اور بعض اوقات فوجی مقابلے میں مصروف ہوگئے۔ یہ تصادم زیادہ تر تیسری دنیا میں ان دو کیمپوں سے باہر ایسے ملکوں میں ہوا جو اکثر غریب اور سیاسی استحکام سے محروم تھے، حال میں آزاد ہوئے تھے اور ناوابستہ ہونے کے دعویدار تھے (نقشہ ۲ء۱)۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں کمیونسٹ دنیا منہدم ہوگئی اور سرد جنگ کا بین الاقوامی نظام تاریخ کا حصہ بن گیا۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں اقوام کے درمیان اہم ترین امتیازات نظریاتی، سیاسی یا معاشی نہیں بلکہ ثقافتی ہیں۔ اقوام اور ملتیں اُس سب سے بنیادی سوال کا جواب دینے کی کوشش کررہی ہیں جو انسان کو درپیش ہوسکتا ہے: ہم کون ہیں؟ اور وہ اس سوال کا جواب اسی روایتی طریقے سے دے رہی ہیں جیسے انسان دیتا رہا ہے یعنی ان چیزوں کے حوالے سے جو اس کے لیے سب سے اہم ہیں۔ لوگ خود کو آباؤاجداد، مذہب، زبان، تاریخ، اقدار، روایات اور اداروں کے حوالوں سے پہچانتے ہیں۔ وہ اپنی شناخت ثقافتی گروہوں کے ساتھ کرتے ہیں یعنی قبائل، نسلی گروہ، مذہبی برادریاں، قومیں اور وسیع ترین سطح پر تہذیبیں۔ لوگ نا صرف اپنے مفادات کی خاطر بلکہ اپنی شناخت کے تعین کے لیے بھی سیاست کو استعمال کرتے ہیں۔ ہم کون ہیں، اس بات کا ہمیں اسی وقت علم ہوتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ ہم کون نہیں بلکہ اکثر اس وقت جب یہ معلوم ہو کہ ہم کس کے خلاف ہیں۔

عالمی امور میں قومی ریاستوں کا مرکزی کردار برقرار ہے۔ ماضی کی مانند ان کا طرزِعمل طاقت اور دولت کی جستجو سے تشکیل پاتا ہے لیکن اس کی تشکیل ثقافتی ترجیحات، مشترکہ پہلوؤں اور اختلافات سے بھی ہوتی ہے۔ ریاستوں کی اہم ترین گروہ بندی اب سرد جنگ کے تین بلاکوں کی صورت میں نہیں رہی بلکہ دنیا کی سات یا آٹھ بڑی تہذیبوں کی شکل میں ہے (نقشہ ۳ء۱)۔ غیرمغربی معاشرے بالخصوص مشرقی ایشیا میں اپنی اقتصادی دولت بڑھا رہے ہیں اور فوجی طاقت و

سیاسی اثر و نفوذ میں اضافے کی اساس پیدا کر رہے ہیں۔ جیسے جیسے غیر مغربی معاشروں کی طاقت اور خود اعتمادی بڑھ رہی ہے وہ اپنی ثقافتی اقدار کا اثبات کر رہے ہیں اور مغرب کی ''تھوپی'' ہوئی اقدار کو مسترد کر رہے ہیں۔ ہنری کسنجر نے لکھا ہے کہ ''اکیسویں صدی کے بین الاقوامی نظام ... میں کم از کم چھ بڑی طاقتیں امریکا، یورپ، چین، جاپان، روس اور غالباً بھارت نیز متعدد درمیانے اور چھوٹے ممالک ہوں گے''۔[۱] کسنجر کی چھ بڑی طاقتیں پانچ بہت مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے علاوہ اہم اسلامی ریاستیں ہیں جن کے محل وقوع، بڑی آبادیاں اور/ یا تیل کے وسائل انہیں عالمی امور میں بااثر بناتے ہیں۔ اس نئی دنیا میں مقامی سیاست نسلیت کی سیاست ہے؛ عالمی سیاست تہذیبوں کی سیاست ہے۔ سپر طاقتوں کی مخاصمت کی جگہ تہذیبوں کے تصادم نے لے لی ہے۔

اس نئی دنیا میں سب سے زیادہ پھیلے ہوئے، اہم اور خطرناک تنازعات سماجی طبقات، امیر و غریب یا اقتصادی طور پر متعین کردہ دوسرے گروہوں کے مابین نہیں بلکہ مختلف ثقافتی اکائیوں کے درمیان ہوں گے۔ تہذیبوں کے اندر قبائلی جنگیں اور نسلی تنازعے رونما ہوتے رہیں گے۔ مگر مختلف تہذیبوں سے متعلق ممالک اور گروہوں کے درمیان تشدد کے واقعات میں شدت آنے کا امکان ہے کیونکہ ان تہذیبوں کے دوسرے ممالک اور گروہ اپنے ''قرابت دار ممالک'' کی حمایت کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔[۲] صومالیہ میں قبائل کے درمیان خونریز ٹکراؤ کے بڑھنے کا خطرہ نہیں۔ روانڈا میں قبیلوں کے خونیں تصادم کے یوگنڈا، زائر اور برونڈی پر اثرات ہوں گے لیکن اس سے آگے نہیں۔ بوسنیا، کاکیشیا، وسط ایشیا یا کشمیر میں تہذیبوں کے مابین خونریز تنازعات بڑی جنگوں میں بدل سکتے ہیں۔ یوگوسلاویہ کے تنازعات میں روس نے سربوں کو سفارتی حمایت فراہم کی اور سعودی عرب، ترکی، ایران اور لیبیا نے بوسنیائیوں کو رقوم اور اسلحہ دیا۔ کسی نظریے یا طاقت کی سیاست یا معاشی مفادات کے باعث نہیں بلکہ ثقافتی قرابت داری کی وجہ سے۔ واکلاف ہیول نے کہا ہے کہ ''ثقافتی تنازعات بڑھ رہے ہیں اور تاریخ کے کسی بھی دوسرے عہد کے مقابلے میں آج زیادہ پُرخطر ہیں'' اور ژاق ڈیلو متفق ہے کہ ''مستقبل کے تنازعات اقتصادیات یا نظریات کی بجائے ثقافتی عوامل کی بنا پر چھڑیں گے''۔[۳] اور خطرناک ترین ثقافتی تنازعات تہذیبوں کے مابین رخنوں پر ہیں۔

مابعد سرد جنگ کی دنیا میں ثقافت تقسیم کرنے والی قوت بھی ہے اور متحد کرنے والی بھی۔ نظریات کے لحاظ سے جدا لیکن ثقافت کے اعتبار سے متحد لوگ یکجا ہو رہے ہیں جیسے دونوں جرمنی ہوئے اور جیسے دونوں کوریا اور کئی چین ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ نظریات یا تاریخی حالات کے اعتبار سے متحد لیکن تہذیب کے لحاظ سے منقسم معاشرے ٹوٹ رہے ہیں جیسے سوویت یونین، یوگوسلاویہ اور

بوسنیا، یا شدید داخلی کھچاؤ کا شکار ہیں جیسے یوکرین، نائیجیریا، سوڈان، بھارت، سری لنکا اور بہت سے دوسرے۔ ثقافتی قربت رکھنے والے ممالک اقتصادی و سیاسی طور پر تعاون کرتے ہیں۔ یورپی یونین جیسی بین الاقوامی انجمنیں جو مشترک ثقافت کے حامل ممالک پر مشتمل ہیں ان تنظیموں سے کہیں زیادہ کامیاب ہیں جو ثقافت سے ماورا ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ پینتالیس سال تک آہنی پردہ یورپ میں مرکزی خط تقسیم تھا۔ یہ خط کئی سو میل مشرق کی سمت منتقل ہوگیا ہے۔ اب یہ وہ خط ہے جو مغربی عیسائیت کی اقوام کو مسلمانوں اور آرتھوڈوکس اقوام سے علیحدہ کرتا ہے۔

تہذیبوں کے درمیان فلسفیانہ مفروضات، اساسی اقدار، سماجی روابط، روایات اور زندگی کے مجموعی نقطہ ہائے نظر کے حوالے سے اہم اختلافات ہیں۔ دنیا کے بیشتر حصوں میں مذہب کے احیا سے ان ثقافتی اختلافات کو تقویت مل رہی ہے۔ ثقافت بدل سکتی ہے اور سیاست و معاشیات پر اس کے اثرات کی نوعیت مختلف ادوار میں مختلف ہوسکتی ہے۔ لیکن تہذیبوں کے سیاسی و معاشی ارتقا میں اہم اختلافات کی جڑیں بلاشبہ مختلف ثقافتوں سے وابستگی میں ہیں۔ مشرقی ایشیائی اقتصادی کامیابی کا ماخذ مشرقی ایشیا کی ثقافت ہے اور اسی طرح مستحکم جمہوری سیاسی نظام بنانے میں مشرقی ایشیائی معاشروں کو جو دشواریاں پیش آئی ہیں اس کا سبب بھی یہی ہے۔ مسلم دنیا کے بیشتر حصوں میں جمہوریت کے نہ پنپ سکنے کی تشریح بڑی حد تک اسلامی ثقافت سے ہوتی ہے۔ کمیونزم کے بعد کے مشرقی یورپ اور سابق سوویت یونین کے معاشروں میں جو حالات پیدا ہوئے ان میں ان کی تہذیبی شناخت کارفرما ہے۔ مغربی عیسائی ورثہ رکھنے والے سماج معاشی ترقی اور جمہوری سیاست کی طرف گامزن ہیں؛ آرتھوڈوکس ممالک میں معاشی و سیاسی ترقی کے امکانات غیر یقینی ہیں؛ مسلمان جمہوریاؤں میں امکانات تاریک ہیں۔

مغرب طاقتور ترین تہذیب ہے اور برسوں تک رہے گی لیکن دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں اس کی طاقت زوال پذیر ہے۔ مغرب اپنی اقدار کے اثبات اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کوشاں ہے اور غیر مغربی معاشرے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ بعض مغرب کی تقلید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور مغرب کے ساتھ شامل ہونا یا ''دوڑ میں شریک ہونا'' چاہتے ہیں۔ دوسرے کنفیوشسی اور اسلامی معاشرے مغرب کی مزاحمت کرنے اور اس کے اثر کو ''متوازن'' کرنے کے لیے اپنی اقتصادی وفوجی طاقت بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح مابعد سرد جنگ کی عالمی سیاست کا ایک مرکزی محور مغربی طاقت وثقافت اور غیر مغربی طاقت وثقافت کے مابین تعامل ہے۔

ماحصل یہ ہے کہ مابعد سرد جنگ کی دنیا سات یا آٹھ بڑی تہذیبوں کی دنیا ہے۔ ثقافتی اشتراک

و اختلاف ریاستوں کے مفادات، مخالفتوں اور اتحادوں کو تشکیل دے رہے ہیں۔ دنیا کے اہم ترین ممالک زیادہ تر مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن مقامی تنازعات کے بڑھ کر جنگ میں بدلنے کا سب سے زیادہ خطرہ ہے وہ مختلف تہذیبوں سے متعلق گروہوں اور ممالک کے درمیان ہیں۔ بین الاقوامی ایجنڈے پر جو کلیدی مسائل ہیں ان میں تہذیبوں کے مابین اختلافات شامل ہیں۔ مغرب مدتوں سے حاوی تھا اب غیر مغربی تہذیبوں کو طاقت منتقل ہو رہی ہے۔ عالمی سیاست کثیر قطبی اور کثیر تہذیبی ہوگئی ہے۔

دوسری دنیائیں؟

نقشے اور خاکے۔ مابعد سرد جنگ کی عالمی سیاست کی یہ تصویر جس میں ثقافتی عوامل کارفرما ہیں اور مختلف تہذیبوں کے ممالک اور گروہوں کے درمیان تعلق کو پیش نظر رکھا گیا ہے بہت زیادہ سادہ بنا دی گئی ہے۔ اس میں سے متعدد باتیں محذوف ہیں، بعض باتیں مسخ ہیں اور کچھ مبہم۔ تاہم اگر ہمیں دنیا کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہے اور اس میں مؤثر انداز میں عمل کرنا ہے تو حقائق پیش کرنے والا کوئی سادہ نقشہ، کوئی نظریہ، تصور، نمونہ، خاکہ ضروری ہے۔ اس طرح کے علمی طریقوں کے بغیر بقول ولیم جیمز صرف ایک ''پھیلتا ہوا ہنگامہ خیز گورکھ دھندا'' رہ جاتا ہے۔ ٹامس کوہن نے اپنی شاہکار کتاب The Structure of Scientific Revolutions میں بتایا کہ علمی اور سائنسی ترقی کا مفہوم ایک خاکے یا نمونے کی جگہ، جو نئے یا نو دریافت شدہ حقائق کی وضاحت سے قاصر ہوتا جا رہا ہے نیا خاکہ یا نمونہ لانا ہے جو ان حقائق کی زیادہ اطمینان بخش توضیح کرتا ہے۔ کوہن نے لکھا ''کسی نظریے کو اسی وقت ایک خاکے کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے جب وہ حریف خاکوں سے بہتر محسوس ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ان تمام حقائق کی توضیح کر دے جن سے اس کا واسطہ پڑ سکتا ہے بلکہ درحقیقت کبھی ایسا نہیں ہوتا''۔ جان لوئیس گیڈس نے بھی دانشمندی کی بات کی ہے کہ ''نامانوس زمینوں میں سے راستہ تلاش کرنے کے لیے عموماً کسی قسم کا نقشہ درکار ہوتا ہے۔ نقشہ نگاری پیچیدگیاں دور کرنے والا ایک ضروری عمل ہے، جیسا کہ ادراک خود بھی ہے، جو ہمیں یہ دیکھنے کے قابل بناتا ہے کہ ہم کہاں ہیں اور کہاں جا رہے ہوں گے۔'' جیسا کہ گیڈس نے لکھا ہے، سپر طاقتوں کے مقابلے کے تصور پر مبنی سرد جنگ کا ماڈل اسی طرح کا ایک خاکہ تھا جسے پہلے ہیری ٹرومین نے بیان کیا۔ یہ ''جغرافیائی و سیاسی نقشہ نگاری کا ایک عمل تھا جس میں بین الاقوامی زمین کی ایسے انداز میں عکاسی کی

گئی جو ہر ایک سمجھ سکے اور اس سے مخالف طاقتوں کی روک تھام کی ایک نفیس حکمت عملی کے لیے، جو جلد ہی سامنے آنے والی تھی، راہ ہموار ہوئی۔'' بین الاقوامی تعلقات کے معاملے میں عالمی نقطہ ہائے نظر اور علمی نظریات کو رہنما کے طور پر استعمال کرنا ناگزیر ہے۔[۵]

چالیس سال تک بین الاقوامی تعلقات سے براہ راست وابستہ افراد اور طلبہ نے سرد جنگ کے خاکے کے حوالے سے سوچا اور عمل کیا، جو انتہائی سادہ بنایا گیا مگر بہت مفید خاکہ تھا۔ یہ خاکہ عالمی سیاست میں ہونے والی ہر بات کی توضیح نہیں کرسکتا تھا۔ کوہن کی استعمال کردہ اصطلاح کے مطابق بیشتر بے قاعدگیاں تھیں اور بعض اوقات اس خاکے نے دانشوروں اور اہلِ سیاست کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور وہ اہم واقعات کو پہلے سے نہ سمجھ پائے جیسے چین اور سوویت یونین کا مناقشہ۔ مگر عالمی سیاست کے ایک سادہ نمونے کی حیثیت سے اس نے اپنے حریف خاکوں سے زیادہ مظاہر کی توضیح کی۔ یہ بین الاقوامی امور کے بارے میں سوچنے کے لیے ایک لازمی نقطۂ آغاز تھا۔ اسے تقریباً سب نے قبول کرلیا اور دونسلوں تک اس نے عالمی سیاست سے متعلق سوچ کو ڈھالا۔

انسانی فکروعمل کے لیے سادہ بنائے گئے خاکے یا نقشے ناگزیر ہیں۔ ایک تو ہم واضح نظریات یا نمونے وضع کرسکتے ہیں اور شعوری طور پر انہیں اپنے برتاؤ کو متعین کرنے کے لیے بطور رہنما استعمال کرسکتے ہیں۔ اس کی بجائے ہم یہ بھی کرسکتے ہیں کہ ایسی رہنمائیوں کی ضرورت سے انکار کردیں اور فرض کرلیں کہ ہم فقط مخصوص ''معروضی'' حقائق کے حوالے سے ہر معاملے سے ''اس کے حسن و قبح کے مطابق'' نمٹتے ہوئے عمل کریں گے۔ لیکن اگر ہم یہ فرض کرلیں تو خود کو دھوکا دیں گے کیونکہ ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں وہ مفروضات اور تعصبات پوشیدہ ہوتے ہیں جو یہ طے کرتے ہیں کہ ہم حقائق کا کیسے ادراک کریں، کن امورِ واقعہ کو پیشِ نظر رکھیں اور یہ کہ ان کی اہمیت اور حسن و قبح کا فیصلہ کیسے کریں۔ ہمیں عیاں یا مضمر نمونے یا خاکے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ہم:

۱۔ حقائق کو منظم کرسکیں اور انہیں عمومی شکل دے سکیں؛
۲۔ مظاہر کے مابین علّی تعلقات کو سمجھ سکیں؛
۳۔ مستقبل کے حالات کے لیے تیار رہ سکیں اور خوش قسمت ہوں تو پیشگوئی کرسکیں؛
۴۔ اہم اور غیر اہم کے درمیان تمیز کرسکیں؛
۵۔ دیکھ سکیں کہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہمیں کون سے راستے اختیار کرنے چاہئیں۔

ہر خاکہ یا نقشہ ایک تجرید ہوتا ہے جو بعض مقاصد کے لیے زیادہ مفید ہوگا، بعض کے لیے کم۔ سڑک کا نقشہ ہمیں بتاتا ہے کہ مقام الف سے مقام ب کی طرف کیسے جائیں لیکن اگر ہم طیارہ اڑا

رہے ہوں تو یہ بہت مفید نہ ہوگا۔ اُس صورت میں ہمیں ایسا نقشہ درکار ہوگا جو ائرفیلڈز، ریڈیائی اشاروں، اڑان کے راستوں اور جغرافیائی تفصیلات کو نمایاں کرے۔ اگر کوئی بھی نقشہ نہ ہو تو ہم بھٹک جائیں گے۔ نقشہ جتنا تفصیلی ہو حقائق کی عکاسی اتنی ہی بھرپور کرے گا تاہم انتہائی تفصیلی نقشہ بہت سے مقاصد کے لیے فائدہ مند نہ ہوگا۔ اگر کسی شاہراہ پر ایک بڑے شہر سے دوسرے شہر جانا ہو تو ہمیں ایسا نقشہ درکار نہ ہوگا جس میں بہت سی غیر متعلق معلومات ہوں اور بڑی شاہراہیں چھوٹی چھوٹی سڑکوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئی ہوں بلکہ اس قسم کا نقشہ ہمیں الجھن میں مبتلا کرسکتا ہے۔ دوسری طرف ایک ایسا نقشہ جس میں صرف شاہراہ دکھائی گئی ہو ہماری یہ مدد نہیں کرسکتا کہ کوئی حادثہ رونما ہونے پر سڑک بند ہوجائے تو متبادل راستوں کی جانب ہماری رہنمائی کردے۔ مختصر یہ کہ ہمیں ایسے نقشے کی ضرورت ہوتی ہے جو حقائق کی عکاسی بھی کرے اور انہیں سادہ بھی بنائے، اس طرح کہ ہمارے مقاصد کی بہترین انداز میں تکمیل ہوسکے۔ سرد جنگ کے خاتمے پر عالمی سیاست کے کئی نقشے یا خاکے پیش کیے گئے۔

ایک دنیا: انبساط اور ہم آہنگی۔ ایک خاکہ جس کو بڑے پیمانے پر بیان کیا گیا اس مفروضے پر قائم تھا کہ سرد جنگ کے خاتمے کا مطلب عالمی سیاست میں تصادم کا خاتمہ اور ایک نسبتاً ہم آہنگ دنیا کا ابھرنا ہے۔ اس نمونے پر جس شکل میں سب سے زیادہ بحث کی گئی وہ فرانسس فوکویاما کا ''تاریخ کے خاتمے'' کا نظریہ تھا☆ فوکویاما کہتا ہے کہ ''ہوسکتا ہے ہم... تاریخ کا خاتمہ دیکھ رہے ہوں: یعنی بنی نوع انسان کے نظریاتی ارتقا کا آخری نقطہ اور مغربی لبرل جمہوریت کا انسانی حکومت کی حتمی شکل میں آفاقی حیثیت اختیار کرلینا۔'' اس نے کہا کہ بے شک تیسری دنیا کے بعض مقامات پر کچھ تنازعات ہوسکتے ہیں لیکن عالمی تصادم ختم ہوچکا ہے اور صرف یورپ میں نہیں — ''غیر یورپی دنیا میں ہی'' بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں علی الخصوص چین اور سوویت یونین میں۔ نظریات کی جنگ ختم ہوچکی ہے — ''مناگوا، پیانگ یانگ اور کیمبرج، میساچوسیٹس جیسی جگہوں پر'' مارکسزم لینن ازم کے ماننے والے موجود ہوسکتے ہیں لیکن مجموعی طور پر لبرل جمہوریت کی فتح ہوچکی ہے۔ مستقبل میں بڑی بڑی دل خوش کن فکری لڑائیاں نہیں ہوں گی بلکہ معمول کے اقتصادی و تکنیکی مسائل حل کیے جائیں گے اور وہ خاصے افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ خاصا اکتا دینے والا ہوگا۔[۶]

☆ اسی طرح کے ایک استدلال پر تیسرے باب میں بحث کی گئی ہے جس کی بنیاد سرد جنگ کے خاتمے کی بجائے اس تصور پر ہے کہ طویل المیعاد اقتصادی و معاشرتی رجحانات ایک ''آفاقی تہذیب'' پیدا کررہے ہیں۔

ہم آہنگی کی توقع ہمہ گیر تھی۔ سیاسی اور علمی حلقوں کے رہنماؤں نے انہی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا۔ دیوارِ برلن گر چکی تھی، کمیونسٹ حکومتیں ختم ہوگئی تھیں، اقوام متحدہ کو ایک نئی اہمیت اختیار کرنی تھی، سرد جنگ کے سابق حریف ''شراکت داری'' میں مصروف ہوتے، اور ایک ''عظیم سمجھوتے'' کے تحت تشکیل پانے والا قیام امن نافذ ہوتا۔ دنیا کے رہبر ملک کے صدر نے ''نئے عالمی نظام'' کا اعلان کردیا؛ دنیا کی صف اول کی جامعہ کے صدر نے مطالعہ سلامتی کے مضمون کے ایک پروفیسر کا تقرر ویٹو کردیا کیونکہ اس کی ضرورت نہیں رہی تھی: ''الحمدللہ ہم جنگ کا مطالعہ نہیں کریں گے کیونکہ جنگ نہیں رہی۔''

سرد جنگ کے خاتمے پر مسرت وانبساط کی کیفیت نے ہم آہنگی کا مغالطہ پیدا کیا اور جلد ہی منکشف ہوا کہ واقعی یہ مغالطہ تھا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں دنیا مختلف ہوگئی مگر ضروری نہیں تھا کہ زیادہ پُرامن بھی ہوگئی ہو۔ تبدیلی ناگزیر تھی، ترقی نہیں۔ بیسویں صدی کے دیگر اہم تنازعات میں ہر ایک کے خاتمے پر اسی طرح کے ہم آہنگی کے دھوکے کچھ عرصے کے لیے ہوئے تھے۔ جنگ عظیم اول ''جنگوں کو ختم کرنے والی جنگ'' تھی اور اسے دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ بنانا تھا۔ جنگ عظیم دوم، جیسا کہ فرینکلن روزویلٹ نے کہا، ''یکطرفہ کارروائی، مخصوص اتحادوں، طاقت کے توازن اور ان تمام تدابیر کے نظام کو ختم'' کردے گی ''جو صدیوں سے آزمائی جاتی رہی ہیں—اور ہمیشہ ناکام ہوئی ہیں۔'' اس کی بجائے ''امن سے محبت کرنے والی اقوام'' کی ''ایک آفاقی تنظیم'' ہوگی اور ''امن کے دائمی ڈھانچے'' کی شروعات ہوجائے گی۔ لیکن جنگ عظیم اول نے کمیونزم، فاشزم کو جنم دیا اور جمہوریت کی جانب ایک صدی پرانے رجحان کا رخ پلٹ دیا۔ جنگ عظیم دوم نے ایک سرد جنگ پیدا کی جو صحیح معنوں میں عالمی تھی۔ سرد جنگ کے اختتام پر ہم آہنگی کا جو دھوکا پیدا ہوا وہ نسلی تنازعات اور ''نسلی تطہیر'' کے واقعات میں اضافے، امن وامان کی خرابی، ریاستوں کے درمیان اتحاد وتصادم کے نئے پہلوؤں، نواشتمالی اور نو فاشستی تحریکوں کے دوبارہ زور پکڑنے، مذہبی بنیاد پرستی میں شدت آنے، مغرب کے ساتھ روس کے تعلقات میں ''مسکراہٹوں کی سفارتکاری'' اور ''جی حضوری کی پالیسی'' کے خاتمے، خونریز مقامی تنازعات کو دبانے میں اقوام متحدہ اور امریکا کی ناکامی اور ابھرتے ہوئے چین کی روزافزوں ادعائیت کی بنا پر جلد ہی رفع ہوگیا۔ دیوارِ برلن گرنے کے بعد پانچ سال میں لفظ ''نسل کشی'' اتنی مرتبہ سنا گیا کہ سرد جنگ کے دوران کسی پانچ سالہ عرصے میں نہیں سنا گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ دنیا کو ایک ہم آہنگ اکائی کے طور پر پیش کرنے والا یہ خاکہ حقیقت سے بہت دور ہے اور مابعد سرد جنگ کی دنیا کو سمجھنے میں ہماری مفید رہنمائی نہیں کرسکتا۔

دو دنیائیں: ہم اور وہ۔ دنیا کے اکائی بننے کی توقعات بڑے تنازعات کے خاتمے پر ہی سامنے آتی ہیں لیکن دو دنیاؤں کے حوالے سے سوچنے کا رجحان پوری انسانی تاریخ میں بار بار نظر آتا ہے۔ لوگ ہمیشہ لوگوں کو 'ہم' اور 'وہ'، گروہ کے اندر اور باہر، ہماری تہذیب اور 'وہ وحشی' میں تقسیم کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اہلِ علم نے دنیا کا مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب، مرکز اور محیط کی صورت میں تجزیہ کیا ہے۔ مسلمانوں نے روایتاً دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں بانٹا ہے۔ سرد جنگ کے اختتام کے بعد اس تقسیم کا اظہار، جو ایک اعتبار سے معکوس تھا، امریکی محققین کی تحریروں میں ہوا جنھوں نے دنیا کو ''امن کے خطوں'' اور ''فساد کے خطوں'' میں بانٹا۔ اول الذکر میں مغرب اور جاپان شامل تھے جن میں دنیا کی ۱۵ فیصد آبادی تھی اور آخر الذکر میں بقیہ سب تھے۔[۸]

دو حصوں پر مشتمل دنیا کی تصویر کسی حد تک حقیقت کے مطابق ہوسکتی ہے لیکن یہ اس بات پر منحصر ہے کہ حصوں کی تعریف کیسے کی جائے۔ جو تقسیم سب سے زیادہ کی جاتی ہے وہ امیر (جدید، ترقی یافتہ) ممالک اور غریب (روایتی، پسماندہ یا ترقی پذیر) ممالک کے درمیان ہے۔ اس معاشی تقسیم سے تاریخی لحاظ سے مربوط ثقافتی تقسیم، مغرب اور مشرق کے مابین ہے جس میں اقتصادی خوشحالی کے فرق پر کم اور داخلی فلسفے، اقدار اور طرزِ حیات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔[۹] یہ تمام تصویریں حقائق کے بعض عناصر کی عکاسی کرتی ہیں لیکن بعض اعتبار سے محدود بھی ہیں۔ امیر جدید ممالک میں کچھ خواص مشترک ہیں جو انہیں غریب روایتی ملکوں سے ممتاز کرتے ہیں اور ان غریب روایتی ملکوں میں بھی کچھ خواص مشترک ہیں۔ دولت میں فرق معاشروں کے درمیان تنازعات کی طرف لے جاتا ہے لیکن شواہد سے پتا چلتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر اس وقت ہوتا ہے جب امیر اور طاقتور تر معاشرے غریب اور زیادہ روایتی معاشروں کو تسخیر کرنے اور انہیں اپنی نوآبادی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مغرب نے یہ عمل چار سو سال تک کیا پھر بعض نوآبادیوں نے بغاوت کی اور نوآبادیاتی طاقتوں کے خلاف، جو ممکن ہے اپنی قلمرو کو برقرار رکھنے کی خواہش ہی کھو چکی ہوں، آزادی کی جنگیں لڑیں۔ موجودہ دنیا میں نوآبادیاں ختم ہوئی ہیں اور آزادی کی نوآبادیاتی جنگوں کی جگہ آزاد ہونے والی اقوام کے درمیان تنازعات نے لے لی ہے۔

ذرا زیادہ عمومی سطح پر دیکھا جائے تو امیر اور غریب کے درمیان تنازعات کا امکان نہیں کیونکہ سوائے مخصوص حالات کے غریب ملکوں میں اتنا سیاسی ایکا، اقتصادی طاقت اور فوجی صلاحیت نہیں کہ وہ امیر ممالک کے مقابلے پر آسکیں۔ ایشیا اور لاطینی امریکا میں ہونے والی معاشی ترقی متمول و مفلس کی تفریق کو دھندلا رہی ہے۔ امیر ممالک آپس میں تجارتی جنگیں لڑ سکتے ہیں؛ غریب ملکوں کے مابین

پُر تشدد جنگیں ہو سکتی ہیں؛ لیکن غریب جنوب اور دولتمند شمال کے درمیان بین الاقوامی طبقاتی جنگ کا خیال اتنا ہی بعید از حقیقت ہے جتنا ایک خوشگوار ہم آہنگ دنیا کا تصور۔

ثقافتی حوالے سے دنیا کی دو حصوں میں تقسیم اس سے بھی کم مفید ہے۔ مغرب تو کسی سطح پر ایک اکائی ہے لیکن غیر مغربی سماجوں میں سوائے اس کے کیا بات مشترک ہے کہ وہ غیر مغربی ہیں؟ جاپانی، چینی، ہندو، مسلمان اور افریقی تہذیبوں کے مذہب، معاشرتی ڈھانچے، اداروں اور رائج اقدار میں برائے نام اشتراک ہے۔ غیر مغربی تہذیبوں کا اتحاد اور مشرق و مغرب کی تقسیم من گھڑت تصورات ہیں جو مغرب نے پیدا کیے ہیں۔ ان من گھڑت تصورات میں استشراق (Orientalism) کے وہی نقائص پائے جاتے ہیں جن پر ایڈورڈ سعید نے بجا تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ''مانوس (یورپ، مغرب، 'ہم') اور نامانوس (شرق، مشرق، 'وہ') کے مابین فرق'' کو ترویج دے رہے ہیں اور یہ کہ یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ اول الذکر داخلی طور پر آخرالذکر سے برتر ہے۔[10] سرد جنگ کے دوران دنیا خاصی حد تک ایک نظریاتی طیف پر بٹی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی ایک ثقافتی طیف وجود نہیں رکھتا۔ ''مشرق'' اور ''مغرب'' کی ثقافتی تقسیم جزواً یورپی تہذیب کو مغربی تہذیب کہنے کے عام لیکن افسوسناک رواج کا نتیجہ ہے۔ ''مشرق اور مغرب'' کی بجائے ''مغرب اور بقیہ'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا جس میں کم از کم یہ بات تو موجود ہے کہ غیر مغربی معاشرے کئی ہیں۔ دنیا اتنی پیچیدہ ہے کہ اسے زیادہ تر مقاصد کے لیے سادہ طریقے سے اقتصادی طور پر شمال اور جنوب یا ثقافتی طور پر مشرق اور مغرب میں منقسم تصور کرنے سے فائدہ نہیں ہوگا۔

۱۸۴ ریاستیں، کم و بیش۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا کا تیسرا نقشہ اس نظریے سے ماخوذ ہے جسے اکثر بین الاقوامی تعلقات کا ''حقیقت پسندانہ'' نظریہ کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق عالمی امور میں بنیادی بلکہ واحد اہم عامل ریاستیں ہیں، ریاستوں کے درمیان تعلق طوائف الملوکی کا ہے اس لیے ریاستیں اپنی بقا اور تحفظ کی خاطر ہمیشہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ اگر ایک ریاست دوسری ریاست کو طاقت میں اضافہ کرتے اور اس طرح ممکنہ خطرہ بنتے دیکھتی ہے تو اپنی طاقت بڑھا کر اور/ یا دیگر ریاستوں سے اتحاد کر کے اپنی سلامتی کے تحفظ کی کوشش کرتی ہے۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں کم و بیش ۱۸۴ ریاستوں کے مفادات اور اعمال کی پیشگوئی ان مفروضات سے کی جاسکتی ہے۔[11]

دنیا کی ''حقیقت پسندانہ'' تصویر بین الاقوامی امور کا تجزیہ کرنے کے لیے بہت مفید نقطۂ آغاز ہے اور ریاستوں کے رویے کی خاصی حد تک وضاحت کرتا ہے۔ عالمی معاملات میں ریاستیں غالب

اکائیاں ہیں اور رہیں گی۔ ریاستیں افواج رکھتی ہیں، سفارتکاری کرتی ہیں، معاہدے کرتی ہیں، جنگیں لڑتی ہیں، بین الاقوامی تنظیموں کو چلاتی ہیں، پیداوار اور تجارت پر اثرانداز ہوتی ہیں اور ان کو بڑی حد تک تشکیل دیتی ہیں۔ ریاستوں کی حکومتیں خارجی سلامتی کو یقینی بنانے کو ترجیح دیتی ہیں (اگرچہ وہ بطور حکومت داخلی خطرات کے خلاف اپنی سلامتی کو یقینی بنانے کو اکثر اس بھی زیادہ اہمیت دے سکتی ہیں)۔ بحیثیت مجموعی یہ ریاستی خاکہ ایک یا دو دنیا والے خاکوں کی بہ نسبت عالمی سیاست کی زیادہ حقیقت پسندانہ تصویر پیش کرتا ہے اور بہتر رہنمائی کرسکتا ہے۔

بہرحال اس خاکے میں بعض سنگین خامیاں ہیں۔

اس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ تمام ریاستیں اپنے مفادات کو یکساں انداز میں دیکھتی ہیں اور ایک ہی طرح عمل کرتی ہیں۔ اس کا سادہ مفروضہ کہ طاقت ہی سب کچھ ہے ریاستی رویے کو سمجھنے کے لیے ایک نقطۂ آغاز ہے لیکن زیادہ دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔ ریاستیں اپنے مفادات کا تعین طاقت کے حوالے سے کرتی ہیں مگر اس سے ہٹ کر بھی بہت سے دوسرے حوالوں سے کرتی ہیں۔ بلاشبہ ریاستیں اکثر طاقت کو متوازن کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اگر وہ صرف یہی کررہی ہوتیں تو ۱۹۴۰ء کے عشرے کے اواخر میں مغربی یورپی ممالک امریکا کے خلاف سوویت یونین میں ضم ہوجاتے۔ بنیادی طور پر ریاستیں محسوس ہونے والے خطرات پر ردِعمل ظاہر کرتی ہیں اور اُس زمانے میں مغربی یورپی ریاستوں کو مشرق کی طرف سے سیاسی، نظریاتی اور فوجی خطرہ نظر آرہا تھا۔ انہوں نے اپنے مفادات کو جس انداز میں دیکھا اس کی پیشگوئی کلاسیکی حقیقت پسندانہ نظریے سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ اقدار، ثقافت اور ادارے اس بات پر بہت اثرانداز ہوتے ہیں کہ ریاستیں اپنے مفادات کا تعین کس طرح کریں۔ ریاستوں کے مفادات کو نا صرف ان کی ملکی اقدار اور ادارے تشکیل دیتے ہیں بلکہ بین الاقوامی رواج اور ادارے بھی۔ سلامتی سے متعلق تشویش تو بنیادی ہے مگر اس سے ہٹ کر مختلف ریاستیں اپنے مفادات کا مختلف طریقوں سے تعین کرتی ہیں۔ ملتی جلتی ثقافتوں اور اداروں کی حامل ریاستیں اپنا مفاد مشترک سمجھیں گی۔ جمہوری ریاستیں باہم مشترک عناصر رکھتی ہیں اور وہ آپس میں نہیں لڑتیں۔ کینیڈا کو امریکا کی طرف سے حملہ روکنے کے لیے کسی اور طاقت سے اتحاد کرنے کی ضرورت نہیں۔

اساسی سطح پر ریاستی خاکے کے مفروضات پوری تاریخ کے دوران درست رہے ہیں۔ چنانچہ ان مفروضات سے یہ سمجھنے میں مدد نہیں ملتی سرد جنگ کے بعد کی عالمی سیاست سرد جنگ کے دوران اور پہلے کی عالمی سیاست سے مختلف کیسے ہوگی۔ لیکن یہ واضح ہے کہ دونوں کے درمیان اختلافات

ہیں اور ریاستیں ایک تاریخی دور میں اپنے مفادات کی جدوجہد دوسرے دور کے مقابلے میں مختلف انداز میں کرتی ہیں۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں ریاستیں اپنے مفادات زیادہ سے زیادہ تہذیبی حوالوں سے متعین کررہی ہیں۔ وہ ملتی جلتی یا مشترک ثقافت کی حامل تہذیبوں والی ریاستوں سے تعاون کرتی ہیں اور مختلف ثقافت والے ممالک سے زیادہ متصادم ہوتی ہیں۔ ریاستیں خود کو لاحق خطرات کا تعین دوسری ریاستوں کے عزائم کے لحاظ سے کرتی ہیں، اور ثقافتی حوالے ان عزائم اور ان کے احساس پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس بات کا امکان کم ہے کہ عوام اور سیاستداں ان لوگوں سے خطرہ محسوس کریں جن کو مشترک زبان، مذہب، اقدار، اداروں اور ثقافت کی بنا پر وہ سمجھتے ہیں اور ان پر اعتماد کرسکتے ہیں۔ یہ امکان زیادہ ہے کہ انہیں ایسی ریاستوں سے خطرہ محسوس ہو جن کے معاشروں میں مختلف ثقافتیں ہیں اور اسی لیے انہیں وہ نہیں سمجھتے اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ اعتماد نہیں کرسکتے۔ اب جبکہ مارکسسٹ لیننسٹ سوویت یونین آزاد دنیا کے لیے خطرہ نہیں رہا اور امریکا کمیونسٹ دنیا کے لیے جوابی خطرہ نہیں رہا تو دونوں دنیاؤں میں ایسے معاشروں سے خطرات محسوس کیے جارہے ہیں جو ثقافتی اعتبار سے مختلف ہیں۔

ریاستیں بدستور عالمی امور میں بنیادی عامل کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن ان کی خود مختاری، وظائف اور طاقت میں کمی بھی آرہی ہے۔ اب ریاستوں کی اپنی سرزمین پر سرگرمیوں کے بارے میں بین الاقوامی ادارے فیصلے کرنے کا حق جتاتے ہیں اور ان سرگرمیوں کو محدود کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر خصوصاً یورپ میں بین الاقوامی اداروں نے ایسے اہم وظائف سنبھال لیے ہیں جو پہلے ریاستیں انجام دیا کرتی تھیں اور طاقتور بین الاقوامی افسر شاہیوں نے جنم لیا ہے جو براہِ راست انفرادی طور پر شہریوں سے معاملہ کرتی ہیں۔ عالمی سطح پر ریاستی حکومتوں کی طرف سے ریاستوں کی ماتحت، علاقائی، صوبائی اور مقامی سیاسی اکائیوں کو اختیارات سونپنے کا رجحان رہا ہے۔ ترقی یافتہ دنیا سمیت بہت سی ریاستوں میں علاقائی تحریکیں موجود ہیں جو خاصی خودمختاری یا علیحدگی کو فروغ دیتی ہیں۔ ریاستی حکومتیں اپنے ممالک کے اندر اور باہر دولت کے بہاؤ کو اپنے اختیار میں رکھنے کی اہلیت کسی حد تک کھوچکی ہیں اور انہیں خیالات، ٹیکنالوجی، اشیا اور افراد کا بہاؤ روکنے میں بھی زیادہ سے زیادہ دشواریوں کا سامنا ہے۔ مختصر یہ کہ ریاستی سرحدوں کی نفوذ پذیری بڑھ گئی ہے۔ ان تمام تبدیلیوں نے بہت سے لوگوں کو اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ ایک سخت ''بلیرڈ کی گیند'' جیسی ریاست رفتہ رفتہ ختم ہورہی ہے جو ۱۶۴۸ء میں ویسٹ فیلیا کے معاہدے کے بعد سے معمول سمجھی جاتی رہی ہے[۱۲] اور ایک متنوع، پیچیدہ، کئی سطحوں پر مشتمل بین الاقوامی نظام ابھر رہا ہے جو قرون وسطیٰ سے قریبی مشابہت

رکھتا ہے۔

کلّی انتشار۔ ریاستوں کی کمزوری اور ''ناکام ریاستوں'' کے نمودار ہونے کے عمل نے ایک اور عالمی خاکے کو تقویت دی ہے جو یہ ہے کہ دنیا میں طوائف الملوکی ہے۔ اس خاکے میں حکومتی اقتدار کی ناکامی؛ ریاستوں کے ٹوٹنے؛ قبائلی، نسلی اور مذہبی تنازعات میں شدت؛ بین الاقوامی جرائم پیشہ تنظیموں کے ابھرنے؛ پناہ گزینوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ جانے؛ جوہری اور بڑے پیمانے پر تباہی کے دوسرے ہتھیاروں کے پھیلاؤ؛ دہشت گردی کے نفوذ؛ قتل عام اور نسلی صفائی کے واقعات کی کثرت پر زور دیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں شائع ہونے والی دو کتابوں میں متاثر کن انداز میں دنیا میں انتشار کی یہ تصویر کھینچی گئی اور ان کتابوں کے عنوانات میں ہی ان کا خلاصہ موجود ہے: زبگنیو بریزنسکی کی *Out of Control* اور ڈینیل پیٹرک موئنی ہان کی *Pandaemonium*۔[۱۳]

ریاستوں کے خاکے کی طرح انتشار کا خاکہ بھی حقیقت سے قریب ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ اس کی محاکاتی اور صحیح عکاسی کرتا ہے اور ریاستی خاکے کے برخلاف اس میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد عالمی سیاست میں واقع ہونے والی اہم تبدیلیوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۳ء کے اوائل میں ۴۸ نسلی جنگیں دنیا بھر میں جاری تھیں اور سابق سوویت یونین میں سرحدوں سے متعلق ۱۶۴ ''علاقائی و نسلی دعوے اور تنازعات'' موجود تھے جن میں سے ۳۰ میں مسلح تصادم کی کوئی شکل شامل تھی۔[۱۴] تاہم حقیقت سے ضرورت سے زیادہ قریب ہونے کے حوالے سے یہ ریاستی خاکے سے بھی زیادہ خام ہے۔ دنیا میں انتشار ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی نہیں کہ سرے سے کوئی ترتیب و تنظیم ہی نہ ہو۔ ہمہ گیر اور بلا امتیاز طوائف الملوکی کی تصویر سے دنیا کی تفہیم میں، واقعات مرتب کرنے اور ان کی اہمیت جانچنے، انتشار کی اقسام اور ان کے ممکنہ اسباب و نتائج میں تمیز کے سلسلے میں اور حکومتی پالیسی سازوں کے لیے رہنما خطوط مرتب کرنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔

دنیاؤں کا موازنہ: حقیقت پسندی، کفایت اور پیشگوئیاں

یہ چاروں خاکے حقیقت پسندی اور کفایت کے مختلف امتزاجات پیش کرتے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی خامیاں اور حدود بھی ہیں۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ان نقائص کی تلافی خاکوں کو آپس میں ملا کر کر لی جائے۔ مثلاً یہ موقف اختیار کیا جائے کہ دنیا میں بیک وقت شکستگی اور اتحاد کے عمل جاری ہیں۔[۱۵] دراصل دونوں رجحانات موجود ہیں اور سادہ کی بہ نسبت پیچیدہ تر ماڈل حقیقت کے زیادہ قریب ہوگا۔

لیکن اس میں حقیقت پر کفایت کو قربان کرنا پڑے گا اور اگر اسے زیادہ بڑھایا جائے تو تمام خاکے یا نظریے مسترد کرنا پڑیں گے۔ مزید برآں شکستگی و اتحاد کے اس ماڈل میں دو بیک وقت مخالف رجحانات کو شامل کرنے کے باعث یہ طے نہیں کیا جاسکتا کہ کن حالات میں ایک رجحان غالب ہوگا اور کن میں دوسرا۔ اصل چیلنج ایسا خاکہ تشکیل دینا ہے جو اہم واقعات کی توضیح کرے اور علمی تجرید کی ملتی جلتی سطح پر دوسرے خاکوں کے مقابلے میں رجحانات کی بہتر تفہیم فراہم کرے۔

یہ چاروں خاکے باہم مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ دنیا ایک بھی ہو اور مشرق و مغرب یا شمال وجنوب کے درمیان اساسی طور پر منقسم بھی ہو۔ اور اگر دنیا منتشر ہورہی ہے اور خانہ جنگی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے تو قومی ریاست بین الاقوامی امور کی بنیاد نہیں ہوسکتی۔ دنیا یا تو ایک ہے، یا دو ہے، یا ۱۸۴ ریاستوں پر مشتمل ہے یا ممکنہ طور پر قبائل، نسلی گروہوں اور قومیتوں کی تقریباً لامحدود تعداد پر مشتمل ہے۔

دنیا کو سات یا آٹھ تہذیبوں کی صورت میں دیکھنے سے ان میں سے بہت سی دشواریاں رفع ہوجاتی ہیں۔ اس میں حقیقت کفایت پر قربان نہیں ہوتی جیسے ایک یا دو دنیا والے خاکوں میں ہوتی ہے؛ ساتھ ہی اس میں کفایت حقیقت پر بھی قربان نہیں ہوتی جیسے ریاستی یا انتشاری خاکوں میں ہوتی ہے۔ یہ خاکہ دنیا کی تفہیم کے لیے سہولت سے سمجھ میں آنے والا ڈھانچا پیش کرتا ہے، متعدد تنازعات میں سے اہم کو غیر اہم سے الگ کرتا ہے، مستقبل کے حالات کی پیشگوئی کرتا ہے اور پالیسی سازوں کے لیے رہنما خطوط فراہم کرتا ہے۔ یہ دوسرے خاکوں میں اضافہ اور ان کے عناصر کو اپنے اندر شامل بھی کرتا ہے۔ یہ ان خاکوں سے جتنی مطابقت رکھتا ہے اتنی وہ آپس میں نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر تہذیبی نقطۂ نگاہ یہ بیان کرتا ہے کہ:

* دنیا میں اتحاد کی قوتیں حقیقی ہیں اور یہی قوتیں ثقافتی دعوے اور تہذیبی آگاہی کی مخالف قوتیں پیدا کررہی ہیں۔
* ایک مفہوم میں دنیا دو ہے لیکن مرکزی امتیاز مغرب کی تاحال غالب تہذیب اور دیگر تمام کے مابین ہے جن میں مشترکہ عناصر موجود نہیں۔ مختصر یہ کہ دنیا ایک مغربی وحدت اور غیر مغربی کثرت کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔
* قومی ریاستیں دنیا میں اہم ترین عامل ہیں اور رہیں گی لیکن ان کے مفادات، شراکتیں اور تنازعات، ثقافتی اور تہذیبی عوامل سے تشکیل پارہے ہیں۔
* دنیا میں واقعی طوائف الملوکی ہے، قبائلی اور قومی تنازعے ہیں لیکن جو تنازعے استحکام کے لیے

سب سے بڑھ کر خطرہ ہیں وہ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی ریاستوں یا گروہوں کے درمیان ہیں۔

اس طرح تہذیبی خاکہ بیسویں صدی کے اختتام پر دنیا میں ہونے والے واقعات کو سمجھنے کے لیے نسبتاً سادہ نقشہ پیش کرتا ہے لیکن یہ نقشہ ضرورت سے زیادہ سادہ نہیں۔ تاہم کوئی خاکہ ہمیشہ کے لیے کارآمد نہیں ہوتا۔ سرد جنگ کا خاکہ چالیس سال تک مفید اور بامعنی رہا لیکن ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں فرسودہ ہوگیا۔ کسی مرحلے پر تہذیبی خاکے کو بھی اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن عصر حاضر میں یہ اہم اور کم اہم باتوں کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے مفید رہنما ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۳ء کے اوائل میں دنیا میں جاری اڑتالیس نسلی تنازعات میں سے نصف سے کچھ کم مختلف تہذیبوں سے وابستہ گروہوں کے مابین تھے۔ تہذیبی تناظر اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل اور امریکی وزیر خارجہ کی توجہ قیام امن کے لیے ان تنازعات کی طرف مبذول کرائے گا جن میں بڑھ کر جنگوں میں تبدیل ہونے کا خطرہ زیادہ ہے۔

خاکے پیشگوئیاں بھی کرتے ہیں اور کسی خاکے کی صحت و افادیت کا ایک اہم امتحان یہ ہے کہ اس سے ماخوذ پیشگوئیاں متبادل خاکوں کی بہ نسبت کس حد تک درست نکلتی ہیں۔ مثلاً ریاستی خاکے نے جان میئرز ہائمر سے یہ پیشگوئی کروائی کہ ''یوکرین اور روس کی صورتحال ان کے مابین سلامتی کے حوالے سے مسابقت کو جنم دے سکتی ہے۔ طویل اور غیر محفوظ مشترکہ سرحد، جیسی روس اور یوکرین کے درمیان ہے، رکھنے والی بڑی طاقتوں میں سلامتی کے خدشات کے باعث مسابقت شروع ہوجاتی ہے۔ روس اور یوکرین اس متحرک صورتحال پر قابو پاکر ہم آہنگی سے رہنا سیکھ سکتے ہیں لیکن اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ غیر معمولی بات ہوگی''۔[۱۶] دوسری جانب تہذیبی نقطۂ نظر روس اور یوکرین میں قریبی ثقافتی، ذاتی اور تاریخی روابط اور دونوں ملکوں میں روسیوں اور یوکرینی باشندوں کے اختلاط پر زور دیتا ہے اور اس کی بجائے اس تہذیبی رخنے پر توجہ مرکوز کرتا ہے جو آرتھوڈوکس مشرقی یوکرین کو یونیٹ (uniet) مسلک مغربی یوکرین سے جدا کرتا ہے۔ یہ ایک پرانی تاریخی حقیقت ہے جو میئرز ہائمر ریاستوں کے اس ''حقیقت پسندانہ'' تصور کی وجہ سے بالکل نظر انداز کردیتا ہے کہ وہ قطعی متحد اور ذاتی شناخت رکھنے والی اکائیاں ہیں۔ ریاستی نقطۂ نگاہ روس اور یوکرین میں جنگ کے امکان کو نمایاں کرتا ہے تو تہذیبی نقطۂ نظر اس امکان کو کم بتاتا ہے اور اس کی جگہ یوکرین کے دو حصوں میں بٹ جانے کے امکان کو نمایاں کرتا ہے۔ ثقافتی عوامل اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ تقسیم چیکوسلوواکیہ سے زیادہ متشدد مگر یوگوسلاویہ سے بہت کم خونریز ہوسکتی ہے۔ یہ مختلف پیشگوئیاں

مختلف پالیسی ترجیحات پیدا کرتی ہیں۔ ریاستی خاکے کے مطابق کی گئی ممکنہ جنگ اور یوکرین پر روس کی فتح کی پیشگوئی کے باعث میرز ہائمر یوکرین کے لیے جوہری اسلحے کے حصول کی حمایت کرتا ہے۔ تہذیبی نقطۂ نگاہ روس اور یوکرین کے درمیان تعاون، یوکرین کے جوہری ہتھیاروں سے دستبردار ہونے، یوکرین کی سالمیت اور آزادی برقرار رکھنے کے سلسلے میں اقتصادی امداد و دیگر اقدامات اور یوکرین کی ممکنہ تقسیم کے لیے ہنگامی منصوبہ بندی میں مدد دینے پر زور دیتا ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد بہت سے اہم واقعات تہذیبی خاکے سے مطابقت رکھتے تھے اور اس خاکے سے ان کی پیشگوئی کی جا سکتی تھی۔ ان میں سوویت یونین اور یوگوسلاویہ کی تقسیم؛ ان کے سابق علاقوں میں جاری جنگیں؛ ساری دنیا میں مذہبی بنیاد پرستی کا ابھرنا؛ روس، ترکی اور میکسیکو کے اندر ان کی شناخت پر کشمکش؛ امریکا اور جاپان میں تجارتی تنازعات میں شدت؛ عراق اور لیبیا پر مغربی دباؤ کے خلاف اسلامی ریاستوں کی مزاحمت؛ اسلامی اور کنفیوشسی ریاستوں کی جوہری ہتھیار اور انہیں چلانے کے وسائل حاصل کرنے کی کوششیں؛ چین کا ''بیرونی'' بڑی طاقت کے طور پر جاری کردار؛ بعض ممالک میں نئی جمہوری حکومتوں کا مضبوط ہونا اور بعض میں نہ ہونا؛ اور مشرقی ایشیا میں اسلحے کے حوالے سے مسابقت کا پیدا ہونا شامل ہیں۔

نئی ابھرتی ہوئی دنیا کے لیے تہذیبی خاکے کی معنویت ۱۹۹۳ء کی ایک ششماہی میں ہونے والے واقعات سے عیاں ہوتی ہے:

* سابق یوگوسلاویہ میں کروٹس، مسلمانوں اور سربوں کے درمیان لڑائی جاری رہنا اور اس میں شدت آنا؛
* بوسنیائی مسلمانوں کو قابل ذکر حمایت فراہم کرنے اور کروٹس کے مظالم کی بھی اسی انداز میں، جس طرح سرب مظالم کی کی گئی تھی، مذمت کرنے میں مغرب کی ناکامی؛
* کروشیا کے سربوں کی کروشیائی حکومت سے مفاہمت کرانے میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے دیگر ارکان کا ساتھ دینے میں روس کی عدم رضامندی اور بوسنیائی مسلمانوں کے لیے ایران اور دوسرے مسلم ممالک کی ۱۸۰۰۰ فوجی فراہم کرنے کی پیشکش؛
* آرمینیوں اور آذریوں کی جنگ میں شدت، ترکی اور ایران کے یہ مطالبات کہ آرمینی اپنی مفتوحات سے دستبردار ہو جائیں، آذربائی جان کی سرحد پر ترک اور سرحد کے پار ایرانی افواج کی تعیناتی اور روس کا یہ انتباہ کہ ایرانی کارروائی سے ''تنازع پر کشیدگی میں اضافہ'' ہوا ہے اور وہ ''بین الاقوامیت کی خطرناک حدود تک پھیل گیا ہے''؛

* وسط ایشیا میں روسی فوج اور مجاہدین چھاپہ ماروں میں مسلسل لڑائی؛
* ویانا انسانی حقوق کانفرنس میں امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر کی قیادت میں مغرب کا اسلامی وکنفیوشسی ریاستوں کے اتحاد سے ٹکراؤ، جس میں کرسٹوفر نے ''ثقافتی اضافیت'' کی مذمت کی تھی جبکہ مذکورہ ریاستوں نے ''مغربی آفاقیت'' کو مسترد کیا تھا؛
* ''جنوب کی جانب سے خطرے'' کے خلاف روسی اور نیٹو کے فوجی منصوبہ سازوں کا متوازی انداز میں پھر توجہ مرکوز کرنا؛
* ۲۰۰۰ء کے اولمپک کھیلوں کے بیجنگ کی بجائے سڈنی میں انعقاد کا فیصلہ جس کے لیے رائے شماری بظاہر تقریباً مکمل طور پر تہذیبی خطوط پر ہوئی؛
* چین سے پاکستان کو میزائل کے اجزا کی فروخت، نتیجتاً چین کے خلاف امریکی پابندیوں کا نفاذ اور ایران کو جوہری ٹیکنالوجی کی مبینہ فراہمی کے مسئلے پر چین اور امریکا میں محاذ آرائی؛
* چین کی جانب سے تعطل توڑ کر جوہری ہتھیار کا تجربہ کرنا اور شمالی کوریا کا اپنے جوہری اسلحہ پروگرام پر مزید مذاکرات میں شرکت سے انکار؛
* یہ انکشاف کہ امریکی محکمہ خارجہ ایران اور عراق دونوں کے لیے ایک ''دہری روک تھام'' کی پالیسی پر گامزن ہے؛
* امریکی محکمہ دفاع کا دو ''بڑے علاقائی تنازعات'' سے نمٹنے کے لیے نئی حکمت عملی کا اعلان، ایک شمالی کوریا کے خلاف اور دوسرا ایران یا عراق کے خلاف؛
* ایران کے صدر کا چین اور بھارت سے اتحاد کی ضرورت پر زور دینا تاکہ ''بین الاقوامی واقعات میں حرفِ آخر ہماری بات ہو''؛
* جرمنی میں پناہ گزینوں کا داخلہ بہت کم کرنے کے لیے نئی قانون سازی؛
* روسی صدر بورس یلسن اور یوکرینی صدر لیونڈ کراوچک کے درمیان بحیرۂ اسود کے بیڑے کی تعیناتی اور دیگر معاملات پر اتفاق؛
* امریکا کی بغداد پر بمباری، مغربی حکومتوں کی طرف سے اس کی عملاً مکمل حمایت اور تقریباً تمام مسلمان حکومتوں کی جانب سے اس کو مغرب کے ''دہرے معیار'' کی ایک اور مثال قرار دیتے ہوئے مذمت؛
* امریکا کا سوڈان کو دہشت گرد ریاست قرار دینا اور مصری شیخ عمر عبدالرحمان اور ان کے پیروکاروں پر ''امریکا کے خلاف شہری دہشت گردی کی جنگ تھوپنے'' کی سازش کی فردِ جرم عائد

کیا جانا؛

* پولینڈ، ہنگری، چیک جمہوریہ اور سلوواکیہ کی نیٹو میں بالآخر شمولیت کے امکانات روشن ہوجانا؛

* ۱۹۹۳ء کے روسی صدارتی انتخابات جن سے ثابت ہوا کہ روس واقعی ایک ''منقسم'' ملک ہے جس کی آبادی اور اشرافیہ اس بارے میں غیر یقینی کیفیت میں مبتلا ہیں کہ وہ مغرب کے ساتھ شامل ہوں یا اسے چیلنج کریں۔

۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل کی تقریباً کسی بھی ششماہی کے لیے تہذیبی خاکے کی معنویت ظاہر کرنے والی اسی نوعیت کی فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔

سرد جنگ کے ابتدائی برسوں میں کینیڈین سیاست داں لیسٹر پیئرسن نے غیر مغربی معاشروں کے احیا اور تحرک کی نشاندہی کی۔ اس نے انتباہ کیا کہ ''یہ خیال کرنا حماقت ہوگی کہ مشرق میں پیدا ہونے والے یہ نئے سیاسی معاشرے ان سماجوں کی نقل بمطابق اصل ہوں گے جن سے ہم مغرب میں آشنا ہیں۔ ان قدیم تہذیبوں کا احیا نئی شکلیں اختیار کرے گا۔'' اس نے نشاندہی کی کہ ''کئی صدیوں تک'' بین الاقوامی تعلقات کا مطلب یورپ کی ریاستوں کے مابین تعلقات تھے اور یہ نکتہ پیش کیا کہ ''اب بہت دوررس نتائج رکھنے والے مسائل ایک ہی تہذیب کے اندر موجود اقوام کے درمیان پیدا نہیں ہوتے بلکہ خود تہذیبوں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں''۔[17] سرد جنگ کی طویل عرصے تک چھائی ہوئی دوقطبیت نے ان حالات کو مؤخر کردیا جو پیئرسن نے مستقبل میں ہوتے دیکھ لیے تھے۔ سرد جنگ کے خاتمے نے ان ثقافتی وتہذیبی قوتوں کو آزاد کردیا جو اس نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پہچان لی تھیں، اور اہل علم اور مبصرین کی بڑی تعداد نے عالمی سیاست میں ان عوامل کے نئے کردار کو اجاگر کیا ہے۔[18] فرنینڈ براؤڈل کی یہ حکیمانہ نصیحت ہے کہ ''ہم عصر دنیا میں دلچسپی رکھنے والے اور اس میں عمل کرنے والے کسی فرد کے لیے یہ جاننا 'نفع بخش' ہے کہ دنیا کے نقشے پر کون سی تہذیبیں وجود رکھتی ہیں، ان کی سرحدیں، مراکز، گردوپیش، صوبے اور وہ فضا کیسی ہے جس میں لوگ سانس لیتے ہیں، ان میں موجود اور ان سے وابستہ عمومی اور خصوصی 'شکلیں' کیا ہیں۔ وگرنہ کتنی ہی تباہ کن تناظری غلطیاں جنم لے سکتی ہیں!''[19]

دوسرا باب

تہذیبیں تاریخ اور عصرِ حاضر میں

تہذیبوں کی ماہیت

انسانی تاریخ تہذیبوں کی تاریخ ہے۔ نوعِ انسانی کے ارتقا کے بارے میں کسی اور حوالے سے سوچنا ناممکن ہے۔ یہ کہانی قدیم سمیری اور مصری تہذیبوں سے کلاسیکی اور میسو امریکی سے مسیحی و اسلامی تہذیبوں کی متعدد نسلوں اور صینی اور ہندو تہذیبوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ پوری تاریخ میں تہذیبوں سے ہی لوگوں کو شناخت کے وسیع ترین حوالے ملے ہیں۔ چنانچہ تہذیبوں کے اسباب، پیدائش، عروج، باہمی روابط، کارناموں، زوال اور سقوط کا ممتاز مورخین، ماہرین معاشرتی علوم اور بشریات کے عالموں نے مفصل جائزہ لیا ہے جن میں دیگر کے علاوہ میکس ویبر، ایمائیل ڈرکھائیم، اوسوالڈ اسپینگلر، پٹیرم سوروکن، آرنلڈ ٹائن بی، الفریڈ ویبر، اے ایل کروئیبر، فلپ بیگ بی، کیرول کوئیگلی، رشٹن کولبورن، کرسٹوفر ڈاسن، ایس اے آئزن شٹاٹ، فرعینڈ براوڈل، ولیم ایچ مک نیل، ایڈا بوزمین، ایمانوئیل ویلرسٹائن اور فلپ فرنانڈس آرمسٹوشامل ہیں[1] ان مصنفین نے اور ان کے علاوہ دیگر نے تہذیبوں کے تقابلی تجزیے کے بارے میں بلند پایہ اور ضخیم تحریریں چھوڑی ہیں۔ ان تحریروں میں نقطہ نظر، طریقہ کار، مرکز توجہ اور تصورات کے اعتبار سے بہت اختلافات ہیں تاہم تہذیبوں کی ماہیت، شناخت اور حرکیات کے بارے میں مرکزی قضیات پر خاصا اتفاق بھی پایا جاتا ہے۔

اول، صیغہ واحد میں تہذیب اور صیغہ جمع میں تہذیبوں کے درمیان تمیز کی جاتی ہے۔ تہذیب

کا تصور اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی مفکرین نے ''بربریت'' کے تصور کی ضد کے طور پر وضع کیا۔ مہذب سماج بسا بسایا، شہری اور پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے ابتدائی (primitive) معاشرے سے مختلف تھا۔ مہذب ہونا اچھی بات تھی، غیر مہذب ہونا بری بات تھی۔ تہذیب کا تصور معاشروں کو جانچنے کا ایک معیار تھا اور انیسویں صدی میں اہل یورپ نے وہ پیمانے بیان کرنے میں بہت علمی، سفارتی اور سیاسی توانائی صرف کی جن کی رو سے یہ تعین کیا جا سکے کہ غیر یورپی معاشرے یورپ کے زیرِ تسلط بین الاقوامی نظام کے رکن کے طور پر قبول کیے جانے کے لیے کافی ''مہذب'' ہیں یا نہیں۔ ساتھ ہی صیغہ جمع میں تہذیبوں کی بات بھی کی جانے لگی۔ اس طرح ایک آدرش کی حیثیت سے تہذیب کا تصور مسترد ہونے لگا اور یہ مفروضہ بدلنے لگا کہ 'مہذب' کا تعین کرنے کے لیے کوئی واحد پیمانہ موجود ہے جو براوڈل کے لفظوں میں ''انسانیت کی 'اشرافیہ' مراعات یافتہ اقوام یا گروہوں تک محدود ہے۔'' اس کی بجائے بہت سی تہذیبیں ہوگئیں اور ہر ایک اپنے طور پر مہذب تھی۔ مختصراً صیغہ واحد میں تہذیب کا مفہوم ''اپنا کچھ طرۂ امتیاز کھو بیٹھا'' اور تہذیب کا جو مفہوم صیغہ جمع میں تھا اس کے لحاظ سے کوئی تہذیب صیغہ واحد کے معنوں میں خاصی غیر مہذب ہو سکتی تھی۔[۲]

اس کتاب میں تہذیبوں کے صیغہ جمع والے مفہوم سے بحث کی گئی ہے۔ تاہم واحد اور جمع کے فرق کی اہمیت ہے اور صیغہ واحد میں تہذیب کا تصور اس موقف کی صورت میں سامنے آیا ہے کہ ایک آفاقی عالمی تہذیب وجود رکھتی ہے۔ یہ موقف جان نہیں رکھتا لیکن اس سوال کا جائزہ لینے کے لیے یہ فائدہ مند ہے کہ تہذیبیں مزید مہذب ہو رہی ہیں یا نہیں۔ اس کتاب کے آخری باب میں یہ جائزہ لیا جائے گا۔

دوم، جرمنی کے سوا ہر جگہ تہذیب ایک ثقافتی اکائی ہے۔ انیسویں صدی کے جرمن مفکرین نے تہذیب اور ثقافت کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچا۔ تہذیب کو میکانیات، ٹیکنالوجی اور مادی عوامل جبکہ ثقافت کو اقدار، آدرشوں اور معاشرے کی اعلیٰ ذہنی، فنی اور اخلاقی خصوصیات سے منسلک کیا گیا۔ جرمن فکر میں یہ امتیاز برقرار رہا ہے لیکن دوسرے ممالک میں قبول نہیں کیا گیا۔ بعض بشریات دانوں نے اس ربط کو الٹ بھی دیا ہے اور ثقافتوں کو ابتدائی، غیر مبدل، غیر شہری معاشروں کی خاصیت کہا ہے جبکہ زیادہ پیچیدہ، ترقی یافتہ، شہری اور متحرک معاشروں کو تہذیبیں قرار دیا ہے۔ بہرکیف ثقافت اور تہذیب میں امتیاز کرنے کی یہ کوششیں جڑ نہیں پکڑ سکی ہیں اور سوائے جرمنی کے ہر جگہ براوڈل کی اس بات سے بالعموم اتفاق کیا جاتا ہے کہ ''جرمن انداز میں ثقافت کو اس کی بنیاد تہذیب سے علیحدہ کرنے کی خواہش کرنا مغالطے'' پر مبنی ہے۔[۳]

تہذیب اور ثقافت دونوں کسی قوم کے مجموعی طرز زندگی کی نشاندہی کرتے ہیں اور تہذیب جلی حروف میں لکھی ہوئی ثقافت ہے۔ دونوں کا تعلق ''اقدار، رواج، ادارے اور اُن طرز ہائے فکر'' سے ہے ''جنہیں کسی مخصوص معاشرے میں یکے بعد دیگرے مختلف پیڑھیوں نے بنیادی اہمیت دی ہو''۔[۴] براؤڈل کی نظر میں تہذیب ''ایک مقام، ایک ثقافتی خطہ'' ہے، ''ثقافتی خواص و مظاہر کا ایک مجموعہ'' ہے۔ ویلرسٹائن اس کی تعریف یوں کرتا ہے کہ یہ ''دنیا کے بارے میں نقطہ نگاہ، روایات، ڈھانچوں اور ثقافت (مادی ثقافت اور اعلیٰ ثقافت دونوں) کا ایک مخصوص سلسلہ ہے جو ایک قسم کا تاریخی کُل بناتا ہے اور جو اس مظہر کی دوسری متنوع شکلوں کے ساتھ وجود رکھتا ہے (گو کہ ہمیشہ ایک ہی زمانے میں نہیں)۔'' ڈاسن کے مطابق تہذیب ''کسی خاص قوم کی ثقافتی تخلیق کے اصلی عمل'' کی پیداوار ہے جبکہ ڈرکھائیم اور ماؤس کی نظر میں یہ ''ایک قسم کا اخلاقی ماحول [ہے] جس کے دائرے میں اقوام کی کچھ تعداد آجاتی ہے اور ہر قومی ثقافت کُل کی صرف ایک مخصوص شکل ہوتی ہے۔'' اسپینگلر کے خیال میں تہذیب ثقافت کا ناگزیر مقدر ... وہ انتہائی خارجی اور مصنوعی کیفیات جن کی کوئی ترقی یافتہ انسانی نسل اہل ہوسکتی ہے ... ایک نتیجہ، زیرِ تکمیل شے کے بعد آنے والی شے'' ہے۔ تہذیب کی عملاً ہر تعریف میں ثقافت مشترک موضوع ہے۔[۵]

تہذیب کی تعریف کرنے والے کلیدی ثقافتی عناصر کی وضاحت اہل ایتھنز نے کلاسیکی شکل میں اس وقت کی جب انہوں نے اسپارٹا کے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ اہل فارس سے ملکر ان سے دغابازی نہیں کریں گے:

> کیونکہ متعدد اور طاقتور وجوہ ہیں جو ہمیں ایسا کرنے سے روکتی ہیں خواہ ہم اس طرف مائل بھی ہوتے۔ پہلی اور سب سے بڑی وجہ، دیوتاؤں کی شبیہیں اور مسکن ہیں، سوختہ اور تباہ و برباد: اس کا ہمیں اپنی بھرپور طاقت سے انتقام لینا چاہیے بجائے اس کے کہ ایسی حرکتوں کے مرتکب شخص سے ساز باز کریں۔ دوسرے، یونانی نسل ایک خون اور ایک زبان رکھتی ہے، دیوتاؤں کے مندر اور قربانیاں مشترک ہیں، اور ملتے جلتے رواج، اہل ایتھنز کا ان سے دغابازی کرنا اچھی بات نہ ہوگی۔

یونانی مشترک خون، زبان، مذہب، طرز حیات رکھتے تھے اور یہی چیزیں انہیں اہل فارس اور غیر یونانیوں سے ممیز کرتی تھیں[۶] لیکن تہذیب کی تعریف کرنے والے تمام معروضی عناصر میں اہم ترین عموماً مذہب ہوتا ہے جس پر اہل ایتھنز نے زور دیا۔ بڑی حد تک انسانی تاریخ میں بڑی بڑی تہذیبوں کی شناخت دنیا کے عظیم مذاہب سے ہوئی ہے، جب کہ جو لوگ مشترک نسل و زبان مگر مختلف مذہب رکھتے ہیں ایک دوسرے کا خون کرسکتے ہیں جیسے لبنان، سابق یوگوسلاویہ اور برصغیر میں ہوا۔[۷]

ثقافتی خواص کے لحاظ سے لوگوں کی تہذیبوں میں تقسیم اور جسمانی خواص کے لحاظ سے نسلوں

میں تقسیم کے درمیان اہم مطابقت ہے۔ تاہم تہذیب اور نسل ایک چیز نہیں۔ ایک نسل کے افراد میں تہذیبی اعتبار سے گہری خلیج ہوسکتی ہے اور مختلف النسل افراد میں تہذیبی یگانگت ہوسکتی ہے۔ عظیم تبلیغی مذاہب عیسائیت اور اسلام متنوع نسلوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ انسانی گروہوں کے مابین اہم امتیازات کا تعلق ان کی اقدار، عقائد، اداروں اور سماجی ڈھانچے سے ہے، ان کی جسامت، کاسۂ سر اور جلد کی رنگت سے نہیں۔

سوم، تہذیبیں جامع ہوتی ہیں یعنی پوری تہذیب کے حوالے کے بغیر ان کے کسی جز کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ ٹائن بی نے کہا تھا کہ تہذیبیں ''احاطہ کرتی ہیں اور دوسروں کے احاطے میں نہیں آتیں۔'' تہذیب ایک کُل ہوتی ہے۔ میلکو کہتا ہے

> تہذیبیں اتحاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے اجزا کا تعین آپس میں اور کُل کے ساتھ ربط سے ہوتا ہے۔ اگر تہذیب ریاستوں پر مشتمل ہو تو ان میں باہمی تعلقات ان ریاستوں سے زیادہ ہوں گے جو تہذیب سے باہر ہیں۔ ان میں لڑائیاں زیادہ ہوسکتی ہیں، سفارتی روابط زیادہ ہوسکتے ہیں۔ وہ اقتصادی طور پر ایک دوسرے پر زیادہ انحصار کریں گی۔ ان میں نفوذ پذیر جمالیاتی و فلسفیانہ دھارے پائے جائیں گے۔[8]

تہذیب وسیع ترین ثقافتی اکائی ہے۔ دیہات، خطے، نسلی گروہ، قومیتیں، مذہبی گروہ، سب ثقافتی اختلاف کی مختلف سطح پر جداگانہ ثقافتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ جنوبی اٹلی کے کسی گاؤں کی ثقافت شمالی اٹلی کے گاؤں سے مختلف ہوسکتی ہے لیکن دونوں کی ایک مشترک اطالوی ثقافت ہوگی جو انہیں جرمن دیہات سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی طرح یورپی آبادیوں میں مشترک ثقافتی خواص ہوں گے جو انہیں چینی یا ہندو آبادیوں سے جدا کرتے ہیں۔ لیکن چینی، ہندو اور مغربی باشندے کسی وسیع تر ثقافتی اکائی کا حصہ نہیں۔ یہ تہذیبیں ہیں۔ چنانچہ تہذیب افراد کی اعلیٰ ترین گروہ بندی ہے اور ثقافتی شناخت کی وسیع ترین سطح ہے جس کے بعد انسان اور دوسری انواع کی تمیز ہی رہ جاتی ہے۔ اس کا تعین مشترکہ خارجی عناصر مثلاً زبان، تاریخ، مذہب، روایات اور اداروں اور افراد کی داخلی، ذاتی شناخت سے ہوتا ہے۔ شناخت کی سطحیں ہوتی ہیں: روم کا رہنے والا مختلف درجوں کی شدت سے خود کو رومی، اطالوی، کیتھولک، عیسائی، یورپی، مغربی بتا سکتا ہے۔ جس تہذیب سے اس کا تعلق ہے وہ شناخت کی وسیع ترین سطح ہے جس کا اسے بھرپور احساس ہوتا ہے۔ تہذیبیں سب سے بڑا ''ہم'' ہیں جن کے اندر ہم ثقافتی طور پر اطمینان محسوس کرتے ہیں، باہر موجود ''اُن'' کے مقابلے میں۔ تہذیبوں میں افراد کی بڑی تعداد ہوسکتی ہے، جیسے چینی تہذیب، یا بہت چھوٹی تعداد ہوسکتی ہے جیسے جزائر غرب الہند کے انگریزی بولنے والے۔ پوری تاریخ میں افراد کے ایسے چھوٹے گروہ رہے ہیں جن کی علیٰحدہ

ثقافت تھی اور کوئی وسیع تر ثقافتی شناخت نہ تھی۔ جسامت و اہمیت کے اعتبار سے بڑی اور ذیلی تہذیبوں (بیگ بی) یا بڑی اور گرفتار (arrested) یا ناتمام (abortive) تہذیبوں (ٹائن بی) کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں انہی تہذیبوں سے بحث کی گئی ہے جنہیں عموماً انسانی تاریخ کی بڑی تہذیبیں سمجھا جاتا ہے۔

تہذیبوں کی کوئی واضح سرحدیں ہوتی ہیں نہ معینہ آغاز و انجام۔ لوگ اپنی شناخت کا ازسرِنو تعین کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں چنانچہ وقت کے ساتھ تہذیبوں کی ترکیب اور شکل بدلتی رہتی ہے۔ اقوام کی ثقافتیں باہمی تعامل کرتی ہیں اور ان کے دائرے آپس میں ملے ہوتے ہیں۔ تہذیبوں کی ثقافتوں کی باہمی مشابہت یا غیر مشابہت بھی کم یا بیش ہوتی ہے۔ بایں ہمہ تہذیبیں بامعنی اکائیاں ہیں اور ہر چند کہ ان کے مابین خطوطِ امتیاز شاذ و نادر ہی واضح ہوتے ہیں مگر حقیقی ہوتے ہیں۔

چہارم، تہذیبیں فانی ہوتی ہیں مگر بہت عرصہ زندہ رہتی ہیں، ارتقا پاتی ہیں، مطابقت کے عمل سے گزرتی ہیں اور سب سے دیرپا انسانی ادارہ اور ''انتہائی طویل المدت حقائق'' ہیں۔ ان کا ''منفرد اور خاص جوہر ان کا طویل تاریخی تسلسل [ہے] تہذیب درحقیقت طویل ترین کہانی ہے۔'' سلطنتیں عروج و زوال پاتی ہیں، تہذیبیں باقی رہتی ہیں اور ''سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، حتیٰ کہ نظریاتی انقلابات سے بھی بچ کر نکل آتی ہیں''۔[9] بوزمین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''بین الاقوامی تاریخ میں بجا طور پر یہ نظریہ درج ہے کہ سیاسی نظام تہذیب کی بالائی سطح پر عارضی تدابیر ہیں اور لسانی و اخلاقی طور پر متحد ہر آبادی کی تقدیر کا انحصار بالآخر کچھ بنیادی تصورات کی بقا پر ہوتا ہے جن کے گرد یکے بعد دیگرے مختلف پیڑھیوں نے پرورش پائی ہو اور جو معاشرے کے تسلسل کی علامت ہوں''۔[10] بیسویں صدی میں دنیا کی عملاً تمام تہذیبیں یا تو ایک ہزار سال سے وجود رکھتی ہیں یا لاطینی امریکا کی طرح کسی اور طویل تہذیب کے بطن سے نکلی ہیں۔

تہذیبیں دیرپا تو ہوتی ہیں لیکن ارتقا بھی پاتی ہیں، متحرک ہوتی ہیں، عروج و زوال پاتی ہیں اور جیسا کہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے، صفحۂ ہستی سے مٹ کر وقت کی ریت میں دفن بھی ہو جاتی ہیں۔ ان کے ارتقا کے مراحل مختلف طریقوں سے متعین کیے جا سکتے ہیں۔ کوئیگلی تہذیبوں کو سات مراحل سے گزرتا ہوا قرار دیتا ہے: آمیزہ، زمانۂ حمل، توسیع، تنازعے کا دور، آفاقی سلطنت، ٹوٹ پھوٹ اور یورش۔ میلکو تبدیلی کے ایک خاکے کو عمومی طور پر یوں بیان کرتا ہے کہ ایک پختہ جاگیرداری نظام عبوری جاگیرداری نظام میں بدلتا ہے جو ایک پختہ ریاستی نظام کی شکل اختیار کرتا ہے جو عبوری ریاستی نظام میں تبدیل ہوتا ہے اور اس کے بعد پختہ شاہی نظام آتا ہے۔ ٹائن بی کی نظر میں

تہذیب چیلنجوں کے جواب میں ابھرتی ہے اور اس کے بعد نمو کا ایک دور آتا ہے جس میں ایک خلاق اقلیت کی ماحول پر قدرت میں اضافہ ہوتا ہے، پھر ایک دورِ ابتلا آتا ہے، ایک آفاقی ریاست جنم لیتی ہے اور اس کے بعد انتشار پیدا ہوتا ہے۔ ان نظریات میں اہم اختلافات ہیں مگر ان سب کے مطابق تہذیبیں ایک دورِ ابتلا یا تنازعے کے دور سے آفاقی ریاست اور پھر ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کی طرف جاتی ہیں۔[11]

پنجم، چونکہ تہذیبیں ثقافتی اکائیاں ہیں، سیاسی نہیں اس لیے وہ حکومتوں کی طرح نظم و ضبط برقرار رکھنے، انصاف قائم رکھنے، محصولات اکٹھا کرنے، جنگ لڑنے، معاہدے طے کرنے جیسے کام نہیں کرتیں۔ مختلف تہذیبوں کی سیاسی ترکیب مختلف ہوتی ہے اور ایک ہی تہذیب کے اندر بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ کسی تہذیب کے اندر ایک یا زیادہ سیاسی اکائیاں ہوسکتی ہیں۔ یہ اکائیاں شہری ریاستیں، سلطنتیں، وفاق، کنفیڈریشنز، قومی ریاستیں، کثیر قومی ریاستیں ہوسکتی ہیں جن میں حکومت کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ جب کوئی تہذیب ارتقا پذیر ہوتی ہے تو اس میں موجود سیاسی اکائیوں کی تعداد اور نوعیت میں عموماً تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ایک انتہا یہ ہے کہ تہذیب اور سیاسی اکائی یکساں ہو۔ لوسین پائی کا یہ تبصرہ ہے کہ چین ''ریاست کے لبادے میں ایک تہذیب'' ہے۔[12] جاپان ایک ایسی تہذیب ہے جو ریاست ہے۔ تاہم بیشتر تہذیبوں کے اندر ایک یا ایک سے زیادہ ریاستیں یا دیگر سیاسی اکائیاں ہوتی ہیں۔ جدید دنیا میں زیادہ تر تہذیبوں میں دو یا دو سے زائد ریاستیں ہیں۔

آخراً، اہلِ علم بالعموم جدید دنیا میں موجود اور تاریخ کی بڑی تہذیبوں کی شناخت کے بارے میں متفق ہیں۔ تاہم اس بات پر اکثر اختلاف پایا جاتا ہے کہ تاریخ میں کتنی تعداد میں تہذیبیں گزری ہیں۔ کوئیگلی کی رائے میں تاریخ میں سولہ تہذیبیں واضح طور پر ملتی ہیں اور غالباً آٹھ ان کے علاوہ ہیں۔ ٹائن بی نے یہ تعداد پہلے اکیس پھر تیئس بتائی۔ اسپنگلر نے آٹھ بڑی ثقافتوں کی بات کی ہے۔ مک نیل نے تمام تاریخ میں نو تہذیبوں پر بحث کی ہے۔ بیگ بی کی نظر میں بھی نو بڑی تہذیبیں ہیں اور اگر جاپان اور آرتھوڈوکسی کو چین اور مغرب سے علیحدہ مانا جائے تو گیارہ ہیں۔ براؤڈل اور روستووانی نے نو اور سات اہم عصر تہذیبیں گنوائی ہیں۔[13] ان اختلافات کا انحصار جزوی طور پر اس بات پر ہے کہ آیا چینیوں اور ہندوستانیوں جیسے ثقافتی گروہوں کو تاریخ میں دو یا دو سے زائد باہم منسلک تہذیبوں کا حامل سمجھا جائے جن میں سے ایک دوسری کے بطن سے نکلی ہو۔ ان اختلافات کے باوجود بڑی تہذیبوں کی شناخت متنازع نہیں۔ میلکو نے لٹریچر کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اس بارے میں ''خاصا اتفاق'' پایا جاتا ہے کہ کم از کم بارہ بڑی تہذیبیں ہیں جن میں سات اب

موجود نہیں (میسو پوٹیمیائی، مصری، کریٹن، کلاسیکی، بازنطینی، وسط امریکی، اینڈین) اور پانچ موجود ہیں (چینی، جاپانی، ہندوستانی، اسلامی اور مغربی)۔[14] کئی دانشوروں نے آرتھوڈوکس روسی تہذیب کو اس کی منبع (parent) بازنطینی تہذیب اور مغربی مسیحی تہذیب سے الگ قرار دیا ہے۔ ہمارے مقاصد کے لیے ان چھ تہذیبوں میں ہم عصر دنیا کی لاطینی امریکی اور ممکنہ طور پر افریقی تہذیب کا اضافہ کرنا فائدہ مند ہوگا۔

پس بڑی ہم عصر تہذیبیں مندرجہ ذیل ہیں:

صینی ۔تمام اہلِ علم نے تسلیم کیا ہے کہ کم از کم ۱۵۰۰ ق م اور شاید اس سے ایک ہزار سال پہلے سے تعلق رکھنے والی ایک علیحدہ قدیم چینی تہذیب یا دو چینی تہذیبیں موجود تھیں جو مسیحی دور کی ابتدائی صدیوں میں یکے بعد دیگرے آئیں۔ اپنے فارن افیئرز میں شائع ہونے والے مضمون میں، میں نے اسے کنفیوشین تہذیب کا نام دیا تھا لیکن صینی (Sinic) کی اصطلاح زیادہ صحیح ہے۔ کنفیوشزم چینی تہذیب کا ایک بڑا جز ہے مگر چینی تہذیب کنفیوشزم سے بڑھ کر ہے اور سیاسی اکائی کے طور پر چین کے علاوہ بھی پائی جاتی ہے۔ ''صینی'' کی اصطلاح جو متعدد اہلِ دانش نے استعمال کی ہے، چین اور چین کے باہر جنوب مغربی ایشیا اور دوسرے مقامات پر موجود چینی آبادیوں نیز ویت نام اور کوریا کی منسلکہ ثقافتوں کا موزوں طور پر احاطہ کرتی ہے۔

جاپانی ۔بعض دانشور جاپانی اور چینی ثقافت کو ملا کر مشرق بعید کی ایک تہذیب کا نام دیتے ہیں۔ تاہم بیشتر ایسا نہیں کرتے اور جاپان کو ایک جدا تہذیب قرار دیتے ہیں جو چینی تہذیب کے بطن سے پیدا ہوئی اور ۱۰۰ء اور ۴۰۰ء کے درمیان ابھری۔

ہندو۔ یہ بالاتفاق تسلیم کیا جاتا ہے کہ برصغیر میں کم از کم ۱۵۰۰ ق م سے ایک یا ایک سے زیادہ یکے بعد دیگرے آنے والی تہذیبوں کا وجود رہا ہے۔ انہیں عموماً ہندوستانی، انڈک یا ہندو کہا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر اصطلاح ترجیحاً سب سے بعد میں آنے والی تہذیب کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ دوسرے ہزارے قبل مسیح سے برصغیر کی ثقافت میں ہندو دھرم مرکزی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ ''یہ مذہب یا سماجی نظام سے بڑھ کر ہندوستانی تہذیب کی بنیاد ہے''۔[15] اس تہذیب کے اس کردار کا تسلسل جدید دور میں بھی رہا ہے حالانکہ خود بھارت میں خاصی بڑی مسلمان آبادی اور دوسری نسبتاً چھوٹی اقلیتیں موجود ہیں۔ صینی کی طرح ہندو کی اصطلاح بھی تہذیب کے نام کو اس کی اہم ترین ریاست کے نام سے الگ کرتی ہے، جو مناسب ہے کیونکہ تہذیب کی ثقافت اہم ترین ریاست تک محدود نہیں۔

اسلامی۔ تمام بڑے دانشور ایک علیٰحدہ اسلامی تہذیب کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسلام ساتویں صدی عیسوی میں جزیرہ نما عرب میں ابھرنے کے بعد شمالی افریقہ اور آئبیریائی جزیرہ نما اور مشرق کی جانب وسط ایشیا، برصغیر اور جنوب مشرقی ایشیا میں تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔ نتیجتاً اسلام کے اندر متعدد الگ الگ ثقافتیں یا ذیلی تہذیبیں بشمول عرب، ترکی، فارسی اور ملائی موجود ہیں۔

آرتھوڈوکس۔ کئی اہلِ علم آرتھوڈوکس تہذیب کو علیٰحدہ قرار دیتے ہیں جس کا مرکز روس ہے اور وہ اپنے بازنطینی ورثے، مختلف مذہب، تاتار حکمرانی کے ۲۰۰ برسوں، افسر شاہی پر مبنی آمرانہ نظام کے باعث نیز نشاۃ ثانیہ، اصلاح کلیسا، روشن خیالی اور دوسرے مرکزی مغربی تجربات سے دوری کی بنا پر مغربی مسیحیت سے جدا ہے۔

مغربی۔ مغربی تہذیب کی پیدائش کی تاریخ عموماً ۷۰۰ء یا ۸۰۰ء کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ اہلِ علم کی رائے میں اس کے تین اہم اجزا یورپ، شمالی امریکا اور لاطینی امریکا میں ہیں۔

لاطینی امریکی۔ بہرحال لاطینی امریکا کی مختلف شناخت ہے جو اسے مغرب سے ممیّز کرتی ہے۔ اگرچہ یہ یورپی تہذیب کے بطن سے نکلی ہے لیکن لاطینی امریکا کا ارتقا یورپ اور شمالی امریکا سے بہت مختلف راہوں پر ہوا ہے۔ اس کی ثقافت میں استبداد کا عنصر پایا جاتا ہے اور بڑے مفاد پرست گروہ چھائے ہوئے ہیں۔ یورپ میں یہ صورتحال خاصی کم اور شمالی امریکا میں بالکل نہیں تھی۔ یورپ اور شمالی امریکا دونوں نے اصلاح کلیسا (Reformation) کے اثرات محسوس کیے اور ان میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ثقافتوں کا امتزاج ہے۔ لاطینی امریکا تاریخی اعتبار سے صرف کیتھولک رہا ہے خواہ اب یہ صورتحال بدل رہی ہو۔ لاطینی امریکا کی تہذیب میں دیسی ثقافتیں شامل ہیں جو یورپ میں موجود نہ تھیں، شمالی امریکا میں ختم کر دی گئیں اور جن کی اہمیت میکسیکو، وسطی امریکا، پیرو اور بولیویا میں ارجنٹینا اور چلی سے مختلف ہے۔ لاطینی امریکی سیاسی ارتقا اور اقتصادی ترقی شمالی اوقیانوس کے ممالک سے واضح طور پر الگ رہی ہے۔ موضوعی لحاظ سے لاطینی امریکی باشندے خود اپنی شناخت کے بارے میں اختلافات رکھتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں "ہاں، ہم مغرب کا حصہ ہیں۔" کچھ کا دعویٰ ہے کہ "نہیں، ہماری اپنی منفرد ثقافت ہے" اور لاطینی و شمالی امریکیوں کی ضخیم تحریریں ان کے ثقافتی اختلافات کو نمایاں کرتی ہیں۔[16] لاطینی امریکا کو یا تو مغربی تہذیب کے اندر ایک ذیلی تہذیب سمجھا جا سکتا ہے یا پھر ایک علیٰحدہ تہذیب تصور کیا جا سکتا ہے جو مغرب سے قریبی وابستگی رکھتی ہے اور اس معاملے پر اندرونی اختلافات رکھتی ہے کہ اس کا تعلق مغرب سے ہے یا نہیں۔ تہذیبوں کے بین الاقوامی سیاسی مضمرات پر مرکوز تجزیے کی خاطر جس میں لاطینی امریکا کے یورپ و شمالی امریکا

سے روابط بھی شامل ہیں مؤخر الذکر صورت موزوں تر اور مفید تر ہوگی۔

اس طرح مغرب میں یورپ، شمالی امریکا اور دوسرے ایسے ممالک شامل ہیں جن میں یورپی آباد ہوئے جیسے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ۔ تاہم مغرب کے دو بڑے اجزا کے مابین تعلقات وقت کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ بیشتر تاریخ میں امریکیوں نے اپنے معاشرے کی شناخت یورپ سے مختلف متعین کی۔ امریکا آزادی، مساوات، مواقع اور مستقبل کی سرزمین تھی جبکہ یورپ ظلم، طبقاتی تصادم، اونچ نیچ اور پسماندگی کی نمائندگی کرتا تھا۔ یہ تک کہا جاتا تھا کہ امریکا علیحدہ تہذیب ہے۔ امریکا اور یورپ کے درمیان یہ مخالفت اس حقیقت کی وجہ سے تھی کہ کم از کم انیسویں صدی کے آخر تک امریکا کے غیر مغربی تہذیبوں سے روابط محدود تھے۔ جب ریاست ہائے متحدہ امریکا عالمی منظر پر آگیا تو یورپ کے ساتھ وسیع تر شناخت کا فہم پیدا ہوا۔[۱۷] انیسویں صدی کا امریکا خود کو یورپ سے مختلف اور مخالف قرار دیتا تھا تو بیسویں صدی کا امریکا خود کو وسیع تر اکائی یعنی مغرب کا حصہ بلکہ رہنما ٹھہراتا ہے۔

''مغرب'' کی اصطلاح اب ہر جگہ ان علاقوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جسے عالمِ مسیحیت کہا جاتا تھا۔ اس طرح مغرب واحد تہذیب ہے جو کسی خاص قوم، مذہب یا جغرافیائی خطے سے نہیں بلکہ قطب نما کی ایک سمت سے پہچانی جاتی ہے۔☆ یہ شناخت اس تہذیب کو اس کے تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی تناظر سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے مغربی تہذیب یورپی تہذیب ہے۔ جدید عہد میں مغربی تہذیب یورو امریکی یا شمالی اوقیانوسی تہذیب ہے۔ یورپ، امریکا اور شمالی اوقیانوس نقشے پر مل سکتے ہیں۔ مغرب نہیں مل سکتا۔ ''مغرب'' کے نام نے ''مغربیت'' (Westernization) کے تصور کو جنم دیا ہے اور مغربیت اور جدیدیت کو ملا دیا ہے جو گمراہ کن ہے: جاپان کے بارے میں یہ تصور کرنا زیادہ آسان ہے کہ وہ ''مغربی طرز اختیار کر رہا'' ہے بجائے اس کے کہ ''یورو امریکی طرز اختیار کر رہا'' ہے۔ تاہم یورپی امریکی تہذیب کو ہر جگہ مغربی تہذیب کہا جاتا ہے اور یہاں یہی اصطلاح استعمال کی جائے گی حالانکہ اس میں خاصے نقائص ہیں۔

☆ جغرافیائی علاقوں کے لیے ''مشرق'' اور ''مغرب'' کے الفاظ کا استعمال ابہام پیدا کرنے والا اور نسل پرستانہ سا ہے۔ ''شمال'' اور ''جنوب'' کو قطبوں کے نام کے طور پر سب تسلیم کرتے ہیں۔ ''مشرق'' اور ''مغرب'' کے ایسے کوئی حوالے کے نقاط نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ: کس چیز کا مشرق اور مغرب؟ اس کا انحصار اس پر ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں۔ ابتدا میں ''مغرب'' اور ''مشرق'' غالباً یوریشیا کے مغربی اور مشرقی حصوں کو کہتے تھے۔ لیکن امریکی نقطۂ نظر سے مشرق بعید درحقیقت مغرب بعید ہے۔ بیشتر چینی تاریخ میں مغرب کا مطلب ہندوستان تھا جبکہ'' جاپان میں مغرب کا مطلب عموماً چین ہوتا تھا۔'' ولیم ای نیف
Reflections on the Question of East and West from the point of view of Japan
Comparative Civilizations Review ۱۳ تا ۱۴ (خزاں ۱۹۸۵ء اور بہار ۱۹۸۶ء)، صفحہ ۲۲۸۔

افریقی (ممکنہ)۔ براؤڈل کے سوا تہذیب کے بیشتر اسکالر ایک علیٰحدہ افریقی تہذیب کو تسلیم نہیں کرتے۔ براعظم افریقہ کا شمالی علاقہ اور مشرقی ساحل اسلامی تہذیب سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ایتھوپیا کی اپنی الگ تہذیب تھی۔ دوسرے علاقوں میں استعماریت اور آبادکاری کے باعث مغربی تہذیب کے عناصر آئے۔ جنوبی افریقہ میں ولندیزی، فرانسیسی اور پھر انگریز آبادکاروں نے ایک متعدد ٹکڑوں میں بٹی ہوئی یورپی ثقافت کو جنم دیا۔[18] اہم تر بات یہ ہے کہ یورپی سامراج کے ساتھ صحرائے اعظم کے جنوب کے خطے میں زیادہ تر مسیحیت پہنچ گئی۔ پورے افریقہ میں قبائلی شناختیں عام ہیں اور شدت سے محسوس کی جاتی ہیں لیکن اب افریقیوں میں افریقی شناخت کا احساس بڑھ رہا ہے اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ صحرائے اعظم کے جنوب کا علاقہ باہم اختلاط کر کے ایک ممتاز تہذیب کی شکل اختیار کر لے جس میں ملک جنوبی افریقہ اہم ترین ریاست ہو۔

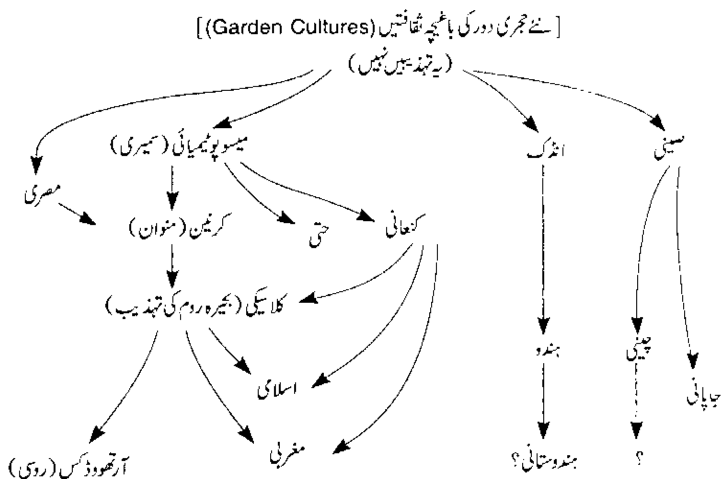
تہذیبوں کی مرکزی شناختی خاصیت مذہب ہے اور جیسا کہ کرسٹوفر ڈاسن نے کہا ''عظیم مذاہب وہ بنیادیں ہیں جن پر تہذیبیں کھڑی ہیں''۔[19] ویبر کے پانچ ''عالمی مذاہب'' میں سے چار یعنی عیسائیت، اسلام، ہندو دھرم اور کنفیوشزم بڑی تہذیبوں سے وابستہ ہیں۔ پانچواں مذہب بدھ مت وابستہ نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اسلام اور عیسائیت کی طرح بدھ مت ابتدا ہی میں دو شاخوں میں بٹ گیا تھا اور عیسائیت کی طرح یہ اپنی جائے پیدائش میں باقی نہ رہا۔ مہایانا بدھ مت پہلی صدی عیسوی سے شروع ہو کر چین اور پھر کوریا، ویت نام اور جاپان تک پہنچا۔ ان معاشروں میں بدھ مت مقامی ثقافت میں مختلف انداز میں ڈھلا اور شامل ہوا (مثلاً چین میں کنفیوشزم اور تاؤازم میں) اور دبایا گیا۔ لہٰذا بدھ مت کے ان معاشروں کی ثقافت کا اہم جز ہونے کے باوجود یہ معاشرے بدھ تہذیب کا حصہ نہیں، نہ ہی خود کو اس طرح شناخت کرتے ہیں۔ تاہم سری لنکا، برما، تھائی لینڈ، لاؤس اور کمبوڈیا میں ایک ایسی تہذیب ضرور موجود ہے جسے تھراواڈا بدھ مت تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں تبت، منگولیا اور بھوٹان کی آبادیوں نے تاریخی اعتبار سے مہایانا بدھ مت کی لامائی شکل کو اختیار کیا ہے اور یہ معاشرے بدھ تہذیب کا ایک اور علاقہ ہیں۔ بہرحال مجموعی طور پر ہندوستان میں بدھ مت کے تقریباً مکمل خاتمے اور چین و جاپان کی موجودہ ثقافتوں میں اس کے گھل مل جانے کے باعث بدھ مت بڑا مذہب ہونے کے باوجود کسی بڑی تہذیب کی بنیاد نہیں بنا۔☆[20]

☆ اور یہودی تہذیب؟ تہذیبوں کے بیشتر اسکالر اس کا تذکرہ بھی نہیں کرتے۔ افراد کی تعداد کے لحاظ سے یہ واضح طور پر کوئی بڑی تہذیب نہیں۔ ٹائن بی نے اسے گرفتار تہذیب قرار دیا ہے جو اس سے پہلے کی شامی تہذیب سے نکلی۔ (باقی اگلے صفحے پر)

تہذیبوں کے مابین روابط

ٹکراؤ: تہذیبیں ۱۵۰۰ء سے قبل: تہذیبوں کے درمیان تعلقات دو مراحل سے گزر چکے ہیں اور اب تیسرے مرحلے میں ہیں۔ تہذیبوں کے ظہور میں آنے کے بعد تین ہزار سال سے زائد عرصے تک ان کے مابین روابط چند مستثنیات کے سوا یا تو تھے ہی نہیں یا پھر محدود تھے یا کبھی کبھار اور

شکل ۱ء۲
مشرقی نصف کرّے کی تہذیبیں



ماخذ: کیرول کویگلی، The Evolution of Civilizations: An Introduction to Historical Analysis (انڈیاناپولس، لبرٹی پریس، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۷۹ء) صفحہ ۸۳۔

یہ تاریخی طور پر عیسائیت اور اسلام سے منسلک ہے اور کئی صدیوں تک یہودیوں نے مغربی، آرتھوڈکس اور اسلامی تہذیبوں کے ساتھ اپنی ثقافتی شناخت برقرار رکھی۔ اسرائیل بننے کے بعد یہودیوں کے پاس تہذیب کے لیے درکار تمام لوازمات ہو گئے: مذہب، زبان، روایات، ادب، ادارے اور ایک علاقائی و سیاسی وطن۔ لیکن موضوعی شناخت؟ دوسرے ممالک میں رہنے والے یہودیوں نے اپنی شناخت مختلف طریقوں سے کی ہے جس میں یہودیت اور اسرائیل کے ساتھ مکمل وابستگی سے لے کر برائے نام یہودیت اور جس ملک میں آباد ہیں اس کے ساتھ مکمل وابستگی شامل ہیں۔ مؤخرالذکر صورت زیادہ تر مغرب میں مقیم یہودیوں میں پائی جاتی ہے۔ دیکھیے مورڈیسائی ایم کیپلان Judaism as a Civilization (فلاڈلفیا: ری کانسٹرکشنسٹ پریس، ۱۹۸۱ء، پہلے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی)، خصوصاً ۱۷۳ تا ۲۰۸۔

شدید ہوتے تھے۔ ان روابط کی نوعیت اس لفظ سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے جسے تاریخ داں استعمال کرتے ہیں یعنی ''ٹکراؤ'' یا ''مٹھ بھیڑ''۔[۲۱] تہذیبوں کے درمیان زمان و مکان حائل تھے۔ ان کی بہت تھوڑی تعداد کسی ایک وقت پر موجود تھی اور جیسا کہ بنجمن شوارٹز اور شموئیل آئزن شٹاٹ نے کہا ہے، محوری عہد اور قبل از محوری عہد کی تہذیبوں کے مابین خاصا فرق ہے۔ ان اصطلاحات کا تعین اس حوالے سے ہوتا ہے کہ کوئی تہذیب ''ماورائی اور دنیاوی نظاموں'' کے درمیان امتیاز کرتی ہے یا نہیں۔ محوری تہذیبوں میں پہلے کی تہذیبوں کے برخلاف ماورائی اساطیر تھے جو ایک خاص دانشور طبقے ''یہودی انبیا و مذہبی علما، یونانی فلاسفہ وسوفسطائی، چینی ادبا، ہندو برہمن، بدھ سنگھ اور اسلامی علما'' نے پروان چڑھائے۔[۲۲] بعض خطوں میں منسلکہ تہذیبوں کی دو یا تین نسلیں اس طرح دیکھنے میں آئیں کہ ایک تہذیب ختم ہوئی تو تعطل کے بعد ایک اور جانشین نسل ابھری۔ شکل ا ء ۲ (کیرول کوئیگلی سے لیا گیا) ایک سادہ چارٹ ہے جس میں بڑی یوریشین تہذیبوں کے مابین مختلف زمانوں میں تعلقات کو واضح کیا گیا ہے۔

تہذیبیں جغرافیائی اعتبار سے بھی دور تھیں۔ ۱۵۰۰ء تک اینڈین اور میسوامریکی تہذیبوں کا دوسری تہذیبوں سے یا آپس میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ نیل، دجلہ وفرات، سندھ اور زرد دریاؤں کی وادیوں کی ابتدائی تہذیبوں کے درمیان بھی تعلق نہیں رہا۔ آخر کار مشرقی بحیرۂ روم، جنوب مغربی ایشیا اور شمالی ہندوستان کی تہذیبوں کے مابین تعلقات بڑھے مگر تہذیبوں کے باہمی فاصلے اور ان کو طے کرنے کے لیے دستیاب ذرائع نقل وحمل محدود ہونے کے باعث مواصلاتی وتجارتی روابط کم کم تھے۔ بحیرۂ روم اور بحرِ ہند میں سمندر کے راستے کچھ تجارت ہوئی لیکن ''۱۵۰۰ء سے قبل دنیا کی علیٰحدہ علیٰحدہ تہذیبوں کے درمیان جس حد تک بھی آپس میں تھوڑے بہت تعلقات تھے، اس میں نقل وحرکت کا مؤثر ذریعہ سمندر عبور کرتے جہازوں کی بجائے گیاہستان عبور کرتے گھوڑے تھے''۔[۲۳]

خیالات اور ٹیکنالوجی ایک تہذیب سے دوسری میں منتقل ہوتی رہی لیکن اکثر اس میں صدیاں لگیں۔ شاید اہم ترین ثقافتی نفوذ جو فتوحات کا نتیجہ نہیں تھا بدھ مت کا چین تک پہنچنا تھا جو شمالی ہندوستان میں اس کے جنم لینے کے لگ بھگ چھ سو سال بعد ہوا۔ آٹھویں صدی میں چین میں چھاپہ خانہ اور گیارہویں صدی میں متحرک ٹائپ ایجاد ہوا لیکن یہ ٹیکنالوجی یورپ تک پندرہویں صدی میں پہنچ سکی۔ کاغذ چین میں دوسری صدی میں متعارف ہوا، جاپان میں ساتویں صدی میں آیا اور مغرب کی سمت وسط ایشیا میں آٹھویں صدی میں، شمالی افریقہ میں دسویں صدی، اسپین میں بارہویں اور یورپ میں تیرہویں صدی میں پہنچا۔ ایک اور چینی ایجاد بارود جو نویں صدی میں ہوئی

چند سو سال بعد عربوں تک اور چودھویں صدی میں یورپ پہنچی۔[۲۴]

تہذیبوں کے مابین سب سے ڈرامائی اور اہم روابط وہ تھے جب ایک تہذیب کے افراد نے دوسری کے لوگوں کو فتح کیا اور ختم کر دیا یا محکوم بنا لیا۔ یہ روابط عام طور پر نا صرف تشدد آمیز تھے بلکہ مختصر تھے اور فقط کبھی کبھار ہوئے۔ تاہم ساتویں صدی سے نسبتاً مستقل اور بعض اوقات شدید بین التہذیبی روابط اسلام و مغرب اور اسلام و ہندوستان کے درمیان پیدا ہوئے۔ بہرحال زیادہ تر تجارتی، ثقافتی اور فوجی تعاملات تہذیبوں کے اندر ہی رہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان اور چین پر حملے ہوئے اور دوسری اقوام (مغلوں، منگولوں) نے انہیں محکوم بنایا مگر دونوں تہذیبوں کے اندر طویل دور ایسے گزرے جب ان میں ''برسرِ پیکار'' ریاستیں موجود تھیں۔ اسی طرح یونانی آپس میں جتنی لڑائی اور تجارت کرتے تھے اتنی اہلِ فارس اور دیگر غیر یونانیوں سے نہیں کرتے تھے۔

تصادم: مغرب کا عروج۔ یورپی عالمِ مسیحیت آٹھویں اور نویں صدی میں ایک الگ تہذیب کے طور پر ابھرنا شروع ہوا۔ کئی صدیوں تک یہ تہذیبی سطح میں بہت سی دوسری تہذیبوں سے بہت پیچھے تھا۔ تانگ، سنگ اور منگ خاندانوں کے دور میں چین، آٹھویں سے بارہویں صدی تک اسلامی دنیا اور آٹھویں سے گیارہویں صدی تک بازنطینیہ دولت، مقبوضہ علاقوں، فوجی قوت اور فنی، ادبی اور سائنسی کارناموں میں یورپ سے کہیں آگے تھے۔[۲۵] گیارہویں سے تیرہویں صدیوں کے درمیان یورپی ثقافت پروان چڑھنا شروع ہوئی۔ اسلام اور بازنطینیہ کی اعلیٰ تر تہذیبوں کے مناسب عناصر شوق سے اور منظم انداز میں شامل کیے گئے اور مغرب کے مخصوص حالات اور مفادات کے باعث ان کو قبول کیا گیا۔ اسی دور میں ہنگری، پولینڈ، اسکینڈے نیویا اور بالٹک ساحل کے علاقے مغربی مسیحیت کے دائرے میں آ گئے۔ رومی قانون اور مغربی تہذیب کے دوسرے پہلو اس کے بعد آئے اور مغربی تہذیب کی مشرقی سرحد اس مقام پر مستحکم ہو گئی جہاں اسے کسی خاص تبدیلی کے بغیر رہنا تھا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں اہلِ مغرب نے اسپین میں اپنا اقتدار بڑھانے کی جدوجہد کی اور بحیرۂ روم پر عملاً غلبہ حاصل بھی کر لیا۔ تاہم بعد ازاں ترک قوت ابھری اور ''مغربی یورپ کی پہلی سمندر پار سلطنت'' ختم ہو گئی۔[۲۶] اس کے باوجود ۱۵۰۰ء تک یورپی ثقافت کا احیا خاصا آگے تک جا چکا تھا اور سماجی تکثیریت (pluralism)، پھیلتی ہوئی تجارت اور تیکنیکی ترقی نے عالمی سیاست کے ایک نئے دور کی بنیاد فراہم کی۔

تہذیبوں کے مابین جو کبھی کبھار یا محدود کثیر سمتی مٹھ بھیڑ ہوتی تھی وہ تمام تہذیبوں پر مغرب کے مستقل، غالب اور یک سمتی اثرات میں بدل گئی۔ پندرہویں صدی کے خاتمے پر مورز سے جزیرہ

نما آئبیریا دوبارہ چھین لیا گیا اور ایشیا میں پرتگالیوں اور براعظم امریکا میں اسپینیوں نے قدم جمانے شروع کردیے۔ اگلے دو سو پچاس سال کے دوران پورا مغربی نصف کرہ اور ایشیا کے اہم علاقے یورپی حکومت یا غلبے کے ماتحت آ گئے۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام پر براہ راست یورپی بالادستی پھر پسپا ہوتی نظر آئی کیونکہ پہلے ریاست ہائے متحدہ امریکا، پھر ہیٹی اور پھر بیشتر لاطینی امریکا نے یورپی حکمرانی کے خلاف بغاوت کی اور آزادی حاصل کرلی۔ تاہم انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی سامراج نے ایک بار پھر قوت پکڑی اور تقریباً پورے افریقہ پر اپنی حکومت قائم کرلی، برصغیر اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں مغربی اثر ورسوخ کو مضبوط کیا اور بیسویں صدی کے اوائل تک ترکی کے سوا تقریباً تمام مشرق وسطیٰ بالواسطہ یا بلاواسطہ مغرب کے ماتحت تھا۔ ۱۸۰۰ء میں اہلِ یورپ یا سابق یورپی نوآبادیاں (براعظم امریکا میں) کرۂ ارض کی زمینی سطح کے ۳۵ فیصد، ۱۸۷۸ء میں ۶۷ فیصد اور ۱۹۱۴ء میں ۸۴ فیصد حصے پر قابض تھیں۔ ۱۹۲۰ء تک بھی یہ شرح بلند تھی جب سلطنت عثمانیہ برطانیہ، فرانس اور اٹلی میں تقسیم ہوئی۔ ۱۸۰۰ء میں برطانوی سلطنت ۱۵ لاکھ مربع میل اور دو کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔ ۱۹۰۰ء تک وکٹوریائی سلطنت جس پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا ایک کروڑ دس لاکھ مربع میل پر محیط تھی اور ۳۹ کروڑ افراد اس میں شامل تھے۔[۲] یورپی حکمرانی کی توسیع کے دوران اینڈین اور میسوامریکی تہذیبیں عملاً فنا کردی گئیں، ہندوستانی اور اسلامی تہذیبوں نیز افریقہ کو محکوم بنالیا گیا اور مغربی اثرات نے چین پہنچ کر اسے بھی مغلوب کرلیا۔ صرف روس، جاپان اور ایتھوپیائی تہذیبیں جو تینوں انتہائی مرکزی قوت کی حامل بادشاہتیں رکھتی تھیں، مغرب کی بڑھتی ہوئی یورش کی مزاحمت کرکے اپنا بامعنی وجود قائم رکھنے میں کامیاب رہیں۔ چار سو سال تک بین التہذیبی تعلقات اسی طرح رہے کہ دوسری تہذیبیں مغربی تہذیب کے غلبے میں آتی رہیں۔

اس منفرد اور ڈرامائی صورتحال کے اسباب میں مغرب کا معاشرتی ڈھانچا اور طبقاتی تعلقات، شہروں اور تجارت کا ترقی پانا، مغربی معاشروں میں جاگیروں (estates) اور فرماں رواؤں اور سیکولر اور مذہبی اداروں کے درمیان اقتدار کا منتشر ہونا، مغربی اقوام میں قومی شعور بیدار ہونا اور ریاستی افسر شاہی کا ابھرنا شامل ہیں۔ لیکن مغربی اثرات کے پھیلاؤ کا فوری ذریعہ ٹیکنالوجی تھی: دور دراز بسنے والی اقوام تک پہنچنے کے لیے بحری سفر کے وسائل کی ایجاد اور ان اقوام کو تسخیر کرنے کے لیے فوجی قوت۔ جیسا کہ جیوفری پارکر نے کہا ہے ''زیادہ تر 'مغرب کے عروج' کا انحصار قوت پر تھا، اس حقیقت پر کہ اہلِ یورپ اور ان کے سمندر پار حریفوں کے مابین فوجی توازن مسلسل اول الذکر کے حق میں بدل رہا تھا... ۱۵۰۰ء اور ۱۷۵۰ء کے درمیان پہلی حقیقی عالمی سلطنتیں قائم کرنے

میں اہلِ مغرب کی کامیابی کی کلید جنگ لڑنے کی اہلیت میں اس اضافے پر منحصر تھی جسے 'فوجی انقلاب' کا نام دیا گیا ہے۔'' مغرب کی توسیع کو اپنی افواج کی تنظیم، نظم وضبط اور تربیت میں برتری اور بعد میں برتر ہتھیاروں، ذرائع مواصلات اور نقل وحمل نیز طبی خدمات سے بھی مدد ملی جس کا باعث صنعتی انقلاب میں اس کا قائدانہ کردار تھا۔[۲۸] مغرب نے اپنے خیالات، اقدار اور مذہب (جو دوسری تہذیبوں کے بہت کم لوگوں نے قبول کیے) کی برتری کی وجہ سے دنیا کو فتح نہیں کیا بلکہ منظم تشدد کرنے میں برتری کے باعث فتح کیا۔ اہلِ مغرب اس حقیقت کو اکثر بھول جاتے ہیں، غیر مغربی کبھی نہیں بھولتے۔

۱۹۱۰ء تک دنیا سیاسی و معاشی اعتبار سے اتنی متحد ہو چکی تھی جتنی انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہ رہی تھی۔ مجموعی عالمی پیداوار کی نسبت سے بین الاقوامی تجارت ہمیشہ سے زیادہ ہوگئی اور ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں سے پہلے اس حد تک کبھی نہیں پہنچ سکی۔ مجموعی سرمایہ کاری کے فیصد کے لحاظ سے بین الاقوامی سرمایہ کاری ہمیشہ سے بڑھ گئی۔[۲۹] تہذیب کا مطلب مغربی تہذیب تھی۔ بین الاقوامی قانون گروشس کی روایت سے ابھرنے والا مغربی بین الاقوامی قانون تھا۔ بین الاقوامی نظام کے معنی تھے خودمختار مگر ''مہذب'' قومی ریاستوں اور ان کے زیرِ اثر نوآبادیوں کا مغربی ویسٹ فیلیائی نظام۔

مغرب کے طے کردہ اس بین الاقوامی نظام کا سامنے آنا ۱۵۰۰ء کے بعد کی صدیوں میں عالمی سیاست میں دوسری بڑی تبدیلی تھی۔ مغربی معاشروں کے غیر مغربی معاشروں کے ساتھ غالب ومغلوب والے روابط تھے تو آپس میں ان کے تعلقات زیادہ برابر کی سطح پر تھے۔ ایک ہی تہذیب کی سیاسی اکائیوں کے مابین اس نوعیت کے تعلقات چینی، ہندوستانی اور یونانی تہذیبوں سے بہت مشابہ تھے۔ ان تعلقات کی بنیاد ایک ثقافتی ہم آہنگی تھی جس میں ''زبان، قانون، مذہب، انتظامی طور طریقے، زراعت، ارضی ملکیت اور شاید قرابت داری بھی'' شامل تھی۔ یورپی اقوام کی مشترک ثقافت تھی اور وہ تجارت کے فعال سلسلے، افراد کی مسلسل حرکت اور حکمران خاندانوں کے زبردست باہمی رشتوں کے توسط سے بڑے پیمانے پر روابط رکھے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں ہمیشہ لڑتے بھی رہتے تھے، یورپی ریاستوں میں امن کا زمانہ قاعدہ نہیں استثنا تھا۔[۳۰] اگرچہ اس عرصے میں زیادہ تر سلطنت عثمانیہ اس علاقے کے جسے اکثر یورپ سمجھا جاتا تھا ایک چوتھائی حصے تک پر قابض تھی، لیکن اس سلطنت کو یورپی بین الاقوامی نظام کا رکن تصور نہیں کیا جاتا تھا۔

ڈیڑھ سو سال تک مغرب کی دروں تہذیبی (intracivilizational) سیاست پر مذہبی فرقہ واریت اور مذہبی و اقتدار کی جنگیں چھائی ہوئی تھیں۔ ویسٹ فیلیا کے معاہدے کے ڈیڑھ صدی

بعد تک مغربی دنیا کے تنازعات بیشتر ریاستی حکمرانوں، بادشاہوں، مطلق العنان فرماں رواؤں اور آئینی فرماں رواؤں کے مابین تھے جو اپنی افسرشاہیوں، اپنی افواج، اپنی تجارتی معاشی طاقت اور سب سے بڑھ کر اپنے زیرِ قبضہ علاقوں کو توسیع دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس عمل کے دوران انہوں نے قومی ریاستوں کو جنم دیا اور انقلابِ فرانس اور اس کے بعد سے اہم تنازعات ریاستی حکمرانوں کی بجائے اقوام کے درمیان ہونے لگے۔ ۱۷۹۳ء میں جیسا کہ آر آر پامر نے کہا ''بادشاہوں کی جنگیں ختم ہوچکی تھیں، اقوام کی جنگیں شروع ہوگئی تھیں''۔[۲۱] انیسویں صدی کی یہ صورتحال پہلی جنگ عظیم تک رہی۔

۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب کے نتیجے میں قومی ریاستوں کے مابین تنازعے کی جگہ نظریات کے تنازعے نے لے لی، پہلے فاشزم، کمیونزم اور لبرل جمہوریت کے درمیان اور پھر مؤخر الذکر دو کے درمیان۔ سرد جنگ میں ان نظریات نے دو سپر طاقتوں کا روپ دھارا۔ یہ دونوں اپنی شناخت کو اپنے نظریے کے حوالے سے متعین کرتی تھیں اور دونوں روایتی یورپی معنوں میں قومی ریاستیں نہیں تھیں۔ پہلے روس، پھر چین اور ویت نام میں مارکسزم کا برسر اقتدار آنا یورپی بین الاقوامی نظام اور ایک مابعد یورپی کثیر ثقافتی نظام کے مابین عبوری دور کی نمائندگی کرتا تھا۔ مارکسزم یورپی تہذیب کی پیداوار تھا لیکن نہ اس نے وہاں جڑیں پکڑیں نہ وہاں کامیاب ہوا۔ اس کی بجائے جدت پسند اور انقلابی اعلیٰ طبقات نے اسے غیر مغربی معاشروں میں درآمد کرلیا۔ لینن، ماؤ اور ہو نے اسے مغربی طاقت کو چیلنج کرنے، اپنے عوام کو متحرک کرنے اور اپنے ممالک کی قومی شناخت اور خود مختاری کا اثبات کرنے کے لیے استعمال کیا۔ سوویت یونین میں اس نظریے کے خاتمے اور چین اور ویت نام میں اس کے خاصی حد تک دوسری صورتوں میں ڈھل جانے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ معاشرے دوسرا مغربی نظریہ یعنی لبرل جمہوریت درآمد کرلیں گے۔ مغرب کے جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ غیر مغربی ثقافتوں کی تخلیقی صلاحیت، لچک اور انفرادیت کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔

باہمی روابط: ایک کثیر تہذیبی نظام۔ اس طرح بیسویں صدی میں تہذیبوں کے درمیان تعلقات ایک تہذیب کے دوسری تمام تہذیبوں پر یکطرفہ اثرات کے مرحلے سے گزر کر تمام تہذیبوں کے درمیان شدید، مستقل اور کثیر سمتی تعاملات کے مرحلے میں آگئے ہیں۔ پچھلے عہد میں بین التہذیبی تعلقات میں جو دو مرکزی خواص تھے وہ غائب ہونے لگے۔

اول، مؤرخوں کے پسندیدہ الفاظ کے مطابق ''مغرب کی توسیع'' ختم ہوگئی اور ''مغرب کے خلاف بغاوت'' کا آغاز ہوگیا۔ ناہموار انداز میں اور وقفوں اور مراجعت کے ساتھ مغرب کی قوت

دوسری تہذیبوں کی بہ نسبت زوال پذیر ہوگئی۔ ۱۹۹۰ء میں جو دنیا کا نقشہ تھا وہ ۱۹۲۰ء کے نقشے سے برائے نام مشابہت رکھتا تھا۔ فوجی و معاشی طاقت اور سیاسی اثرات کے توازن بدل گئے (بعد میں آنے والے ایک باب میں اس پر زیادہ تفصیل سے بحث ہوگی)۔ مغرب کے دوسرے معاشروں پر اب بھی بہت اثرات تھے لیکن اب مغرب اور دوسری تہذیبوں کے تعلقات میں مغرب کے خلاف ردِعمل نمایاں تھا۔ غیر مغربی سماج اب محض یورپی ساختہ تاریخ کے عناصر نہ تھے بلکہ اپنی اور مغرب کی تاریخ کو خود تشکیل دے رہے تھے۔

دوم، ان تبدیلیوں کے نتیجے میں بین الاقوامی نظام وسعت پا کر مغرب سے ماورا ہوگیا اور کثیر تہذیبی بن گیا۔ ساتھ ہی ساتھ مغربی ریاستوں کے درمیان تنازعات جو اس نظام پر صدیوں سے غالب تھے، دھندلا کر منظر سے اوجھل ہوگئے۔ بیسویں صدی کے اواخر تک مغرب بطور تہذیب اپنے ''برسرِ پیکار ریاست'' والے مرحلے سے نکل آیا اور ''آفاقی ریاست'' والے مرحلے میں داخل ہوگیا۔ اس صدی کے خاتمے پر جب مغرب کی قومی ریاستیں یورپ اور شمالی امریکا میں دو نیم آفاقی ریاستوں میں ڈھل رہی ہیں، یہ مرحلہ تاحال نامکمل ہے۔ تاہم یہ دو اکائیاں اور ان کے اجزا رسمی و غیر رسمی اداروں کے بندھنوں کے ایک غیر معمولی طور پر پیچیدہ جال کے ذریعے آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ گزشتہ تہذیبوں کی آفاقی ریاستیں سلطنتیں ہیں مگر چونکہ مغربی تہذیب کی سیاسی شکل جمہوریت ہے اس لیے مغربی تہذیب کی جو آفاقی ریاست ابھر رہی ہے وہ سلطنت نہیں بلکہ وفاقوں، کنفیڈریشنوں اور بین الاقوامی حکومتوں اور تنظیموں کا مرکب ہے۔

بیسویں صدی کے عظیم سیاسی نظریات میں لبرل ازم، سوشلزم، انارکزم، کارپوریٹزم، مارکسزم، کمیونزم، سوشل جمہوریت، روایت پسندی، قوم پرستی، فاشزم اور مسیحی جمہوریت شامل ہیں۔ ان سب میں ایک چیز مشترک ہے: یہ مغربی تہذیب کی پیداوار ہیں۔ کسی اور تہذیب نے کوئی اہم سیاسی نظریہ جنم نہیں دیا۔ ادھر مغرب نے کوئی بڑا مذہب پیدا نہیں کیا۔ دنیا کے عظیم مذاہب سب کے سب غیر مغربی تہذیبوں کی پیداوار ہیں اور بیشتر صورتوں میں مغربی تہذیب سے قدیم تر ہیں۔ جوں جوں دنیا مغربی دور سے باہر آ رہی ہے، وہ نظریات زوال پذیر ہو رہے ہیں جو بعد میں مغربی تہذیب میں شامل ہوئے تھے اور ان کی جگہ مذہب اور شناخت و وابستگی کی دیگر ثقافتی شکلیں لے رہی ہیں۔ معاہدہ ویسٹ فیلیا کے تحت مذہب اور بین الاقوامی سیاست کی علیحدگی، جو خاص مغربی تہذیب کی پیداوار تھی، ختم ہو رہی ہے اور، جیسا کہ ایڈورڈ مورٹیمر نے کہا، مذہب کے ''بین الاقوامی امور میں زیادہ سے زیادہ داخل ہونے کا امکان'' ہے۔[۳۲] مغرب کے پیدا کردہ گوناگوں سیاسی نظریات کے

دروں تہذیبی تصادم کی جگہ ثقافت اور مذہب کا بین التہذیبی تصادم لے رہا ہے۔

اس طرح عالمی سیاسی جغرافیہ ۱۹۲۰ء کی ایک دنیا سے ۱۹۶۰ء کے عشرے کی تین دنیاؤں اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کی نصف درجن سے زائد دنیاؤں میں بدل گیا۔ ساتھ ہی ۱۹۲۰ء کی مغربی عالمی سلطنتیں سکڑ کر ۱۹۶۰ء کے عشرے کی بہت محدود ''آزاد دنیا'' (جس میں کمیونزم کی مخالف متعدد غیر مغربی ریاستیں شامل تھیں) اور پھر ۱۹۹۰ء کی دہائی کے محدود تر ''مغرب'' میں تبدیل ہوگئی۔ لسانی اعتبار سے اس تبدیلی کا اظہار ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۳ء کے درمیان نظریاتی اصطلاح ''آزاد دنیا'' کے استعمال میں کمی اور تہذیبی اصطلاح ''مغرب'' کے استعمال میں اضافے سے ہوا (دیکھئے جدول ۱ء۲)۔ اس کا اظہار ایک ثقافتی و سیاسی مظہر کے طور پر اسلام، ''عظیم تر چین''، روس اور اس کے ''قریب بیرون ملک'' اور یورپی یونین کے حوالوں سے بھی ہوتا ہے۔ ان سب اصطلاحات میں تہذیبی عنصر نظر آتا ہے۔ اس تیسرے مرحلے میں بین التہذیبی تعلقات پہلے مرحلے سے کہیں زیادہ

جدول ۱ء۲

اصطلاحات کا استعمال ''آزاد دُنیا'' اور ''مغرب''	حوالوں کی تعداد ۱۹۸۸	۱۹۹۳	حوالوں میں تبدیلی فیصد میں
نیویارک ٹائمز			
آزاد دُنیا	۷۱	۴۴	-۳۸
مغرب	۴۶	۱۴۴	+۲۱۳
واشنگٹن پوسٹ			
آزاد دُنیا	۱۱۲	۶۷	-۴۰
مغرب	۳۶	۸۷	+۱۴۲
کانگریشنل ریکارڈ			
آزاد دُنیا	۳۵۶	۱۱۴	-۶۸
مغرب	۷	۱۰	+۴۳

ماخذ: لیکسس/نیکسس۔ حوالہ جات کی تعداد اُن مضامین کی تعداد ہے جن میں ''آزاد دُنیا'' یا ''مغرب'' کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ یہ خیال رکھا گیا ہے کہ ''مغرب'' کی اصطلاح کا سیاق و سباق تہذیب یا سیاسی اکائی کے حوالے سے ہی ہے۔

متعدد اور شدید اور دوسرے مرحلے سے کہیں زیادہ برابری کی سطح پر ہیں۔ علاوہ ازیں سرد جنگ کے برخلاف کوئی ایک خلیج نہیں بلکہ مغرب اور دیگر تہذیبوں کے درمیان اور بہت سے غیر مغربی معاشروں کے مابین آپس میں متعدد خلیجیں پائی جاتی ہیں۔

ہیڈلے بل نے کہا ہے کہ ''جب دو یا زیادہ ریاستوں کے درمیان خاصا رابطہ ہو اور ایک دوسرے کے فیصلوں پر اتنا اثر انداز ہو رہی ہوں کہ کم از کم کسی حد تک ایک کُل کے جز کی حیثیت سے عمل کریں'' تو یہ ایک بین الاقوامی نظام ہوتا ہے۔ تاہم بین الاقوامی معاشرے کا وجود اسی وقت ہوتا ہے جب کسی بین الاقوامی نظام میں ریاستوں کے ''مشترکہ مفادات اور مشترکہ اقدار'' ہوں، ''ایک دوسرے کو مشترکہ اصولوں کے بندھن میں بندھا ہوا تصور کریں،'' ''مشترکہ اداروں کے عمل میں شراکت کریں'' اور ''مشترکہ ثقافت یا تہذیب'' کے حامل ہوں۔[۳۳] اپنے سمیری، یونانی، ہیلینیائی، چینی، ہندوستانی اور اسلامی پیشروؤں کی طرح سترہویں سے انیسویں صدی کا یورپی بین الاقوامی نظام بھی بین الاقوامی معاشرہ تھا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران یورپی بین الاقوامی نظام نے وسیع ہو کر دوسری تہذیبوں کے عملاً تمام معاشروں کو اپنے احاطے میں لے لیا۔ بعض یورپی ادارے اور رواج بھی دوسرے ملکوں کو برآمد ہوئے۔ اس کے باوجود ان سماجوں میں ابھی تک اس مشترک ثقافت کا فقدان ہے جو یورپی بین الاقوامی معاشرے کا خاصہ ہے۔ چنانچہ برطانوی نظریۂ بین الاقوامی تعلقات کے لحاظ سے دنیا ایک ترقی یافتہ بین الاقوامی نظام ہے لیکن حد سے حد ایک بہت خام بین الاقوامی معاشرہ ہے۔

ہر تہذیب خود کو دنیا کے مرکز کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور اپنی تاریخ لکھتے وقت اسے انسانی تاریخ کے مرکزی ڈرامے کا مرتبہ دیتی ہے۔ یہ بات دوسری ثقافتوں کے مقابلے میں مغرب کے بارے میں شاید زیادہ صحیح ہے۔ لیکن ایک کثیر تہذیبی دنیا میں ایسے یک تہذیبی نقطہ ہائے نظر کی اہمیت اور افادیت کم ہو رہی ہے۔ تہذیب کے اسکالر بہت پہلے اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں اسپینگلر نے مغرب میں عام اس متعصبانہ نقطہ نگاہ کی مذمت کی تھی جس میں تاریخ کو قدیم، وسطی اور جدید ادوار میں واضح طور پر تقسیم کیا جاتا ہے اور جو فقط مغرب کے لیے بامعنی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ''تاریخ کے اس بطلیموسی نقطہ نظر'' کی جگہ کوپرنیکس والا نقطہ نظر لانا اور ''ایک خطی تاریخ کے کھوکھلے مفروضے کو متعدد طاقتور ثقافتوں کے ڈرامے'' سے بدلنا ضروری ہے۔[۳۴] چند دہائیوں بعد ٹائن بی نے مغرب کی اس ''تنگ نظری اور ڈھٹائی'' کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جو ان ''خود پرستانہ خوش فہمیوں'' میں ظاہر ہوتی ہے کہ دنیا اسی کے گرد گھومتی ہے، ایک ''ناقابل تبدیل مشرق'' موجود ہے اور ''ترقی''

ناگزیر ہے۔ اسپینگلر کی طرح اس خیال میں بھی تاریخ کی یکسانی کا مفروضہ فضول تھا، یہ مفروضہ کہ ''صرف ایک دریائے تہذیب [ہے] ، ہمارا اپنا، اور یہ کہ دیگر تمام یا تو اس میں آ کر گرتے ہیں یا پھر صحرائی ریت میں جا کر گم ہو جاتے ہیں''۔[۳۵] ٹائن بی کے پچاس سال بعد براوڈل نے اسی طرح ایک وسیع تر تناظر اور ''دنیا کے عظیم ثقافتی تنازعات اور اس کی تہذیبوں کی کثرت'' کو سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا۔[۳٦] تاہم ان دانشوروں نے جن سرابوں اور تعصبات سے ہوشیار رہنے کو کہا تھا وہ زندہ ہیں اور بیسویں صدی کے آخر میں تنگ نظری پر مبنی اس متکبرانہ نقطہ نگاہ کی صورت میں بہت عام ہو گئے ہیں کہ مغرب کی یورپی تہذیب اب دنیا کی آفاقی تہذیب ہے۔

تیسرا باب

آفاقی تہذیب؟ جدیدیت اور مغربیت

آفاقی تہذیب: مفاہیم

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں وی ایس نے پال کے بقول ایک ''آفاقی تہذیب'' نمودار ہورہی ہے۔[1] اس اصطلاح سے کیا مراد ہے؟ عمومی اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نوعِ انسانی ثقافتی طور پر قریب تر آرہی ہے اور پوری دنیا میں اقوام مشترک اقدار، عقائد، رجحانات، رواج اور اداروں کو اپنا رہی ہیں۔ مخصوص پہلوؤں کو دیکھا جائے تو اس تصور میں کچھ ایسی چیزیں آسکتی ہیں جو عمیق مگر غیر متعلق ہیں، بعض چیزیں متعلق ہیں لیکن عمیق نہیں اور بعض غیر متعلق اور سطحی ہیں۔

اول، تقریباً تمام سماجوں میں انسانوں میں بعض بنیادی اقدار مثلاً قتل کو برا سمجھنا، اور بعض بنیادی ادارے مثلاً خاندان کی کوئی شکل مشترک ہے۔ زیادہ تر معاشروں میں بیشتر لوگوں میں ملتا جلتا ''اخلاقی شعور'' یعنی صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز کے حوالے سے ایک بنیادی اخلاقیات پائی جاتی ہے۔[2] اگر آفاقی تہذیب سے یہی مراد ہے تو یہ عمیق اور انتہائی اہم ہے لیکن یہ نہ تو نئی چیز ہے نہ متعلق ہے۔ اگر تمام تاریخ کے دوران لوگوں کے مابین چند اساسی اقدار اور ادارے مشترک رہے ہیں تو اس سے انسانی رویے کے کچھ مستقل پہلوؤں کی وضاحت ہوسکتی ہے لیکن تاریخ اجاگر یا واضح نہیں ہوسکتی۔ علاوہ ازیں اگر تمام انسانوں میں مشترکہ آفاقی تہذیب وجود رکھتی ہے تو نسلِ انسانی کے اندر بڑے ثقافتی گروہوں کو شناخت کرنے کے لیے ہم کیا لفظ استعمال کریں گے؟ نوعِ انسانی

ذیلی گروہوں یعنی قبائل، اقوام اور وسیع تر ثقافتی اکائیوں میں جنہیں عموماً تہذیبیں کہا جاتا ہے، بٹی ہوئی ہے۔ اگر تہذیب کی اصطلاح کو بلند کر کے ان عناصر تک محدود کر دیا جائے جو پوری انسانیت میں مشترک ہیں تو بنی نوع انسان کے بعد سب سے بڑے ثقافتی گروہوں کی نشاندہی کے لیے کوئی نئی اصطلاح ایجاد کرنی پڑے گی یا فرض کرنا پڑے گا کہ یہ گروہ جو بڑے ہیں لیکن تمام نوع انسانی پر محیط نہیں، ختم ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر واکلاف ہیول نے کہا ہے کہ ''اب ہم واحد عالمی تہذیب میں رہتے ہیں'' اور ''ایک باریک سا پردہ ہی ہے'' جو ''ثقافتوں، اقوام، مذہبی دنیاؤں، تاریخی روایات اور تاریخی طور پر بنائے گئے رویوں کو ڈھانپے یا چھپائے ہوئے ہے اور یہ سب کے سب ایک معنوں میں اس کے 'نیچے' ہیں'' [۳] لیکن ''تہذیب'' کو عالمی سطح تک محدود کر دینے اور اُن سب سے بڑی ثقافتی اکائیوں کو جنہیں تاریخ میں ہمیشہ تہذیبیں کہا گیا ہے، ''ثقافتیں'' یا ''ذیلی تہذیبیں'' کہنے سے محض لسانی الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔☆

دوم، ''آفاقی تہذیب'' کی اصطلاح مہذب معاشروں کے مشترکہ اثاثوں مثلاً شہروں اور خواندگی کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے جو انہیں ابتدائی سماجوں اور وحشیوں سے جدا کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اس اصطلاح کا اٹھارہویں صدی کا صیغۂ واحد والا مفہوم ہے۔ ان معنوں میں ایک آفاقی تہذیب ابھر رہی ہے جس سے مختلف بشریات داں اور دیگر ایسے حلقے دہشت زدہ ہیں جنہیں ابتدائی اقوام کے صفحۂ ہستی سے مٹنے پر بہت مایوسی ہے۔ اس مفہوم میں تہذیب پوری انسانی تاریخ میں مسلسل پھیلتی رہی ہے اور صیغۂ واحد میں تہذیب کا یہ پھیلاؤ صیغۂ جمع میں متعدد تہذیبوں کی موجودگی سے خاصا مطابقت رکھتا ہے۔

سوم، ''آفاقی تہذیب'' کی اصطلاح ان مفروضات، اقدار اور عقائد کو ظاہر کر سکتی ہے جن پر مغربی تہذیب کے بیشتر اور دوسری تہذیبوں کے کچھ لوگ یقین رکھتے ہیں۔ اسے ڈیووس کلچر کہا جاسکتا ہے۔ ہر سال بیسیوں ممالک کے لگ بھگ ایک ہزار تاجر، بینکار، سرکاری افسران، دانشور اور

☆ ہیورڈ ایلکر نے بجا طور پر نشاندہی کی ہے کہ میں نے اپنے فارن افیئرز میں چھپنے والے مضمون میں تہذیب کی یہ تعریف کر کے کہ یہ ''افراد کی بلند ترین ثقافتی گروہ بندی اور انسانوں کو دوسری انواع سے ممتاز کرنے والی تقسیم کے بعد ثقافتی شناخت کی وسیع ترین سطح'' ہے، عالمی تہذیب کے تصور کو تہذیب کی تعریف سے ہی خارج کر دیا۔ تہذیب کے بیشتر اسکالروں نے اس اصطلاح کو یقیناً اسی طرح استعمال کیا ہے۔ بہرحال اس باب میں، میں نے اس تعریف کو نرم کر دیا ہے اور اس امکان کو ملحوظ رکھا ہے کہ ساری دنیا کے لوگ ایک علیحدہ عالمی ثقافت کے حوالے سے، جو مغربی، اسلامی یا صینی مفہوم میں تہذیبوں میں اضافہ کرتی ہے یا ان کی جگہ لیتی ہے، اپنی شناخت کریں گے۔

صحافی ڈیووس، سوئٹزرلینڈ میں ورلڈ اکنامک فورم کے اجلاس میں شریک ہوتے ہیں۔ تقریباً ان تمام افراد کے پاس طبیعیاتی علوم، معاشرتی علوم، تجارت یا قانون کی اسناد ہوتی ہیں اور یہ الفاظ اور/ یا اعداد پر کام کرتے ہیں، انگریزی خاصی روانی سے بولتے ہیں، حکومتوں، کارپوریشنوں اور تعلیمی اداروں کے ملازم ہوتے ہیں، بین الاقوامی امور سے وسیع ربط رکھتے ہیں اور اکثر و بیشتر اپنے ملک سے باہر سفر کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بالعموم فرد پسندی، منڈی کی معاشیات اور سیاسی جمہوریت پر مشترکہ یقین رکھتے ہیں جو مغربی تہذیب کے لوگوں میں بھی مشترک ہیں۔ ڈیووس والے عملاً تمام بین الاقوامی اداروں، دنیا کی بہت سی حکومتوں اور دنیا کی اقتصادی و فوجی صلاحیتوں کے بڑے حصے پر قابض ہیں۔ پس ڈیووس کلچر بے انتہا اہم ہے۔ لیکن دنیا بھر میں کتنے افراد اس کلچر میں شریک ہیں؟ مغرب کو چھوڑ کر اس میں غالباً پانچ کروڑ افراد یا دنیا کی آبادی کا ایک فیصد سے بھی کم شامل ہے۔ یہ آفاقی ثقافت نہیں اور ضروری نہیں کہ اس میں شامل افراد کی ان کے اپنے معاشروں میں اقتدار پر مضبوط گرفت ہو۔ جیسا کہ ہیڈلی بل نے واضح کیا ہے یہ ''مشترک دانشورانہ ثقافت صرف بلند طبقاتی سطح پر وجود رکھتی ہے: بیشتر سماجوں میں اس کی جڑیں کھوکھلی ہیں... [اور] یہ بات مشکوک ہے کہ سفارتی سطح پر بھی اسے ایک مشترکہ دانشورانہ ثقافت سے جدا مشترکہ اخلاقی ثقافت یا مشترکہ اقدار کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔''

چہارم، یہ خیال پیش کیا جاتا ہے کہ صَرف و خرچ کے مغربی طور طریقے اور عام پسند (Popular) ثقافت دنیا بھر میں ایک آفاقی تہذیب کو جنم دے رہے ہیں۔ یہ استدلال عمیق ہے نہ متعلق۔ تمام تاریخ میں ثقافتی فیشن ایک تہذیب سے دوسری میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔ ایک تہذیب کی اختراعات کو دوسری تہذیبیں اختیار کرتی ہیں۔ مگر یہ یا تو ایسی تیکنیکیں ہوتی ہیں جن کے اہم ثقافتی نتائج نہیں ہوتے یا پھر ایسے فیشن ہوتے ہیں جو قبول کرنے والی تہذیب کی بنیادی ثقافت کو تبدیل کیے بغیر آتے جاتے رہتے ہیں۔ قبول کرنے والی تہذیب میں یہ عناصر اس لیے آجاتے ہیں کہ یا تو یہ انوکھے لگتے ہیں یا پھر ان کو ٹھونسا جاتا ہے۔ پچھلی صدیوں میں مغربی دنیا میں بعض موقعوں پر چینی یا ہندو ثقافت کے مختلف پہلو بڑے جوش و خروش سے اپنائے گئے۔ انیسویں صدی میں مغرب کی ثقافتی درآمدات چین اور ہندوستان میں مقبول ہوئیں کیونکہ ان میں مغربی قوت جھلکتی ہوئی لگتی تھی۔ اس استدلال سے مغربی ثقافت بہت معمولی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا بھر میں پوپ کلچر اور اشیائے صرف کا استعمال مغربی تہذیب کی فتح ہے۔ مغربی تہذیب کا جوہر میگنا کارٹا ہے میگنا میک نہیں۔ غیر مغربی لوگ اگر مؤخرالذکر کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اس سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ وہ اول الذکر کو بھی قبول کریں گے۔

اس سے مغرب کے بارے میں ان لوگوں کے رویوں کا بھی پتا نہیں چلتا۔ ہوسکتا ہے مشرقِ وسطیٰ میں کہیں نصف درجن نوجوان جینز پہنے ہوئے کوک پینے اور امریکی موسیقی سننے میں مشغول ہوں اور ممکن ہے کہ مختلف اوقات کی نمازیں ادا کرنے کے درمیان کسی امریکی طیارے کو دھماکے سے اڑا دینے کے لیے بم بنا رہے ہوں۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں کے دوران امریکیوں نے لاکھوں کروڑوں جاپانی کاریں، ٹی وی سیٹ، کیمرے اور الیکٹرانک اشیا استعمال کیں لیکن ''جاپانیت'' اختیار نہیں کی بلکہ جاپان کے اور زیادہ خلاف ہوگئے۔ یہ سمجھنا سادہ لوحی اور جہالت ہوگی کہ غیر مغربی لوگ مغربی چیزیں استعمال کرکے مغربیت کو اپنا لیں گے۔ جب اہلِ مغرب اپنی تہذیب کو جھاگ والے مشروبات، ملگجی پتلونوں اور چکنائی والی غذاؤں سے شناخت کرتے ہیں تو اس سے مغرب کے بارے میں دنیا میں کیا تاثر پیدا ہوتا ہے؟

آفاقی عام پسند ثقافت والے استدلال کی ایک تھوڑی سی نفیس شکل وہ ہے جس میں اشیائے صرف کی بجائے ذرائع ابلاغ اور کوکا کولا کی جگہ ہالی وڈ پر زور دیا جاتا ہے۔ عالمی فلمی، ٹی وی اور وڈیو کی صنعتوں پر امریکا جتنا چھایا ہوا ہے اتنا طیاروں کی صنعت پر بھی اس کا غلبہ نہیں۔ ۱۹۹۳ء میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ دیکھی جانے والی سو فلموں میں سے ۸۸ امریکی تھیں۔ دو امریکی اور دو یورپی ادارے عالمی سطح پر خبروں کو جمع کرنے اور پھیلانے کے کام پر چھائے ہوئے ہیں۔[۵] یہ صورتحال دو مظاہر کی عکاس ہے۔ پہلا مظہر ہے محبت، جنس، تشدد، پراسراریت، دلیرانہ کارناموں اور دولت سے تمام انسانوں کی دلچسپی اور اس دلچسپی کو منافع خور کمپنیوں کی، جو زیادہ تر امریکی ہیں، اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی صلاحیت۔ لیکن اس مفروضے کے حق میں شواہد نہیں کہ عالمی مواصلات کے عام ہونے سے رویوں اور عقائد میں کوئی خاص یکسانی پیدا ہورہی ہے۔ جیسا کہ مائیکل ولاہوس نے کہا ہے ''تفریح ثقافتی تبدیلی قبول کرنے کے ہم معنی نہیں۔'' دوسرا مظہر یہ ہے کہ لوگ اپنی پہلے سے موجود قدروں اور تناظرات کے حوالے سے مواصلات کی توضیح کرتے ہیں۔ کشور محبوبانی کا کہنا ہے کہ ''پورے کرۂ ارض پر ہر جگہ گھروں کے کمروں میں بیک وقت پہنچنے والی تصاویر مخالف تاثرات کو جنم دیتی ہیں۔ جب کروز میزائل بغداد پر گرتے ہیں تو مغربی گھروں میں مسرت کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ لیکن باہر رہنے والے بیشتر لوگ اس صورتحال کو اس طرح دیکھتے ہیں کہ غیر سفید فام عراقیوں یا صومالیوں کو مغرب فوراً سبق سکھاتا ہے لیکن سفید فام سربیائیوں کو نہیں، جو کسی بھی پیمانے سے ایک خطرناک علامت ہے''۔[۶]

عالمی مواصلات موجودہ زمانے میں مغربی طاقت کے اہم ترین ذرائع اظہار میں شامل ہیں۔

لیکن مغرب کی یہ بالادستی غیر مغربی معاشروں میں عوام کو متحرک کرنے والے سیاستدانوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ مغربی ثقافتی سامراجیت کی مذمت کریں اور اپنی دیسی ثقافت کی بقا اور سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے عوام کو اکٹھا کریں۔ چنانچہ عالمی مواصلات پر مغرب کا غلبہ مغرب کے خلاف غیر مغربی اقوام کی تلخی اور مخاصمت کا بڑا سبب ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل تک غیر مغربی معاشروں میں جدیدیت اور اقتصادی ترقی کے باعث ذرائع ابلاغ کی مقامی و علاقائی صنعتیں ابھر رہی تھیں جو ان معاشروں کے مختلف ذوق کی تسکین کرتی تھیں۔[7] مثلاً ۱۹۹۴ء میں سی این این نے تخمینہ لگایا کہ اس کے ناظرین کی تعداد ساڑھے پانچ کروڑ یا دنیا کی آبادی کا تقریباً ایک فیصد ہے (جو ڈیووس کلچر کے افراد کی تعداد سے بہت قریب اور بلاشک وشبہ زیادہ تر انہی پر مشتمل ہے) اور اس کے صدر نے پیشگوئی کی کہ اس کی انگریزی نشریات آخر کار مارکیٹ کے دو سے چار فیصد کو پسند آئیں گی۔ پس علاقائی (یعنی تہذیبی) ادارے سامنے آئیں گے جو اسپینی، جاپانی، عربی، فرانسیسی (مغربی افریقہ کے لیے) اور دیگر زبانوں میں نشریات پیش کریں گے۔ تین اسکالر اس نتیجے پر پہنچے کہ "عالمی نیوز روم کو اب بھی ایک بابل کے منار☆ کا سامنا ہے"۔[8] رونالڈ ڈور نے سفارتکاروں اور سرکاری حکام کے درمیان ایک عالمی دانشورانہ ثقافت کے ابھرنے کی بات متاثر کن انداز میں کی ہے۔ لیکن وہ بھی زبردست نوعیت کی مواصلات کے اثرات کے حوالے سے ایک انتہائی مشروط نتیجہ اخذ کرتا ہے: بقیہ تمام چیزیں یکساں رہیں [تاکید اصل کے مطابق] تو مواصلات کی بڑھتی ہوئی کثافت سے اقوام کے مابین، یا کم از کم متوسط طبقات کے مابین، اور یہ بھی نہیں تو دنیا کے سفارتکاروں کے مابین ایک دوسرے کے ہمدم ہونے کا احساس بڑھنا چاہیے" مگر وہ ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ "بعض چیزیں جو ممکن ہے یکساں نہ رہیں بہت اہم ہو سکتی ہیں"۔[9]

زبان۔ کسی ثقافت یا تہذیب کے مرکزی عناصر زبان اور مذہب ہیں۔ اگر ایک آفاقی تہذیب ابھر رہی ہے تو ایک آفاقی زبان اور آفاقی مذہب کے ابھرنے کے رجحانات سامنے آنے چاہئیں۔ زبان کے حوالے سے یہ دعویٰ اکثر کیا جاتا ہے۔ وال اسٹریٹ جرنل کے مدیر نے اس بات کو یوں کہا کہ "دنیا کی زبان انگریزی ہے"۔[10] اس بات کے دو مطالب ہو سکتے ہیں جن میں صرف ایک آفاقی تہذیب کے موقف کو تقویت دیتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں انگریزی بولنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس قضیے کے حق میں کوئی شواہد موجود نہیں اور جو سب سے قابل اعتبار

☆ نوٹ از مترجم: بابل کا منار، کتاب پیدائش میں اس کا ذکر آیا ہے۔ یہ وہ منار ہے جو آسمان تک پہنچنے کے لیے تعمیر کیا جا رہا تھا لیکن خدا نے اس کے بنانے والوں کی زبانوں میں اختلاف پیدا کر دیا تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ پائیں۔

شہادت موجود بھی ہے، جو بہت صحیح نہیں ہو سکتی، بالکل برعکس بات کو ثابت کرتی ہے۔ تین عشروں سے زائد (۱۹۵۸ء تا ۱۹۹۲ء) پر محیط دستیاب معلومات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں زبانوں کے استعمال کی مجموعی صورتحال میں ڈرامائی تبدیلی نہیں آئی اور انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی اور جاپانی بولنے والوں کے تناسب میں خاصی کمی ہوگئی، مینڈارین بولنے والوں کی تعداد نسبتاً کم گھٹی اور ہندی، ملائی، انڈونیشیائی، عربی، بنگالی، اسپینی، پرتگالی اور دوسری زبانیں بولنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔ دنیا میں انگریزی بولنے والوں کی تعداد ۱۹۵۸ء میں کم از کم دس لاکھ افراد کے زیر استعمال زبانوں کے بولنے والوں کے ۸ء۹ فیصد سے گر کر ۱۹۹۲ء میں ۶ء۷ فیصد رہ گئی (دیکھئے جدول ۱ء۳)۔

جدول ۱ء۳
بڑی زبانوں کے بولنے والے
(عالمی آبادی کے فیصدی تناسب*)

سال / زبان	۱۹۵۸	۱۹۷۰	۱۹۸۰	۱۹۹۲
عربی	۲ء۷	۲ء۹	۳ء۳	۳ء۵
بنگالی	۲ء۷	۲ء۹	۳ء۲	۳ء۲
انگریزی	۹ء۸	۹ء۱	۸ء۷	۷ء۶
ہندی	۵ء۲	۵ء۳	۵ء۳	۶ء۴
مینڈارین	۱۵ء۶	۱۶ء۶	۱۵ء۸	۱۵ء۲
روسی	۵ء۵	۵ء۶	۶ء۰	۴ء۹
اسپینی	۵ء۰	۵ء۲	۵ء۵	۶ء۱

* دس لاکھ یا زائد افراد کی زبانیں بولنے والے لوگوں کی کل تعداد

ماخذ: فیصدی تناسب پروفیسر سڈنی ایس کلبرٹ، شعبہ نفسیات، واشنگٹن یونیورسٹی، سیئٹل کے مرتب کردہ اعداد و شمار سے نکالے گئے ہیں۔ یہ اعداد و شمار دس لاکھ یا زائد افراد کی زبانیں بولنے والے لوگوں کی تعداد کے بارے میں ہیں جن کا تذکرہ سال بہ سال World Almanac and Book of Facts میں ہوا۔ کلبرٹ کے تخمینوں میں ''مادری زبان'' اور ''غیر مادری زبان'' دونوں کے بولنے والے شامل ہیں اور قومی مردم شماری، آبادی کے سرویز، ریڈیو ٹی وی کے سرویز، آبادی میں اضافے کے اعداد و شمار، ثانوی مطالعات اور دیگر ماخذوں سے لیے گئے ہیں۔

پانچ بڑی مغربی زبانیں (انگریزی، فرانسیسی، جرمن، پرتگالی، اسپینی) بولنے والی دنیا کی آبادی ۱۹۵۸ء میں ۲۴ء۱ فیصد سے کم ہوکر ۱۹۹۲ء میں ۲۰ء۸ فیصد ہوگئی۔ ۱۹۹۲ء میں انگریزی بولنے

جدول ۲ء۳
اہم چینی اور مغربی زبانیں بولنے والے

	۱۹۵۸ بولنے والوں کی تعداد (ملین میں)	۱۹۵۸ دُنیا کا فیصدی تناسب	۱۹۹۲ بولنے والوں کی تعداد (ملین میں)	۱۹۹۲ دُنیا کا فیصدی تناسب
مینڈارین	۴۴۴	۱۵٫۶	۹۰۷	۱۵٫۲
کنٹونی	۴۳	۱٫۵	۶۵	۱٫۱
وو	۳۹	۱٫۴	۶۴	۱٫۱
من	۳۶	۱٫۳	۵۰	۰٫۸
ہکا	۱۹	۰٫۷	۳۳	۰٫۶
چینی زبانیں	۵۸۱	۲۰٫۵	۱۱۱۹	۱۸٫۸
انگریزی	۲۷۸	۹٫۸	۴۵۶	۷٫۶
اسپینی	۱۴۲	۵٫۰	۳۶۲	۶٫۱
پُرتگالی	۷۴	۲٫۶	۱۷۷	۳٫۰
جرمن	۱۲۰	۴٫۲	۱۱۹	۲٫۰
فرانسیسی	۷۰	۲٫۵	۱۲۳	۲٫۱
مغربی زبانیں	۶۸۴	۲۴٫۱	۱۲۳۷	۲۰٫۸
دُنیا کا میزان	۲۸۴۵	۴۴٫۵	۵۹۷۹	۳۹٫۴

ماخذ: فیصدی تناسب پروفیسر ایس کلبرٹ، شعبہ نفسیات، واشنگٹن یونیورسٹی، سیٹل کے مرتب کردہ اعداد و شمار سے نکالے گئے ہیں جن کا تذکرہ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۹۳ء کی *World Almanac and Book of Facts* میں کیا گیا ہے۔

والوں کے مقابلے میں تقریباً دگنی آبادی، یعنی عالمی آبادی کا ۲ء ۱۵ فیصد، مینڈارین بولتی تھی اور ان کے علاوہ مزید ۶ء۳ فیصد چینی زبان کی دوسری شکلیں استعمال کرتے تھے (دیکھیے جدول ۲ء۳)۔

ایک مفہوم میں جو زبان دنیا کے ۹۲ فیصد لوگوں کے لیے اجنبی ہو وہ عالمی زبان نہیں ہو سکتی۔ تاہم ایک اور مفہوم میں، اگر یہ وہ زبان ہے جس کو مختلف لسانی گروہوں اور ثقافتوں سے منسلک افراد باہم رابطے کے لیے استعمال کرتے ہیں، اگر یہ دنیا کی لنگوا فرینکا ہے، یا لسانی اصطلاحات میں یہ دنیا

کی اہم ترین لینگویج آف وائیڈر کمیونیکیشن (ایل ڈبلیو سی) ہے تو اسے عالمی زبان کہا جا سکتا ہے۔" جن افراد کو آپس میں رابطے کی ضرورت پڑتی ہے انہیں اس کے لیے ذریعہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ ایک سطح پر وہ خصوصی طور پر تربیت یافتہ پیشہ وروں پر انحصار کر سکتے ہیں جو دو یا دو سے زیادہ زبانوں میں روانی رکھتے ہوں تاکہ ترجمان کے طور پر کام کر سکیں۔ لیکن یہ طریقہ بھونڈا، وقت صرف کرنے والا اور مہنگا ہے۔ اس لیے تمام تاریخ میں لنگوا فرینکاز نے جنم لیا ہے: کلاسیکی و قرونِ وسطیٰ کی دنیاؤں میں لاطینی، کئی صدیوں تک مغرب میں فرانسیسی، افریقہ کے بہت سے علاقوں میں سواحلی اور بیسویں صدی کے آخری نصف میں دنیا کے زیادہ تر حصوں میں انگریزی۔ سفارتکاروں، تاجروں، سائنسدانوں، سیاحوں اور ان کو خدمات فراہم کرنے والوں، ائرلائنوں کے پائلٹوں اور ائر ٹریفک کنٹرولروں کو ایک دوسرے سے مؤثر ابلاغ کے لیے کسی ذریعے کی ضرورت ہوتی ہے اور اب وہ انگریزی میں باہم رابطہ کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے انگریزی دنیا میں مختلف ثقافتوں کے درمیان ابلاغ کا وسیلہ ہے جیسے مسیحی کیلنڈر وقت کا تعین کرنے کے لیے عالمی طریقہ ہے، عربی اعداد گننے کے لیے دنیا میں رائج طریقہ ہے اور اعشاری نظام پیمائش کا طریقہ ہے۔ مگر اس انداز میں انگریزی کا استعمال بین الثقافتی ابلاغ کہلائے گا گویا علیحدہ علیحدہ ثقافتیں وجود رکھتی ہیں۔ لنگوا فرینکا لسانی و ثقافتی اختلافات سے نمٹنے کا ذریعہ ہوتی ہے، ان کو ختم کرنے کا نہیں۔ یہ ابلاغ کا ایک آلہ ہے، شناخت اور برادری کا وسیلہ نہیں۔ ایک جاپانی بینکار اور ایک انڈونیشیائی تاجر آپس میں انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ انگریزوں یا اہلِ مغرب جیسے بنتے جا رہے ہیں۔ یہی بات جرمن اور فرانسیسی بولنے والے سوئس باشندوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جن کے آپس میں انگریزی میں ابلاغ کرنے کا امکان بھی اتنا ہی ہے جتنا اپنی قومی زبانوں میں۔ اسی طرح بھارت میں نہرو کے منصوبوں کے برخلاف ایک ثانوی قومی زبان کی حیثیت سے انگریزی کا برقرار رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندی نہ بولنے والی قومیتیں اپنی زبانوں اور ثقافتوں کو محفوظ رکھنے کی شدید خواہش رکھتی ہیں اور بھارت کے ایک کثیر لسانی معاشرے کے طور پر قائم رہنے کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ صف اول کے لسانی دانشور جوشوا فش مین نے کہا ہے، کسی زبان کو اس صورت میں لنگوا فرینکا یا ایل ڈبلیو سی کے طور قبول کیے جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے جب اسے کسی خاص نسلی گروہ، مذہب یا نظریے سے وابستہ نہ کیا جائے۔ ماضی میں انگریزی کی ایسی متعدد شناختیں تھیں۔ لیکن اب انگریزی میں "غیرنسلیت" آ گئی ہے جیسے ماضی میں عکادی، آرامی، یونانی اور لاطینی کے

ساتھ ہوا۔'' یہ اضافی زبان کی حیثیت سے انگریزی کی نسبتاً خوش قسمتی ہے کہ اس کے برطانوی اور امریکی سرچشموں کو لگ بھگ پچھلی چوتھائی صدی سے بہت زیادہ نسلی یا نظریاتی پس منظر میں نہیں دیکھا گیا۔'' [تاکید اصل کے مطابق][۱۲] مختلف ثقافتوں کے افراد کے مابین انگریزی کا استعمال لوگوں کی علیٰحدہ علیٰحدہ شناختوں کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ تقویت دیتا ہے۔ لوگ اسی لیے دوسری ثقافتوں کے افراد سے رابطے کے لیے انگریزی استعمال کرتے ہیں کہ وہ اپنی ثقافت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

دنیا بھر میں انگریزی استعمال کرنے والے لوگ انگریزی کی مختلف قسمیں زیادہ سے زیادہ بول رہے ہیں۔ مختلف علاقوں کی انگریزی میں دیسی پن آجاتا ہے جو اسے برطانوی یا امریکی انگریزی سے ممتاز کرتا ہے اور جو، ایک انتہا پر، انگریزی کی اِن مختلف اقسام کو ایک دوسرے کے لیے ناقابل فہم بنا دیتا ہے جیسے چینی زبان کی مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ نائیجیرین پجن انگریزی، بھارتی انگریزی اور انگریزی کی دوسری شکلیں اپنی اپنی مقامی ثقافتوں میں شامل ہوتی جارہی ہیں اور غالباً الگ ہوتی رہیں گی اور ایک دوسرے سے منسلک مگر علیٰحدہ زبانیں بن جائیں گی جیسے رومانس زبانیں لاطینی سے نکلیں۔ تاہم لاطینی، فرانسیسی اور اسپینی کے برخلاف انگریزی سے ماخوذ یہ زبانیں معاشرے کا ایک بہت چھوٹا طبقہ بولے گا یا یہ مختلف لسانی گروپوں کے درمیان رابطے کے لیے استعمال ہوں گی۔

بھارت میں یہ سارا عمل ہوتا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً ظاہری طور پر ۱۹۸۳ء میں ۷۳ کروڑ ۳۰ لاکھ کی آبادی میں سے ایک کروڑ ۸۰ لاکھ اور ۱۹۹۱ء میں ۸۶ کروڑ ۷۰ لاکھ کی آبادی میں دو کروڑ انگریزی بولنے والے تھے۔ اس طرح بھارتی آبادی میں انگریزی بولنے والوں کی شرح تقریباً ایک جیسی رہی ہے یعنی دو سے چار فیصد تک۔[۱۳] ایک چھوٹے سے بالائی طبقے کے سوا انگریزی لنگوافرینکا تک نہیں۔ نئی دہلی میں انگریزی کے دو پروفیسروں کا کہنا ہے کہ ''زمینی حقیقت یہ ہے کہ کشمیر سے لے کر انتہائی جنوبی علاقے کنیا کماری تک سفر کیا جائے تو انگریزی کی بجائے ہندی کی کسی شکل کے ذریعے رابطہ برقرار رہے گا۔'' علاوہ ازیں بھارتی انگریزی اپنے علیٰحدہ خواص اختیار کرتی جارہی ہے: اس میں بھارتی بلکہ مقامی رنگ آتا جارہا ہے کیونکہ گوناگوں مقامی زبانوں کے انگریزی بولنے والوں کے درمیان اختلافات ابھر رہے ہیں۔[۱۴] انگریزی بھارت کی ثقافت میں جذب ہوتی جارہی ہے جیسے قبل ازیں سنسکرت اور فارسی ہوئی تھیں۔

تمام تاریخ میں دنیا میں زبانوں کی تقسیم طاقت کی تقسیم کی عکاسی کرتی رہی ہے۔ سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانیں یعنی انگریزی، مینڈارین، اسپینی، فرانسیسی، عربی اور روسی سامراجی

ریاستوں کی زبانیں تھیں یا ہیں جنہوں نے دوسری اقوام میں اپنے زبان کو بہت فروغ دیا۔ طاقت کی تقسیم میں تبدیلی زبانوں کے استعمال میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ ''دو صدیوں تک برطانوی و امریکی نوآبادیاتی، تجارتی، صنعتی، سائنسی اور مالیاتی طاقت نے اعلیٰ تعلیم، حکومت، تجارت اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں'' ساری دنیا میں ''خاصا ورثہ چھوڑا ہے''[۱۵] برطانیہ اور فرانس نے اپنی نوآبادیوں میں اپنی اپنی زبانوں کے استعمال پر اصرار کیا۔ تاہم آزادی کے بعد بیشتر سابق نوآبادیوں نے مختلف درجوں میں اور کامیابی کی مختلف سطحوں کے ساتھ سامراجی زبان کی جگہ اپنی زبان رائج کر لی۔ سوویت یونین کے دورِ عروج میں پراگ سے ہنوئی تک روسی زبان لنگوا فرینکا تھی۔ روسی طاقت کے زوال کے ساتھ دوسری زبان کے طور پر روسی کے استعمال میں بھی زوال آیا۔ جیسے ثقافت کی دوسری شکلوں میں ہوتا ہے، بڑھتی ہوئی طاقت اہلِ زبان میں لسانی جارحیت اور دوسروں کے لیے زبان سیکھنے کی ترغیبات کو جنم دیتی ہے۔ دیوارِ برلن گرنے کے ابتدائی دنوں میں جب کامیابی کے نشے میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ متحدہ جرمنی ہی نئی مہیب حقیقت ہے، یہ رجحان دیکھا گیا کہ روانی سے انگریزی بولنے والے جرمن بھی بین الاقوامی اجلاسوں میں جرمن بول رہے تھے۔ جاپان کی اقتصادی قوت نے غیر جاپانی افراد میں جاپانی سیکھنے کی تحریک پیدا کی ہے اور اسی طرح چین کی معاشی ترقی سے چینی زبان عروج پا رہی ہے۔ ہانگ کانگ میں چینی تیزی سے غالب زبان کے طور پر انگریزی کی جگہ لے رہی ہے[۱۶] اور جنوب مشرقی ایشیا میں بیرون ملک مقیم چینیوں کے کردار کے باعث اس علاقے میں بیشتر بین الاقوامی کاروباری سودوں کی زبان بن گئی ہے۔ دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں مغرب کی طاقت کے بتدریج زوال کے ساتھ انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کا دوسرے معاشروں میں اور مختلف معاشروں کے مابین رابطے کے لیے استعمال بھی آہستہ آہستہ کم ہوتا جائے گا۔ اگر مستقبل بعید میں کبھی چین مغرب کی جگہ دنیا کی غالب تہذیب بن گیا تو انگریزی کی جگہ مینڈارین عالمی لنگوا فرینکا بن جائے گی۔

جوں جوں سابقہ نوآبادیاں آزادی کی طرف گامزن ہوئیں اور آزاد ہوتی گئیں، اعلیٰ قوم پرست طبقات نے خود کو مغربی آبادکاروں سے ممتاز کرنے اور اپنی شناخت متعین کرنے کے لیے ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ دیسی زبانوں کو فروغ دیا اور سامراج کی زبانوں کو دبایا۔ تاہم آزادی کے بعد ان معاشروں کے بالائی طبقات عام لوگوں سے خود کو ممتاز رکھنا چاہتے تھے۔ یہ مقصد انہوں نے انگریزی، فرانسیسی یا کسی اور مغربی زبان میں روانی کے ذریعے حاصل کیا۔ نتیجتاً غیر مغربی معاشروں کے بالائی طبقات اکثر اپنے سماج کے لوگوں کی بجائے مغربی باشندوں کے ساتھ اور آپس میں بہتر

طور پر ابلاغ کر سکتے ہیں (سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مغرب میں بھی ایسی ہی صورتحال تھی جب مختلف ممالک کے شرفا فرانسیسی میں ایک دوسرے کے ساتھ بآسانی ابلاغ کر سکتے تھے لیکن اپنے ملک کی مقامی زبان نہیں بول سکتے تھے)۔ غیر مغربی معاشروں میں دو مخالف رجحانات جاری نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو یونیورسٹی کی سطح پر انگریزی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا رہا ہے تاکہ طلبہ سرمایہ اور صارفین کی عالمی مسابقت میں مؤثر طور پر اپنا کردار انجام دے سکیں۔ دوسری طرف معاشرتی و سیاسی دباؤ کی وجہ سے دیسی زبانوں کا استعمال بڑھ رہا ہے، شمالی افریقہ میں فرانسیسی کی جگہ عربی اختیار کی جا رہی ہے، پاکستان میں حکومت اور تعلیم کی زبان کی حیثیت سے انگریزی کی جگہ اردو لے رہی ہے اور بھارت میں مقامی زبان کے ذرائع ابلاغ انگریزی میڈیا کی جگہ لے رہے ہیں۔ بھارتی تعلیمی کمیشن نے اس صورتحال کو ۱۹۴۸ء میں ہی محسوس کر لیا تھا جب اس نے یہ کہا تھا کہ ''انگریزی کا استعمال ... لوگوں کو دو اقوام میں بانٹ دیتا ہے چند لوگ جو حکومت کرتے ہیں اور بہت سے جن پر حکومت کی جاتی ہے، ایک دوسرے کی زبان نہیں بول سکتا اور دونوں ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے۔'' چالیس سال بعد بالائی طبقے کی زبان کی حیثیت سے انگریزی کے برقرار رہنے سے اس پیشگوئی کی صداقت ثابت ہوگئی اور اس نے ''بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر قائم ایک فعال جمہوریت میں غیر فطری صورتحال'' کو جنم دیا، ''انگریزی بولنے والا بھارت اور سیاسی شعور رکھنے والا بھارت دور سے دور تر ہوتے جا رہے ہیں'' اور ''انگریزی جاننے والی بالائی اقلیت اور ووٹ کے حق سے مسلح انگریزی نہ جاننے والے کروڑوں افراد کے درمیان کشیدگی'' کو ہوا مل رہی ہے۔[1] جوں جوں غیر مغربی معاشرے جمہوری ادارے قائم کر رہے ہیں اور ان کے عوام حکومت میں زیادہ سے زیادہ شریک ہو رہے ہیں توں توں مغربی زبانوں کا استعمال کم ہو رہا ہے اور مقامی زبانیں عام ہو رہی ہیں۔

سوویت سلطنت اور سرد جنگ کے خاتمے سے ان زبانوں کے پھیلاؤ اور احیا کو فروغ ملا جن کو دبا دیا گیا تھا یا بھلا دیا گیا تھا۔ بیشتر سابق سوویت جمہوریاؤں میں روایتی زبانوں کو زندہ کرنے کے لیے بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ایسٹونیائی، لیٹویائی، لیتھوینیائی، یوکرینی، جارجیائی اور آرمینیائی اب آزاد ریاستوں کی قومی زبانیں ہیں۔ مسلمان جمہوریاؤں میں بھی اسی طرح لسانی اثبات کا عمل ہوا ہے اور آذربائی جان، کرغزستان، ترکمانستان اور ازبکستان نے سابق روسی آقاؤں کے سریلیک رسم الخط کو چھوڑ کر اپنے ترک قرابت داروں کا مغربی رسم الخط اختیار کر لیا ہے جبکہ تاجکستان میں جہاں فارسی بولی جاتی ہے عربی رسم الخط اپنایا گیا ہے۔ دوسری جانب سرب اپنی زبان کو اب سربو کروشین کی بجائے سربیائی کہتے ہیں اور اپنے کیتھولک دشمنوں کے مغربی رسم الخط کو ترک کر کے روسی

قرابت داروں کا سریلیک رسم الخط اختیار کرلیا ہے۔ اسی طرز پر کروٹس اب اپنی زبان کو کروشیائی کہتے ہیں اور اسے ترکی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے الفاظ سے پاک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ بوسنیا میں بھی "ترکی و عربی مستعار الفاظ، جو بلقان میں سلطنت عثمانیہ کی ۴۵۰ سالہ موجودگی کا لسانی ورثہ ہیں دوبارہ مستعمل ہو رہے ہیں"[۱۸] زبان کو تہذیبوں کی شناخت اور حدودِ اربعہ کے مطابق اور ہم آہنگ بنانے کے لیے زبان کی تشکیلِ نو اور تعمیرِ نو کی جاتی ہے۔ طاقت سمٹتی ہے تو زبانوں کی کثرت پھیلتی ہے۔

مذہب۔ آفاقی مذہب کے ابھرنے کا امکان آفاقی زبان سے معمولی سا ہی زیادہ ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں عالمی سطح پر مذاہب کا احیا ہوا ہے (دیکھئے صفحات ۱۱۶ تا ۱۲۴)۔ اس احیا میں مذہبی احساسات بڑھ گئے ہیں اور بنیاد پرست تحریکیں سامنے آئی ہیں۔ اس طرح مذاہب کے مابین اختلافات شدید تر ہو گئے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس سے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی شرحوں میں اہم تبدیلیاں آئی ہوں۔ مذہب کے پیروکاروں کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہیں

جدول ۳ء۳

اہم مذہبی روایات سے وابستہ عالمی آبادی کا تناسب (فیصد میں)

سال / مذہب	۱۹۰۰	۱۹۷۰	۱۹۸۰	۱۹۸۵ (تخمیناً)	۲۰۰۰ (تخمیناً)
مغربی عیسائی	۲۶ء۹	۳۰ء۶	۳۰ء۰	۲۹ء۷	۲۹ء۹
آرتھوڈوکس عیسائی	۷ء۵	۳ء۱	۲ء۸	۲ء۷	۲ء۴
مسلمان	۱۲ء۴	۱۵ء۳	۱۶ء۵	۱۷ء۱	۱۹ء۲
غیر مذہبی	۰ء۲	۱۵ء۰	۱۶ء۴	۱۶ء۹	۱۷ء۱
ہندو	۱۲ء۵	۱۲ء۸	۱۳ء۳	۱۳ء۵	۱۳ء۷
بدھ	۷ء۸	۶ء۴	۶ء۳	۶ء۲	۵ء۷
لوک چینی	۲۳ء۵	۵ء۹	۴ء۵	۳ء۹	۲ء۵
قبائلی	۶ء۶	۲ء۴	۲ء۱	۱ء۹	۱ء۶
ملحد	۰ء۰	۴ء۶	۴ء۵	۴ء۴	۴ء۲

ماخذ: ڈیوڈ بی بیرٹ کا مدون کیا ہوا World Christian Encyclopedia: A comparative study of churches and religions in the modern world A.D. 1900-2000 (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۲ء)

وہ زبانوں کے بولنے والوں سے متعلق معلومات سے بھی زیادہ شکستہ سی اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ جدول ۳ء۳ میں ایک بہت استعمال ہونے والے ماخذ کے اعداد و شمار دکھائے گئے ہیں۔ ان اعداد و شمار اور دیگر معلومات سے پتا چلتا ہے کہ اس صدی میں دنیا بھر میں مذاہب کے پیروکاروں کی تقابلی تعداد میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس ماخذ کے مطابق جو سب سے بڑی تبدیلی ریکارڈ کی گئی وہ ''لامذہب'' اور ''ملحد'' کے عنوان کے تحت آنے والے لوگوں کی شرح میں اضافہ تھا جو ۱۹۰۰ء میں ۰ء۲ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۸۰ء میں ۹ء۲۰ تک ہوا۔ اسے مذہب سے دوری کی عکاسی سمجھا جا سکتا ہے جب کہ ۱۹۸۰ء میں مذہبی احیا نے قوت پکڑنا شروع ہی کی تھی۔ بہرکیف لامذہب افراد میں ۷ء۲۰ فیصد کا یہ اضافہ ''چینی لوک مذاہب'' کے پیروکاروں کی شرح میں ۰ء۱۹ فیصد کمی سے قریبی مطابقت رکھتا ہے جو ۱۹۰۰ء میں ۵ء۲۳ فیصد سے گھٹ کر ۱۹۸۰ء میں ۵ء۴ فیصد ہوگئی۔ اس تقریباً مساوی اضافے اور کمی سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمیونزم کی آمد پر چینی آبادی کی اکثریت کو لوک مذاہب کے پیروکاروں کی بجائے لامذہب ظاہر کیا گیا۔

ان اعداد و شمار سے دو بڑے تبلیغی مذاہب اسلام اور عیسائیت کے پیروکاروں کے تناسب میں ۸۰ سال کے عرصے میں ہونے والا اضافہ سامنے آتا ہے۔ مغربی عیسائی ۱۹۰۰ء میں دنیا کی آبادی کا تخمیناً ۹ء۲۶ فیصد تھے اور ۱۹۸۰ء میں ۳۰ فیصد۔ مسلمانوں کی شرح ۱۹۰۰ء میں ۴ء۱۲ فیصد سے ڈرامائی طور پر بڑھ کر ۱۹۸۰ء میں ۵ء۱۶ یا بعض دیگر تخمینوں کے مطابق ۱۸ فیصد ہوگئی۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں میں افریقہ میں اسلام اور عیسائیت دونوں کے معتقدین کی تعداد خاصی بڑھی اور جنوبی کوریا میں عیسائیت کے پیروکاروں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا۔ تیزی سے جدید طرزِ زندگی اختیار کرتے ہوئے سماجوں میں اگر روایتی مذہب جدیدیت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا تو مغربی مسیحیت اور اسلام کے پھیلنے کا امکان موجود ہوتا ہے۔ ان معاشروں میں مغربی ثقافت کے کامیاب ترین کردار نوکلاسیکی معاشیات داں یا جمہوریت کی جدوجہد کرنے والے یا کثیر القوی کمپنیوں کے ایگزیکٹو نہیں بلکہ عیسائی مشنریاں ہیں اور غالب امکان ہے کہ آئندہ بھی رہیں گی۔ شہری تارکین وطن یا ثانوی اسکولوں کے پہلی نسل کے گریجویٹس کی نفسیاتی، جذباتی، اخلاقی اور معاشرتی ضروریات کو ایڈم اسمتھ یا ٹامس جیفرسن پورا نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے [حضرت] عیسیٰؑ بھی نہ کر سکیں مگر ان کے کامیاب ہونے کا امکان زیادہ ہے۔

بہرحال طویل المیعاد بنیادوں پر محمد [ﷺ] کی فتح ہوگی۔ عیسائیت زیادہ تر تبدیلی مذہب سے پھیل رہی ہے جبکہ اسلام تبدیلی مذہب اور تولید سے پھیل رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں

عیسائیوں کی شرح سب سے زیادہ یعنی دنیا کی آبادی کا تقریباً ۳۰ فیصد تھی، پھر یکساں ہوئی، اب کم ہورہی ہے اور ۲۰۲۵ء تک غالباً ۲۵ فیصد رہ جائے گی۔ دنیا میں مسلمانوں کا تناسب آبادی میں اضافے کی انتہائی زیادہ شرحوں کے نتیجے میں (دیکھیے باب پنجم) ڈرامائی طور پر بڑھتا رہے گا، صدی کے خاتمے پر دنیا کی آبادی کا ۲۰ فیصد ہوگا، چند برس بعد عیسائیوں کی تعداد کو عبور کرجائے گا اور ۲۰۲۵ء تک عالمی آبادی کا لگ بھگ ۳۰ فیصد ہوجائے گا۔[19]

آفاقی تہذیب: ماخذ

آفاقی تہذیب کا تصور مغربی تہذیب کی مخصوص پیداوار ہے۔ انیسویں صدی میں ''سفید فام کی ذمے داری'' (the white man's burden) کے تصور نے غیر مغربی معاشروں پر مغربی سیاسی اور معاشی غلبے کی توسیع کا جواز فراہم کیا۔ بیسویں صدی کے اختتام پر آفاقی تہذیب کا تصور دوسرے سماجوں پر مغربی ثقافتی بالادستی اور ان سماجوں کے مغربی رواجوں اور اداروں کی نقالی کرنے کی ضرورت کا جواز فراہم کررہا ہے۔ آفاقیت غیر مغربی ثقافتوں سے محاذ آرائی کے لیے مغرب کا نظریہ ہے۔ جیسا کہ کسی مذہب کے نئے ارکان یا ضمنی طبقات کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، واحد تہذیب کے تصور کے سب سے پرجوش حامی ترک وطن کرکے مغرب آنے والے دانشور مثلاً نے پال اور فواد عجمی ہیں جن کے لیے یہ تصور اس مرکزی سوال کا بہت اطمینان بخش جواب فراہم کرتا ہے کہ ''میں کون ہوں؟'' لیکن ان تارکین کے لیے ایک عرب دانشور نے ''وائٹ مینز نگر''☆ (White man's nigger) کی اصطلاح استعمال کی[20] اور ایک آفاقی تہذیب کے تصور کو دوسری تہذیبوں میں بہت کم قبول کیا جاتا ہے۔ مغرب جس بات کو آفاقی سمجھتا ہے غیر مغربی لوگ اسے مغربی سمجھتے ہیں۔ جس چیز کو اہلِ مغرب بابرکت عالمی اتحاد کا نیک عمل کہہ کر خیر مقدم کرتے ہیں، مثلاً پوری دنیا میں ذرائع ابلاغ کا عام ہونا، اسے غیر مغربی لوگ گھناؤنی مغربی سامراجیت کہہ کر مسترد کردیتے ہیں۔ غیر مغربی لوگ جس حد تک دنیا کو ایک خیال کرتے ہیں اسی حد تک اسے خطرہ سمجھتے ہیں۔

یہ دلیل کہ کسی قسم کی آفاقی تہذیب نمودار ہورہی ہے، تین مفروضات میں سے کسی ایک یا زائد کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ اول، یہ مفروضہ ہے، جس پر باب اول میں بحث کی گئی، کہ سوویت کمیونزم کے انہدام کا مطلب تاریخ کا خاتمہ اور ساری دنیا میں لبرل جمہوریت کی مکمل فتح ہے۔ اس

☆ نوٹ از مترجم: nigger، کالا، سیاہ فام (تحقیر آمیز لفظ)۔

دلیل میں نقص یہ ہے کہ کسی اور متبادل کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس کی جڑیں سرد جنگ کے اس نقطۂ نظر میں ہیں کہ کیمونزم کا واحد متبادل لبرل جمہوریت ہے اور اول الذکر کی موت سے ثانی الذکر کی آفاقیت جنم لیتی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ مطلق العنانی، قوم پرستی، کارپوریٹزم اور مارکیٹ کیمونزم (جیسے چین میں) کی متعدد صورتیں ہیں جو آج کی دنیا میں زندہ ہیں اور چل رہی ہیں۔ اہم تر امر یہ ہے کہ سیکولر نظریات کی دنیا کے باہر بہت سے مذہبی متبادل موجود ہیں۔ جدید دنیا میں مذہب ایک مرکزی، بلکہ شاید واحد مرکزی قوت ہے جو لوگوں کو متحرک کرتی ہے۔ یہ سوچنا بے جا غرور کے سوا کچھ نہیں کہ سوویت کیمونزم ختم ہو گیا ہے اس لیے مغرب نے ہمیشہ کے لیے دنیا تسخیر کر لی ہے اور مسلمان، چینی، بھارتی اور دوسرے فوراً مغربی لبرل ازم کو اپنا لیں گے کہ یہ واحد متبادل ہے۔ نوعِ انسانی میں سرد جنگ والی تقسیم ختم ہو چکی ہے لیکن نسل، مذہب اور تہذیب کی شکل میں زیادہ اساسی تقسیم برقرار ہے اور بہت سے نئے تنازعات پیدا کر رہی ہے۔

دوم، مفروضہ یہ ہے کہ اقوام کے مابین ربط ضبط میں اضافے یعنی تجارت، سرمایہ کاری، سیاحت، ذرائع ابلاغ، الیکٹرانک مواصلات کے عمومی طور پر بڑھنے سے ایک مشترکہ عالمی ثقافت وجود میں آ رہی ہے۔ نقل وحمل اور مواصلاتی ٹیکنالوجی نے رقوم، اشیا، افراد، علم، خیالات اور تصاویر کو دنیا میں ہر جگہ پہنچنے کے عمل کو واقعی آسان اور ارزاں بنا دیا ہے۔ ان چیزوں کے بین الاقوامی نقل وحمل میں اضافے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں البتہ اس اضافے کے اثرات کے حوالے سے شبہات ہیں۔ تجارت سے تنازعے کا امکان بڑھتا ہے یا کم ہوتا ہے؟ یہ مفروضہ کہ اس سے اقوام کے درمیان جنگ کا امکان گھٹ جاتا ہے کم از کم غیر ثابت شدہ ہے اور اس کے خلاف خاصے شواہد موجود ہیں۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں بین الاقوامی تجارت میں بہت اضافہ ہوا اور اگلے عشرے میں سرد جنگ ختم ہو گئی۔ لیکن ۱۹۱۳ء میں بین الاقوامی تجارت بلند ترین سطح پر تھی اور اگلے چند برسوں میں اقوام نے آپس میں اتنی خونریزی کی جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔[۲۱] اگر اُس سطح پر بین الاقوامی تجارت جنگ نہ روک سکی تو کب روک سکتی ہے؟ شواہد اس لبرل، بین الاقوامی مفروضے کے حق میں بالکل نہیں کہ کاروبار سے امن فروغ پاتا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں کیے گئے تجزیوں سے یہ مفروضہ اور بھی مشکوک ٹھہرتا ہے۔ ایک تحقیق میں نتیجہ نکالا گیا کہ ''بڑھتی ہوئی تجارت ... بین الاقوامی سیاست کے لیے ایک بے حد تقسیم کرنے والی قوت ہو سکتی ہے'' اور یہ کہ ''بین الاقوامی نظام میں بڑھتا ہوا کاروبار اپنے طور پر بین الاقوامی کشیدگیوں کو کم کرنے یا بین الاقوامی استحکام کے اضافے میں معاون نہیں ہو سکتا''۔[۲۲] ایک اور تحقیق میں کہا گیا کہ باہم اقتصادی انحصار زیادہ ہو تو اس سے ''مستقبل کی تجارت

سے وابستہ توقعات کے مطابق امن یا جنگ کی ترغیب پیدا ہوسکتی ہے۔'' باہم اقتصادی انحصار اسی وقت امن کو فروغ دیتا ہے جب ریاستیں یہ توقع کر رہی ہوں کہ تجارت مستقبل میں بھی بخوبی جاری رہے گی۔ اگر وہ یہ توقع کر رہی ہوں کہ باہمی اقتصادی انحصار کی صورتحال جاری نہیں رہے گی تو جنگ چھڑنے کا امکان ہوتا ہے۔[۲۳]

تجارت اور مواصلات کے امن یا مشترکہ احساسات پیدا کرنے میں ناکامی سماجی علوم سے بھی ہم آہنگ ہے۔ معاشرتی نفسیات کے نظریۂ امتیاز کے مطابق لوگ خود کو ان چیزوں سے شناخت کرتے ہیں جو انہیں کسی مخصوص تناظر میں دوسروں سے مختلف بناتی ہیں: انسان اپنے آپ کو ان خواص کے حوالے سے دیکھتا ہے جو اسے دوسرے انسانوں سے جدا کرتے ہیں خصوصاً ان انسانوں سے جو اس کے سماجی ماحول میں موجود ہوں ... ایک خاتون نفسیات داں جو دوسرے پیشوں سے متعلق درجن بھر عورتوں کے ساتھ ہو خود کو نفسیات داں کی حیثیت سے دیکھتی ہے مگر جب وہ درجن بھر مرد نفسیات دانوں کے ساتھ ہوتی ہے تو خود کو عورت کی حیثیت سے دیکھتی ہے''۔[۲۴] لوگ اپنی شناخت کا تعین اس چیز سے کرتے ہیں جو وہ نہیں ہیں۔ جوں جوں مواصلات، تجارت اور سفر میں اضافہ ہو رہا ہے اور تہذیبوں کے درمیان روابط بڑھ رہے ہیں، لوگ اپنی تہذیبی شناخت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ دو یورپی، جن میں ایک جرمن اور ایک فرانسیسی ہو، جب آپس میں رابطہ کریں گے تو ایک دوسرے کو جرمن اور فرانسیسی کے طور پر شناخت کریں گے۔ جب ایک جرمن اور ایک فرانسیسی کا دو عربوں کے ساتھ، جن میں ایک سعودی اور ایک مصری ہو، رابطہ ہوگا تو چاروں خود کو یورپی اور عرب کی حیثیت سے پہچانیں گے۔ فرانس میں شمالی افریقی افراد کی نقلِ مکانی سے فرانسیسیوں میں مخاصمانہ جذبات ابھرتے ہیں لیکن وہ یورپی کیتھولک پولش باشندوں کی آمد کو قبول کرتے ہیں۔ امریکی جاپانی سرمایہ کاری پر زیادہ منفی ردعمل ظاہر کرتے ہیں بمقابلہ کینیڈا اور یورپی ممالک کی اس سے بڑی سرمایہ کاریوں کے۔ اسی طرح، جیسا کہ ڈونلڈ ہوروونز نے کہا ہے، ایک آئبو ... اس علاقے میں جو نائجیریا کا مشرقی خطہ تھا اووری آئبو یا اونتشا آئبو ہوسکتا ہے، لاگوس میں وہ فقط آئبو ہوتا ہے، لبنان میں وہ نائجیریائی ہوتا ہے، نیویارک میں افریقی ہوتا ہے''۔[۲۵] عمرانیات سے ہی عالمگیریت کا نظریہ ملتے جلتے نتیجے پر پہنچتا ہے: ''ایک زیادہ سے زیادہ متحد ہوتی ہوئی دنیا میں، جس میں باہم انحصار کے تہذیبی، سماجی اور دیگر طریقے اور ان کا عام احساس پایا جاتا ہے، تہذیبی، سماجی اور نسلی خود آگاہی بدتر شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔'' عالمی مذہبی احیا، یعنی ''مقدس کی طرف مراجعت'' اس تصور کا ردعمل ہے کہ دنیا ''واحد جگہ'' ہے۔[۲۶]

مغرب اور جدیدیت

ایک آفاقی تہذیب کے ابھرنے کے حق میں تیسری اور سب سے عمومی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ جدیدیت کے وسیع عمل کا نتیجہ ہے جو اٹھارہویں صدی سے جاری ہے۔ جدیدیت میں صنعت کاری، شہروں کا بسنا، خواندگی میں اضافہ، تعلیم، دولت اور معاشرتی حرکت کے علاوہ پیچیدہ تر اور متنوع پیشہ ورانہ ڈھانچے شامل ہیں۔ یہ سائنس اور انجینئرنگ کے علم میں اس زبردست ترقی کی پیداوار ہے جو اٹھارہویں صدی میں شروع ہوئی۔ جس نے انسانوں کی اپنے ماحول پر قدرت اور اسے ڈھالنے کی صلاحیت میں بے مثال اضافہ کر دیا۔ جدیدیت ایک انقلابی عمل ہے جس کا موازنہ ابتدائی معاشروں کے مہذب معاشروں میں تبدیلی سے ہی کیا جا سکتا ہے، یعنی صیغہ واحد کے معنوں میں تہذیب کے ابھرنے کے عمل سے جو تقریباً ۵۰۰۰ قبل مسیح میں دجلہ و فرات، نیل اور سندھ کی وادیوں میں شروع ہوا[۲۷] کسی جدید سماج میں لوگوں کے رویے، اقدار، علم اور ثقافت روایتی معاشرے کے افراد سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ جدید بننے والی پہلی تہذیب کی حیثیت سے مغرب جدیدیت کی ثقافت کے حصول میں قائد کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس دلیل کے مطابق جیسے جیسے دوسرے معاشرے تعلیم، کام، دولت اور طبقاتی ڈھانچے کے اسی سے ملتے جلتے طور طریقے اختیار کرتے جائیں گے، یہ جدید مغربی ثقافت دنیا کی آفاقی ثقافت بنتی چلی جائے گی۔

یہ امر غیر متنازع ہے کہ جدید اور روایتی ثقافتوں میں اہم اختلافات ہیں۔ بہرحال اس سے یہ لازمی نتیجہ نہیں نکلتا کہ جدید ثقافتیں رکھنے والے معاشروں کی باہمی مشابہت روایتی ثقافتوں والے معاشروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جس میں بعض معاشرے بہت جدید ہوں اور بعض روایتی ہوں اس دنیا کی بہ نسبت کم ہموار اور کم ہم آہنگ ہوگی جس میں تمام معاشرے جدیدیت کی بلند سطح پر ہوں۔ لیکن وہ دنیا کیسی ہوگی جس میں تمام معاشرے روایتی ہوں؟ چند سو سال قبل یہ دنیا تھی۔ کیا یہ اس سے کم ہموار اور ہم آہنگ تھی جیسی مستقبل کی ایک آفاقی جدیدیت رکھنے والی دنیا کے ہونے کا امکان ہے؟ ممکنہ طور پر نہیں۔ براؤڈل کہتا ہے کہ ”منگ زمانے کا چین ... یقینی طور پر ویلوئی دور کے فرانس سے اُس سے زیادہ قریب تھا جتنا ماؤزے تنگ کے عہد کا چین پانچویں جمہوریہ کے فرانس سے ہے“۔[۲۸]

تاہم دو وجوہ کی بنا پر جدید معاشرے روایتی سماجوں کے مقابلے میں ایک دوسرے سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ اول، جدید معاشروں کے مابین روابط کے بڑھنے سے مشترک ثقافت خواہ پیدا نہ ہو لیکن اس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ تکنیکیں، ایجادات اور رواج جس تیزی سے اور جس درجے پر

ایک معاشرے سے دوسرے میں منتقل ہوتی ہیں وہ روایتی دنیا میں ناممکن تھا۔ دوم، روایتی سماج کی بنیاد زراعت تھی، جدید سماج کی بنیاد صنعت ہے جس کا ارتقا دستکاری سے ترقی کر کے کلاسیکی بھاری صنعت اور اس کے بعد علم کی بنیاد پر قائم صنعت کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ زراعت کے طور طریقے اور ان سے منسلک معاشرتی ڈھانچا صنعت کی بہ نسبت فطری ماحول پر خاصا منحصر ہوتا ہے۔ مٹی اور موسم کے ساتھ ان میں تبدیلی ہوتی ہے اور ان کے نتیجے میں زمینی ملکیت، سماجی ڈھانچے اور حکومت کی مختلف شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ وٹفوگل کے ہائیڈرالک تہذیب کے نظریے میں جو بھی خوبیاں ہوں، بڑے بڑے آب پاشی نظاموں کی تعمیر اور ان کو چلانے پر منحصر زراعت مرتکز اور افسر شاہی والی سیاسی حکمرانی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ زرخیز مٹی اور اچھے موسمی حالات بڑی فصلوں والی زراعت اور اس کے نتیجے میں ایک ایسے سماجی ڈھانچے کو ابھارتے ہیں جس میں متمول زمینداروں کا ایک چھوٹا طبقہ اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں، غلاموں اور کمیوں کا ایک بڑا طبقہ ہوتا ہے۔ اگر حالات بڑے پیمانے پر زراعت کے لیے ناسازگار ہوں تو خود مختار کاشتکاروں پر مشتمل معاشرہ ابھر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ زرعی سماجوں میں سماجی ڈھانچے کی تشکیل کا انحصار جغرافیہ پر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں صنعت مقامی فطری ماحول پر کم منحصر ہوتی ہے۔ صنعتی تنظیم میں جو اختلافات ہوتے ہیں وہ ثقافتی و معاشرتی ڈھانچے سے ماخوذ ہوتے ہیں بجائے جغرافیہ کے، اور اول الذکر اختلافات کم ہوسکتے ہیں جبکہ مؤخر الذکر نہیں ہوسکتے۔

پس جدید معاشروں میں بہت کچھ مشترک ہوتا ہے لیکن کیا یہ لازمی ہے کہ وہ مدغم ہوکر ہم آہنگی اختیار کرلیں؟ یہ دلیل کہ ایسا واقعی ہوتا ہے اس مفروضے پر قائم ہے کہ جدید معاشرے کو ایک ہی مخصوص طرز کی یعنی مغربی طرز کی صورت اپنا لینی چاہیے، جدید تہذیب مغربی تہذیب ہے اور مغربی تہذیب جدید تہذیب ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ مغربی تہذیب آٹھویں اور نویں صدی میں ابھری اور بعد کی صدیوں میں اس کی علیحدہ خصوصیات بنیں۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی سے قبل اس میں جدیدیت نہیں آئی۔ جدید بننے سے بہت پہلے مغرب مغرب تھا۔ مغرب کی مرکزی خصوصیات جو اسے دوسری تہذیبوں سے الگ کرتی ہیں، مغرب کی جدیدیت سے پہلے کی ہیں۔

جدید بننے سے قبل سو سال کے عرصے میں مغربی معاشرے کو ممتاز کرنے والی خصوصیات کیا تھیں؟ مختلف اہلِ علم نے اس سوال کے جوابات دیے ہیں جن میں بعض پہلوؤں سے فرق ہے لیکن اہم اداروں، رواجوں اور عقائد پر، جنہیں جائز طور پر مغربی تہذیب کی اساس کہا جاسکتا ہے، یہ دانشور متفق ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں۔[۲۹]

کلاسیکی ورثہ۔ تیسری نسل کی تہذیب کی حیثیت سے مغرب نے سابقہ تہذیبوں خاص طور پر کلاسیکی تہذیب سے بہت کچھ وراثت میں لیا۔ کلاسیکی تہذیب سے لیے ہوئے مغرب کے ورثے متعدد ہیں جن میں یونانی فلسفہ اور عقلیت، رومی قانون، لاطینی اور عیسائیت شامل ہیں۔ اسلامی اور آرتھوڈوکس تہذیبوں کو بھی کلاسیکی تہذیب سے ورثہ ملا مگر اس سے بہت کم جو مغربی تہذیب نے حاصل کیا۔

کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسالک۔ تاریخی اعتبار سے مغربی تہذیب کی واحد اہم ترین خاصیت مغربی مسیحیت ہے، پہلے کیتھولک مسلک اور پھر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسالک۔ بلکہ پہلے ہزاریے کے بیشتر عرصے کے دوران تو مغربی تہذیب کو مغربی عالمِ مسیحیت (Western Christendom) ہی کہا جاتا تھا۔ مغربی عیسائی اقوام میں یہ احساس واضح طور پر تھا کہ وہ ترکوں، مورز، بازنطینیوں اور دیگر سے الگ ہیں اور سولہویں صدی میں جب اہلِ مغرب دنیا کو تسخیر کرنے نکلے تو یہ عمل دین کے لیے بھی تھا اور دنیا کے لیے بھی۔ اصلاحِ کلیسا و جوابی اصلاحِ کلیسا اور مغربی عالمِ مسیحیت کی پروٹسٹنٹ شمال اور کیتھولک جنوب میں تقسیم بھی مغربی تاریخ سے مخصوص ہیں۔ یہ خواص مشرقی آرتھوڈوکسی میں بالکل موجود نہیں اور لاطینی امریکی تجربے میں زیادہ تر شامل نہیں۔

یورپی زبانیں۔ ایک ثقافت کو دوسری سے علیٰحدہ کرنے والے عوامل میں زبان کی اہمیت صرف مذہب سے کم ہے۔ زبانوں کی کثرت کے اعتبار سے مغرب دوسری تہذیبوں سے مختلف ہے۔ جاپانی، ہندی، مینڈارین، روسی، حتیٰ کہ عربی بھی اپنی اپنی تہذیبوں کی بنیادی زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ مغرب نے لاطینی زبان ورثے میں پائی لیکن متعدد اقوام ابھریں اور ان کے ساتھ قومی زبانیں نمودار ہوئیں جو رومانس اور جرمانک زبانوں کی وسیع تر تقسیم بندی کے تحت مختلف گروہوں میں شمار ہوتی تھیں۔ سولہویں صدی تک ان زبانوں نے عمومی طور پر اپنی موجودہ شکلیں اختیار کر لیں۔

دینی و دنیوی حاکموں کی علیحدگی۔ پوری مغربی تاریخ میں پہلے ایک کلیسا اور پھر بہت سے کلیساؤں کا ریاست سے الگ وجود تھا۔ خدا اور سیزر؛ کلیسا اور ریاست؛ روحانی و زمانی حاکم؛ تصورات کے یہ جوڑے مغربی ثقافت میں چھائے رہے ہیں۔ صرف ہندو تہذیب ایسی ہے جس میں مذہب اور سیاست کو اس انداز میں الگ الگ کیا گیا۔ اسلام میں خدا سیزر ہے [یعنی سیاسی مقتدرِ اعلیٰ بھی ہے]، چین اور جاپان میں سیزر خدا ہے۔ آرتھوڈوکسی میں خدا سیزر کا جونیئر شریک ہے۔ کلیسا اور ریاست کی علیٰحدگی اور ان کے درمیان بار بار ہونے والے تصادم کا، جو مغربی تہذیب کا خاصہ ہے، کسی اور تہذیب میں وجود نہیں رہا۔ حاکمیت کی اس تقسیم سے مغرب میں آزادی کے ارتقا

میں بے پناہ مدد ملی۔

قانون کی حکمرانی۔ مہذب وجود کے لیے قانون کی مرکزیت کا تصور رومیوں سے وراثت میں لیا گیا۔ قرونِ وسطیٰ کے مفکرین نے فطری قانون کے تصور کو پھیلایا جس کے مطابق فرماں روا اپنے اختیارات استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح انگلینڈ میں کامن لا کی روایت نے جنم لیا۔ سولھویں اور سترہویں صدی کے مطلق العنانی کے دور میں قانون کی حکمرانی حقیقت کی بجائے خلاف ورزی کی شکل میں زیادہ دیکھی گئی لیکن انسانی طاقت کے کسی بیرونی بندش کے ماتحت ہونے کا تصور برقرار رہا: "Non sub homine sed sub Deo et lege" قانون کی حکمرانی کی روایت نے دستوریت اور مطلق اختیارات کے استعمال کے خلاف املاک کے حقوق سمیت تحفظِ حقوقِ انسانی کی بنیاد ڈالی۔ بیشتر دوسری تہذیبوں میں فکر و کردار کو تشکیل دینے والے عامل کی حیثیت سے قانون خاصا کم اہم تھا۔

سماجی تکثیریت۔ تاریخی اعتبار سے مغربی معاشرہ بہت زیادہ کثرت پسند رہا ہے۔ جیسا کہ ڈوئش کہتا ہے ''ایسے متنوع خودمختار گروہوں کا ابھرنا اور قائم رہنا جن کی بنیاد خون کے رشتوں یا شادی پر نہیں تھی'' مغرب کی امتیازی خاصیت ہے۔[۲۰] یہ سلسلہ چھٹی اور ساتویں صدی میں شروع ہوا، ابتدا میں ان گروہوں میں راہبوں کی جماعتیں اور گلڈ (تجارتی انجمنیں) شامل تھے لیکن بعد میں توسیع ہوئی اور یورپ کے بیشتر علاقوں میں مختلف قسم کی دوسری تنظیمیں اور انجمنیں شامل ہوگئیں۔[۲۱] اس تنظیمی تکثیریت کے ساتھ طبقاتی تکثیریت بھی مل گئی۔ بیشتر مغربی یورپی معاشروں میں ایک نسبتاً مضبوط اور خودمختار اشرافیہ، اچھی خاصی کسان آبادی اور تاجروں اور بیوپاریوں کا چھوٹا مگر اہم طبقہ شامل تھا۔ جاگیردارانہ اشرافیہ کی قوت نے زیادہ تر یورپی اقوام میں مطلق العنانی کو حدود میں رکھا اور مضبوطی سے جڑ نہیں پکڑنے دیا۔ یورپی تکثیریت اور اسی زمانے میں روس، چین، عثمانی علاقوں اور دیگر غیر مغربی معاشروں میں پائی جانے والی شہری سماج کی غربت، اشرافیہ کی کمزوری اور مرتکز قوت کی حامل افسر شاہی پر مشتمل سلطنتوں کے درمیان نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

نمائندہ ادارے۔ سماجی تکثیریت نے ابتدائی دور میں جاگیروں، پارلیمانوں اور دوسرے اداروں کو جنم دیا جو اشرافیہ، پادریوں، تاجروں اور دوسرے گروہوں کے مفادات کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان اداروں نے نمائندگی کی ایسی شکلیں فراہم کیں جو جدیدیت کے عمل کے دوران ترقی پاکر جدید جمہوریت کے ادارے بن گئے۔ بعض مقامات پر دورِ مطلق العنانی میں یہ ادارے ختم کردیے گئے یا ان کے اختیارات بتدریج محدود کردیے گئے۔ جہاں ایسا ہوا وہاں بھی یہ ادارے دوبارہ زندہ

ہو گئے اور وسیع تر سیاسی شمولیت کا ذریعہ بنے جیسے فرانس میں ہوا۔ کسی اور ہم عصر تہذیب میں نمائندہ اداروں کا اس طرح کا ورثہ موجود نہیں جو پچھلے ایک ہزار سال سے چلا آ رہا ہو۔ مقامی سطح پر بھی، لگ بھگ نویں صدی میں شروع ہو کر خود مختاری کی تحریکیں اطالوی شہروں میں پیدا ہوئیں، شمال کی طرف پھیلتی گئیں اور ''بشپوں، مقامی نوابوں اور دوسرے بڑے شرفا کو شہریوں میں اختیار تقسیم کرنے پر اور آخر میں انہیں بالکل گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کرتی گئیں''۔[۳۲] چنانچہ قومی سطح پر نمائندگی کے ساتھ مقامی سطح پر بھی کسی حد تک خود مختاری حاصل ہوئی جو دنیا کے دوسرے خطوں میں نہیں ہوا۔

فرد پسندی۔ مغربی تہذیب کے مندرجہ بالا کئی پہلوؤں نے فرد پسندی اور انفرادی حقوق اور آزادیوں کی روایت ابھرنے میں مدد دی جو مہذب معاشروں کا ہی خاصہ ہے۔ چودھویں اور پندرہویں صدی میں فرد پسندی ابھری اور انفرادی اختیار کے حق کو، جسے ڈوئش ''رومیو اور جولیٹ انقلاب'' کہتا ہے، سترہویں صدی میں مغرب میں قبولیت عام حاصل ہوگئی۔ تمام افراد کے لیے مساوی حقوق تک کے دعوے بھی۔۔ ''انگلینڈ میں غریب ترین آدمی کو بھی زندگی بسر کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا امیر ترین آدمی کو ہے''۔۔ کیے گئے، گو ہر جگہ قبول نہیں کیے گئے۔ بیسویں صدی کی تہذیبوں میں فرد پسندی مغرب کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک تجزیے میں جس میں پچاس ممالک کے ملتے جلتے نمونے شامل کیے گئے، فرد پسندی کے اشاریے پر سب سے زیادہ سکور حاصل کرنے والے بیس ممالک میں پرتگال کے سوا تمام مغربی ممالک تھے نیز اسرائیل بھی تھا۔[۳۳] فرد پسندی اور اجتماع پسندی کے بارے میں مختلف ثقافتوں کے ایک اور سروے کے مصنف نے اسی طرح مغرب میں فرد پسندی کے مقابلے میں دوسرے خطوں میں اجتماعیت کے رجحان کو اجاگر کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ ''مغرب میں جو اقدار اہم ترین ہیں وہ پوری دنیا میں سب سے کم اہم ہیں۔'' اہلِ مغرب اور غیر مغربی بار بار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ فرد پسندی مغرب کی مرکزی امتیازی خاصیت ہے۔[۳۴]

مندرجہ بالا فہرست میں مغربی تہذیب کے تمام علیحدہ خواص نہیں گنوائے گئے، نہ ہی یہ مطلب ہے کہ یہ خواص ہمیشہ اور آفاقی طور پر مغربی معاشرے میں موجود رہے ہیں۔ یقیناً نہیں رہے: مغربی تاریخ کے بیشتر جابر حکمران مسلسل قانون کی حکمرانی کو نظر انداز اور نمائندہ اداروں کو معطل کرتے رہے، نہ ہی یہ مطلب ہے کہ ان میں سے کوئی بھی خصوصیات دوسری تہذیبوں میں ہیں ہی نہیں۔ یقیناً ہیں: قرآن اور شریعت اسلامی معاشروں کے بنیادی قوانین ہیں، جاپان اور بھارت میں جو طبقاتی نظام ہیں وہ مغرب کے متوازی ہیں (اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ یہی دو غیر مغربی معاشرے ہیں جن میں جمہوری حکومتیں کچھ عرصے سے برقرار ہیں)۔ ان عوامل میں سے کوئی بھی ایسا

نہیں جو صرف مغرب سے مخصوص ہو۔ لیکن ان کا مجموعہ مغرب سے مخصوص ہے اور اسی نے مغرب کو اس کی امتیازی خاصیت بخشی۔ یہ تصورات، رواج اور ادارے دوسری تہذیبوں کی بہ نسبت مغرب میں زیادہ عام رہے ہیں۔ یہ مغربی تہذیب کی لازمی بنیاد کا کم از کم ایک حصہ ہیں۔ مغرب میں جو کچھ مغربی ہے وہ یہی ہے، مگر جدید نہیں۔ بڑی حد تک یہ وہ عوامل ہیں جنہوں نے مغرب کو خود کو اور دنیا کو جدید بنانے میں قائد کا کردار عطا کیا۔

مغرب اور جدیدیت کے ردِعمل

مغرب کی توسیع نے غیر مغربی معاشروں میں جدیدیت اور مغربیت دونوں کو فروغ دیا۔ ان معاشروں کے سیاسی و علمی رہنماؤں نے تین طریقوں سے کسی ایک یا زائد کے ذریعے مغرب کے اثرات پر ردِعمل کا اظہار کیا: جدیدیت اور مغربیت دونوں کو مسترد کر کے، دونوں کو اپنا کر، اول الذکر کو اپنا کر لیکن ثانی الذکر کو رد کر کے۔[۳۵]

استرداد۔ جاپان نے مغرب سے ۱۵۴۲ء میں اپنے اولین رابطے سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک مسترد کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ جدیدیت کی صرف محدود شکلیں جائز قرار دی گئیں مثلاً آتشیں اسلحے کا حصول۔ مغربی ثقافت کی درآمد بشمول عیسائیت کی بہت مزاحمت کی گئی۔ سترہویں صدی کے وسط میں مغرب کے لوگوں کو بالکل نکال دیا گیا۔ استرداد کا یہ عمل ۱۸۵۴ء میں کموڈور پیری کے جاپان کے دروازے زبردستی کھولنے اور ۱۸۶۸ء میں میجی ریسٹوریشن کے بعد مغرب سے سیکھنے کی یکدم جدوجہد کے ساتھ اختتام پذیر ہو گیا۔ کئی صدیوں تک چین نے بھی جدیدیت یا مغربیت پر قدغن لگائی۔ اگرچہ ۱۶۰۱ء میں عیسائی ایلچیوں کو چین میں داخل ہونے دیا گیا تاہم ۱۷۲۲ء میں انہیں عملاً نکال دیا گیا۔ جاپان کے برخلاف چین کی استرداد کی پالیسی کی جڑیں چین کے اس امیج میں تھیں جو اس نے وسطی بادشاہت کے حوالے سے اپنے بارے میں قائم کیا ہوا تھا اور دیگر تمام اقوام کے مقابلے میں چینی اپنی ثقافت کو برتر سمجھتے تھے۔ چین کی اس علیٰحدگی کا خاتمہ مغربی اسلحے نے کیا جو ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۲ء کی جنگ افیون میں برطانویوں نے چین پر استعمال کیا۔ جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے، انیسویں صدی میں مغربی طاقت نے غیر مغربی معاشروں کے لیے خالصتاً علیٰحدگی پسندانہ راستے اختیار کرنا مشکل سے مشکل اور آخر کار ناممکن بنا دیا۔

بیسویں صدی میں نقل و حمل اور مواصلات کی ترقی اور عالمی باہمی انحصار کے باعث

علیحدگی پسندی کی راہ اختیار کرنے والوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ موجودہ دنیا میں، جو انتہائی جدید اور باہم مربوط ہوتی جا رہی ہے، جدیدیت نیز مغربیت کو مکمل طور پر مسترد کرنا بمشکل ہی ممکن ہے سوائے ان برادریوں کے جو چھوٹی، الگ تھلگ اور زندگی کی بہت بنیادی سطح پر رہنے پر آمادہ ہیں۔ ڈینیل پائپس اسلام کے بارے میں لکھتا ہے ''بہت انتہا پسند بنیاد پرست ہی جدیدیت نیز مغربیت کو مسترد کرتے ہیں۔ یہ لوگ ٹیلی وژن سیٹ دریاؤں میں پھینک دیتے ہیں، کلائی کی گھڑیوں پر پابندی لگاتے ہیں اور اندرونی احتراقی انجن کو رد کر دیتے ہیں۔ اس پروگرام کے ناقابل عمل ہونے کے باعث ان گروہوں کی کشش بہت محدود ہو جاتی ہے اور بعض صورتوں میں حکام سے تشدد آمیز ٹکراؤ میں شکست کھانے کے بعد ان گروہوں کا نام و نشان مٹ گیا جیسے کانو کا ین ازالا، سادات کے قاتل، مکہ کی مسجد کے حملہ آور اور بعض ملائشیائی دکوا گروپ''۔[۳۶] نام و نشان مٹ جانا ہی عام طور پر بیسویں صدی میں خالصتاً استرداد کی پالیسیوں کی تقدیر ہے۔ ٹائن بی کے الفاظ میں کٹر پن (zealotry) ایک قابل عمل راستہ نہیں۔

کمال ازم۔ مغرب کا ایک اور ممکنہ جواب ٹائن بی کی ہیروڈینزم☆ ہے یعنی جدیدیت اور مغربیت دونوں کو قبول کرنا۔ اس ردِ عمل کی بنیاد ان مفروضوں پر ہے کہ جدیدیت پسندیدہ اور ضروری چیز ہے، دیسی ثقافت جدیدیت سے ہم آہنگ نہیں اور اسے ترک یا منسوخ کر دینا چاہیے اور معاشرے کو کامیابی سے جدید بننے کے لیے کاملاً مغربی رنگ اپنانا چاہیے۔ جدیدیت اور مغربیت ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں اور انہیں ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کو انیسویں صدی کے اواخر کے بعض جاپانی اور چینی دانشوروں نے اپنے ان دلائل میں بیان کیا کہ جدید بننے کی خاطر ان معاشروں کو اپنی تاریخی زبانیں ترک کر دینی چاہئیں اور انگریزی کو قومی زبان کے طور پر اختیار کر لینا چاہیے۔ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ نقطہ نگاہ غیر مغربی بالائی طبقات سے زیادہ اہلِ مغرب میں مقبول رہا ہے۔ اس میں پیغام یہ ہے: ''کامیاب ہونے کے لیے تمہیں ہم جیسا ہونا چاہیے۔ ہمارا طریقہ واحد طریقہ ہے۔'' دلیل یہ ہے کہ ان [غیر مغربی] سماجوں کی مذہبی اقدار، اخلاقی مفروضات اور معاشرتی ڈھانچے صنعت کاری کی اقدار اور رواجوں کے بعض اوقات مخالف ہیں یا کم از کم ان کے لیے اجنبی ہیں۔'' پس اقتصادی ترقی کے لیے زندگی اور معاشرے کی انقلابی اور انہدامی تشکیلِ نو اور اکثر خود وجود کے معانی کی، جو ان تہذیبوں کے لوگ سمجھتے رہے ہیں، نئی توضیح کی

☆ نوٹ از مترجم: ہیروڈینزم (Herodianism)، ٹائن بی کی اصطلاح، مغلوب تہذیب کے لوگوں کا غالب تہذیب کے افراد کے رہن سہن اور طور طریقوں کو اپنانا۔

ضرورت'' ہوگی۔[۳۷] پائپس یہی بات اسلام کے واضح حوالے کے ساتھ کہتا ہے:

> معاشرتی و اخلاقی معیار کے فقدان سے بچنے کے لیے مسلمانوں کے پاس صرف ایک راستہ ہے، جدیدیت کے لیے مغربیت کی ضرورت ہے... اسلام جدید بننے کے لیے کوئی متبادل طریقہ فراہم نہیں کرتا... سیکولرزم سے گریز ممکن نہیں۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے اس فکری عمل کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہی بات سیاسی اداروں کے معاملے میں بھی ہے۔ چونکہ صورت کے ساتھ مواد کی نقل بھی لازمی ہے اس لیے مغربی تہذیب سے سیکھنے کے لیے اس کی بالادستی تسلیم کرنا ضروری ہے۔ یورپی زبانوں اور مغربی تعلیمی اداروں کے بغیر گزارہ نہیں خواہ مؤخرالذکر آزاد خیالی اور بے فکر زندگی کی حوصلہ افزائی کریں۔ مسلمان فقط اسی صورت میں تیکنیکی ترقی کر سکتے ہیں اور آگے بڑھ سکتے ہیں جب کھل کر مغربی ماڈل اپنا لیں۔[۳۸]

یہ الفاظ تحریر کیے جانے سے ساٹھ سال قبل مصطفیٰ کمال اتاترک اس سے ملتے جلتے نتائج پر پہنچے تھے۔ انہوں نے سلطنت عثمانیہ کے کھنڈرات سے ایک نیا ترکی تخلیق کیا تھا اور اسے مغربیت اور جدیدیت کے رنگ میں ڈھالنے کے لیے بڑے پیمانے پر کوششیں شروع کی تھیں۔ اس راستے پر چلنے میں اور اسلامی ماضی کو مسترد کرنے میں اتاترک نے ترکی کو ایک ''ٹوٹا پھوٹا'' ملک بنا دیا، ایک ایسا معاشرہ جو مذہب، ورثے، روایات اور رواجوں کے لحاظ سے مسلمان تھا لیکن ایک حکمراں بالائی طبقہ اسے جدید، مغربی اور مغرب کے ساتھ متحد بنانے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ بیسویں صدی کے اواخر میں متعدد ممالک کمال ازم کے راستے پر گامزن ہیں اور غیر مغربی شناخت کی جگہ مغربی شناخت اپنانے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ چھٹے باب میں ان کوششوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

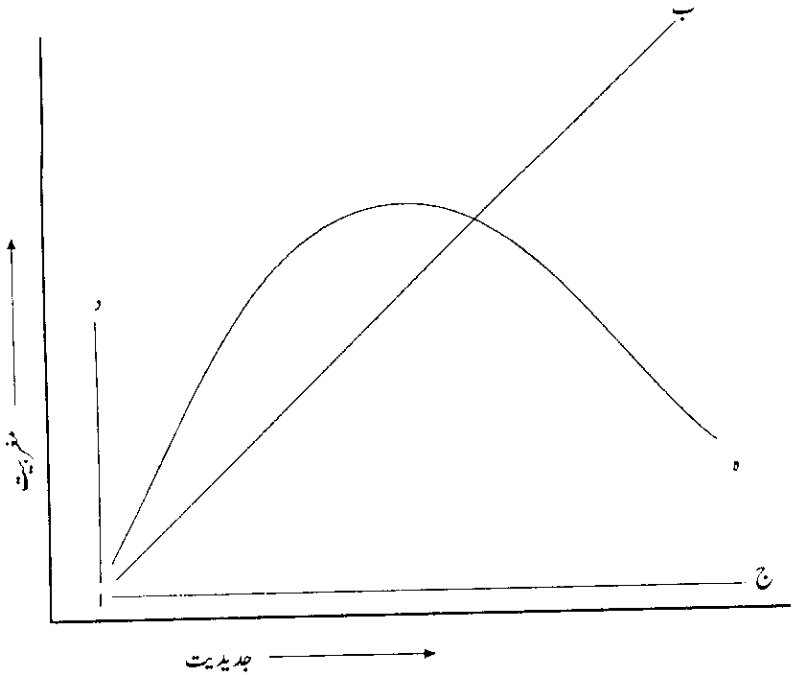
اصلاح پسندی۔ استرداد کے عمل کا مطلب ہے سکڑتی ہوئی جدید دنیا سے معاشرے کو الگ تھلگ کرنے کی ناکام کوشش کرنا۔ کمال ازم میں صدیوں سے موجود ثقافت کو تباہ کر کے اس کی جگہ بالکل نئی، کسی اور تہذیب سے درآمد شدہ ثقافت کو لایا جاتا ہے جو بہت مشکل اور دھچکا پہنچانے والا عمل ہے۔ تیسرا راستہ یہ ہے کہ جدیدیت کے ساتھ معاشرے کی مقامی ثقافت کی مرکزی اقدار، رواجوں اور اداروں کو برقرار رکھا جائے اور دونوں کو ساتھ لے کر چلا جائے۔ یہ بات قابلِ فہم ہے کہ یہ راستہ غیر مغربی اعلیٰ طبقات میں مقبول ترین رہا ہے۔ چین میں چی انگ خاندان کے آخری دور میں تی یونگ یعنی ''بنیادی اصولوں کے لیے چینی علوم، عملی استعمال کے لیے مغربی علوم'' کا نعرہ لگایا جاتا تھا۔ جاپان میں واکون، یوسی ''جاپانی روح، مغربی تیکنیک'' کا نعرہ تھا۔ مصر میں ۱۸۳۰ء میں محمد علی نے ''ضرورت سے زیادہ ثقافتی مغربیت کے بغیر تیکنیکی جدیدیت لانے کی کوشش کی۔'' تاہم یہ کوشش اس وقت ناکام ہوگئی جب برطانویوں نے محمد علی کو جدیدیت کی اپنی بیشتر

اصلاحات ترک کرنے پر مجبور کیا۔ نتیجتاً علی مزروئی کہتا ہے ''مصر کی تقدیر میں نہ جاپان کی طرح ثقافتی مغربیت کیے بغیر تیکنیکی جدیدیت لکھی تھی اور نہ اتاترک کی طرح ثقافتی مغربیت کیے ذریعے تکنیکی جدیدیت لکھی تھی''[۳۹] بہرحال انیسویں صدی کے اواخر میں جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ اور دیگر مصلحین نے اسلام اور جدیدیت کے درمیان پھر مصالحت کی کوشش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ''اسلام جدید سائنس اور مغربی فکر کے بہترین اجزا سے مطابقت'' رکھتا ہے۔ ان مصلحین نے ''جدید سائنسی، تکنیکی یا سیاسی (آئینی اور نمائندہ حکومت) خیالات اور اداروں کو قبول کرنے کے لیے اسلامی جواز'' فراہم کیا۔[۴۰] یہ وسیع پیمانے پر اصلاح تھی۔ اس کا رجحان کمال ازم کی طرف تھا جس میں نا صرف جدیدیت کو تسلیم کیا جاتا تھا بلکہ بعض مغربی اداروں کو بھی۔ اس نوعیت کی اصلاح پسندی ۱۸۷۰ء کی دہائی سے ۱۹۲۰ء کی دہائی تک یعنی پچاس برس مغرب کے بارے میں اعلیٰ مسلمان طبقات کا نمایاں ترین ردِعمل تھا۔ اس کے بعد پہلے کمال ازم اور پھر بنیاد پرستی کی شکل میں بہت خالص اصلاح پسندی نے اسے چیلنج کیا۔

استرداد، کمال ازم اور اصلاح پسندی کی بنیاد اس حوالے سے مختلف مفروضات پر ہے کہ کیا ممکن ہے اور کیا قابلِ قبول ہے۔ استرداد کے نقطہ نگاہ سے جدیدیت اور مغربیت دونوں نا قابلِ قبول ہیں اور دونوں کو مسترد کرنا ممکن ہے۔ کمال ازم کے نقطہ نظر سے جدیدیت اور مغربیت دونوں قابلِ قبول ہیں، مؤخرالذکر اس لیے کہ یہ اول الذکر کے حصول کے لیے ناگزیر ہے، اور دونوں ممکن ہیں۔ اصلاح پسندی کے نقطہ نگاہ سے جدیدیت قابلِ قبول اور زیادہ مغربیت کے بغیر ممکن ہے اور مغربیت نا قابلِ قبول ہے۔ اس طرح جدیدیت اور مغربیت کے قابلِ قبول ہونے کے بارے میں استرداد اور کمال ازم میں تنازع ہے اور اس نکتے پر کمال ازم اور اصلاح پسندی کے مابین تنازع ہے کہ مغربیت کے بغیر جدیدیت ممکن ہے کہ نہیں۔

شکل ۱ء۳ میں ان تینوں راستوں کو دکھایا گیا ہے۔ استرداد کے حامی نقطہ الف پر رہیں گے، کمال ازم والے آگے سفر کرتے ہوئے نقطہ ب کی سمت جائیں گے، اصلاح پسند افقی طور پر حرکت کرتے ہوئے نقطہ ج کی طرف بڑھیں گے۔ مگر معاشرے درحقیقت کس طرف بڑھے ہیں؟ بے شک ہر غیر مغربی معاشرے نے اپنی راہ اختیار کی ہے جو ان تینوں بنیادی راستوں سے خاصی مختلف ہو سکتی ہے۔ مزروئی تو یہاں تک کہتا ہے کہ مصر اور افریقہ نقطہ د کی طرف گئے ہیں جس میں ''تیکنیکی جدیدیت کیے بغیر ثقافتی مغربیت کے تکلیف دہ عمل'' کو اپنایا گیا ہے۔ مغرب کے بارے میں غیر مغربی معاشروں کے ردِعمل کے حوالے سے جدیدیت اور مغربیت کی جو بھی عمومی تصویر ہے وہ منحنی

شکل ۱ء۳
مغرب کے اثرات کے مختلف ردِ عمل



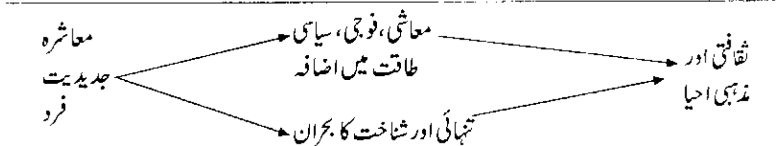
الف۔ہ سے ظاہر ہوگی۔ ابتدا میں مغربیت اور جدیدیت میں باہم قریبی رابطہ ہے جس میں غیر مغربی سماج مغربی ثقافت کے بہت سے عناصر کو جذب کرتا ہے اور جدیدیت کی جانب سست روی سے بڑھتا ہے۔لیکن جب جدیدیت کی رفتار میں اضافہ ہوتا ہے تو مغربیت کی رفتار میں کمی آجاتی ہے اور مقامی ثقافت کا احیا ہوتا ہے۔ پھر مزید جدیدیت مغرب اور غیر مغربی معاشرے کے مابین تہذیبی توازن کو بدل دیتی ہے اور دیسی ثقافت سے وابستگی مضبوط تر ہوجاتی ہے۔

اس طرح تبدیلی کے ابتدائی مراحل میں مغربیت جدیدیت کو فروغ دیتی ہے۔ بعد کے مراحل میں جدیدیت مغربیت کو کم کرنے اور مقامی ثقافت کو ابھارنے کے عمل کو دو طریقوں سے آگے بڑھاتی ہے۔ سماجی سطح پر جدیدیت کلی طور پر معاشرے کی اقتصادی، فوجی اور سیاسی طاقت میں اضافہ کرتی ہے اور اس معاشرے کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ اپنی ثقافت پر اعتماد کریں

اور ثقافتی اعتبار سے اپنا اثبات کرنے لگیں۔ انفرادی سطح پر جدیدیت روایتی بندھن اور سماجی روابط ٹوٹنے کی وجہ سے تنہائی کا احساس اور معاشرتی و اخلاقی معیار کا فقدان پیدا کرتی ہے اور شناخت کے بحرانوں کی طرف لے جاتی ہے جن کا حل مذہب فراہم کرتا ہے۔ یہ سارا عمل شکل ۲ء۳ میں سادہ انداز میں دکھایا گیا ہے۔

یہ مفروضہ عمومی ماڈل معاشرتی سائنس اور تاریخی تجربے دونوں سے ہم آہنگ ہے۔ ریز باؤم نے ''مفروضۂ عدم تغیر'' سے متعلق دستیاب شواہد کا مفصل جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''بامعنی حکومت اور بامعنی ذاتی خودمختاری کے لیے انسان کی مسلسل جدوجہد ثقافتی طور پر جداگانہ طریقوں سے واقع ہوتی ہے۔ ان معاملات میں مختلف ثقافتیں مل کر ایک ہم آہنگ دنیا تشکیل نہیں دے رہیں بلکہ ارتقا کے تاریخی اور ابتدائی جدید مراحل میں جو صورتیں بنی تھیں ان میں کوئی تبدیلی معلوم نہیں ہوتی''۔[۱۴] فروبی نیس، اسپنگلر، بوزمین اور دیگر کے بیان کردہ نظریۂ عاریت

شکل ۲ء۳
جدیدیت اور ثقافتی احیا



(borrowing theory) میں اس پہلو پر زور دیا گیا ہے کہ اثر قبول کرنے والی تہذیبیں دوسری تہذیبوں سے کس طرح مختلف چیزیں مستعار لیتی ہیں اور انہیں ڈھال کر، بدل کر اور جذب کر کے اپنی ثقافت کی اساسی اقدار کو مضبوط کرتی اور ان کے بقا کی ضمانت دیتی ہیں۔[۱۲] دنیا میں تقریباً تمام غیر مغربی تہذیبوں کا وجود کم سے کم ایک ہزار سال اور بعض کا کئی ہزار سال سے ہے۔ یہ تہذیبیں اپنی بقا کی بہتری کے لیے دوسری تہذیبوں کے اجزا مستعار لیتی رہی ہیں۔ دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان سے لیا گیا بدھ مت چین کو ہندوستانیوں جیسا بنانے میں ناکام رہا۔ چینیوں نے بدھ مت کو چینی غایات و حاجات کے مطابق ڈھال لیا۔ چینی ثقافت چینی رہی۔ اب تک چینی خود کو مسیحی بنانے کی بے پناہ مغربی کوششوں کو مسلسل شکست دے رہے ہیں۔ اگر کبھی انہوں نے عیسائیت کو درآمد کیا تو توقع ہے کہ یہ اس طرح ڈھل جائے گی اور جذب ہو جائے گی کہ چینی ثقافت کے مرکزی عناصر کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گی۔ اسی طرح مسلمان عربوں نے خالصتاً افادی مقاصد کے تحت [اپنے]

''ہیلینیائی ورثے کو وصول کیا، وقعت دی اور استعمال کیا۔ وہ بعض خارجی شکلوں اور تیکنیکی پہلوؤں کو مستعار لینے میں دلچسپی رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ یونانی جسدِ فکری کے ایسے تمام عناصر کو کس طرح مسترد کیا جائے جو ان کے بنیادی قرآنی معمولات اور تصورات میں موجود 'سچائی' سے متصادم ہیں''۔[۴۳] جاپان نے بھی یہی طرز اختیار کی۔ ساتویں صدی میں جاپان نے چینی ثقافت درآمد کی اور ''اپنے انداز میں'' بلند تہذیب کے ''اقتصادی اور فوجی دباؤ سے آزاد'' ہوکر تبدیلیاں قبول کیں۔ ''آئندہ صدیوں میں براعظمی اثرات سے نسبتاً دوری اور ازسرِنو قربت اور ثقافتی عاریت کے ادوار یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ دوری کے ادوار میں گزشتہ مستعار لیے ہوئے پہلوؤں کو چھانٹ کر مفید پہلو جذب کیے جاتے''۔[۴۴] ان تمام ادوار میں جاپانی ثقافت نے اپنا امتیازی کردار برقرار رکھا۔

کمال ازم کے استدلال کی یہ معتدل صورت کہ غیرمغربی معاشرے مغربیت اختیار کر کے جدید بن سکتے ہیں، غیر ثابت شدہ ہے۔ کمال ازم کا یہ انتہا پسندانہ استدلال کہ غیرمغربی معاشروں کو جدید بننے کے لیے مغربی بننا پڑے گا ایک آفاقی موقف کی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس سے یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے: کیا ایسے غیرمغربی سماج موجود ہیں جن میں مقامی ثقافت جدیدیت لانے کی راہ میں اتنی رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے کہ جدید بننے کے لیے اس ثقافت کی جگہ مغربی ثقافت لانی پڑے؟ نظری اعتبار سے یہ بات غالباً آلاتی (instrumental) ثقافتوں کی بہ نسبت تکمیلی (consummatory) ثقافتوں کے بارے میں زیادہ درست ہے۔ آلاتی ثقافتیں وہ ہوتی ہیں جن میں '' ثانوی مقاصد کی ایک بڑی تعداد ہوتی ہے جو حتمی مقاصد سے الگ اور آزاد'' ہوتی ہے۔ ان نظاموں میں ''روایت کی چادر کو تبدیلی کے عمل کے اوپر پھیلا کر بآسانی اختراع کرلی جاتی ہے... یہ نظام اپنے سماجی اداروں کو بنیادی طور پر تبدیل کیے بغیر اختراع کرسکتے ہیں بلکہ اختراع قدامت کے کام آتی ہے۔'' اس کے مقابلے میں تکمیلی نظاموں میں '' ثانوی و حتمی مقاصد کے مابین قریبی تعلق ہوتا ہے ... معاشرہ، ریاست، حکمراں وغیرہ سب ایک لمبے چوڑے مستقل اور ٹھوس نظام کا حصہ ہوتے ہیں جس میں مذہب ایک ادراکی رہنما کی حیثیت سے پھیلا ہوتا ہے۔ ایسے نظام اختراع کے مخالف رہے ہیں''۔[۴۵] ایپٹر نے افریقی قبائل میں تبدیلی کے عمل کا تجزیہ کرنے کے لیے اس تقسیم کو استعمال کیا ہے۔ آئزن شٹاٹ عظیم ایشیائی تہذیبوں پر اسی طرز کے تجزیے کا اطلاق کرتا ہے اور اس سے ملتے جلتے نتیجے پر پہنچتا ہے۔ اندرونی تبدیلی کے عمل کو ''معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی اداروں کی خودمختاری سے بے انتہا مدد ملتی ہے''۔[۴۶] اس سبب سے جاپانی اور ہندو معاشروں نے، جو زیادہ آلاتی تھے، کنفیوشین اور اسلامی معاشروں کی بہ نسبت جدیدیت کی طرف جلد اور زیادہ آسانی سے پیش رفت

کی۔ یہ معاشرے جدید ٹیکنالوجی درآمد کرنے اور اسے اپنی موجودہ ثقافت کو زرخیز بنانے کے لیے استعمال کرنے میں زیادہ کامیاب ہوئے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ چینی اور اسلامی معاشروں کو یا تو جدیدیت اور مغربیت دونوں کو ترک کرنا چاہیے یا دونوں کو اپنانا چاہیے؟ جو متبادل راستے دستیاب ہیں ان کی تعداد اتنی محدود نہیں۔ جاپان، سنگاپور، تائیوان، سعودی عرب اور کسی حد تک ایران کے معاشرے مغربی بنے بغیر جدید بن گئے ہیں بلکہ شاہ ایران کی کمال ازم کے راستے پر چلنے کی کوشش نے شدید مغرب مخالف ردِعمل پیدا کیا جو جدیدیت کا مخالف نہیں تھا۔ چین تو واضح طور پر اصلاح پسندی کے راستے پر گامزن ہے۔

اسلامی معاشروں کو جدید بننے میں دشواریاں پیش آئی ہیں اور پاپَس اپنے اس دعوے کی حمایت میں کہ مغربیت اختیار کرنا لازمی ہے، سود، روزے، وراثتی قوانین اور عورتوں کی ملازمت جیسے اقتصادی امور میں اسلام اور جدیدیت کے درمیان تنازعات کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن وہ بھی میکسن روڈنسن کا تعریفی انداز میں حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ''یہ مطلب لازمی طور پر نہیں نکلتا کہ مسلمانوں کے مذہب نے مسلم دنیا کو جدید سرمایہ داری کے راستے پر ترقی کرنے سے روکا'' اور یہ نکتہ پیش کرتا ہے کہ اقتصادی امور کے علاوہ بیشتر معاملات میں

> اسلام اور جدیدیت متصادم نہیں۔ متقی مسلمان سائنس کو ترقی دے سکتے ہیں، فیکٹریوں میں بخوبی کام کر سکتے ہیں یا ترقی یافتہ ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں۔ جدیدیت کے لیے کسی ایک سیاسی نظریے یا اداروں کے مجموعے کی ضرورت نہیں: انتخابات، قومی سرحدیں، شہری تنظیمیں اور مغربی زندگی کے دوسرے امتیازی خواص معاشی نمو کے لیے لازمی نہیں۔ عقیدے کی حیثیت سے اسلام مینجمنٹ کنسلٹنٹس اور کسانوں دونوں کے لیے موزوں ہے۔ جدیدیت کے ساتھ آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں شریعت کچھ نہیں کہتی، جیسے زراعت سے صنعت کی جانب، گاؤں سے شہر کی طرف یا سماجی استحکام سے سماجی بہاؤ کی طرف تبدیلی۔ نہ ہی یہ بڑے پیمانے پر تعلیم کو عام کرنے، تیز مواصلات اور نقل و حمل کی نئی شکلوں یا صحت کی نگہداشت جیسے معاملات پر اثر انداز ہوتی ہے۔[۴۷]

اسی طرح مغرب دشمنی اور مقامی ثقافتوں کے احیا کے انتہاپسند حامی بھی اپنے مقصد کے فروغ کے لیے ای میل، کیسٹ اور ٹیلی وژن استعمال کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

المختصر، جدیدیت کا لازمی مطلب مغربیت نہیں۔ غیر مغربی معاشرے اپنی ثقافتوں کو ترک کیے بغیر اور تمام مغربی اقدار، اداروں اور رواجوں کو اپنائے بغیر جدید بن سکتے ہیں اور بنے ہیں۔ مؤخرالذکر [یعنی تمام مغربی اقدار اور اداروں کو اپنانا] تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے: غیر مغربی ثقافتیں جدیدیت کی راہ میں جو رکاوٹیں ڈالتی ہیں وہ ان رکاوٹوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو وہ مغربیت

کی راہ میں ڈالتی ہیں۔ جیسا کہ براوڈل کہتا ہے، یہ سوچنا بچکانہ بات ہوگی کہ جدیدیت یا ''صیغہ واحد میں تہذیب کی فتح'' تاریخی ثقافتوں کی اس کثرت کو ختم کردے گی جو صدیوں سے دنیا کی عظیم تہذیبوں کا حصہ ہیں[۴۸] بلکہ جدیدیت ان ثقافتوں کو مضبوط تر بناتی ہے اور مقابلتاً مغرب کی قوت کو کم کرتی ہے۔ بنیادی پہلوؤں سے دنیا جدید تر اور کم مغربی ہوتی جا رہی ہے۔

حصہ دوم

تہذیبوں کا بدلتا توازن

چوتھا باب

مغرب کا زوال: طاقت، ثقافت اور مقامیانا☆

مغربی طاقت: بالا دستی اور زوال

دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں مغرب کی طاقت کے زوال کی دو تصاویر پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی تصویر یہ ہے کہ مغرب چھایا ہوا، فاتح اور کاملاً غالب ہے۔ سوویت یونین کی شکست و ریخت نے مغرب کے واحد اہم مقابل کو منظر سے ہٹا دیا اور نتیجے کے طور پر دنیا بڑے مغربی ممالک کے مقاصد، ترجیحات اور مفادات کے مطابق چل رہی ہے اور چلے گی، اور شاید جاپان سے کبھی کبھار مدد لی جاتی رہے گی۔ واحد سپر طاقت کی حیثیت سے امریکا، برطانیہ اور فرانس کے ساتھ سیاسی و سلامتی کے معاملات پر حساس فیصلے کرتا ہے؛ امریکا، جرمنی اور جاپان کے ساتھ اقتصادی امور پر اہم فیصلے کرتا ہے۔ مغرب واحد تہذیب ہے جو ہر دوسری تہذیب یا خطے میں خاصے مفادات رکھتی ہے اور ہر دوسری تہذیب یا خطے کی سیاست، اقتصادیات اور سلامتی پر اثرانداز ہونے کی اہلیت رکھتی ہے۔ دوسری تہذیبوں کے معاشروں کو اپنے مقاصد کے حصول اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے عموماً مغربی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مصنف کے پیش کردہ خلاصے کے مطابق، مغربی اقوام:

- بین الاقوامی بینکاری نظام کی مالک ہیں اور اسے چلاتی ہیں

☆ نوٹ از مترجم: مقامیانا (Indigenization) یا تحلید یا مقامیت، دیسی یا مقامی رنگ ڈھنگ اختیار کرنے کا عمل۔

- تمام ہارڈ کرنسیوں کو کنٹرول کرتی ہیں
- دنیا کی سب سے بڑی صارف ہیں
- دنیا کی زیادہ تر تیار اشیائے تجارت فراہم کرتی ہیں
- بین الاقوامی سرمایہ منڈیوں پر حاوی ہیں
- بہت سے معاشروں کے اندر خاصی حد تک اخلاقی قیادت کرتی ہیں
- بڑے پیمانے پر فوجی مداخلت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں
- بحری گزرگاہوں کو کنٹرول کرتی ہیں
- بیشتر اعلیٰ تیکنیکی تحقیق و ترقی کے کام انجام دیتی ہیں
- قائدانہ تیکنیکی تعلیم پر کنٹرول رکھتی ہیں
- خلا کی رسائی پر حاوی ہیں
- فضائی و خلائی صنعت پر حاوی ہیں
- بین الاقوامی مواصلات پر حاوی ہیں
- اعلیٰ تیکنیکی اسلحہ صنعت پر حاوی ہیں[1]

مغرب کی دوسری تصویر بہت مختلف ہے۔ اس میں ایک ایسی تہذیب دکھائی دیتی ہے جو زوال پذیر ہے، دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں عالمی سیاسی، معاشی اور فوجی قوت میں اس کا حصہ گھٹ رہا ہے۔ سرد جنگ میں مغرب کی جیت نے سرشاری نہیں، تھکاوٹ پیدا کی ہے۔ سست معاشی نمو، جمود کی شکار آبادیوں، بے روزگاری، بھاری سرکاری خساروں، زوال پذیر اخلاقیات کار (work ethic)، بچت کی کم شرحوں اور امریکا سمیت بہت سے ممالک میں معاشرتی ٹوٹ پھوٹ، منشیات اور جرائم کی وجہ سے مغرب اپنے اندرونی مسائل میں الجھتا جا رہا ہے۔ اقتصادی قوت تیزی سے مشرقی ایشیا منتقل ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ فوجی قوت اور سیاسی اثر و رسوخ بھی منتقل ہو رہا ہے۔ بھارت معاشی اڑان شروع کرنے کے لیے پر تول رہا ہے اور اسلامی دنیا میں مغرب کے خلاف جذبات بڑھ رہے ہیں۔ مغرب کے احکامات کی تعمیل کرنے یا اس کے وعظوں پر عمل کرنے کے سلسلے میں دوسرے معاشروں کی آمادگی تیزی سے ختم ہو رہی ہے اور اسی طرح مغرب کی خود اعتمادی اور غلبے کا عزم بھی۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے اواخر میں امریکا کے زوال کے نظریے پر بہت بحث مباحثہ کیا گیا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں ایک متوازن تجزیہ اس سے ملتے جلتے نتیجے پر پہنچا:

> بیشتر اہم پہلوؤں سے اس کی [امریکا کی] تقابلی طاقت تیزی سے زوال پذیر ہوگی۔ خام معاشی

صلاحیتوں کے حوالے سے امریکا کی پوزیشن جاپان اور آخر کار چین کے مقابلے میں مزید کم ہونے کا امکان ہے۔ فوجی شعبے میں امریکا اور کئی بڑھتی ہوئی علاقائی طاقتوں (جس میں شاید ایران، بھارت اور چین شامل ہیں) کی مؤثر صلاحیتوں کا توازن مرکز سے گردوپیش کی طرف چلا جائے گا۔ امریکا کی کچھ ڈھانچا جاتی طاقت دوسری اقوام کو منتقل ہو جائے گی۔ کچھ (اور اس میں سے کچھ نرم طاقت بھی) غیر ریاستی کرداروں مثلاً کثیر قومی کارپوریشنوں کو مل جائے گی۔[۲]

دنیا میں مغرب کے مقام کے بارے میں ان دو مخالف تصویروں میں سے کون سی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے؟ بلاشبہ جواب یہ ہے کہ دونوں کرتی ہیں۔ مغرب اس وقت انتہائی بالادست ہے اور اکیسویں صدی میں بھی خاصے عرصے طاقت اور اثرورسوخ کے اعتبار سے پہلے نمبر پر رہے گا۔ بہرحال تہذیبوں کے مابین طاقت کے توازن میں رفتہ رفتہ، بے رحم اور بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں مغرب کی طاقت زوال پذیر ہونے لگی ہے۔ مغرب کی اولیت کم ہونے کے ساتھ اس کی زیادہ تر طاقت تو بخارات بن کر اڑ جائے گی اور بقیہ علاقائی بنیادوں پر کئی بڑی اہم تہذیبوں اور ان کی مرکزی ریاستوں کے درمیان بٹ جائے گی۔ سب سے زیادہ اضافہ ایشیائی تہذیبوں کی طاقت میں ہو رہا ہے اور ہوگا، اور سب سے زیادہ امکان یہ ہے کہ چین عالمی اثرورسوخ کے معاملے میں مغرب کو چیلنج کرنے والا معاشرہ ہوگا۔ تہذیبوں کے درمیان طاقت کی یہ تبدیلی غیر مغربی معاشروں کے احیا اور ثقافتی اثبات نیز مغربی ثقافت کو مسترد کرنے کے عمل کو بڑھا رہا ہے اور بڑھائے گا۔

مغرب کے زوال کی تین اہم خصوصیات ہیں۔

اول، یہ ایک سست عمل ہے۔ مغربی طاقت کے عروج میں چار سو سال لگے۔ اس کے زوال میں بھی اتنا ہی عرصہ لگ سکتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں ممتاز برطانوی دانشور ہیڈلے بل نے کہا تھا کہ ''پورے بین الاقوامی سماج پر یورپی یا مغربی غلبہ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ نقطہ عروج پر پہنچا''۔[۳] اسپینگلر کی پہلی کتاب ۱۹۱۸ء میں آئی اور بیسویں صدی کی تاریخ کی کتابوں میں ''زوالِ مغرب'' مرکزی خیال رہا ہے۔ یہ عمل اس صدی کے زیادہ تر عرصے کے دوران طویل تر ہوتا گیا ہے۔ لیکن اس میں تیزی آسکتی ہے۔ کسی ملک کی معاشی نمو اور دیگر صلاحیتوں میں اضافہ اکثر S منحنی کی شکل میں ہوتا ہے: آہستہ آغاز پھر تیزی اور اس کے بعد توسیع کی رفتار میں کمی اور یکسانی۔ ملکوں کا زوال بھی الٹے S منحنی کی شکل میں ہوسکتا ہے جیسے سوویت یونین میں ہوا: پہلے کم کم پھر تیز اور آخر میں خاتمہ۔ مغرب کا زوال ابھی تک پہلے مرحلے میں ہے لیکن کسی وقت ڈرامائی انداز میں تیز ہوسکتا ہے۔

دوم، زوال خطِ مستقیم میں نہیں ہوتا۔ یہ بہت بے قاعدہ ہے۔ اس میں وقفے اور مراجعت کے

ادوار آئیں گے اور مغرب کی جانب سے اپنی کمزوریاں ظاہر ہونے پر طاقت کے اثبات کے مظاہرے ہوں گے۔ مغرب کے کھلے جمہوری معاشروں میں احیا کی زبردست صلاحیتیں ہیں۔ علاوہ ازیں بیشتر دیگر تہذیبوں کے برخلاف مغرب میں طاقت کے دو بڑے مراکز ہیں۔ بل نے ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ جس زوال کا ذکر کیا ہے وہ دراصل مغربی طاقت کے یورپی جز کا زوال تھا۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۴۵ء تک یورپ اندر سے منقسم تھا اور اپنے داخلی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۴۰ء کے عشرے میں مغربی طاقت کی بالادستی کا امریکی دور شروع ہوا اور ۱۹۴۵ء میں امریکا کچھ عرصے کے لیے دنیا پر اسی طرح چھا گیا جیسے ۱۹۱۸ء میں اتحادی طاقتیں چھائی ہوئی تھیں۔ جنگ کے بعد نوآبادیوں کے خاتمے نے یورپی اثرات کو مزید کم کیا مگر امریکا کے اثرات کم نہیں ہوئے اور اس نے روایتی مقبوضاتی سلطنت کی بجائے ایک نئی بالاقوی (transnational) سامراجیت کی ابتدا کی۔ بہرحال سرد جنگ کے دوران سوویت یونین فوجی طاقت میں امریکا کی ٹکر پر تھا اور جاپان کے مقابلے میں امریکا کی اقتصادی طاقت کم ہوگئی۔ تاہم فوجی و اقتصادی طاقت کی بحالی کی کوششیں بھی وقتاً فوقتاً ہوئیں۔ ۱۹۹۱ء میں ایک اور ممتاز برطانوی اسکالر بیری بوزن نے کہا کہ ''عمیق تر حقیقت یہ ہے کہ جب سے نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کا عمل شروع ہوا ہے، مرکز کا غلبہ اور گردوپیش کی مغلوبیت کبھی اتنی نہ تھی جتنی اب ہے''۔[۴] لیکن اس خیال کی صحت دھندلا رہی ہے کیونکہ جس فوجی فتح نے اسے جنم دیا تھا وہ بھی دھندلا کر تاریخ کا حصہ بنتی جارہی ہے۔

سوم، طاقت کا مطلب ہے کسی فرد یا گروہ کی کسی اور فرد یا گروہ کا طرزِ عمل بدلنے کی اہلیت۔ طرزِ عمل ترغیب، جبر یا نصیحت و فہمائش سے بدلا جاسکتا ہے جس کے لیے طاقت استعمال کرنے والے کے پاس معاشی، فوجی، ادارہ جاتی، آبادیاتی، سیاسی، تیکنیکی، سماجی یا دیگر وسائل ہونا ضروری ہیں۔ چنانچہ کسی ریاست یا گروہ کی طاقت کا اندازہ دوسری ریاستوں یا گروہوں کے مقابلے میں، جن پر وہ اثرانداز ہونے کی کوشش کررہا ہو، اس کے وسائل دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مغرب کے قبضے میں طاقت کے اہم وسائل کا بیشتر حصہ تھا مگر تمام نہیں۔ اس کے بعد دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں اس میں زوال آنے لگا۔

مقبوضہ علاقے اور آبادی۔ ۱۴۹۰ء میں مغربی معاشرے بلقان کے باہر یورپی جزیرہ نما کے بیشتر حصے پر قابض تھے جو پوری دنیا (انٹارکٹیکا چھوڑ کر) کے زمینی رقبے سوا پانچ کروڑ مربع میل میں سے شاید ۱۵ لاکھ مربع میل بنتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اپنی علاقائی توسیع کے عروج پر مغرب دو کروڑ

۵۵ لاکھ مربع میل یا تقریباً آدھی زمین پر قابض تھا۔ ۱۹۹۳ء تک یہ قبضہ نصف ہو کر لگ بھگ ایک کروڑ ۲۷ لاکھ مربع میل رہ گیا تھا۔ مغرب کے زیرِ قبضہ زمین پھر اتنی رہ گئی جو اس کے اصل یورپی علاقے نیز شمالی امریکا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں وسیع آباد کاروں کی زمینوں پر مشتمل تھی۔ اس کے مقابلے میں آزاد اسلامی ممالک کے مقبوضہ علاقے ۱۹۲۰ء میں ۱۸ لاکھ مربع میل سے بڑھ کر ۱۹۹۳ء میں ایک کروڑ دس لاکھ مربع میل سے زائد ہو گئے۔ آبادی پر کنٹرول میں بھی اسی طرح کی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ۱۹۰۰ء میں مغربی باشندے دنیا کی آبادی کا تقریباً ۳۰ فیصد تھے اور مغربی حکومتیں اُس وقت اس آبادی کے لگ بھگ ۴۵ فیصد پر اور ۱۹۲۰ء میں ۴۸ فیصد پر حکمراں تھیں۔ ۱۹۹۳ء میں ہانگ کانگ جیسے کچھ بچے کھچے چھوٹے سامراجی علاقوں کو چھوڑ کر مغربی حکومتیں مغربی باشندوں کے سوا کسی پر حکمرانی نہیں کر رہی تھیں۔ مغربی باشندے نوعِ انسانی کے ۱۳ فیصد سے

جدول ۱ء۴

تہذیبوں کے سیاسی مقبوضات، ۱۹۰۰ء تا ۱۹۹۳ء

سال	مغربی	افریقی	چینی	ہندو	اسلامی	جاپانی	لاطینی امریکی	آرتھوڈوکس	دیگر
مقبوضات کے اوسط تخمینے، ہزار مربع میل									
۱۹۰۰	۲۰،۲۹۰	۱۶۴	۴،۳۱۷	۵۴	۳،۵۹۲	۱۶۱	۷،۷۲۱	۸،۷۳۳	۷،۴۶۸
۱۹۲۰	۲۵،۴۴۷	۴۰۰	۳،۹۱۳	۵۴	۱،۸۱۱	۲۶۱	۸،۰۹۸	۱۰،۲۵۸	۲،۲۵۸
۱۹۷۱	۱۲،۸۰۶	۴،۶۳۶	۳،۹۳۶	۱،۳۱۶	۹،۱۸۳	۱۴۲	۷،۸۳۳	۱۰،۳۴۶	۲،۳۰۲
۱۹۹۳	۱۲،۷۱۱	۵،۶۸۲	۳،۹۲۳	۱،۲۷۹	۱۱،۰۵۴	۱۴۵	۷،۸۱۹	۷،۱۶۹	۲،۷۱۸
عالمی مقبوضات کے تخمینے فیصدی تناسب میں*									
۱۹۰۰	۳۸٫۷	۰٫۳	۸٫۲	۰٫۱	۶٫۸	۰٫۳	۱۴٫۷	۱۶٫۶	۱۴٫۳
۱۹۲۰	۴۸٫۵	۰٫۸	۷٫۵	۰٫۱	۳٫۵	۰٫۵	۱۵٫۴	۱۹٫۵	۴٫۳
۱۹۷۱	۲۴٫۴	۸٫۸	۷٫۵	۲٫۵	۱۷٫۵	۰٫۳	۱۴٫۹	۱۹٫۷	۴٫۴
۱۹۹۳	۲۴٫۲	۱۰٫۸	۷٫۵	۲٫۴	۲۱٫۱	۰٫۳	۱۴٫۹	۱۳٫۷	۵٫۲

نوٹ: عالمی مقبوضات مذکورہ برسوں میں ممالک کی سرحدوں کے مطابق ہیں۔

*سوا پانچ کروڑ مربع میل عالمی علاقے میں انٹارکٹیکا شامل نہیں۔

ماخذ: Statesman's Year-Book (نیویارک: سینٹ مارٹنز پریس، ۱۹۰۱ء تا ۱۹۲۷ء)؛ World Book Atlas (شکاگو: فیلڈ انٹرپرائزز ایجوکیشنل کارپوریشن، ۱۹۷۰ء)؛ Britannica Book of the Year (شکاگو: انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا، انکارپوریٹیڈ، ۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۴ء)۔

جدول ۲ء۴
دُنیا کی بڑی تہذیبوں سے متعلق ممالک کی آبادی، ۱۹۹۳ء (ہزاروں میں)

صینی	۱،۳۴۰،۹۰۰	لاطینی امریکی	۵۰۷،۵۰۰
اسلامی	۹۲۷،۶۰۰	افریقی	۳۹۲،۱۰۰
ہندو	۹۱۵،۸۰۰	آرتھوڈوکس	۲۶۱،۳۰۰
مغربی	۸۰۵،۴۰۰	جاپانی	۱۲۴،۷۰۰

ماخذ: Encyclopedia Britannica, 1994 Book of the Year (شکاگو: انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا، ۱۹۹۴ء) صفحات ۷۶۴ تا ۷۶۹ پر دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق۔

تھوڑے سے زیادہ تھے اور اگلی صدی کے اوائل میں ان کا تناسب گر کر ۱۱ فیصد اور ۲۰۲۵ء تک ۱۰ فیصد رہ جائے گا۔[۵] مجموعی آبادی کے حوالے سے ۱۹۹۳ء میں مغرب، صینی، اسلامی اور ہندو تہذیبوں کے بعد چوتھے نمبر پر تھا۔

پس مقداری اعتبار سے اہلِ مغرب دنیا کی آبادی کی گھٹتی ہوئی اقلیت ہیں۔ معیاری اعتبار سے بھی مغرب اور دوسری آبادیوں کے مابین توازن بدل رہا ہے۔ غیر مغربی اقوام زیادہ صحت مند، زیادہ شہری اور زیادہ خواندہ، بہتر تعلیم یافتہ ہوتی جارہی ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل تک لاطینی امریکا، افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، جنوبی ایشیا، مشرقی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں شیرخوار بچوں کی شرحِ اموات کم ہوکر تیس سال پہلے کی شرح کے ایک تہائی سے نصف کے درمیان رہ گئی۔ ان خطوں میں عمر کا تناسب خاصا بڑھا ہے۔ افریقہ میں اس میں گیارہ برس اور مشرقی ایشیا میں تیئس برس کا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں تیسری دنیا کے بیشتر حصے میں ایک تہائی سے بھی کم بالغ آبادی خواندہ تھی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں افریقہ کے سوا بہت کم ممالک میں نصف سے کم آبادی خواندہ تھی۔ لگ بھگ پچاس فیصد بھارتی اور ۷۵ فیصد چینی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں ترقی پذیر ممالک میں شرحِ خواندگی اوسطاً ترقی یافتہ ممالک کا ۴۱ فیصد تھی؛ ۱۹۹۲ء میں ۷۱ فیصد ہوگئی۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل میں سوائے افریقہ کے ہر خطے میں پرائمری تعلیم کے لائق تقریباً پورا ایج گروپ اسکولوں میں داخل تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اوائل میں ایشیا، لاطینی امریکا، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ میں ثانوی تعلیم کے لائق ایج گروپ کا ایک تہائی اسکولوں میں داخل تھا؛ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل تک افریقہ کے سوا اس ایج گروپ کا نصف اسکولوں میں داخل تھا۔ ۱۹۶۰ء میں شہری مکین کم ترقی یافتہ دنیا کی آبادی کے ایک چوتھائی سے بھی کم تھے۔ ۱۹۶۰ء

اور ۱۹۹۲ء کے درمیان اس آبادی کا شہری تناسب لاطینی امریکا میں ۴۹ سے بڑھ کر ۷۳ فیصد، عرب ملکوں میں ۳۴ سے بڑھ کر ۵۵ فیصد، افریقہ میں ۱۴ سے بڑھ کر ۲۹ فیصد، چین میں ۱۸ سے بڑھ کر ۲۷ فیصد اور بھارت میں ۱۹ سے بڑھ کر ۲۶ فیصد ہو گیا۔[۶]

خواندگی، تعلیم اور شہری آبادی کی شرحوں میں ان تبدیلیوں نے معاشرتی لحاظ سے متحرک آبادیوں کو جنم دیا جن کی صلاحیتیں زیادہ تھیں اور توقعات بلند تھیں اور جنہیں سیاسی مقاصد کے لیے جس طرح سرگرم بنایا جاسکتا تھا اس طرح ناخواندہ کسانوں کو نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ معاشرتی طور پر متحرک معاشرے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں ۱۵ فیصد سے کم ایرانی خواندہ اور ۱۷ فیصد سے کم شہری تھے۔ کرمٹ، روزویلٹ اور سی آئی اے کے چند جاسوسوں نے کافی آسانی سے ایک شورش دبا دی اور شاہ کو اس کے تخت پر بحال کر دیا۔ ۱۹۷۹ء میں جب ۵۰ فیصد ایرانی خواندہ تھے اور

جدول ۳ء۴

تہذیبوں کے زیر اقتدار عالمی آبادی کے تناسب، ۱۹۰۰ء تا ۲۰۲۵ء (فیصد میں)

سال	[مجموعی عالمی آبادی]*	مغربی	افریقی	چینی	ہندو	اسلامی	جاپانی	لاطینی امریکی	آرتھوڈوکس	دیگر
۱۹۰۰	[۱٫۶]	۴۴٫۳	۰٫۴	۱۹٫۳	۰٫۳	۴٫۲	۳٫۵	۳٫۲	۸٫۵	۱۶٫۳
۱۹۲۰	[۱٫۹]	۴۸٫۱	۰٫۷	۱۷٫۳	۰٫۳	۲٫۴	۴٫۱	۴٫۶	۱۳٫۹	۸٫۶
۱۹۷۱	[۳٫۷]	۱۴٫۴	۵٫۶	۲۲٫۸	۱۵٫۲	۱۳٫۰	۲٫۸	۸٫۴	۱۰٫۰	۵٫۵
۱۹۹۰	[۵٫۳]	۱۴٫۷	۸٫۲	۲۴٫۳	۱۶٫۳	۱۳٫۴	۲٫۳	۹٫۲	۶٫۵	۵٫۱
۱۹۹۵	[۵٫۸]	۱۳٫۱	۹٫۵	۲۴٫۰	۱۶٫۴	۱۵٫۹†	۲٫۲	۹٫۳	۶٫۱‡	۳٫۵
۲۰۱۰	[۷٫۲]	۱۱٫۵	۱۱٫۷	۲۲٫۳	۱۷٫۱	۱۷٫۹†	۱٫۸	۱۰٫۳	۵٫۴‡	۲٫۰
۲۰۲۵	[۸٫۵]	۱۰٫۱	۱۴٫۴	۲۱٫۰	۱۶٫۹	۱۹٫۲†	۱٫۵	۹٫۲	۴٫۹‡	۲٫۸

نوٹ: عالمی مقبوضات مذکورہ برسوں میں ممالک کی سرحدوں کے مطابق ہیں۔

* عالمی آبادی کا تخمینہ اربوں میں۔

† تخمینوں میں آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ کے ارکان یا بوسنیا شامل نہیں۔

‡ تخمینوں میں آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ، جارجیا اور سابق یوگوسلاویہ شامل نہیں۔

ماخذ: اقوام متحدہ، آبادی ڈویژن، اقتصادی و معاشرتی معلومات اور پالیسیوں کے تجزیے کا شعبہ *World Population Prospects, The 1992 Revision* (نیویارک: اقوام متحدہ، ۱۹۹۲ء)؛ *Statesman's Year-Book* (نیویارک: سینٹ مارٹنز پریس، ۱۹۰۱ء تا ۱۹۲۷ء)؛ *World Almanac and Book of Facts* (نیویارک: پریس پبلی کیشنز کمپنی، ۱۹۷۰ء تا ۱۹۹۳ء)

۷۴ فیصد شہروں میں رہتے تھے، امریکا جتنی بھی فوجی طاقت استعمال کر لیتا، شاہ کو اس کے تخت پر برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب بھی ایک طرف چینیوں، بھارتیوں، عربوں اور دوسری طرف افریقیوں اور مغربی باشندوں، جاپانیوں اور روسیوں کے درمیان خاصا فرق ہے لیکن یہ فرق تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی ایک مختلف فرق پیدا ہو رہا ہے۔ مغربی باشندوں، جاپانیوں اور روسیوں کی اوسط عمریں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتی جا رہی ہیں اور آبادی کا بڑا حصہ جواب کام نہیں کرتا اُن افراد پر بوجھ بڑھا رہا ہے جو ابھی تک کام کر کے پیداوار میں اضافہ کر رہا ہے۔ دوسری تہذیبوں پر بچوں کی بڑی تعداد کا بوجھ ہے مگر بچے مستقبل کے کارکن اور فوجی ہوتے ہیں۔

معاشی پیداوار۔ عالمی معاشی پیداوار میں مغرب کا حصہ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں عروج پر رہا ہوگا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سے واضح طور پر گھٹتا نظر آ رہا ہے۔ ۱۷۵۰ء میں دنیا کی مصنوعات کی پیداوار کا تقریباً ایک تہائی چین، ایک چوتھائی بھارت اور بیس فیصد سے بھی کم مغرب کے حصے میں آتا تھا۔ ۱۸۳۰ء تک مغرب چین سے تھوڑا سا آگے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد کی

جدول ۴ء۴
عالمی مصنوعاتی پیداوار میں حصہ بلحاظ تہذیب یا ملک، ۱۷۵۰ء تا ۱۹۸۰ء

(فیصد میں، دُنیا = ۱۰۰ فیصد)

ملک	۱۷۵۰	۱۸۰۰	۱۸۳۰	۱۸۶۰	۱۸۸۰	۱۹۰۰	۱۹۱۳	۱۹۲۸	۱۹۳۸	۱۹۵۳	۱۹۶۳	۱۹۷۳	۱۹۸۰
مغرب	۱۸٫۲	۲۳٫۳	۳۱٫۱	۵۳٫۷	۶۸٫۸	۷۷٫۴	۸۱٫۶	۸۴٫۲	۷۸٫۶	۷۴٫۶	۶۵٫۴	۶۱٫۲	۵۷٫۸
چین	۳۲٫۸	۳۳٫۳	۲۹٫۸	۱۹٫۷	۱۲٫۵	۶٫۲	۳٫۶	۳٫۴	۳٫۱	۲٫۳	۳٫۵	۳٫۹	۵٫۰
جاپان	۳٫۸	۳٫۵	۲٫۸	۲٫۶	۲٫۴	۲٫۴	۲٫۷	۳٫۳	۵٫۲	۲٫۹	۵٫۱	۸٫۸	۹٫۱
بھارت/ پاکستان	۲۴٫۵	۱۹٫۷	۱۷٫۶	۸٫۶	۲٫۸	۱٫۷	۱٫۴	۱٫۹	۲٫۴	۱٫۷	۱٫۸	۲٫۱	۲٫۳
روس/ یو ایس ایس آر*	۵٫۰	۵٫۶	۵٫۶	۷٫۰	۷٫۶	۸٫۸	۸٫۲	۵٫۳	۹٫۰	۱۶٫۰	۲۰٫۹	۲۰٫۱	۲۱٫۱
برازیل اور میکسیکو	—	—	—	۰٫۸	۰٫۶	۰٫۷	۰٫۸	۰٫۸	۰٫۸	۰٫۹	۱٫۲	۱٫۶	۲٫۲
دیگر	۱۵٫۷	۱۴٫۶	۱۳٫۱	۷٫۶	۵٫۳	۲٫۸	۱٫۷	۱٫۱	۰٫۹	۱٫۶	۲٫۱	۲٫۳	۲٫۵

* سرد جنگ کے دور کے معاہدہ وارسا کے ممالک شامل ہیں۔

ماخذ: پال بیروچ "International Industrialization Levels from 1750 to 1980," *Journal of European Economic History* ۱۱، (خزاں ۱۹۸۲ء)، صفحات ۲۶۹ تا ۳۳۴۔

جدول ۵ء۴
عالمی مجموعی اقتصادی پیداوار میں تہذیبوں کا حصہ، ۱۹۵۰ء تا ۱۹۹۲ء (فیصد میں)

سال	مغربی	افریقی	صینی	ہندو	اسلامی	جاپانی	لاطینی امریکی	آرتھوڈوکس*	دیگر+
۱۹۵۰	۶۴٫۱	۰٫۲	۳٫۳	۳٫۸	۲٫۹	۳٫۱	۵٫۶	۱۶٫۰	۱٫۰
۱۹۷۰	۵۳٫۴	۱٫۷	۴٫۸	۳٫۰	۴٫۶	۷٫۸	۶٫۲	۱۷٫۴	۱٫۱
۱۹۸۰	۴۸٫۶	۲٫۰	۶٫۴	۲٫۷	۶٫۳	۸٫۵	۷٫۷	۱۶٫۴	۱٫۴
۱۹۹۲	۴۸٫۹	۲٫۱	۱۰٫۰	۳٫۵	۱۱٫۰	۸٫۰	۸٫۳	۶٫۲	۲٫۰

* آرتھوڈوکس کے ۱۹۹۲ء کے تخمینے میں سابق سوویت یونین اور سابق یوگوسلاویہ شامل ہیں۔

+ ''دیگر'' میں دوسری تہذیبیں اور معمولی تخمینی فرق شامل ہیں۔

ماخذ: ۱۹۵۰ء، ۱۹۷۰ء، ۱۹۸۰ء کے فیصدی تناسب ہربرٹ بلاک کی The Planetary Product in 1980: A Creative Pause (واشنگٹن ڈی سی: بیوریو آف پبلک افیئرز، امریکی محکمہ خارجہ، ۱۹۸۱ء)، صفحات: ۳۰ تا ۴۵ پر مذکور معلومات سے نکالے گئے ہیں۔ ۱۹۹۲ء کے فیصدی تناسب World Development Report 1994 (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۴ء) سے نکالے گئے ہیں۔

دہائیوں میں، جیسا کہ بیروک نے نشاندہی کی ہے، مغرب میں صنعت کاری بقیہ دنیا کو صنعت کاری کے خاتمے کی طرف لے گئی۔ ۱۹۱۳ء میں غیر مغربی ممالک کی مصنوعات کی پیداوار ۱۸۰۰ء کی پیداوار کا دوتہائی رہ گئی۔ مغرب کے حصے میں اضافہ انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر ڈرامائی انداز میں بڑھا اور ۱۹۲۸ء میں عالمی مصنوعاتی پیداوار کا ۸۴٫۲ ہو گیا جو نقطہ عروج تھا۔ اس کے بعد مغرب کا حصہ کم ہونے لگا کیونکہ اس کی شرحِ نمو معمولی رہی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد کم صنعتی ممالک نے اپنی پیداوار میں اضافہ کیا۔ ۱۹۸۰ء تک عالمی مصنوعاتی پیداوار میں مغرب کا حصہ ۵۷٫۸ فیصد تھا۔ یہ لگ بھگ اتنا تھا جو ۱۲۰ سال قبل ۱۸۶۰ء کی دہائی میں تھا۔[۲]

جنگ عظیم دوم سے پہلے کی مجموعی معاشی پیداوار کے بارے میں معتبر اعداد و شمار دستیاب نہیں۔ بہر حال ۱۹۵۰ء میں مغرب کی مجموعی پیداوار عالمی پیداوار کا لگ بھگ ۶۴ فیصد تھی؛ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک یہ تناسب گر کر ۴۹ فیصد رہ گیا۔ (دیکھیے جدول ۵ء۴) ۲۰۱۳ء تک ایک تخمینے کے مطابق عالمی پیداوار میں مغرب کا حصہ ۳۰ فیصد ہوگا۔ ایک اور تخمینے کے مطابق ۱۹۹۱ء میں دنیا کی سات بڑی معیشتوں میں سے چار غیر مغربی ممالک سے تعلق رکھتی تھیں: جاپان (دوسرے نمبر پر)، چین (تیسرا)، روس (چھٹا) اور بھارت (ساتواں)۔ ۱۹۹۲ء میں دنیا کی سب سے بڑی معیشت امریکا کی

تھی اور دس سب سے بڑی معیشتوں میں پانچ مغربی ممالک کے علاوہ پانچ دوسری تہذیبوں کے صف اول کے ممالک، چین، جاپان، بھارت، روس اور برازیل کی معیشتیں شامل تھیں۔ قابل یقین تخمینوں کے مطابق ۲۰۲۰ء میں پانچ سب سے بڑی معیشتیں پانچ مختلف تہذیبوں سے متعلق ہوں گی۔ بلاشبہ مغرب کا زوال بڑی حد تک مشرقی ایشیا کے تیزی سے عروج کی بنا پر ہو رہا ہے۔[8]

اقتصادی پیداوار کے بارے میں مجموعی اعداد و شمار سے معیار کے حوالے سے مغرب کی برتری جزواً چھپ جاتی ہے۔ مغرب اور جاپان ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کی صنعتوں پر تقریباً مکمل طور پر چھائے ہوئے ہیں لیکن ٹیکنالوجی دنیا میں پھیل رہی ہے اور اگر مغرب اپنی برتری قائم رکھنا چاہتا ہے تو اس پھیلاؤ کو کم سے کم کرنے کے لیے جو کچھ کرسکتا ہے کرے گا۔ بہرحال مغرب نے جو باہم مربوط دنیا پیدا کی ہے اس کی وجہ سے دوسری تہذیبوں تک ٹیکنالوجی پہنچنے سے روکنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔ اب ایسا کوئی ایک، بڑا اور سب کا متفقہ خطرہ بھی موجود نہیں جو سرد جنگ کے دوران تھا اور جس سے ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کو روکنے میں تھوڑی بہت کامیابی ہو رہی تھی۔

غالب امکان اس بات کا ہے کہ تاریخ کے بیشتر ادوار میں چین دنیا کی سب سے بڑی معیشت رہا ہوگا۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں غیر مغربی معاشروں تک ٹیکنالوجی کے نفوذ اور ان کی معاشی ترقی سے وہی تاریخی صورتحال دوبارہ جنم لے رہی ہے۔ یہ عمل سست ہوگا لیکن اگر پہلے نہیں تو، اکیسویں صدی کے وسط تک، صف اول کی تہذیبوں میں معاشی اور مصنوعات کی پیداوار کی تقسیم ۱۸۰۰ء سے مشابہ ہو جانے کا امکان ہے۔ عالمی معیشت کے سمندر پر دو سو سال کے لیے جو مغربی بلبلہ نمودار ہوا تھا وہ پھوٹ جائے گا۔

فوجی صلاحیت۔ فوجی طاقت کی چار جہتیں ہیں: مقداری -- جوانوں، ہتھیاروں اور آلات کی تعداد اور وسائل؛ تیکنیکی -- اسلحے اور ساز و سامان کا معیار؛ تنظیمی -- فوجیوں کا ارتباط، نظم و ضبط، تربیت اور حوصلہ اور کمانڈ اینڈ کنٹرول کے نظام کا مؤثر ہونا؛ اور معاشرتی -- سماج کے اندر فوجی قوت کو استعمال کرنے کی اہلیت اور آمادگی۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں مغرب ان تمام حوالوں سے ہر ایک سے آگے تھا۔ اس کے بعد کے برسوں میں دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں مغرب کی فوجی قوت کم ہوئی ہے۔ یہ کمی فوجی عملے کے بدلتے ہوئے توازن میں ظاہر ہوتی ہے جو فوجی اہلیت کا ایک پیمانہ ہے، گو بے شک اہم ترین پیمانہ نہیں۔ جدیدیت اور اقتصادی ترقی نے ریاستوں میں وسائل پیدا کیے ہیں اور ساتھ ہی فوجی صلاحیتیں بڑھانے کی خواہش کو جنم دیا ہے اور بہت کم ریاستیں ہیں جو ایسا نہیں کر پا رہیں۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں جاپان اور سوویت یونین نے بہت طاقتور افواج بنائیں جیسا

جدول ٦ء۴
عالمی فوجی افرادی قوت میں تہذیبوں کا حصہ (فیصد میں)

سال	[عالمی مجموعی افرادی قوت]	مغربی	افریقی	چینی	ہندو	اسلامی	جاپانی	لاطینی امریکی	آرتھوڈوکس	دیگر
۱۹۰۰	[۱۰،۰۸٦]	۴۳٫۷	۱٫٦	۱۰٫۰	۰٫۴	۱٦٫۷	۱٫۸	۹٫۴	۱٦٫٦	۰٫۱
۱۹۲۰	[۸،٦۴۵]	۴۸٫۵	۳٫۸	۱۷٫۴	۰٫۴	۳٫٦	۲٫۹	۱۰٫۲	۱۲٫۸*	۰٫۵
۱۹۷۰	[۲۳،۹۹۱]	۲٦٫۸	۲٫۱	۲۴٫۷	٦٫٦	۱۰٫۴	۰٫۳	۴٫۰	۲۵٫۱	۲٫۳
۱۹۹۱	[۲۵،۷۹۷]	۲۱٫۱	۳٫۴	۲۵٫۷	۴٫۸	۲۰٫۰	۱٫۰	٦٫۳	۱۴٫۳	۳٫۵

نوٹ: تخمینے مذکورہ برسوں میں ملکی حدود کے مطابق ہیں۔ مجموعی عالمی افرادی قوت ہزاروں میں۔

*اس میں سوویت یونین کا جو حصہ شامل ہے وہ ۱۹۲۴ء کے اس تخمینے کے مطابق ہے جو جے ایم میکنتوش نے بی ایچ لڈل ہارٹ کی The Red Army: The Red Army—1918 to 1945, The Soviet Army—1946 to present (نیویارک: ہارکورٹ، بریس، ۱۹۵٦ء) میں لگایا ہے۔

ماخذ: یو ایس آرمز کنٹرول اینڈ ڈس آرمامنٹ ایجنسی World Military Expenditures and Arms Transfers (واشنگٹن ڈی سی: دی ایجنسی، ۱۹۷۱ء تا ۱۹۹۴ء)؛ Statesman's Year-Book (نیویارک: سینٹ مارٹنز پریس، ۱۹۰۱ء تا ۱۹۲۷ء)۔

کہ دوسری جنگ عظیم میں ثابت ہوا۔ سرد جنگ کے دوران دنیا کی دو طاقتور ترین افواج میں سے ایک سوویت یونین کے پاس تھی۔ فی الوقت دنیا میں کسی بھی مقام پر بھاری روایتی افواج تعینات کرنے کی صلاحیت صرف مغرب کو حاصل ہے۔ یہ بات غیر یقینی ہے کہ یہ صلاحیت برقرار رہے گی یا نہیں۔ بہرحال یہ خاصا یقینی ہے کہ کوئی غیر مغربی ریاست یا ریاستوں کا گروہ آنے والی دہائیوں میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں کر سکے گا۔

مجموعی طور پر سرد جنگ کے بعد کے زمانے میں عالمی فوجی صلاحیتوں کے ارتقا میں پانچ بڑے رجحانات غالب رہے ہیں۔

اول، سوویت یونین کا وجود ختم ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد اس کی مسلح افواج کا وجود بھی ختم ہو گیا۔ روس کے علاوہ صرف یوکرین کو بڑی مقدار میں فوجی صلاحیتیں ورثے میں ملیں۔ روسی افواج کی تعداد بے حد کم کر دی گئی اور وسطی یورپ اور بالٹک ریاستوں سے فوج ہٹا لی گئی۔ معاہدۂ وارسا ختم ہو گیا۔ امریکی بحریہ کو چیلنج کرنے کا ہدف ترک کر دیا گیا۔ فوجی سازوسامان کو ٹھکانے لگا دیا گیا یا خراب ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور وہ بے کار ہو گیا۔ دفاع کا بجٹ بے انتہا کم کر دیا گیا۔ افسران

اور جوانوں دونوں کی صفوں میں حوصلے کا فقدان تھا۔ ساتھ ہی روسی فوج اپنے مشنوں اور نظریات کا ازسرِ نوتعین کر رہی تھی اور روسیوں کی حفاظت کرنے اور ''قریب بیرون ملک'' میں علاقائی تنازعات سے نمٹنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔

دوم، روس کی فوجی صلاحیتوں میں یکدم کمی سے مغربی دفاعی اخراجات، افواج اور صلاحیتوں میں سست رفتار مگر اہم زوال آنے لگا۔ بش اور کلنٹن حکومتوں کے منصوبوں کے تحت امریکی فوجی اخراجات ۱۹۹۰ء میں ۳ء ۳۴۲ارب ڈالر (۱۹۹۴ء کے ڈالر میں) سے ۳۵ فیصد گھٹ کر ۱۹۹۸ء میں ۳ء ۲۲۲ارب ڈالر ہو جائیں گے۔ اس سال فوج کا ڈھانچا سرد جنگ کے مقابلے میں نصف تا دوتہائی رہ جائے گا۔ مجموعی فوجی عملہ ۲۱ لاکھ سے کم ہوکر ۱۴ لاکھ رہ جائے گا۔ بہت سے اسلحہ پروگرام منسوخ کر دیے گئے ہیں یا کیے جا رہے ہیں۔ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۵ء کے درمیان بڑے ہتھیاروں کی سالانہ خریداری ۲۹ بحری جہازوں سے کم ہوکر چھ، ۹۴۳ طیاروں سے کم ہوکر ۱۲۷، ۷۲۰ ٹینکوں سے کم ہوکر صفر، اور ۴۸ اسٹرے ٹجک میزائلوں سے کم ہوکر ۱۸ رہ گئی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں کمی کا سلسلہ شروع ہوا تو برطانیہ، جرمنی اور کسی حد تک فرانس نے دفاعی اخراجات اور فوجی صلاحیتوں میں اسی طرح کی کمی کر لی۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے وسط میں جرمن مسلح افواج کو تین لاکھ ۷۰ ہزار سے کم کر کے تین لاکھ ۴۰ ہزار بلکہ غالباً تین لاکھ ۲۰ ہزار کر دینے کا پروگرام تھا؛ فرانسیسی بری فوج کو ۱۹۹۰ء میں دو لاکھ ۹۰ ہزار کی نفری سے گھٹا کر ۱۹۹۷ء میں سوا دو لاکھ کیا جانا تھا۔ برطانوی فوجی عملہ ۱۹۸۵ء میں تین لاکھ ۷۷ ہزار ۱۰۰ سے کم ہوکر ۱۹۹۳ء میں دو لاکھ ۷۴ ہزار ۸۰۰ رہ گیا۔ نیٹو کے یورپی ارکان نے بھی جبری فوجی ملازمت کی میعاد مختصر کر دی اور جبری بھرتی کو ختم کرنے کے امکان پر بحث و مباحثہ شروع کیا۔

سوم، مشرقی ایشیا میں روس اور مغرب سے بالکل مختلف رجحانات دیکھنے میں آئے۔ اس خطے میں فوجی اخراجات اور افواج میں بہتری کی کوششیں جاری تھیں۔ چین آگے آگے تھا۔ اپنی روزافزوں معاشی دولت اور چینی قوت میں اضافے سے تحریک پا کر دوسری مشرقی ایشیائی اقوام بھی اپنی افواج کو جدید خطوط پر استوار کر رہی ہیں اور ان میں توسیع کر رہی ہیں۔ جاپان نے اپنی ترقی یافتہ فوجی طاقت میں اضافہ جاری رکھا ہے، تائیوان، جنوبی کوریا، تھائی لینڈ، ملائشیا، سنگاپور اور انڈونیشیا سب کے سب اپنی افواج پر زیادہ سے زیادہ اخراجات کر رہے ہیں اور روس، امریکا، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دوسرے ممالک سے طیارے، ٹینک اور بحری جہاز خرید رہے ہیں۔ نیٹو کے دفاعی اخراجات ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۳ء کے درمیان لگ بھگ دس فیصد کم ہوئے (۶ء۵۳۹ارب ڈالر سے ۰۰ء۴۸۵ارب

(مستقل امریکی ڈالر) تو مشرقی ایشیا میں یہ اخراجات اسی عرصے کے دوران ۸ء ۸۹ ارب ڈالر سے ۵۰ فیصد بڑھ کر ۸ء ۱۳۴ ارب ڈالر ہو گئے۔[9]

چہارم، بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں سمیت فوجی صلاحیتیں دنیا میں پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ جیسے جیسے ممالک اقتصادی لحاظ سے ترقی کر رہے ہیں، ان میں ہتھیار بنانے کی صلاحیت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۰ کی دہائیوں کے درمیان لڑاکا طیارے بنانے والے تیسری دنیا کے ملکوں کی تعداد ایک سے بڑھ کر آٹھ، ٹینک بنانے والوں کی ایک سے چھ، ہیلی کاپٹر بنانے والوں کی ایک سے چھ اور تزویراتی (tactical) میزائل بنانے والوں کی صفر سے سات ہو گئی۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں یہ واضح رجحان دیکھنے میں آیا ہے کہ دفاعی صنعت عالمگیر ہوتی جا رہی ہے جس سے مغربی فوجی برتری مزید کم ہونے کا امکان ہے۔[10] بیشتر غیر مغربی معاشروں کے پاس یا تو جوہری ہتھیار ہیں (روس، چین، اسرائیل، بھارت، پاکستان اور ممکنہ طور پر شمالی کوریا) یا وہ ان ہتھیاروں کے حصول کے لیے سخت جدوجہد کر رہے ہیں (ایران، عراق، لیبیا اور ممکنہ طور پر الجزائر) یا پھر خود کو اس پوزیشن میں لا رہے ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو فوراً یہ ہتھیار حاصل کر لیں (جاپان)۔

آخراً، ان تمام تبدیلیوں کے باعث مابعد سرد جنگ کی دنیا میں عسکری حکمت عملی اور طاقت کے معاملے میں علاقائیت مرکزی رجحان بن گیا ہے۔ روسی اور مغربی افواج میں کمی اور دوسری ریاستوں کی فوجوں میں اضافے کا جواز علاقائیت ہی ہے۔ روس کو اب عالمی سطح پر فوجی صلاحیت حاصل نہیں لیکن وہ اپنے آس پاس کے علاقے میں عسکری حکمت عملی اور افواج پر توجہ دے رہا ہے۔ چین نے اپنی عسکری حکمت عملی اور افواج کی اس طرح تنظیم نو کی ہے کہ مقامی طاقت کی حیثیت سے وہ نمایاں ہو اور مشرقی ایشیا میں چینی مفادات کا دفاع ہو سکے۔ یورپی ممالک بھی اسی طرح نیٹو اور مغربی یورپی یونین کے توسط سے اپنی افواج کو نئی جہت دے رہے ہیں تاکہ مغربی یورپ کے گردوپیش میں عدم استحکام سے نمٹ سکیں۔ امریکا نے اپنی فوجی منصوبہ بندی میں تبدیلی کی ہے اور عالمی بنیادوں پر سوویت یونین کی مزاحمت اور اس سے لڑنے کی بجائے خلیج فارس اور شمال مشرقی ایشیا میں علاقائی ہنگامی معاملات سے نمٹنے پر توجہ مرکوز کر دی ہے۔ لیکن امریکا میں ان اہداف کے حصول کے لیے فوجی صلاحیت نہیں ہوگی۔ عراق کو شکست دینے کے لیے امریکا نے خلیج فارس میں اپنے ۷۵ فیصد فعال تزویراتی طیارے، ۴۲ فیصد جدید لڑاکا ٹینک، ۴۶ فیصد طیارہ بردار بحری جہاز، ۳۷ فیصد بری فوجی عملہ اور ۴۶ فیصد بحری عملہ تعینات کر دیا تھا۔ افواج میں بہت کمی کے باعث مستقبل میں امریکا کے لیے مغربی نصف کرے کے باہر طاقتور علاقائی ملکوں کے خلاف مداخلت کی ایک کارروائی

انجام دینا بھی مشکل ہوگا اور دو کارروائیاں کرنا مشکل تر ہوگا۔ پوری دنیا میں فوجی تحفظ کا انحصار اب طاقت کی عالمی تقسیم اور سپر طاقتوں کی کارروائیوں کی بجائے دنیا کے ہر خطے کے اندر طاقت کی تقسیم اور تہذیبوں کی اہم ترین ریاستوں کی کارروائیوں پر ہوتا جا رہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر اکیسویں صدی کے شروع کے عشروں میں مغرب کی طاقتورترین تہذیب کی حیثیت قائم رہے گی۔ اس کے بعد بھی وہ غالباً سائنسی صلاحیت، تحقیق و ترقی کی اہلیت اور سویلین و فوجی تیکنیکی اختراعات کے حوالے سے خاصا آگے رہے گا۔ تاہم طاقت کے دوسرے وسائل پر اس کا قبضہ غیر مغربی تہذیبوں کے اہم ترین اور نمایاں ممالک کو منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ان وسائل پر مغربی قبضہ نقطہ عروج پر تھا اور تب سے بے قاعدگی سے مگر واضح طور پر کم ہوتا رہا ہے۔ ۲۰۲۰ء میں اس نقطہ عروج کے سو سال بعد مغرب کے زیر قبضہ علاقے (عروج پر ۴۹ فیصد سے گھٹ کر) دنیا کی زمین کا تقریباً ۲۴ فیصد، اس کی آبادی (۴۸ فیصد سے کم ہو کر) عالمی آبادی کا ۱۰ فیصد اور سماجی اعتبار سے متحرک آبادی کا شاید ۱۵ سے ۲۰ فیصد رہ جائے گی۔ مغرب کی معاشی پیداوار (عروج پر غالباً ۷۰ فیصد سے کم ہو کر) عالمی پیداوار کا لگ بھگ ۳۰ فیصد رہ جائے گی اور مصنوعاتی پیداوار (عروج پر ۸۴ فیصد سے کم ہو کر) شاید ۲۵ فیصد رہ جائے گی جبکہ فوجی افرادی قوت (۴۵ فیصد سے گھٹ کر) دنیا کے ۱۰ فیصد سے بھی کم رہ جائے گی۔

۱۹۱۹ء میں وڈرو ولسن، لائیڈ جارج اور ژارژ کلیمنشو، مل کر پوری دنیا پر تقریباً قابض تھے۔ پیرس میں بیٹھ کر انہوں نے طے کیا کہ کن ملکوں کا وجود ہوگا کن کا نہیں، کون سے نئے ممالک تخلیق کیے جائیں گے، ان کی سرحدیں کیا ہوں گی اور ان پر کون حکومت کرے گا اور مشرقِ وسطیٰ اور دنیا کے دوسرے خطوں کو فاتح طاقتوں میں کیسے بانٹا جائے گا۔ انہوں نے روس میں فوجی مداخلت اور چین سے معاشی رعایات حاصل کرنے کے بارے میں بھی فیصلے کیے۔ سو سال بعد سیاستدانوں کا کوئی بھی چھوٹا گروپ اس درجے کی طاقت کا حامل نہیں ہوگا اور اگر ہوا بھی تو یہ گروپ تین مغربی باشندوں پر نہیں، دنیا کی سات یا آٹھ بڑی تہذیبوں کی اہم ترین ریاستوں کے رہنماؤں پر مشتمل ہوگا۔ ریگن، تھیچر، متراں اور کوہل کے جانشین ڈینگ زیاؤ پنگ، ناکاسونے، اندرا گاندھی، یلسن، خمینی اور سوہارتو کے جانشینوں کے حریف ہوں گے۔ مغربی بالادستی کا زمانہ ختم ہو جائے گا۔ اس دوران مغرب کا زوال اور طاقت کے دوسرے مراکز کا عروج عالمی سطح پر مقامیت اور غیر مغربی ثقافتوں کے دوبارہ ابھرنے کے عمل کو فروغ دے رہا ہے۔

مقامیانا: غیر مغربی ثقافتوں کا احیا

دنیا میں ثقافتوں کی تقسیم طاقت کی تقسیم کی عکاسی کرتی ہے۔ تجارت پرچم کی تقلید کرے یا نہ کرے لیکن ثقافت ہمیشہ طاقت کی تقلید کرتی ہے۔ تمام تاریخ میں کسی تہذیب کی طاقت میں توسیع کے ساتھ ساتھ عموماً اس کی ثقافت بھی پھلی پھولی ہے اور تقریباً ہمیشہ اس طاقت کو اقدار، رواجوں اور اداروں کو دوسرے معاشروں میں پھیلانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ آفاقی تہذیب کے لیے آفاقی طاقت درکار ہوتی ہے۔ رومی طاقت نے کلاسیکی دنیا کی حدوں کے اندر تقریباً آفاقی تہذیب تخلیق کی۔ انیسویں صدی میں یورپی نوآبادیاتی نظام اور بیسویں صدی میں امریکی بالادستی کی شکل میں مغربی طاقت نے مغربی ثقافت کو بیشتر ہم عصر دنیا میں پھیلا دیا۔ یورپی نوآبادیاتی نظام ختم ہو چکا ہے اور امریکی بالادستی کم ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے مقامی، تاریخی جڑیں رکھنے والی اخلاقیات، زبانیں، عقائد اور ادارے پھر اپنا اثبات کر رہے ہیں، مغربی ثقافت مٹتی جا رہی ہے۔ جدیدیت کے طفیل غیر مغربی معاشروں کی روز افزوں طاقت ساری دنیا میں غیر مغربی ثقافتوں کے احیا کا سبب بن رہی ہے۔☆

جوزف نائے کے مطابق معاشی و فوجی قوت پر منحصر ''سخت طاقت'' اور ''نرم طاقت'' کے درمیان فرق ہے۔ نرم طاقت کا مطلب ہے اپنی ثقافت اور نظریات کی کشش کے ذریعے دوسرے ممالک کو وہ چاہنے پر آمادہ کرنے کی صلاحیت جو کوئی ریاست خود چاہتی ہو۔ جیسا کہ نائے تسلیم کرتا ہے دنیا میں سخت طاقت کی تقسیم کا عمل واقع ہو رہا ہے اور بڑی اقوام ''ماضی کے مقابلے میں روایتی طاقت کے وسائل کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پہلے جیسی کامیابی سے استعمال نہیں کر پا رہی ہیں۔'' نائے مزید کہتا ہے کہ اگر ریاست کی ''ثقافت اور نظریات پرکشش ہوں تو دوسرے'' اس کی قیادت ''قبول کرنے پر زیادہ آمادہ ہوں گے، اس لیے نرم طاقت بھی ''اتنی ہی اہم ہے جتنی سخت طاقت۔''[11] مگر ثقافت اور نظریات کو کونسی چیز پرکشش بناتی ہے؟ یہ اس وقت پرکشش ہوتے ہیں جب ان کی جڑیں مادی کامیابی اور اثر ورسوخ میں دیکھی جاتی ہیں۔ نرم طاقت اسی صورت میں طاقت ہوتی ہے جب اس کی اساس سخت طاقت پر ہو۔ سخت معاشی و فوجی طاقت میں اضافے سے

☆ آفاقی تہذیب کے ابھرنے کی بات کرنے والے اور جدیدیت کو مغربیت سے مشروط کرنے والے تقریباً سبھی لوگوں نے طاقت اور ثقافت کے مابین تعلق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ لوگ یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ ان کی منطق دنیا میں مغربی غلبے میں توسیع اور اسے مضبوط تر بنانے کی حمایت پر مجبور کرتی ہے اور اگر دوسرے ساجوں کو اپنی تقدیریں خود بنانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ پرانے عقائد، عادات اور رواجوں کو زندہ کر دیں گے جو، آفاقیت پسندوں کے مطابق، ترقی کے دشمن ہیں۔ بہر حال جو لوگ آفاقی تہذیب کے فضائل کے قائل ہیں آفاقی سلطنت کی خوبیوں کی بات نہیں کرتے۔

خوداعتمادی، غرور اور دوسری اقوام کے مقابلے میں اپنی ثقافت یا نرم طاقت کی برتری پر یقین بڑھ جاتا ہے اور دوسری اقوام کے لیے اس کی کشش میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ معاشی اور فوجی طاقت میں کمی خود پر شبہے، شناخت کے بحران اور دوسری ثقافتوں میں معاشی، فوجی اور سیاسی کامیابی تلاش کرنے کی کوششوں کی جانب مائل کرتی ہے۔ جیسے جیسے غیر مغربی معاشرے اپنی اقتصادی، فوجی اور سیاسی وسعت میں اضافہ کرر ہے ہیں، وہ اپنی اقدار، اداروں اور ثقافت کی خوبیوں کا زیادہ سے زیادہ ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں جب کمیونسٹ نظریے کو سوویت یونین کی معاشی کامیابی اور فوجی قوت سے منسلک کیا گیا تو اس نے پوری دنیا میں لوگوں کو متاثر کیا۔ سوویت معیشت میں جمود آیا اور وہ سوویت فوجی طاقت کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی تو یہ کشش ختم ہوگئی۔ مغربی اقدار اور ادارے دوسری ثقافتوں کے لوگوں کو پرکشش لگتے رہے ہیں کیونکہ انہیں مغربی طاقت اور دولت کا ذریعہ سمجھا گیا۔ یہ عمل صدیوں سے جاری ہے۔ جیسا کہ ولیم مک نیل نے نشاندہی کی ہے، ۱۰۰۰ء اور ۱۳۰۰ء کے درمیان عیسائیت، رومی قانون اور مغربی ثقافت کے دوسرے عناصر کو ہنگری، پولینڈ اور لیتھوینیا کے لوگوں نے اختیار کیا اور ''مغربی تہذیب کی اس مقبولیت کا محرک مغربی حکمرانوں کی فوجی قوت سے خوف اور پسندیدگی کے ملے جلے جذبات تھے''۔[۱۲] مغربی طاقت کے زوال کے ساتھ مغرب کی اپنے انسانی حقوق، حریت فکر وعمل اور جمہوریت کے تصورات کو دوسری تہذیبوں پر ٹھونسنے کی صلاحیت بھی زوال پذیر ہورہی ہے اور دوسری تہذیبوں کے لیے ان اقدار کی کشش بھی ختم ہورہی ہے۔

ایسا ہو چکا ہے۔ کئی صدیوں تک غیر مغربی اقوام مغربی معاشروں کی معاشی خوشحالی، تیکنیکی ترقی، فوجی طاقت اور سیاسی ہم آہنگی پر رشک کرتی رہیں۔ انہوں نے اس کامیابی کا راز مغربی اقدار اور اداروں میں تلاش کیا اور جب انہوں نے اپنی دانست میں وہ کلید ڈھونڈ لی تو اسے اپنے معاشروں میں لاگو کرنے کی کوشش کی۔ امیر اور طاقتور بننے کے لیے انہیں مغرب جیسا بننا تھا۔ بہرحال اب یہ کمال ازم والے رویے مشرقی ایشیا میں غائب ہوگئے ہیں۔ مشرقی ایشیائی لوگ اپنی ڈرامائی معاشی کامیابی کو مغربی ثقافت کی درآمد سے منسلک نہیں کرتے بلکہ خود اپنی ثقافت سے وابستہ رہنے سے جوڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اس لیے کامیاب ہورہے ہیں کہ وہ مغرب سے مختلف ہیں۔ اسی طرح جب غیر مغربی معاشرے مغرب کے مقابلے میں خود کو کمزور محسوس کرتے تھے تو مغربی غلبے سے اپنی مخالفت کا جواز پیش کرنے کے لیے خود ارادیت، لبرل ازم، جمہوریت اور آزادی کی مغربی اقدار اپناتے تھے۔ اب جبکہ وہ کمزور نہیں رہے بلکہ طاقتور بنتے جارہے ہیں، وہ انہی اقدار

پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے جنہیں وہ پہلے اپنے مفادات کے فروغ کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مغرب سے مخالفت کا جواز پہلے مغربی اقدار کی آفاقیت کا اثبات کر کے کیا گیا؛ اب غیر مغربی اقدار کی برتری کا اثبات کر کے کیا جاتا ہے۔

ان رویوں کے ابھرنے کو رونلڈ ڈور کے الفاظ میں ''دوسری پیڑھی کا مقامیت کا مظہر'' کہا جا سکتا ہے۔ سابق مغربی نوآبادیوں اور چین اور جاپان جیسے آزاد ممالک دونوں میں ''پہلی 'جدید بننے والی' یا 'مابعد آزادی' کی پیڑھی نے اکثر غیر ملکی (مغربی) جامعات میں مغربی عالمگیر زبان میں تربیت پائی۔ بیرونِ ملک جاتے وقت چونکہ وہ کچے ذہنوں والے نوجوان تھے جزواً اسی لیے انہوں نے مغربی اقدار اور طرزِ حیات کو بہت زیادہ جذب کیا۔'' اس کے مقابلے میں ان سے کہیں بڑی دوسری پیڑھی اپنے ملک کی پہلی پیڑھی کی قائم کردہ جامعات میں تعلیم حاصل کر رہی ہے اور پڑھائی میں نوآبادیاتی زبان کی بجائے مقامی زبان کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔'' ان جامعات میں ''عالمگیر شہری ثقافت سے بہت کم ربط ضبط ہوتا ہے'' اور ''ترجمے کے ذریعے جو عموماً محدود نوعیت اور ناقص معیار کا ہوتا ہے، علم کو مقامی رنگ میں ڈھالا جاتا ہے۔'' ان جامعات کے فارغ التحصیل افراد پرانی مغربی تعلیم یافتہ پیڑھی کے غلبے کو ناپسند کرتے ہیں اور اکثر ''مقامیت پسند حزب اختلاف کی تحریکوں کی کشش کے اسیر ہو جاتے ہیں''۔[۳۱] مغربی اثرات کم ہو رہے ہیں اس لیے ابھرتے ہوئے نوجوان رہنما طاقت اور دولت کے حصول کے لیے مغرب کی طرف نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں کامیابی کے ذرائع اپنے ہی معاشرے میں تلاش کرنے ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہیں اپنی اقدار اور ثقافت سے مطابقت پیدا کرنی ہوتی ہے۔

مقامیت کے اس عمل کے شروع ہونے کے لیے دوسری پیڑھی کا انتظار ضروری نہیں۔ پہلی پیڑھی کے لائق، دور رس نگاہ کے حامل اور ڈھل جانے والے رہنما خود بھی مقامی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ تین نمایاں مثالیں محمد علی جناح، ہیری لی اور سولومن بندرانائیکے کی ہیں۔ یہ اوکسفرڈ، کیمبرج اور لنکنز ان کے قابل سند یافتگان تھے، زبردست وکلا تھے اور اپنے معاشروں کے مکمل مغربی رنگ میں رنگے ہوئے اعلیٰ طبقات کے ارکان تھے۔ جناح سیکولرزم سے پوری وابستگی رکھتے تھے۔ لی، ایک برطانوی وزیر کے الفاظ میں ''سوئز کے مشرق کی جانب بہترین بلڈی انگریز'' تھے۔ بندرانائیکے کی پرورش عیسائی کے طور پر ہوئی تھی۔ لیکن اپنی قوم کو آزادی کی منزل کی طرف لے جانے اور آزادی کے بعد رہنمائی کرنے کے لیے انہیں دیسی بننا پڑا۔ یہ لوگ اپنی آبائی ثقافتوں کی طرف لوٹ گئے اور اس عمل کے دوران بعض اوقات شناخت، نام، لباس اور عقائد بدل لیے۔ انگریز وکیل ایم اے جناح پاکستان کے قائد اعظم بن گئے۔ ہیری لی، لی کوآن یو بن گئے۔ سیکولر جناح اسلام کو

پاکستان کی ریاست کی بنیاد بنانے کے لیے سرگرم ہوگئے۔ انگریز زدہ لی نے مینڈارین سیکھ لی اور کنفیوشنزم کی ترویج کے لیے سرگرم ہوگئے۔ عیسائی بندرانائیکے نے بدھ مت اختیار کرلیا اور سنہالی قوم پرستی کی بات کرنے لگیں۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں تمام غیر مغربی دنیا میں مقامیت کا چرچا رہا ہے۔ اسلام کا احیا اور ''ری اسلامائزیشن'' مسلمان معاشروں کے مرکزی تصورات ہیں۔ بھارت میں مغربی طور طریقوں اور اقدار کو مسترد کرنے کا رجحان اور سیاست اور معاشرے پر ''ہندوائیزیشن'' غالب ہے۔ مشرقی ایشیا میں حکومتیں کنفیوشنزم کو فروغ دے رہی ہیں اور سیاسی اور دانشور رہنما اپنے ممالک کی ''ایشیائیزیشن'' کی بات کرتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں جاپان کو ''نی ہون جن رون یا جاپان اور جاپانی کے نظریے'' کا خبط سا ہوگیا۔ بعد میں جاپان کے صف اول کے ایک دانشور نے کہا کہ تاریخی اعتبار سے جاپان ''بیرونی ثقافتوں کی درآمد'' اور ''نقل و تطہیر کے ذریعے ان ثقافتوں کو مقامی رنگ میں ڈھالنے کے ادوار سے گزرتا رہا ہے، درآمدی اور تخلیقی چشمے خشک ہوجانے کے باعث ناگزیر طور پر گڑبڑ پیدا ہوئی ہے اور بالآخر بیرونی دنیا کے دروازے دوبارہ کھولے جانے کا عمل ہوا ہے۔'' آج کل جاپان ''اس دور کے دوسرے مرحلے سے گزر رہا ہے''[۱۴] سرد جنگ کے خاتمے پر روس پھر ایک ''منقسم'' ملک بن گیا اور مغرب پسندوں اور سلاف پسندوں کے مابین کلاسیکی لڑائی پھر چھڑ گئی۔ بہر حال ایک عشرے تک رجحان اول الذکر سے مؤخر الذکر کی طرف تھا۔ مغربی رنگ میں رنگے ہوئے گورباچیف کی جگہ یلسن نے لی جو انداز میں روسی اور عقائد میں مغربی تھی جن کو قوم پرستوں نے چیلنج کیا جو روسی آرتھوڈوکس دیسی پن کا نمونہ تھے۔

جمہوریت کے تضاد سے مقامیت کو فروغ ملتا ہے: غیر مغربی معاشروں کے مغربی جمہوری اداروں کو اپنانے سے مقامی اور مغرب دشمن سیاسی تحریکوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ اقتدار تک رسائی حاصل کرلیتی ہیں۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں ترقی پذیر ملکوں میں مغربیت اختیار کرنے والی اور مغرب کی حامی حکومتوں کو انقلابات کے خطرات درپیش تھے؛ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں انہیں انتخابات کے ذریعے برطرفی کا خطرہ ہے۔ جمہوریت اختیار کرنا مغربیت اختیار کرنے کے عمل سے متصادم ہے اور جمہوریت داخلی طور پر عالمگیریت کی بجائے تنگ نظری پیدا کرنے والا عمل ہے۔ غیر مغربی معاشروں میں سیاستداں یہ ثابت کرکے انتخابات نہیں جیتتے کہ وہ کتنے مغربی ہیں۔ انتخابی مقابلہ انہیں وہ انداز اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے جو ان کے خیال میں سب سے مقبول ہو اور یہ عموماً نسلی، قوم پرستانہ اور مذہبی نوعیت کے انداز ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ مغربی تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ اعلیٰ طبقات کے خلاف عوامی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان ممالک میں جو تھوڑے بہت انتخابات ہوئے ہیں ان میں مسلمان بنیاد پرستوں کی اچھی کارکردگی رہی ہے اور الجزائر میں وہ برسر اقتدار آ جاتے اگر فوج نے ۱۹۹۲ء کے انتخابات منسوخ نہ کر دیے ہوتے۔ بھارت میں انتخابی مسابقت نے فرقہ وارانہ نعروں اور تشدد کی حوصلہ افزائی کی ہے۔[15] سری لنکا میں جمہوریت کی وجہ سے ۱۹۵۶ء میں سری لنکا فریڈم پارٹی اونچے طبقے کی مغرب زدہ یونائیٹڈ نیشنل پارٹی سے اقتدار چھیننے میں کامیاب ہوگئی اور ۱۹۸۰ء کے عشرے میں پاتھیکا چنتانایا سنہالی قوم پرست تحریک کو ابھرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۹ء سے قبل جنوبی افریقہ اور مغرب دونوں کے اعلیٰ طبقے جنوبی افریقہ کو مغربی ریاست سمجھتے تھے۔ نسل پرست حکومت آئی تو مغربی اعلیٰ طبقات نے جنوبی افریقہ کو مغربی کیمپ سے باہر خیال کرنا شروع کر دیا جبکہ جنوبی افریقہ والے خود کو مغربی ہی سمجھتے رہے۔ بہرکیف بین الاقوامی مغربی نظام میں اپنا مقام بحال کرنے کے لیے انہیں مغربی جمہوری ادارے متعارف کرانے پڑے جس کے نتیجے میں ایک بہت مغرب پسند سیاہ فام اعلیٰ طبقہ اقتدار میں آ گیا۔ لیکن اگر دوسری پیڑھی کے دیسی بننے کا عمل شروع ہوا تو ان کے جانشین کوسا، زولو اور افریقی ہوں گے اور جنوبی افریقہ خود کو افریقی ریاست کی حیثیت سے شناخت کرے گا۔

انیسویں صدی سے پہلے مختلف ادوار میں بازنطینی، عرب، چینی، عثمانی، مغل اور روسی مغرب کے مقابلے میں اپنی قوت اور کارناموں کے بارے میں بے حد پر اعتماد تھے۔ اُن زمانوں میں وہ مغرب کی ثقافتی کمتری، اداروں کی پسماندگی، بدعنوانی اور اخلاق کی پستی کو بھی حقارت سے دیکھتے تھے۔ مغرب کی کامیابی ماند پڑنے کے ساتھ یہ رویے دوبارہ سامنے آ رہے ہیں۔ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ''انہیں مزید برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔'' ایران کی مثال اس کی ایک انتہا ہے، لیکن جیسا کہ ایک مبصر نے کہا ''مغربی اقدار مختلف انداز میں لیکن اتنے ہی زور و شور سے ملائشیا، انڈونیشیا، سنگاپور، چین اور جاپان میں مسترد کی جا رہی ہیں۔''[16] ہم مغربی نظریات سے مغلوب ''ترقی پسندانہ دور کا اختتام'' دیکھ رہے ہیں اور اس دور میں قدم رکھ رہے ہیں جس میں متعدد اور متنوع تہذیبیں آپس میں روابط رکھیں گی، مقابلہ کریں گی اور بقائے باہمی کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے گنجائش پیدا کریں گی۔[17] مقامیت کا یہ عالمی عمل دنیا کے بہت سے علاقوں میں مذہب کے احیا خصوصاً ایشیائی اور اسلامی ملکوں میں ثقافتوں کے دوبارہ ابھرنے میں عیاں ہے جس کا سبب معاشی اور شرح آبادی کے حوالوں سے ان کی سرگرمیاں ہیں۔

خدائی انتقام

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں دانشور طبقوں نے بالعموم یہ فرض کرلیا کہ معاشی و معاشرتی جدیدیت وجودِ انسانی میں مذہب کے عنصر رفتہ رفتہ مٹا رہی ہے۔ اس مفروضے پر انہیں بھی یقین تھا جو اس رجحان کو پسند کرتے تھے اور انہیں بھی جو اس کی مذمت کرتے تھے۔ ادہام، اساطیر، عدم معقولیت اور موجودہ مذاہب کے مغز کی حیثیت رکھنے والی رسومات سائنس، عقلیت اور عملیت پسندی کے نتیجے میں جس حد تک بھی ختم ہورہی تھیں اسے جدیدیت پسند سیکولر افراد نے سراہا۔ نیا ابھرتا ہوا معاشرہ روادار، معقول، عملیت پسند، ترقی پسند، انسان دوست اور سیکولر ہوگا۔ دوسری طرف قدامت پسندوں نے مذہبی عقائد، مذہبی اداروں اور انفرادی و اجتماعی انسانی برتاؤ کے لیے مذہب کی فراہم کردہ اخلاقی رہنمائی کے ختم ہونے کے سنگین نتائج سے خبردار کیا۔ اس کا آخری نتیجہ طوائف الملوکی، گراوٹ اور مہذب زندگی کی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا کہ ''اگر خدا نہیں ہوگا (اور وہ ایک حاسد خدا ہے) تو آپ کو ہٹلر یا اسٹالن کو جھک کر سلام کرنا پڑے گا۔''[۱۸]

بیسویں صدی کے دوسرے نصف نے ان امیدوں اور اندیشوں کو بے بنیاد ثابت کردیا۔ معاشی و معاشرتی جدیدیت پوری دنیا میں پھیل گئی اور ساتھ ہی مذہب کا عالمی پیمانے پر احیا ہوا۔ یہ احیا جسے جلس کیپل نے خدائی انتقام کہا ہے، ہر براعظم، ہر تہذیب اور قریب قریب ہر ملک میں ہوا ہے۔ جیسا کہ کیپل تبصرہ کرتا ہے، ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں سیکولرائزیشن اور مذہب کو سیکولرزم کے مطابق بنانے کا رجحان ''مخالف سمت میں چل پڑا۔ ایک نیا مذہبی نقطہ نظر پیدا ہوا جس کا ہدف سیکولر اقدار سے مذہب کو ہم آہنگ بنانا نہیں تھا بلکہ سماج کی تنظیم کے لیے، ضرورت پڑے تو سماج کو بدل کر ایک مقدس بنیاد کو بحال کرنا تھا۔ یہ نقطہ نظر جس کا متعدد انداز میں اظہار کیا گیا، ایک ناکام جدیدیت سے آگے بڑھنے کی حمایت کرتا تھا اور اس جدیدیت کی ناکامیوں اور خرابیوں کو خدا سے دوری سے منسوب کرتا تھا۔ اب مرکزی خیال aggiarnamento نہیں تھا بلکہ 'یورپ میں عیسائیت کی دوسری تبلیغ' تھی، اب مقصد اسلام کو جدید بنانا نہیں تھا بلکہ 'جدیدیت کو اسلامی بنانا' تھا۔''[۱۹]

اس مذہبی احیا میں جزوی طور پر بعض مذاہب کی توسیع شامل ہے۔ ان مذاہب کو ان معاشروں میں نئے پیروکار ملے جہاں پہلے ان کے ماننے والے نہیں تھے۔ لیکن مذہبی احیا زیادہ تر اس صورت میں ہوا ہے کہ لوگ اپنے روایتی مذاہب کی طرف پلٹے، ان میں نئی روح پھونکی اور نئے معانی پہنائے۔ مسیحیت، اسلام، یہودیت، ہندومت، بدھ مت، آرتھوڈوکسی ان سب کے پیروکاروں میں، جو قبل ازیں اپنے عقائد سے بے پروا تھے، نیا جوش و جذبہ اور وابستگی پیدا ہوگئی۔ ان تمام

مذاہب میں بنیاد پرست تحریکوں نے جنم لیا جو مذہبی عقائد اور اداروں کی بزورِ قوت تطہیر کرنا اور مذہبی احکامات کے مطابق انفرادی، معاشرتی اور عوامی رویوں کو ڈھالنا چاہتی تھیں۔ بنیاد پرست تحریکیں ڈرامائی نوعیت کی حامل ہیں اور اہم سیاسی اثرات مرتب کرسکتی ہیں۔ لیکن یہ ایک وسیع تر اور زیادہ اساسی مذہبی طوفان کی صرف سطحی لہریں ہیں جو بیسویں صدی کے آخر میں حیات انسانی کو نیا روپ دے رہا ہے۔ ساری دنیا میں مذہب کا احیا بنیاد پرست انتہا پسندوں کی سرگرمیوں سے کہیں ماورا ہے۔ یہ احیا ایک کے ایک بعد مختلف معاشروں میں عام لوگوں کی روزمرہ زندگیوں اور روزگار میں نیز حکومتوں سے متعلق معاملوں اور منصوبوں میں عیاں ہورہا ہے۔ سیکولر کنفیوشین کلچر میں ثقافت کا ابھرنا ایشیائی اقدار کے اثبات کی شکل اختیار کرتا ہے لیکن بقیہ دنیا میں اس کا اظہار مذہبی اقدار کے اثبات کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ جارج وائیگل نے کہا ہے ”دنیا کا سیکولرزم ترک کرنا بیسویں صدی کے اواخر کے غالب ترین سماجی حقائق میں شامل ہے۔“[20]

مذہب کا ہر جگہ نمودار ہونا اور اس کی اہمیت سابق کمیونسٹ ریاستوں میں ڈرامائی طور پر نمایاں ہے۔ البانیہ سے ویت نام تک ان ممالک میں نظریاتی انہدام سے پیدا ہونے والے خلا کو بھرنے کے لیے مذہبی احیا کی تحریکیں سامنے آئی ہیں۔ روس میں آرتھوڈوکسی کا بڑے پیمانے پر احیا ہوا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں پچیس سال سے کم عمر کے ۳۰ فیصد روسیوں نے کہا کہ وہ الحاد چھوڑ کر خدا کو ماننے لگے ہیں۔ ماسکو میں فعال کلیساؤں کی تعداد ۱۹۸۸ء میں ۵۰ سے بڑھ کر ۱۹۹۳ء میں ۲۵۰ ہوگئی۔ سیاسی رہنماؤں نے مذہب کے بارے میں احترام کا رویہ اپنا لیا اور حکومت اس کی حمایت کرنے لگی۔ ۱۹۹۳ء میں ایک زیرک مبصر نے بتایا کہ روسی شہروں میں ”کلیساؤں کی گھنٹیوں کی آواز پھر فضا میں گونجتی ہے۔ نئے گنبد دھوپ میں چمکتے ہیں۔ جو کلیسا ابھی حال ہی میں تباہ و برباد پڑے تھے ان میں پھر شاندار نغمے گونجتے ہیں۔ کلیسا شہر کی مصروف ترین جگہیں ہیں۔“[21] سلاف جمہوریاؤں میں آرتھوڈوکسی کے احیا کے ساتھ ہی وسط ایشیا کے خطے کو اسلامی احیا نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۹۸۹ء میں وسط ایشیا میں ۱۶۰ مساجد اور ایک مدرسہ تھا؛ ۱۹۹۳ء تک ۱۰۰۰۰ مساجد اور دس مدرسے ہو چکے تھے۔ اگرچہ اس احیا میں بعض بنیاد پرست سیاسی تحریکیں شامل تھیں اور باہر سے سعودی عرب، ایران اور پاکستان نے اس کی حوصلہ افزائی کی تاہم بنیادی طور پر یہ ایک انتہائی وسیع البنیاد، معاشرے کے مرکزی دھارے میں چلنے والی اور ثقافتی تحریک تھی۔[22]

اس عالمی مذہبی احیا کی کیسے تشریح کی جاسکتی ہے؟ یہ واضح ہے کہ مختلف ممالک اور تہذیبوں میں مخصوص مقاصد کے تحت یہ سرگرمیاں جاری تھیں۔ لیکن یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ مختلف مقاصد کی

بہت بڑی تعداد دنیا کے بیشتر حصوں میں ایک ساتھ ملتے جلتے حالات پیدا کرے گی۔ عالمی مظہر عالمی تشریح کا تقاضا کرتا ہے۔ مخصوص ملکوں میں ہونے والے واقعات پر انفرادی عوامل کا کتنا بھی اثر پڑا ہو بعض عمومی اسباب ضرور سرگرمِ عمل رہے ہوں گے۔ وہ اسباب کیا تھے؟

عالمی سطح پر مذہب کے احیا کا واضح ترین، نمایاں ترین اور طاقتور ترین سبب بعینہٖ وہ ہے جس کا مقصد مذہب کو فنا کرنا تھا: سماجی، معاشی اور ثقافتی جدیدیت کا وہ عمل جس نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شناخت کے طویل عرصے سے موجود وسیلے اور اقتدار کے نظام بکھر رہے ہیں۔ لوگ دیہات سے شہروں میں آرہے ہیں، اپنی جڑوں سے علیٰحدہ ہو رہے ہیں اور نئے ذرائع معاش اختیار کررہے ہیں یا بے روزگار ہیں۔ بڑی تعداد میں اجنبی افراد سے ان کا ربط ضبط اور نئے تعلقات کا تجربہ ہورہا ہے۔ انہیں شناخت کے نئے وسیلے، مستحکم برادری کی نئی شکلیں اور نئے اخلاقی تصورات درکار ہیں جو انہیں نئے معنی اور مقصد فراہم کرسکیں۔ مذہب خواہ معاشرے کے مرکزی دھارے کا ہو یا بنیاد پرست، یہ ضروریات پوری کرتا ہے۔ جیسا کے لی کوآن یو نے مشرقی ایشیا کے بارے میں کہا:

> ہم زرعی معاشرے ہیں جو ایک یا دوصدیوں کے اندر صنعتی بن گئے ہیں۔ مغرب میں جو کچھ ۲۰۰ برس میں ہوا وہ یہاں ۵۰ سال یا اس سے کم عرصے میں ہورہا ہے۔ یہ سب بہت مختصر وقت کے اندر بہت تیزی سے ہورہا ہے اس لیے کچھ گڑبڑ اور خرابیاں ہونی لازمی ہیں۔ اگر آپ تیزی سے ترقی کرتے ہوئے ملکوں کوریا، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ اور سنگاپور کو دیکھیں تو ایک بہت نمایاں مظہر سامنے آتا ہے: مذہب کا ابھرنا... پرانے رواج اور مذاہب-- آباؤاجداد کی پوجا، شامانیت☆-- اب مکمل طور پر مطمئن نہیں کرتے۔ انسان کے مقصد کے بارے میں، اس بارے میں کہ ہم یہاں کیوں ہیں، بعض اعلیٰ تر تشریحات کی تلاش ہے۔ اس سے معاشرے میں شدید دباؤ کے ادوار وابستہ ہیں۔[۲۳]

لوگ صرف عقل کے سہارے نہیں جیتے۔ جب تک وہ اپنی ذات کی تعریف متعین نہ کریں، اپنے ذاتی مفاد کے لیے صحیح فیصلے اور معقول عمل نہیں کرسکتے۔ مفاد کی سیاست میں شناخت مضمر ہوتی ہے۔ تیز رفتار سماجی تبدیلی کے زمانے میں طے شدہ شناختیں تحلیل ہوجاتی ہیں، ذات کی ازسرِ نو تعریف متعین کرنی ہوتی ہے اور نئی شناختیں پیدا ہوتی ہیں۔ جن لوگوں کو یہ طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ میں کون ہوں؟ میرا کہاں سے تعلق ہے؟ ان کے لیے مذہب اپنی گرفت میں لے لینے

☆ نوٹ از مترجم: شامانیت (Shamanism)، ابتدائی عہد کے مذاہب کا ایک عقیدہ جس کے مطابق کسی شخص میں جو شامان کہلاتا تھا، روحانی قوتیں ہوتی تھیں۔

والے جوابات فراہم کرتا ہے اور مذہبی تنظیمیں شہروں کے بسنے کے دوران ختم ہونے والی برادریوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی معاشرتی برادریاں فراہم کرتی ہیں۔ جیسا کہ حسن الترابی نے کہا ہے، تمام مذاہب ''لوگوں کو شناخت کا احساس اور زندگی میں ایک سمت'' عطا کرتے ہیں۔ اس عمل کے دوران لوگ نئی تاریخی شناختیں دریافت یا پیدا کر لیتے ہیں۔ مذاہب کے آفاقی مقاصد کچھ بھی ہوں، وہ ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان، ایک برتر 'اپنے' اور ایک مختلف کمتر 'پرائے' کے مابین بنیادی امتیاز قائم کر کے لوگوں کو شناخت دیتے ہیں۔''[۲۴]

برنارڈ لوئیس کہتا ہے کہ مسلم دنیا میں ''ایک رجحان بار بار [سامنے آتا رہا ہے] کہ ابتلا کے ادوار میں مسلمان اپنی بنیادی شناخت اور وابستگی دینی برادری میں ڈھونڈتے ہیں یعنی کسی ایسی اکائی میں جس کی تعریف کا تعین نسلی یا علاقائی پیمانوں کی بجائے اسلام سے ہوتا ہے۔'' اسی طرح جلس کیپل شناخت کی تلاش کی مرکزی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے: '' 'نیچے سے' ری اسلامائزیشن☆ سب سے بڑھ کر ایک ایسی دنیا میں شناخت کی تشکیلِ نو کا طریقہ ہے جو اپنے معانی کھو چکی ہے اور بے ڈھب اور الگ تھلگ کر دینے والی بن گئی ہے''۔[۲۵] بھارت میں جدیدیت کے پیدا کردہ کھچاؤ اور تنہائی کے ردِ عمل کے طور پر ''ایک نئی ہندو پہچان زیرِ تعمیر ہے''۔[۲۶] روس میں مذہبی احیا ''شناخت کی شدید خواہش'' کا نتیجہ ہے ''جو صرف آرتھوڈوکس کلیسا فراہم کر سکتا ہے جو روسیوں کے ایک ہزار سالہ ماضی کا واحد نہ ٹوٹنے والا بندھن ہے'' جبکہ اسلامی جمہوریاؤں میں یہ احیا ''وسط ایشیائیوں کی سب سے بڑی آرزو [کا عکاس ہے یعنی] اس شناخت کا اثبات کرنا جسے ماسکو کئی عشروں تک دباتا رہا''۔[۲۷] علی الخصوص بنیاد پرست تحریکیں ''جدید معاشرتی و سیاسی حالات، سیکولرزم، سائنسی کلچر اور اقتصادی ترقی کے پیدا کردہ انتشار، شناخت اور محفوظ سماجی ڈھانچوں سے محرومی کے تجربے نمٹنے کا ایک طریقہ'' ہیں۔ ولیم ایچ مک نیل بھی متفق ہے کہ بنیاد پرست ''تحریکیں جو اہمیت رکھتی ہیں ... وہ ہیں جو پورے معاشرے سے اپنے کارکن چنتی ہیں اور جو اس لیے پھیلتی ہیں کہ نئی محسوس کی جانے والی انسانی ضروریات کا جواب دیتی ہیں یا دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ... یہ کوئی اتفاق نہیں کہ یہ تمام تحریکیں ایسے ملکوں میں جنم لے رہی ہیں جہاں زمین پر آبادی کے دباؤ نے لوگوں کی اکثریت کے لیے پرانے دیہی طور طریقے برقرار رکھنا ناممکن بنا دیا ہے اور جہاں بڑے پیمانے پر مواصلات نے دیہات تک پہنچ کر کسانوں کی قدیم زندگی کے ڈھانچے کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا ہے''۔[۲۸]

☆ نوٹ از مترجم: 'نیچے سے' کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی بیداری کا عمل نچلے طبقات سے شروع ہو رہا ہے۔

وسیع تر سطح پر دیکھا جائے تو ساری دنیا میں مذہب کا احیا سیکولرزم، اخلاقی اضافیت اور عیش پرستی کا ردِعمل ہے اور نظم و ضبط، کام، باہمی امداد اور انسانی یکجہتی کی اقدار کا اثبات ہے۔ مذہبی تنظیمیں ان سماجی ضروریات کو پورا کرتی ہیں جنھیں ریاستی افسر شاہی چھوڑ دیتی ہے۔ ان میں طبی خدمات کی فراہمی، چھوٹے بڑے بچوں کے اسکول، معمر افراد کی نگہداشت، قدرتی آفات اور دوسرے مصائب کے بعد فوری امداد اور معاشی محرومی کے وقت رفاہی اور معاشرتی مدد شامل ہیں۔ نظم و ضبط اور شہری معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ خلا پیدا کرتی ہے جو مذہبی، بلکہ اکثر بنیاد پرست مذہبی تنظیمیں پُر کرتی ہیں۔[۲۹]

اگر روایتی غالب مذاہب جڑوں سے اکھاڑے ہوئے لوگوں کی جذباتی و معاشرتی ضروریات پوری نہیں کرتے تو دوسرے مذہبی گروہ ایسا کرنے کے لیے آجاتے ہیں اور اس عمل کے دوران اپنی رکنیت میں بہت اضافہ کر لیتے ہیں اور معاشرتی و سیاسی زندگی میں مذہب کو بے حد نمایاں کر دیتے ہیں۔ جنوبی کوریا تاریخی اعتبار سے زیادہ تر بدھ مت کے پیروکاروں کا ملک تھا جہاں ۱۹۵۰ء میں عیسائیوں کی تعداد آبادی کا شاید ایک سے تین فیصد تھی۔ جب جنوبی کوریا نے تیزی سے اقتصادی ترقی شروع کی، شہروں کی آبادی بڑھنے لگی اور مختلف پیشوں کی الگ الگ پہچان بنی تو بدھ مت تشنہ معلوم ہونے لگا۔ ''شہروں میں آنے والے اور تبدیل شدہ دیہات میں رہ جانے والے لاکھوں افراد کے لیے کوریا کے زرعی دور کا جامد بدھ مت کشش کھو بیٹھا۔ ذہنی الجھاؤ اور تبدیلی کے اس دور میں ذاتی نجات اور انفرادی تقدیر کا پیغام دینے والی عیسائیت زیادہ تسلی فراہم کرتی تھی''۔[۳۰] ۱۹۸۰ء کی دہائی تک عیسائی، جن میں زیادہ تر پریسبی ٹیرین اور کیتھولک تھے، جنوبی کوریا کی آبادی کا کم از کم ۳۰ فیصد ہو گئے۔

لاطینی امریکا میں بھی اس سے مشابہ اور متوازی تبدیلی واقع ہوئی۔ لاطینی امریکا میں پروٹسٹنٹس کی تعداد ۱۹۶۰ء میں لگ بھگ ۷۰ لاکھ سے بڑھ کر ۱۹۹۰ء میں تقریباً پانچ کروڑ ہو گئی۔ لاطینی امریکی کیتھولک بشپوں نے ۱۹۸۹ء میں تسلیم کیا کہ اس کامیابی کی وجوہات میں ''شہری زندگی کے تکنیکی پہلوؤں کو دشواری سے قبول کیا جانا'' اور ''اس کا وہ ڈھانچا [شامل تھا] جو بعض اوقات موجودہ دور کے لوگوں کی نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔'' ایک برازیلی پروٹسٹنٹ پادری نے یہ تبصرہ کیا کہ کیتھولک کلیسا کے برخلاف پروٹسٹنٹ کلیسا فرد کی بنیادی ضروریات یعنی انسانی گرمجوشی، مسیحائی، گہرے روحانی تجربے کی تکمیل کرتا ہے۔'' لاطینی امریکا کے غریبوں میں پروٹسٹنٹ مسلک کا پھیلنا محض ایک مذہب کی جگہ دوسرا مذہب آجانے کا عمل نہیں بلکہ برائے نام اور انفعالی کیتھولک افراد کے فعال اور پرجوش ایونجلیکل بننے کے باعث مذہبی وابستگی اور شرکت میں بڑا

اضافہ ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل میں برازیل میں ۲۰ فیصد آبادی خود کو پروٹسٹنٹ اور ۷۳ فیصد کیتھولک کی حیثیت سے شناخت کرتی تھی۔ اس کے باوجود اتوار کے دن دو کروڑ افراد پروٹسٹنٹ اور لگ بھگ ایک کروڑ ۲۰ لاکھ کیتھولک گرجا گھروں میں ہوتے تھے۔[۳۱] دوسرے عالمی مذاہب کی مانند عیسائیت کا بھی احیا ہو رہا ہے جو جدیدیت سے منسلک ہے اور لاطینی امریکا میں اس نے کیتھولک کی بجائے پروٹسٹنٹ شکل اختیار کی ہے۔

جنوبی کوریا اور لاطینی امریکا میں ان تبدیلیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدھ مت اور موجودہ کیتھولک مسلک جدیدیت کے صدموں سے دوچار لوگوں کی نفسیاتی، جذباتی اور معاشرتی ضروریات پوری کرنے سے قاصر رہے۔ دوسرے خطوں میں مذہبی وابستگی میں مزید اہم تبدیلیاں آنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ مروجہ مذہب ان ضروریات کی تکمیل کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔ خاص طور پر کنفیوشزم اپنے جذباتی بنجر پن کے باعث کمزور نظر آتا ہے۔ کنفیوشین ملکوں میں لوگوں کے لیے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مسالک میں اسی طرح کی کشش پیدا ہو سکتی ہے جیسی لاطینی امریکیوں کے لیے ایونجلیکل پروٹسٹنٹ مسلک میں، جنوبی کوریائیوں کے لیے عیسائیت میں اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے بنیاد پرستی میں پیدا ہوئی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں چین میں جبکہ اقتصادی نمو پورے زوروں پر تھی عیسائیت بھی پھیلی ''خصوصاً نوجوانوں میں۔'' شاید پانچ کروڑ چینی عیسائی ہیں۔ حکومت نے پادریوں اور مبلغوں کو جیلوں میں ڈال کر، مذہبی تقریبات اور سرگرمیوں پر پابندی لگا کر اس اضافے کو روکنے کی کوشش کی ہے اور ۱۹۹۴ء میں ایک قانون منظور کیا جس کے تحت غیر ملکی افراد تبلیغ یا مذہبی اسکول یا کوئی اور مذہبی تنظیم قائم نہیں کر سکتے اور مذہبی گروہ آزادانہ یا بیرونی مالی امداد سے سرگرمیوں میں مشغول نہیں ہو سکتے۔ سنگاپور میں بھی چین کی طرح تقریباً پانچ فیصد آبادی عیسائی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں سرکاری وزرا نے مبلغین کو خبردار کیا کہ وہ ملک کے ''حساس مذہبی توازن'' کو بگاڑنے کی کوشش نہ کریں، کیتھولک تنظیموں کے اہلکاروں سمیت مذہبی کارکنوں کو حراست میں لیا اور مختلف طریقوں سے مسیحی گروپوں اور افراد کو ہراساں کیا۔[۳۲] سرد جنگ کے خاتمے اور اس کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی امکانات کے ہمراہ مغربی کلیسا سابق سوویت آرتھوڈوکس جمہوریاؤں میں بھی پہنچ کر نو احیا شدہ آرتھوڈوکس کلیساؤں کے حریف بن گئے۔ چین کی طرح یہاں بھی ان کی تبلیغ کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۹۳ء میں آرتھوڈوکس چرچ کے اصرار پر روسی پارلیمنٹ نے ایک مسودۂ قانون منظور کیا جس کے تحت تبلیغی یا تعلیمی سرگرمیاں شروع کرنے کے لیے غیر ملکی مذہبی تنظیموں کا ریاست سے توثیق کرانا یا کسی روسی

مذہبی تنظیم سے منسلک ہونا لازمی قرار پاتا تاہم صدر ریلسن نے اس مسودۂ قانون پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔[۳۳] مجموعی طور پر ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ جہاں ان دونوں میں تصادم ہوتا ہے وہاں خدائی انتقام مقامیت پر غالب آجاتا ہے: اگر جدیدیت کی مذہبی ضروریات روایتی عقائد پوری نہیں کر سکتے تو لوگ جذبات کو اطمینان بخشنے والی مذہبی درآمدات کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

جدیدیت کے نفسیاتی، جذباتی اور معاشرتی صدموں کے علاوہ مذہبی احیا کے دوسرے محرکات میں مغرب کی پسپائی اور سرد جنگ کا خاتمہ شامل تھے۔ انیسویں صدی سے مغرب کے بارے میں غیر مغربی تہذیبوں کا ردِعمل بالعموم مغرب سے درآمد شدہ نظریات کے سلسلے سے ہوتا ہوا گزرا۔ انیسویں صدی میں غیر مغربی اعلیٰ طبقات نے مغرب کی لبرل اقدار کو جذب کیا اور مغرب سے ان کی مخالفت کا پہلا اظہار لبرل قوم پرستی کی شکل میں ہوا۔ بیسویں صدی میں روسی، ایشیائی، عرب، افریقی اور لاطینی امریکی اعلیٰ طبقوں نے سوشلسٹ اور مارکسسٹ نظریات درآمد کیے اور انہیں قوم پرستی سے ملا کر مغربی سرمایہ داری اور سامراجیت کی مخالفت کی۔ سوویت یونین میں کمیونزم کے انہدام، چین میں اس کے اندر بڑی ترامیم اور سوشلسٹ معیشتوں کی مستقل ترقی کے حصول میں ناکامی نے اب ایک نظریاتی خلا پیدا کر دیا ہے۔ مغربی حکومتوں، گروپوں اور آئی ایم ایف اور عالمی بینک جیسے بین الاقوامی اداروں نے رائج الوقت معاشیات اور جمہوری سیاست کے ذریعے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ یقینی نہیں کہ ان نظریات کا غیر مغربی ثقافتوں پر پائیدار اثر کس حد تک پڑے گا۔ بہرحال اس دوران لوگوں کی نظروں میں کمیونزم ناکام ہونے والا تازہ ترین سیکولر خدا ہے اور نئے پرکشش سیکولر دیوتاؤں کی غیر موجودگی میں وہ سکون اور جوش کے ساتھ اصل چیز کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ مذہب نے نظریات کی جگہ معاملات سنبھال لیے ہیں اور سیکولر قوم پرستی کی جگہ مذہبی قوم پرستی آگئی ہے۔[۳۴]

مذہبی احیا کی تحریکیں سیکولر دشمن اور آفاقیت کی مخالف ہیں اور اپنی عیسائی شکلوں کے سوا مغرب دشمن بھی ہیں۔ یہ تحریکیں اخلاقی اضافیت، انا پرستی اور صارف پسندی (consumersim) کی بھی مخالف ہیں جسے بروس بی لارنس modernism کہتا ہے جو modernity سے الگ چیز ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ تحریکیں شہروں کے بسنے، صنعت کاری، ترقی، سرمایہ داری، سائنس اور ٹیکنالوجی اور ان سے وابستہ تقاضوں کو، جو معاشرے کی تنظیم کے لیے درکار ہوتے ہیں، مسترد نہیں کرتیں۔ اس مفہوم میں یہ جدیدیت کی مخالف نہیں۔ جیسا کہ لی کوآن یو کہتا ہے، یہ تحریکیں جدیدیت کو، ''سائنس اور ٹیکنالوجی کی ناگزیریت کو'' اور ''طرزِ حیات میں ان کی وجہ سے آنے والی تبدیلیوں کو'' قبول کرتی ہیں لیکن ''اس تصور کو قبول نہیں کرتیں کہ ان پر مغربیت کا رنگ چڑھایا جائے۔'' الترابی کہتا ہے کہ نہ تو

قوم پرستی نے اور نہ ہی سوشلزم نے اسلامی دنیا میں ترقی پیدا کی۔ ''مذہب ترقی کا محرک ہے'' اور تطہیر شدہ اسلام عصرِ حاضر میں وہ کردار ادا کرے گا جس کا موازنہ مغرب کی تاریخ میں پروٹسٹنٹ اخلاقیات سے کیا جاسکتا ہے۔ نہ ہی مذہب کسی جدید ریاست کی ترقی سے عدم مطابقت رکھتا ہے۔[۳۵] اسلامی بنیاد پرست تحریکیں زیادہ ترقی یافتہ اور بظاہر سیکولر مسلم معاشروں میں مضبوط رہی ہیں جیسے الجزائر، ایران، مصر، لبنان اور تیونس۔[۳۶] مذہبی تحریکیں، جن میں بنیاد پرست تحریکیں بھی شامل ہیں، اپنا پیغام پہنچانے کے لیے جدید مواصلاتی اور تنظیمی تیکنیکیں استعمال کرنے میں بہت مہارت رکھتی ہیں۔ اس کی شاندار مثال وسطی امریکا میں پروٹسٹنٹ ٹیلی وینجیلزم (televangelism) کی کامیابی ہے۔

مذہبی احیا میں شریک لوگوں کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے مگر دو حلقوں کے افراد کی تعداد اس میں بہت زیادہ ہے۔ یہ دونوں حلقے شہروں میں بسنے والے اور متحرک افراد پر مشتمل ہیں۔ شہروں میں حال ہی میں آنے والے افراد کو عموماً جذباتی، سماجی اور مادی مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے جو مذہبی گروپوں سے بڑھ کر کوئی پوری نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ رَیجس ڈیبرے نے کہا، ان کے لیے مذہب ''عوام کی افیون نہیں بلکہ کمزوروں کی حیاتین ہے''۔[۳۷] دوسرا حلقہ نیا متوسط طبقہ ہے جو ڈور کے ''دوسری پیڑھی کے مقامیت کے مظہر'' کی تجسیم ہے۔ جیسا کہ کیپل نے نشاندہی کی ہے، اسلامی بنیاد پرست گروپوں کے فعال کارکن ''عمر رسیدہ قدامت پرست یا اَن پڑھ کسان'' نہیں۔ دوسروں کی طرح مسلمانوں میں بھی مذہبی احیا شہری مظہر ہے اور ان لوگوں کے لیے کشش رکھتا ہے جو جدیدیت کی طرف مائل، تعلیم یافتہ اور مختلف پیشوں، حکومت اور تجارت سے وابستہ ہیں۔[۳۸] مسلمانوں میں نوجوان مذہبی ہیں، ان کے والدین سیکولر ہیں۔ ہندومت کے معاملے میں بھی یہی صورت ہے۔ احیا کی تحریکوں کے رہنماؤں کا تعلق دیسی بن جانے والی دوسری پیڑھی سے ہے اور وہ اکثر ''کامیاب تاجر یا منتظم'' ہوتے ہیں جنھیں بھارتی اخبارات میں ''اسکپیز'' (Scuppies) یعنی زعفرانی کپڑوں میں ملبوس یپیز (saffron-clad yuppies) کہا جاتا ہے۔ ۱۹۹۰ء کے اوائل میں ان کے حامی زیادہ تر ''بھارت کے ٹھوس متوسط ہندو طبقے سے تعلق رکھتے تھے یعنی تاجر اور اکاؤنٹنٹس، وکلا اور انجینئر'' اور ''سینئر سول سرونٹس، دانشور اور صحافی''۔[۳۹] جنوبی کوریا میں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں کے دوران اسی قسم کے لوگوں سے کیتھولک اور پریس بی ٹیرین کلیسا بھر گئے تھے۔

مذہب، خواہ مقامی ہو یا درآمد کیا ہوا، جدید بننے والے سماجوں کو معنی اور سمت عطا کرتا ہے۔ رونلڈ ڈور نے مزید یہ کہا ہے کہ ''کسی روایتی مذہب کی قدر کرنے کا مطلب یہ دعویٰ ہے کہ ہم بھی اتنے احترام کے حقدار ہیں جتنی 'دیگر غالب' اقوام اور مقامی حکمراں طبقہ ہے جس نے ان دیگر غالب

اقوام کی اقدار اور طرزِ زندگی اپنا لیا ہے۔'' ولیم مک نیل کا تبصرہ ہے کہ اسلام کا اثبات، اس کی مخصوص فرقہ وارانہ شکل کچھ بھی ہو، سب سے بڑھ کر یہ معنی رکھتا ہے کہ مقامی معاشرے، سیاست اور اخلاقیات پر یورپی اور امریکی اثرات کو مسترد کیا جائے''۔[۴] اس مفہوم میں غیر مغربی معاشروں میں مغرب دشمنی کا طاقتور ترین اظہار غیر مغربی مذاہب کے احیا کی صورت میں ہو رہا ہے۔ یہ احیا جدیدیت کا استرداد نہیں، مغرب کا اور سیکولر، اخلاقی اضافیت اور پستی کی اس ثقافت کا استرداد ہے جو مغرب سے منسلک کیا جاتا ہے۔ یہ اس چیز کا استرداد ہے جسے غیر مغربی معاشروں کی مغرب زدگی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ مغرب سے ثقافتی آزادی کا اعلان ہے، یہ فخریہ بیان ہے کہ: ''ہم جدید بنیں گے لیکن تمہارے جیسے نہیں۔''

پانچواں باب

معاشیات، آبادیات اور چیلنج کرنے والی تہذیبیں

مقامیانا اور مذہب کا احیا عالمی مظاہر ہیں۔ ان کا سب سے نمایاں اظہار ثقافتی اثبات اور مغرب کے خلاف ان چیلنجوں کی صورت میں ہوا ہے جو ایشیا اور اسلام کی طرف سے آئے ہیں۔ یہ بیسویں صدی کے ربعِ آخر کی متحرک تہذیبیں رہی ہیں۔ اسلام کا چیلنج مسلم دنیا میں اسلام کے ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی احیا اور اس کے ہمراہ مغربی اقدار اور اداروں کو مسترد کرنے کے عمل میں عیاں ہے۔ ایشیائی چیلنج تمام مشرقی ایشیائی تہذیبوں -- صینی، جاپانی، بدھ اور مسلم -- میں عیاں ہے اور اس میں مغرب سے اِن تہذیبوں کے ثقافتی اختلافات اور، بعض اوقات ایک دوسرے کے مشترک پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے۔ ان مشترک پہلوؤں کو اکثر کنفیوشنزم سے شناخت کیا جاتا ہے۔ ایشیائی اور مسلمان دونوں مغربی ثقافت کے مقابلے میں اپنی ثقافت کی برتری پر زور دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسری -- ہندو، آرتھوڈوکس، لاطینی امریکی، افریقی -- غیر مغربی تہذیبوں کے لوگ اپنی ثقافتوں کے علیحدہ ہونے پر اصرار تو کرتے ہیں مگر، ۱۹۹۰ء کے عشرے کے وسط تک، مغربی ثقافت کے مقابلے میں اپنی برتری جتانے سے گریزاں تھے۔ یہ صرف ایشیا اور اسلام کی تہذیبیں ہیں جو مغرب کے مقابلے میں اعتماد سے اپنا اثبات کرتی ہیں اور بعض اوقات مل کر کرتی ہیں۔

ان چیلنجوں کے پس پشت باہم منسلک لیکن مختلف اسباب کارفرما ہیں۔ ایشیائی اثبات کی جڑیں معاشی نمو میں ہیں جبکہ مسلم اثبات کا باعث خاصی حد تک سماجی تحرک اور آبادی میں اضافہ

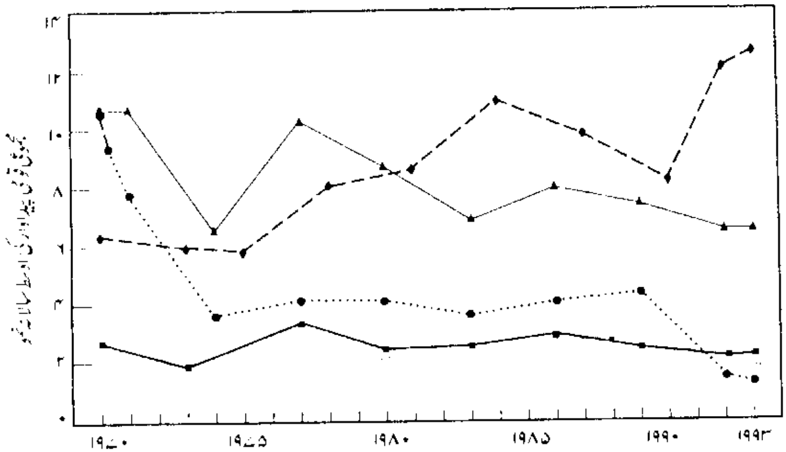
ہے۔ اکیسویں صدی میں ان چیلنجوں کے عالمی سیاست پر غیر مستحکم کرنے والے اثرات پڑ رہے ہیں اور پڑتے رہیں گے۔ تاہم ان چیلنجوں کی نوعیت بہت مختلف ہے۔ چین اور دوسرے ایشیائی معاشروں کی معاشی ترقی ان کی حکومتوں کو دوسرے ملکوں سے بڑھ چڑھ کر مطالبات کرنے کی ترغیبات اور وسائل فراہم کرتی ہے۔ مسلمان ملکوں میں آبادی میں اضافہ، خصوصاً پندرہ سے چوبیس سال کے عمر کے افراد میں، بنیاد پرستی، دہشت گردی، شورش انگیزی اور ہجرت کے لیے افرادی قوت فراہم کرتا ہے۔ معاشی نمو ایشیائی حکومتوں کو مضبوط کر رہی ہے۔ آبادیاتی نمو مسلمان حکومتوں اور غیر مسلم معاشروں کے لیے خطرہ بن رہی ہے۔

ایشیائی اثبات

مشرقی ایشیا کی اقتصادی ترقی بیسویں صدی کے نصف آخر میں دنیا کی اہم ترین تبدیلیوں میں شامل ہے۔ یہ عمل ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جاپان میں شروع ہوا اور تھوڑے عرصے تک جاپان کو ایک بہت بڑا استثنا سمجھا گیا: ایک غیر مغربی ملک جو کامیابی سے جدید بن گیا اور معاشی ترقی کر گیا۔ تاہم اقتصادی ترقی کا یہ عمل چار ٹائیگروں (ہانگ کانگ، تائیوان، جنوبی کوریا، سنگاپور) تک پھیل گیا اور پھر چین، ملائشیا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا تک، اور اب فلپائن، بھارت اور ویت نام میں قدم جما رہا ہے۔ ان ممالک نے اکثر ایک عشرے یا اس سے زیادہ عرصے تک ۸ تا ۱۰ فیصد یا زائد کی اوسط سالانہ شرح نمو برقرار رکھی ہے۔ پہلے ایشیا اور بقیہ دنیا کے درمیان اور پھر ایشیا کے اندر تجارت میں ڈرامائی انداز میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ایشیا کی یہ معاشی کارکردگی یورپی اور امریکی معیشتوں کی معمولی نمو اور بیشتر بقیہ دنیا میں پھیلے ہوئے جمود سے واضح تضاد رکھتی ہے۔

اس طرح استثنا اب فقط جاپان نہیں بلکہ پورا ایشیا بنتا جا رہا ہے۔ یہ تاثر کہ مغرب دولت مند اور غیر مغربی دنیا پسماندہ ہے، بیسویں صدی کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اس تبدیلی کی رفتار حیرت انگیز ہے۔ جیسا کہ کشور محبوبانی نے کہا ہے، برطانیہ اور امریکا کو اپنی فی کس پیداوار دگنی کرنے میں بالترتیب اٹھاون اور ستاون برس لگے لیکن جاپان نے تینتیس، انڈونیشیا نے سترہ، جنوبی کوریا نے گیارہ اور چین نے دس سال میں یہ کام کر لیا۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے دوران اور ۱۹۹۰ء کے عشرے کے پہلے نصف میں چینی معیشت نے اوسطاً ۸ فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کی اور ٹائیگر اس سے ذرا سا پیچھے تھے (دیکھیے شکل ۱ء ۵)۔ ۱۹۹۳ء میں عالمی بینک نے اعلان کیا کہ ''چینی

شکل ۱ء۵
اقتصادی چیلنج: ایشیا اور مغرب



ماخذ: عالمی بینک، World Tables 1995, 1991 (بالٹی مور: جان ہاپکنز یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء، ۱۹۹۱ء)؛ ڈائریکٹریٹ جنرل آف بجٹ، اکاؤنٹنگ اینڈ اسٹیٹسٹکس، آر او سی، Statistical Abstract of National Income, Taiwan Area, Republic of China, 1951—1995۔

معاشی علاقہ'' امریکا، جاپان اور جرمنی کے ساتھ دنیا کا ''چوتھا ترقی کا قطب'' بن چکا ہے۔ زیادہ تر تخمینوں کے مطابق چینی معیشت اکیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کی سب سے بڑی معیشت بن جائے گی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ایشیا دنیا کی دوسری اور تیسری سب سے بڑی معیشتیں رکھتا ہے۔ امکان ہے کہ ۲۰۲۰ء تک پانچ سب سے بڑی معیشتوں میں سے چار اور دس سب سے بڑی معیشتوں میں سے سات ایشیا کی ہوں گی۔ اُس وقت تک امکان ہے کہ ایشیائی معاشرے عالمی معاشی پیداوار کے ۴۰ فیصد سے زائد کے حصہ دار ہوں گے۔ بیشتر مسابقتی معیشتیں بھی غالباً ایشیائی ہوں گی۔[1] اگر ایشیائی اقتصادی نمو جلد یکساں ہوگئی اور توقع سے زیادہ گرگئی تب بھی جو ترقی پہلے ہی ہوچکی ہے اس کے اثرات ایشیا اور دنیا کے لیے بہت زیادہ ہیں۔

مشرقی ایشیا کی اقتصادی ترقی ایشیا اور مغرب، خصوصاً ایشیا و امریکا کے مابین طاقت کا توازن بدل رہی ہے۔ کامیاب معاشی ترقی ان لوگوں میں خود اعتمادی اور اثبات پیدا کرتی ہے جو اس ترقی کا

سبب بنتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ طاقت کی طرح دولت بھی اچھائی کا ثبوت فرض کی جاتی ہے۔ معاشی اعتبار سے کامیاب ہونے کے بعد مشرقی ایشیائیوں نے اپنی ثقافت کے ممتاز ہونے پر زور دینے اور مغرب اور دیگر معاشروں کے مقابلے میں اپنی اقدار اور طرزِ زندگی کی برتری کا ڈھنڈورا پیٹنے میں ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کی ہے۔ ایشیائی معاشرے امریکی مطالبات اور مفادات کی کم سے کم پروا اور امریکا اور دوسرے مغربی ملکوں کے دباؤ کی زیادہ سے زیادہ مزاحمت کر رہے ہیں۔

۱۹۹۳ء میں سفیر ٹومی کوہ نے کہا کہ ''ثقافتی نشاۃ ثانیہ کی لہر'' نے ایشیا کو لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اس لہر کے اندر ایک ''بڑھتی ہوئی خود اعتمادی'' ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایشیائی ''اب ہر مغربی یا امریکی چیز کو لازمی طور پر بہترین نہیں سمجھتے''۔[۲] اس نشاۃ ثانیہ کا اظہار انفرادی ایشیائی ممالک کی جداگانہ ثقافتی شناختوں اور ایشیائی ثقافتوں کے باہم مشترک عناصر سے، جو ان کو مغربی ثقافت سے ممیز کرتے ہیں، ہوتا ہے۔ اس ثقافتی احیا کی اہمیت مشرقی ایشیا کے دو بڑے معاشروں کے مغربی ثقافت کے ساتھ بدلتے ہوئے روابط میں نظر آتی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب مغرب نے خود کو چین اور جاپان پر ٹھونسا تو کمال ازم کے وقتی سحر سے نکلنے کے بعد، اعلیٰ طبقات نے اصلاح پسندانہ حکمت عملی اختیار کی۔ جاپان میں میجی ریسٹوریشن کے ساتھ اصلاح پسندوں کا ایک متحرک گروپ برسر اقتدار آ گیا۔ اس نے مغربی تکنیکوں، رواجوں اور اداروں کا مطالعہ کیا اور جاپان میں جدیدکاری کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے یہ عمل ایسے انداز میں کیا کہ روایتی جاپانی ثقافت کے لازمی عناصر قائم رہیں۔ اس ثقافت نے کئی پہلوؤں سے جدیدکاری میں مدد کی اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں جاپان کے لیے یہ ممکن بنایا کہ وہ اس ثقافت کے عناصر کی تشکیل نو کرنے اور اس میں بہتری لانے کے حق میں حمایت حاصل کر سکے اور شہنشاہیت کا جواز فراہم کر سکے۔ دوسری طرف چین میں زوال پذیر چی انگ شاہی خاندان مغرب کے اثرات کے حوالے سے خود کو ڈھالنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ جاپان اور یورپی طاقتوں نے چین کو شکست دی، استحصال کیا اور تذلیل کی۔ ۱۹۱۰ء میں اس خاندان کے خاتمے کے بعد تقسیم کا عمل ہوا، خانہ جنگی ہوئی اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا چینی دانشور اور سیاسی رہنماؤں نے باہم متصادم مغربی نظریات متعارف کرائے: سن یات سین کے ''قوم پرستی، جمہوریت اور عوام کے لیے گزر اوقات'' کے تین اصول، لیانگ چی چاؤ کا لبرل ازم، ماؤزے تنگ کا مارکسسٹ لینن ازم۔ ۱۹۴۰ء کی دہائی کے اختتام پر سوویت یونین سے درآمد شدہ نظریے نے مغرب کے نظریات -- قوم پرستی، لبرل ازم، جمہوریت، عیسائیت -- کو ہرا دیا اور چین کو سوشلسٹ معاشرے کی حیثیت دے دی گئی۔

جاپان کی دوسری جنگ عظیم میں مکمل شکست مکمل ثقافتی دھچکے کا باعث بنی۔ جاپان سے گہری واقفیت رکھنے والے ایک مغربی باشندے نے ۱۹۹۴ء میں یہ تبصرہ کیا کہ ''ہمارے لیے اب یہ اندازہ کرنا بہت دشوار ہے کہ ہر چیز -- مذہب، ثقافت اور اس ملک کے ذہنی وجود کا ایک ایک پہلو کس حد تک اس جنگ میں شریک تھا۔ جنگ میں شکست نے اس نظام کو بری طرح ہلا دیا۔ ان لوگوں کے ذہنوں میں پوری چیز بے قیمت ہوگئی اور اسے نکال کر پھینک دیا گیا''۔[3] اس کی جگہ مغرب خصوصاً امریکا سے منسلک ہر چیز اچھی اور پسندیدہ سمجھی جانے لگی۔ یوں جاپان نے اسی طرح امریکا کی تقلید کرنے کی کوشش کی جیسے چین نے سوویت یونین کی کی تھی۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کے اواخر تک معاشی نمو پیدا کرنے میں کمیونزم کی ناکامی اور جاپان اور اس کے بعد دوسرے ایشیائی معاشروں میں سرمایہ داری کی کامیابی نے نئی چینی قیادت کو سوویت ماڈل ترک کرنے کی جانب مائل کیا۔ ایک عشرے بعد سوویت یونین کے انہدام نے اس درآمد کی ناکامیوں کو اور نمایاں کردیا۔ اس طرح چینیوں کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اپنا رخ مغرب کی طرف کریں یا اپنی طرف۔ بہت سے دانشوروں اور بعض دوسرے حلقوں نے مکمل مغربیت کی حمایت کی۔ یہ رجحان ٹیلی وژن سیریز ریور ایلیجی اور تیانن من اسکوائر میں جمہوریت کی دیوی کی تنصیب سے اپنی ثقافتی اور عام پسندانہ انتہاؤں پر پہنچا۔ تاہم مغربیت کے اس رجحان کو نہ تو بیجنگ کے چند سو اہم افراد کی حمایت ملی نہ ہی دیہات میں رہنے والے ۸۰ کروڑ کسانوں کی۔ مکمل مغربیت جو انیسویں صدی کے آخر میں عملاً ممکن نہ تھی، بیسویں صدی کے آخر میں بھی نہ تھی۔ اس کی بجائے چینی قیادت نے تی یونگ کی ایک نئی شکل چن لی: ایک طرف سیاسی جبر واستبداد کے ساتھ سرمایہ داری اور عالمی معیشت میں شرکت اور دوسری طرف روایتی چینی ثقافت سے وابستگی کا ازسرنو اظہار۔ مارکسسٹ لینن ازم کے انقلابی جواز کی جگہ چینی حکومت نے معاشی ترقی کا فراہم کردہ کارکردگی کا جواز اور چینی ثقافت کی ممتاز خصوصیات کا فراہم کردہ قوم پرستی کا جواز متعارف کرایا۔ ایک مبصر کے مطابق ''تیانن من کے بعد کی حکومت نے چینی قوم پرستی کو جواز کے نئے سرچشمے کے طور پر ذوق وشوق سے اختیار کرلیا ہے'' اور اپنے اقتدار اور اپنے رویے کا جواز پیدا کرنے کے لیے قصداً امریکا دشمنی کو ابھارا ہے۔[4] یوں ایک چینی ثقافتی قوم پرستی ابھر رہی ہے جس کے بارے میں ہانگ کانگ کے ایک رہنما نے ۱۹۹۴ء میں کوزے کو دریا میں بند کرتے ہوئے کہا ''ہم چینی خود کو قوم پرست محسوس کرتے ہیں جو ہم نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا۔ ہم چینی ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔'' خود چین میں ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل میں ان چیزوں کی طرف واپسی کی مقبول خواہش پیدا ہوئی جو مستند طور پر چینی

ہیں، جو اکثر آمرانہ، دیسی اور استبدادی ہیں۔ اس تاریخی احیا میں جمہوریت بھی لینن ازم اور دوسری غیرملکی درآمدات کی مانند باعث توقیر نہیں سمجھی جاتی۔[5]

بیسویں صدی کے اوائل میں چینی دانشور اپنے طور پر اس نتیجے پر پہنچے، جس پر ویبر بھی پہنچا تھا کہ کنفیوشنزم چینی پسماندگی کا سبب ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں چینی سیاسی رہنما مغربی ماہرین معاشرتی علوم کی طرح کنفیوشنزم کو چینی ترقی کی وجہ بتاتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں چینی حکومت نے کنفیوشنزم میں دلچسپی کو فروغ دینا شروع کیا۔ پارٹی لیڈر اسے چینی ثقافت کا ''مرکزی دھارا'' کہنے لگے۔[6] لی کوآن یو نے بھی کنفیوشنزم کو جوش وخروش سے اپنایا، اسے سنگاپور کی ترقی کا سرچشمہ قرار دیا اور بقیہ دنیا کے لیے کنفیوشین اقدار کا مبلغ بن گیا۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں تائیوانی حکومت نے خود کو ''کنفیوشین فکر کا وارث'' ٹھہرایا اور صدر لی تنگ ہوئی نے تائیوان میں جمہوریت کی جڑیں اس کے چینی ''ثقافتی ورثے'' میں تلاش کیں جو ماضی میں کاؤیاؤ (اکیسویں صدی قبل مسیح)، کنفیوشس (پانچویں صدی قبل مسیح) اور مینشس (تیسری صدی قبل مسیح) تک جاتا ہے۔[7] چینی رہنما آمریت کا جواز تلاش کرنا چاہیں یا جمہوریت کا، اسے درآمد شدہ مغربی تصورات کی بجائے اپنی مشترکہ چینی ثقافت میں ہی ڈھونڈتے ہیں۔

چینی حکومت جس قوم پرستی کو فروغ دے رہی ہے وہ ہان قوم پرستی ہے جو ۹۰ فیصد چینی آبادی میں لسانی، علاقائی اور معاشی اختلافات کو دباتی ہے۔ ساتھ ہی یہ غیرچینی نسلی اقلیتوں سے اختلافات کو نمایاں کرتی ہے جو چین کی آبادی کے دس فیصد سے بھی کم ہیں لیکن اس کی ۶۰ فیصد زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ قوم پرستی عیسائیت، عیسائی تنظیموں اور عیسائی تبلیغی سرگرمیوں سے چینی حکومت کی مخالفت کی بنیاد بھی فراہم کرتی ہے کیونکہ عیسائیت ماؤسٹ لیننن ازم کے خاتمے سے پیدا کردہ خلا کو پُر کرنے کے لیے ایک متبادل مغربی عقیدہ فراہم کرتی ہے۔

اس دوران جاپان میں ۱۹۸۰ء کے عشرے میں کامیاب معاشی نمو کو امریکی معیشت اور سماجی نظام کی مفروضہ ناکامیوں اور ''زوال'' سے موازنہ کرکے دیکھا گیا اور جاپان کے لوگ مغربی ماڈلز کے سحر سے آزاد اور اس بات کے قائل ہوتے گئے کہ ان کی کامیابی کے سرچشمے ان کی اپنی ثقافت میں پوشیدہ ہیں۔ جاپانی ثقافت جس نے ۱۹۴۵ء میں فوجی تباہی کو جنم دیا تھا اور اسی لیے اسے مسترد کرنا ضروری تھا، ۱۹۸۵ء تک اقتصادی سرشاری پیدا کرچکی تھی چنانچہ اسے اختیار کیا جاسکتا تھا۔ مغربی معاشرے سے جاپانیوں کی روشناسی بڑھی تو انہوں نے ''اندازہ کرلیا کہ مغربی ہونا فی نفسہ کوئی بہت شاندار بات نہیں۔ انہیں اپنے نظام سے اس چیز کو نکال دینا چاہیے۔'' میجی ریسٹوریشن کے دور میں

جاپانیوں نے ''ایشیا سے دور ہٹنے اور یورپ سے ملاپ'' کی پالیسی اختیار کی تھی تو بیسویں صدی کے اواخر میں ثقافتی احیا کے دور میں جاپانیوں نے ''امریکا سے فاصلہ پیدا کرنے اور ایشیا کو اپنانے'' کی پالیسی اختیار کی۔[۸] اس رجحان میں ایک تو جاپانی ثقافتی روایات اور ان روایات کی اقدار کا نئے سرے سے اثبات شامل ہے۔ دوسری طرف، جاپان کو ''ایشیا نائز'' کرنے اور اپنی علیحدہ تہذیب کے باوجود ایک عمومی ایشیائی ثقافت سے اپنی پہچان متعین کرنے کی کوشش ہے جو مسائل پیدا کرتی ہے۔ چونکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد چین کی بہ نسبت جاپان نے مغربی شناخت کو بہت زیادہ اپنایا اور چونکہ مغرب، خواہ اس کی ناکامیاں کچھ بھی رہی ہوں، سوویت یونین کی طرح بالکل تباہ نہیں ہوا، اس لیے جاپان کے لیے مغرب کو کاملاً مسترد کرنے کی ترغیبات ان ترغیبات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں جو چین کے سامنے سوویت اور مغربی ماڈلز دونوں کو مسترد کرنے کے سلسلے میں موجود تھیں۔ دوسری جانب جاپانی تہذیب کی انفرادیت، دوسرے ملکوں میں جاپانی شہنشاہیت کی یادوں اور بیشتر دیگر ایشیائی ممالک میں چین کی معاشی مرکزی حیثیت کا یہ بھی مطلب ہے کہ جاپان کے لیے مغرب سے فاصلہ پیدا کرنا ایشیا سے اپنے آپ کو منسلک کرنے سے زیادہ آسان ہوگا۔[۹] جاپان اپنی ثقافتی شناخت کو جتلا کر اپنی انفرادیت اور مغربی و دیگر ایشیائی ثقافتوں دونوں سے اپنے اختلافات کو نمایاں کرتا ہے۔

چینیوں اور جاپانیوں نے اپنی ثقافتوں میں نئی قدر تلاش کی مگر انہوں نے مغرب کے مقابلے میں ایشیائی ثقافت کی قدر و قیمت کا بھی وسیع تر پیمانے پر اثبات کیا۔ اس کے ساتھ جو صنعت کاری اور ترقی ہوئی اس نے ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں مشرقی ایشیائیوں میں وہ وصف پیدا کیا جسے ایشیائی اثبات کہنا موزوں ہوگا۔ رویوں کے اس تانے بانے کے چار اہم اجزا ہیں۔

اول، ایشیائی یہ سمجھتے ہیں کہ مشرقی ایشیا اپنی تیز معاشی ترقی برقرار رکھے گا اور معاشی پیداوار میں جلد مغرب سے سبقت لے جائے گا چنانچہ مغرب کے مقابلے میں عالمی امور میں زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔ ایشیائی معاشروں میں اقتصادی ترقی طاقت کا احساس بیدار کرتی ہے اور اپنی مغرب کے دوبدو کھڑے ہونے کی اہلیت پر اعتماد پیدا کرتی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں ایک نمایاں جاپانی صحافی نے کہا کہ ''وہ دن گئے جب امریکا چھینکتا تھا تو ایشیا کو زکام ہو جاتا تھا'' اور ایک ملائشیائی افسر نے اس طبی استعارے میں یہ اضافہ کیا کہ ''امریکا کے تیز بخار سے بھی ایشیا کو کھانسی نہیں ہوگی۔'' ایک اور ایشیائی رہنما نے کہا کہ ایشیائیوں کے لیے اب امریکا سے تعلقات کے ضمن میں ''گنگ ہونے کا دور ختم اور جواب دینے کا دور شروع'' ہو رہا ہے۔ ملائشیا کے نائب وزیر اعظم کا بیان تھا کہ ''ایشیا کی بڑھتی ہوئی خوشحالی کے معانی یہ ہیں کہ اب وہ غالب عالمی، معاشرتی اور معاشی حالات کے اہم متبادل پیش

کرسکتا ہے"۔[۱] مشرقی ایشیائیوں کے مطابق اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ مغرب انسانی حقوق اور دیگر اقدار کے حوالے سے ایشیائی معاشروں کو مغربی پیمانوں سے ہم آہنگ کرنے پر مجبور کرنے کی صلاحیت تیزی سے کھوتا جارہا ہے۔

دوم، ایشیائی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معاشی کامیابی زیادہ تر ایشیائی ثقافت کے طفیل ہے جو مغرب سے برتر ہے اور مغرب ثقافتی و معاشرتی اعتبار سے پستی کا شکار ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے زمانۂ سرشاری میں جب جاپانی معیشت، برآمدات، تجارتی توازن اور زرِمبادلہ کے ذخائر مسلسل ترقی کررہے تھے، جاپانی اپنی نئی اقتصادی طاقت کا فخریہ اور مغرب کے زوال کا حقارت سے تذکرہ کرتے اور اپنی کامیابی اور مغرب کی ناکامیوں کو اپنی ثقافت کی برتری اور مغربی ثقافت کی پستی سے منسوب کرتے تھے جیسے اس سے قبل سعودی کرتے تھے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں ایشیائی احساسِ فتح کا اظہار ازسرِنو جس شکل میں ہوا اسے صرف "سنگاپوری ثقافتی حملہ" ہی کہا جاسکتا تھا۔ لی کوآن یو سے لے کر نچلی سطح تک سنگاپور کے تمام لیڈر مغرب کے مقابلے میں ایشیا کے عروج کا زوروشور سے تذکرہ کرتے اور اپنی کامیابی کے ذمے دار ایشیائی فضائل، جو بنیادی طور پر کنفیوشین تھے -- ترتیب، نظم و ضبط، خاندانی ذمے داریاں، محنت، اجتماعیت، اعتدال -- کا مقابلہ مغرب کے زوال کے ذمے دار عیش و آرام طلبی، سستی، فرد پرستی، جرائم، کمتر تعلیم، حکام کے احترام نہ کرنے اور "ذہنی جمود" سے کرتے رہے۔ یہ کہا گیا کہ امریکا کو مشرق کا مقابلہ کرنے کے لیے "اپنے معاشرتی و سیاسی نظام کے بارے میں اپنے بنیادی مفروضات پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی اور مشرقی ایشیائی معاشروں سے ایک دو چیزیں سیکھنی ہوں گی"۔[۱۱]

مشرقی ایشیائیوں کے خیال میں مشرقی ایشیا کی کامیابی خاص طور پر فرد کی بجائے اجتماعیت پر زور دینے کی ثقافت کا نتیجہ ہے۔ لی کوآن یو نے کہا "مشرقی ایشیائیوں -- جاپانیوں، کوریائیوں، تائیوانیوں، ہانگ کانگ والوں اور سنگاپوریوں -- کی اجتماعی اقدار اور رواج ترقی کے عمل میں واضح اثاثہ ثابت ہوئے ہیں"۔ "مشرقی ایشیائی ثقافت جن اقدار کی علمبردار ہے، جیسے انفرادی مفادات پر گروہی مفادات کی اولیت، ان سے مجموعی گروہی کاوشوں کو مدد ملتی ہے جو تیزی سے ترقی کرنے کے لیے ضروری ہیں"۔ ملائشیا کے وزیرِاعظم نے اس بات سے اتفاق کیا کہ "جاپانیوں اور کوریائیوں کی اخلاقیات کار جو نظم و ضبط، وفاداری اور ہوشیاری پر مشتمل ہیں، ان کے ممالک کی معاشی و معاشرتی ترقی کے لیے محرک بنی ہے۔ یہ اخلاقیات کار اس فلسفے کی پیداوار ہے کہ گروہ اور ملک فرد سے زیادہ اہم ہیں"۔[۱۲]

سوم، مشرقی ایشیا کے لوگ ایشیا کے معاشروں اور تہذیبوں کے درمیان اختلافات کو تسلیم کرتے ہوئے ان میں بعض مشترک خواص کی بات کرتے ہیں۔ ایک چینی منحرف کے مطابق، ان خواص میں مرکزی حیثیت ''کنفیوشزم کے نظامِ اقدار کی [ہے] جسے تاریخ نے اعزاز بخشا ہے اور جو خطے کے بیشتر ملکوں میں مشترک'' ہے، علی الخصوص کفایت شعاری، خاندان، محنت اور انضباط پر اس کا زور۔ اتنی ہی اہمیت مشترکہ طور پر انفرادیت کو مسترد کرنے اور ''نرم'' آمریت یا جمہوریت کی بہت محدود شکلوں کے موجود ہونے کی ہے۔ مغرب کے مقابلے میں ایشیائی معاشرے ان علیحدہ اقدار کا دفاع کرنے اور اپنے معاشی مفادات کو فروغ دینے کے سلسلے میں مشترک مفادات رکھتے ہیں۔ ایشیائیوں کا موقف ہے کہ اس کے لیے ایشیا کے اندر تعاون کی نئی شکلیں درکار ہیں جیسے جنوبی مشرقی ایشیائی اقوام کی تنظیم آسیان (Association of Southeast Asian Nations) کی توسیع اور مشرقی ایشیائی معاشی کاکس (East Asian Economic Caucus) کا قیام۔ مشرقی ایشیائی معاشروں کا فوری اقتصادی مفاد تو مغربی منڈیوں تک رسائی برقرار رکھنا ہے مگر طویل المیعاد بنیادوں پر معاشی علاقائیت غالب آنے کا امکان ہے چنانچہ مشرقی ایشیا کو ایشیا کے اندر تجارت اور سرمایہ کاری بڑھانی چاہیے۔[۱۳] خاص طور پر ایشیائی ترقی کے رہنما کی حیثیت سے یہ جاپان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تاریخی ''ایشیائیت ترک کرنے اور مغربیت اختیار کرنے کی پالیسی'' چھوڑے اور ''ایشیائیت کو دوبارہ اپنانے کے راستے'' پر چلے، یا وسیع تر سطح پر، ''ایشیا کی ایشیائیت'' کو فروغ دے۔ یہ وہ راستہ ہے جس کی توثیق سنگاپوری حکام نے کی۔[۱۴]

چہارم، مشرقی ایشیائیوں کا کہنا ہے کہ ایشیائی ترقی اور ایشیائی اقدار وہ نمونے ہیں جن کی دوسرے غیر مغربی معاشروں کو مغرب کی ترقی تک پہنچنے کے لیے تقلید کرنی چاہیے اور جو مغرب کو اپنے احیا کے لیے اختیار کرنے چاہئیں۔ مشرقی ایشیائیوں کے بقول ''اینگلو سیکسن ماڈل، جو گزشتہ چار عشروں میں ترقی پذیر اقوام کی معیشتوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے اور ایک قابل عمل سیاسی نظام کی تعمیر کے لیے بے حد محترم متصور کیا گیا، کام نہیں کر رہا۔'' جوں جوں میکسیکو سے چلی، ایران اور ترکی اور سابق سوویت جمہوریاؤں تک متعدد ممالک اس سے سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی جگہ مشرقی ایشیائی ماڈل لے رہا ہے جیسے پچھلی نسلوں نے مغربی کامیابی سے سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ ایشیا کو ''بقیہ دنیا کو وہ اقدار منتقل کرنی چاہئیں جو آفاقی قدر و قیمت کی حامل ہیں... اس آدرش کی منتقلی کا مطلب ہے ایشیا، خصوصاً مشرقی ایشیا کے سماجی نظام کی برآمد۔'' جاپان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کے لیے ضروری ہے کہ ''ایشیا کو عالمگیر بنانے'' کے لیے ''بحرالکاہل کی عالمگیریت'' کا پرچار کریں اور اس

طرح "نئے عالمی نظام کے کردار کو فیصلہ کن انداز میں ڈھالیں"۔[۱۵]

طاقتور معاشرے آفاقیت پسند ہوتے ہیں جبکہ کمزور معاشرے محدودیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ مشرقی ایشیا کی بڑھتی ہوئی خود اعتمادی نے ایشیائی آفاقیت پسندی کو ابھارا ہے جس کا موازنہ اس آفاقیت سے کیا جاسکتا ہے جو مغرب کا خاصہ رہی ہے۔ وزیر اعظم مہاتیر نے ۱۹۹۶ء میں یورپی سربراہانِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایشیائی اقدار آفاقی اقدار ہیں۔ یورپی اقدار یورپی اقدار ہیں"۔[۱۶] اس کے ساتھ ایک ایشیائی "مغربیت" سامنے آرہی ہے جس میں مغرب کو اسی یکساں اور منفی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے جس میں مغرب کی "مشرقیت" کسی زمانے میں مشرق کو پیش کرتی تھی۔ مشرقی ایشیائیوں کے لیے معاشی خوشحالی اخلاقی برتری کا ثبوت ہے۔ اگر کبھی بھارت نے دنیا کے تیز ترین اقتصادی ترقی کرنے والے ملک کی حیثیت سے مشرقی ایشیا کی جگہ لے لی تو دنیا کو ہندو ثقافت کی برتری، معاشی ترقی میں ذات پات کے نظام کے کردار سے متعلق دعوے اور یہ سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ بھارت نے کس طرح برطانوی استعماریت کے زوال پذیر مغربی ورثے پر غالب آکر اور اپنی جڑوں کی طرف لوٹ کر تہذیبوں کی پہلی صف میں مناسب مقام حاصل کیا۔ مادی کامیابی کے بعد ثقافتی اثبات آتا ہے۔ سخت طاقت نرم طاقت کو جنم دیتی ہے۔

اسلامی احیا☆

ایشیائیوں نے اپنی معاشی ترقی کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ اپنا اثبات کرنا شروع کیا تو مسلمان شناخت، معنی، استحکام، جواز، ترقی، طاقت اور امید کی تلاش میں بڑی تعداد میں اسلام کی طرف پلٹ رہے تھے، وہ امید جس کی تجسیم "اسلام حل ہے" کے نعرے میں ہوتی ہے۔ یہ اسلامی احیا اپنی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے اسلامی تہذیب کے مغرب سے مقابلے و موازنے کے عمل کا تازہ

☆ نوٹ از مترجم: مصنف نے یہاں Resurgence کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے بارے میں یہ حاشیہ درج کیا ہے:
بعض قارئین کے ذہنوں میں سوال پیدا ہوگا کہ "Islamic Resurgence" میں "Resurgence" کو بڑے حرف (capital letter) سے کیوں شروع کیا گیا ہے۔ سبب یہ ہے کہ یہ ایک انتہائی اہم تاریخی واقعہ ہے جس سے نوع انسانی کا بیس فیصد یا زائد متاثر ہورہا ہے، یہ کم از کم انقلاب امریکا (American Revolution)، انقلاب فرانس (French Revolution) اور انقلاب روس (Russian Revolution) جتنا اہم ہے جن میں r کو عموماً بڑا لکھا جاتا ہے اور یہ کہ یہ مغربی معاشرے کی پروٹسٹنٹ اصلاح (Protestant Reformation) سے مماثل اور موازنے کے لائق ہے جس میں R تقریباً ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔

ترین مرحلہ ہے اور مغربی نظریات کی بجائے اسلام میں ''حل'' تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس میں جدیدیت کو قبول کرنا، مغربی ثقافت کو رد کرنا اور جدید دنیا میں زندگی کی رہنمائی کے لیے اسلام سے ازسرِنو وابستگی شامل ہیں۔ جیسا کہ ۱۹۹۴ء میں ایک اعلیٰ سعودی اہلکار نے وضاحت کی '' 'غیرملکی درآمدات' چمکدار اور ہائی ٹیک 'چیزوں' کے طور پر عمدہ ہیں۔ لیکن غیرمحسوس سماجی اور سیاسی ادارے کہیں اور سے درآمد کیے جائیں تو مہلک ہوسکتے ہیں-- شاہ ایران سے پوچھیے... اسلام ہمارے لیے محض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک طرزِ حیات ہے۔ ہم سعودی جدید بننا چاہتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ مغربیت اختیار کریں''۔[۱]

اسلامی احیا مسلمانوں کی یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ یہ ایک وسیع علمی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی تحریک ہے جو پورے عالمِ اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسلامی ''بنیاد پرستی'' جسے عام طور پر سیاسی اسلام سمجھا جاتا ہے، اسلامی تصورات، رواجوں اور طریقہ ہائے اظہار کے بڑے پیمانے پر احیا نیز مسلمان آبادیوں میں اسلام سے ازسرِنو وابستگی کا صرف ایک جز ہے۔ یہ احیا مرکزی دھارے میں ہے، انتہا پسندانہ نہیں؛ پھیلا ہوا ہے، الگ تھلگ نہیں۔

اس احیا نے مسلمانوں کو ہر ملک میں اور معاشرے کے زیادہ تر پہلوؤں کو اور بیشتر مسلمان ملکوں میں سیاست کو متاثر کیا ہے۔ جان ایل ایسپوسٹو نے لکھا ہے کہ ''ذاتی زندگی میں اسلامی بیداری کے اشاریے''

> متعدد ہیں: دینی فرائض (نماز روزہ وغیرہ) کی طرف توجہ بڑھ جانا، مذہبی تقریبات و مطبوعات کا عام ہونا، اسلامی ملبوسات و اقدار پر زیادہ زور، صوفی مسلک کا پھر متحرک ہوجانا۔ اس وسیع البنیاد بحالی کے ساتھ عوامی زندگی میں اسلامی رجحان والی حکومتوں، تنظیموں، قوانین، بینکوں، سماجی بہبود کی خدمات اور تعلیمی اداروں میں اضافہ ہوا ہے۔ حکومتوں اور حزب اختلاف کی تحریکوں دونوں نے اپنا اقتدار بڑھانے اور عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے اسلام کا رخ کیا ہے... ترکی اور تیونس جیسے سیکولر ملکوں سمیت بیشتر حکمران اور حکومتیں اسلام کی ممکنہ طاقت سے آگاہ ہورہے ہیں اور اسلامی مسائل کے بارے میں ان کی حساسیت اور تفکرات بڑھ گئے ہیں۔

اس سے ملتے جلتے انداز میں ایک اور ممتاز اسلامی دانشور علی ای ہلال دسوکی اس احیا کو مغربی قانون کی جگہ اسلامی قانون رائج کرنے کی کوششوں، مذہبی زبان اور علامات کے استعمال میں اضافے، اسلامی تعلیم میں توسیع (جو اسلامی مدارس کی تعداد بڑھنے اور عام سرکاری اسکولوں میں اسلامی نصاب کے نفاذ سے ظاہر ہوتی ہے)، معاشرتی رویے کے اسلامی ضوابط پر عمل میں اضافے (مثلاً پردہ، شراب سے اجتناب) اور دینی فرائض میں زیادہ شرکت، مسلمان معاشروں میں اسلامی

تنظیموں کی طرف سے سیکولر حکومتوں کی مخالفت اور اسلامی ریاستوں اور معاشروں کے درمیان بین الاقوامی یکجہتی پیدا کرنے کی بڑھتی ہوئی کوششوں کی صورت میں دیکھتا ہے۔[۱۸] خدائی انتقام ایک عالمی مظہر ہے لیکن خدا بلکہ اللہ نے اپنے انتقام کو اُمّہ میں بہت عام اور تسکین آور بنا دیا ہے۔

اسلامی احیا اپنے اظہار کی سیاسی شکلوں میں مارکسزم سے کچھ مشابہت رکھتا ہے۔ اس میں بھی مقدس کتاب، ایک کامل معاشرے کا تصور، بنیادی تبدیلی سے وابستگی، اہلِ اقتدار اور قومی ریاست کی نفی اور نظریاتی تنوع پایا جاتا ہے جس میں معتدل اصلاح پسندوں سے لے کر تشدد پسند انقلابی تک سب شامل ہیں۔ لیکن پروٹسٹنٹ اصلاح کلیسا سے اس کی مماثلت اور بھی زیادہ ہے۔ یہ دونوں ہی موجودہ اداروں کے جمود اور بدعنوانی کے ردعمل ہیں، اپنے مذہب کی زیادہ خالص اور سخت تر شکل کی طرف رجوع کرنے کی حمایت کرتے ہیں، محنت، ترتیب اور نظم و ضبط کی تلقین کرتے ہیں اور ابھرتے ہوئے، متحرک اور متوسط طبقے کے لیے پرکشش ہیں۔ دونوں پیچیدہ تحریکیں ہیں جن کے متنوع دھارے ہیں مگر دو اہم ہیں، لوتھرزنم اور کالونزم اور شیعہ وسنی بنیاد پرستی۔ حتیٰ کہ جان کالون اور آیت اللہ خمینی اور ان کے اس انضباط کے درمیان بھی مماثلت پائی جاتی ہے جو انہوں نے اپنے اپنے معاشروں میں نافذ کرنے کی کوشش کی۔ اصلاح کلیسا اور احیائے اسلام دونوں کی مرکزی روح بنیادی اصلاح ہے۔ ایک پیورٹن پادری نے کہا تھا ''اصلاح آفاقی ہونی چاہیے... تمام مقامات، تمام افراد اور پیشوں کی اصلاح کرو، ججوں کی بنچوں، کم درجے کے مجسٹریٹوں کی اصلاح کرو... جامعات کی اصلاح کرو، شہروں کی اصلاح کرو، دیہات کی اصلاح کرو، کم تر درجے کے تعلیمی اداروں کی اصلاح کرو، عبادت کی اصلاح کرو، احکامات کی، خدا کی عبادت کی اصلاح کرو۔'' اسی طرح ترابی کہتا ہے کہ ''یہ بیداری جامع ہے، یہ صرف انفرادی تقویٰ تک محدود نہیں۔ یہ صرف علمی اور ثقافتی نہیں، نہ ہی صرف سیاسی ہے۔ یہ سب کچھ ہے، اوپر سے نیچے تک معاشرے کی مکمل تعمیرِ نو''۔[۱۹]

ایک کلیدی پہلو کے حوالے سے احیائے اسلام اصلاح کلیسا سے مختلف ہے۔ مؤخر الذکر کا اثر زیادہ تر شمالی یورپ تک محدود تھا۔ اسپین، اٹلی، مشرقی یورپ اور ہیپس برگ کے علاقوں میں اس نے برائے نام پیش رفت کی۔ اس کے مقابلے میں اسلامی احیا نے تقریباً ہر مسلمان معاشرے کو چھوا ہے۔ اسلامی علامتوں، عقائد، رواجوں، اداروں، پالیسیوں اور تنظیموں کے پھیلنے کا ۱۹۷۰ء کے عشرے میں شروع ہونے والا سلسلہ مراکش سے انڈونیشیا تک اور نائجیریا سے قازقستان تک ایک ارب مسلمانوں کی دنیا میں ہر جگہ اپنا مقام بناتا چلا گیا۔ پہلے ثقافتی شعبے میں اسلامائزیشن کا رجحان پیدا ہوا اور پھر معاشرتی و سیاسی دائروں میں بھی پہنچ گیا۔ علمی و سیاسی رہنما، خواہ اس کے حامی تھے یا

مخالف، اسے نظر انداز کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اور کسی نہ کسی طرح اس کے مطابق ڈھلنے سے گریز نہیں کر سکتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ عمومی بیانات ہمیشہ خطرناک اور اکثر غلط ہوتے ہیں۔ لیکن ایک بیان درست معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۹۵ء میں غالب اکثریت میں مسلمان آبادی والا ہر ملک، سوائے ایران کے، پندرہ سال پہلے کے مقابلے میں زیادہ اسلامی اور ثقافتی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے زیادہ اسلام پسند ہو چکا تھا۔[۲]

بیشتر ملکوں میں اسلامائزیشن کا ایک مرکزی عنصر اسلامی معاشرتی اداروں کا پنپنا اور پہلے سے موجود اداروں پر اسلامی گروپوں کا قبضہ تھا۔ اسلام پسندوں نے دینی مدارس قائم کرنے اور سرکاری اسکولوں میں اسلامی اثرات کو توسیع دینے، دونوں پر خاص توجہ دی۔ اس کے نتیجے میں اسلامی گروپ ایک اسلامی ''شہری معاشرہ'' وجود میں لے آئے جو وسعت اور سرگرمیوں کے لحاظ سے سیکولر شہری معاشرے کے بہت سے ناتواں اداروں کے مقابلے پر آ گیا، سبقت لے گیا اور بعض اوقات اس کی جگہ لے لی۔ مصر میں ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل تک اسلامی تنظیموں نے اداروں کا ایک وسیع جال پھیلا دیا تھا جو، حکومت کے پیدا کردہ خلا میں مصر کے غربا کی بڑی تعداد کو صحت، بہبود، تعلیم اور دوسری خدمات فراہم کر رہے تھے۔ قاہرہ میں ۱۹۹۲ء کے زلزلے کے بعد یہ تنظیمیں ''چند گھنٹوں کے اندر سڑکوں پر تھیں اور خوراک اور کمبل تقسیم کر رہی تھیں جبکہ حکومت کی امدادی کوششیں پیچھے رہ گئیں۔'' اردن میں اخوان المسلمون نے ''ایک اسلامی جمہوریہ کا [معاشرتی اور ثقافتی] اساسی ڈھانچا'' تشکیل دینے کی پالیسی قصداً اختیار کی اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل تک ۴۰ لاکھ افراد کے اس چھوٹے سے ملک میں ایک بڑا اسپتال، بیس کلینک، چالیس اسلامی مدارس اور قرآنی مطالعے کے ۱۲۰ مراکز چل رہے تھے۔ اس سے ملحق مغربی کنارے اور غزہ میں اسلامی تنظیموں نے ''طلبہ یونینیں، نوجوانوں کی تنظیمیں اور مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی ادارے'' کنڈر گارٹن سے اسلامی یونیورسٹی تک، کلینک، یتیم خانے، معمر افراد کی ایک پناہ گاہ اور اسلامی منصفین اور ثالثین کا ایک نظام قائم کیا اور چلایا۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں اسلامی تنظیمیں پورے انڈونیشیا میں پھیل گئیں۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے آغاز تک سب سے بڑی تنظیم محمدی جاہ کے ۶۰ لاکھ ارکان ہو چکے تھے، یہ تنظیم ''مذہبی رفاہی ریاست کے اندر سیکولر ریاست'' بن گئی تھی اور پورے ملک میں اسکولوں، کلینکوں، اسپتالوں اور یونیورسٹی کی سطح کے تعلیمی اداروں کے جال کے ذریعے ''مہد سے لحد تک'' خدمات بہم پہنچا رہی تھی۔ اِن اور دیگر معاشروں میں اسلامی تنظیمیں جن کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی، اس طرح سماجی خدمت کر رہی تھیں جیسی بیسویں صدی کی ابتدا میں امریکا میں سیاسی اداروں نے سرانجام دی تھی۔[۲۱]

اسلامی احیا کے سیاسی اظہار کی شکلیں اتنی نہیں پھیل سکیں جتنی معاشرتی و ثقافتی اظہار کی شکلیں پھیلیں پھر بھی یہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں مسلمان معاشروں کی سب سے اہم سیاسی تبدیلی ہے۔ اسلام پسند تحریکوں کی سیاسی حمایت کا حدود اربعہ مختلف ملکوں میں مختلف رہا ہے۔ تاہم کچھ رجحانات سب میں نظر آتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان تحریکوں کو دیہی اعلیٰ طبقات، کسانوں اور بوڑھوں کی زیادہ حمایت میسر نہیں آتی۔ دوسرے مذاہب کے بنیاد پرستوں کی مانند اسلام پسند بھی جدیدیت کے عمل میں بھرپور انداز میں شریک ہیں اور اسی کی پیداوار ہیں۔ یہ لوگ متحرک اور جدید نقطہ نگاہ کے حامل نوجوان ہیں جو بیشتر تین گروپوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

جیسا کہ بیشتر انقلابی تحریکوں میں ہوتا ہے، بڑا حصہ طلبہ اور دانشوروں پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر ملکوں میں سیاسی اسلامائزیشن کے عمل کا پہلا مرحلہ بنیاد پرستوں کا طلبہ یونینوں یا اس جیسی تنظیموں پر قبضہ کرنا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں مصر، پاکستان اور افغانستان کی یونیورسٹیوں میں اسلام پسندوں کا ''بریک تھرو'' ہوا۔ تیکنیکی اداروں، انجینئرنگ فیکلٹیز اور سائنس کے شعبوں میں خاص طور پر اسلام پسندوں کی قوت زیادہ تھی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں سعودی عرب، الجزائر اور دوسرے مقامات پر ''دوسری پیڑھی کی مقامیت'' کے عمل کا اظہار اس طرح ہو رہا تھا کہ یونیورسٹی کے طلبہ کی زیادہ تعداد اپنی مقامی زبانوں میں تعلیم پا رہی تھی اور اسلام پسندوں کے اثرات کے دائرے میں آ رہی تھی۔[۲۲] اسلام پسند تحریکوں نے اکثر عورتوں کو اپنی جانب کھینچا اور ترکی میں سیکولر خواتین کی پرانی نسل اور ان کی اسلام کی طرف مائل بیٹیوں اور پوتیوں میں واضح فرق تھا۔[۲۳] مصری اسلام پسند رہنماؤں کے بارے میں ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان میں پانچ اہم خصوصیات ہیں جو دوسرے ملکوں کے اسلام پسندوں میں موجود ہیں۔ یہ لوگ جوان تھے، زیادہ تر بیس تیس سال کے لگ بھگ۔ اسی فیصد یونیورسٹی کے طلبہ یا یونیورسٹی گریجویٹ تھے۔ نصف سے زیادہ کا تعلق بلند معیار کے کالجوں یا علمی اعتبار سے تیکنیکی تخصیص کے دشوار ترین شعبوں مثلاً طب یا انجینئرنگ سے تھا۔ ستر فیصد سے زائد نچلے متوسط طبقے سے متعلق تھے، ''پس منظر معمولی مگر غریب نہیں'' اور اپنے خاندان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی پہلی نسل تھے۔ ان لوگوں نے اپنا بچپن چھوٹے قصبوں یا دیہی علاقوں میں گزارا مگر بڑے شہروں میں رہنے لگے تھے۔[۲۴]

طلبہ اور دانشور تو اسلام پسند تحریکوں کی شدت پسند صفوں میں تھے لیکن ارکان کی اکثریت شہری متوسط طبقے کے افراد پر مشتمل تھی۔ کسی حد تک ان کا تعلق ان گروہوں سے تھا جن کو اکثر ''روایتی'' متوسط طبقہ کہا جاتا ہے: تاجر، کاروباری لوگ، چھوٹے بیوپاری، بازاری۔ انقلاب ایران میں ان

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں دنیا میں جمہوریت کی ایک لہر پھیل گئی جس نے کئی درجن ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس لہر کا مسلم ممالک پر اثر پڑا مگر محدود۔ جنوبی یورپ، لاطینی امریکا، مشرقی ایشیائی گردوپیش اور وسطی یورپ میں جمہوری تحریکیں قوت پکڑ رہی تھیں اور برسراقتدار آ رہی تھیں تو ساتھ ہی مسلمان ملکوں میں اسلام پسند تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ مسیحی معاشروں میں آمریت کی جمہوری مخالفت کا عملی متبادل اسلام پسندی تھی جو بڑی حد تک مماثل اسباب کا نتیجہ تھی: سماجی تحرک، کارکردگی کی بنا پر آمرانہ حکومتوں کے جواز کا نہ ہونا اور بدلتا ہوا بین الاقوامی ماحول بشمول تیل کے نرخوں میں اضافہ، جس نے مسلم دنیا کو جمہوری کی بجائے اسلام پسندی کا راستہ اختیار کرنے کی طرف راغب کیا۔ مسیحی معاشروں میں پادریوں اور عام مذہبی گروپوں نے آمرانہ حکومتوں کی مخالفت میں اہم کردار ادا کیا اور مسلمان ملکوں میں علما، مساجد سے منسلک گروپوں اور اسلام پسندوں نے مخالفانہ کردار ادا کیا۔ پولینڈ میں کمیونسٹ حکومت ختم کرنے میں پوپ کا اور ایران میں شاہ کی حکومت گرانے میں آیت اللہ کا مرکزی کردار تھا۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں مسلمان ملکوں میں حکومت مخالف سرگرمیوں پر اسلام پسند تحریکیں چھائی ہوئی تھیں بلکہ اکثر ان سرگرمیوں پر انہی کی اجارہ داری تھی۔ ان کی مضبوطی کا جزوی سبب یہ تھا کہ حزب اختلاف کے متبادل ذرائع کمزور تھے۔ بائیں بازو کی اور کمیونسٹ تحریکیں بدنام ہو چکی تھیں اور پھر سوویت یونین اور بین الاقوامی کمیونزم کے خاتمے کے باعث جڑ سے اکھڑ گئی تھیں۔ بیشتر مسلمان معاشروں میں حزب اختلاف کے لبرل، جمہوری گروہ موجود تھے لیکن عموماً دانشوروں کی تھوڑی سی تعداد اور مغربی جڑیں یا روابط رکھنے والوں تک محدود تھے۔ اکا دکا مستثنیات کے علاوہ لبرل جمہوری لوگ مسلمان معاشروں میں عوامی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ فواد عجمی کا تبصرہ ہے کہ "ایک کے بعد ایک مسلمان معاشروں میں لبرل ازم اور قومی بورژوا روایت کے بارے میں لکھنا ان افراد کا تعزیت نامہ لکھنے کے مترادف ہے جنھوں نے ناممکنات کو ممکن بنانے کی کوشش کی اور ناکام ہو گئے"۔[۲] لبرل جمہوریت کا مسلمان معاشروں میں قوت پکڑنے میں ناکام رہنا ایک پوری صدی کا مسلسل اور بار بار سامنے آنے والا عمل ہے جس کی ابتدا ۱۸۰۰ء کے عشرے کے اواخر میں ہوئی تھی۔ اس ناکامی کی وجہ کم از کم جزوی طور پر یہ ہے کہ اسلامی ثقافت اور معاشرے کی نوعیت مغربی لبرل تصورات کے لیے سازگار نہیں۔

اسلامی تحریکوں کی حزب اختلاف کی حیثیت سے اور خود کو موجودہ حکومتوں کے واحد متبادل کے طور پر کامیابی میں ان حکومتوں کی پالیسیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ سرد جنگ کے دوران کسی نہ کسی موقعے

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں دنیا میں جمہوریت کی ایک لہر پھیل گئی جس نے کئی درجن ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس لہر کا مسلم ممالک پر اثر پڑا مگر محدود۔ جنوبی یورپ، لاطینی امریکا، مشرقی ایشیائی گردوپیش اور وسطی یورپ میں جمہوری تحریکیں قوت پکڑ رہی تھیں اور برسر اقتدار آ رہی تھیں تو ساتھ ہی مسلمان ملکوں میں اسلام پسند تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ مسیحی معاشروں میں آمریت کی جمہوری مخالفت کا عملی متبادل اسلام پسندی تھی جو بڑی حد تک مماثل اسباب کا نتیجہ تھی: سماجی تحرک، کارکردگی کی بنا پر آمرانہ حکومتوں کے جواز کا نہ ہونا اور بدلتا ہوا بین الاقوامی ماحول بشمول تیل کے نرخوں میں اضافہ، جس نے مسلم دنیا کو جمہوری کی بجائے اسلام پسندی کا راستہ اختیار کرنے کی طرف راغب کیا۔ مسیحی معاشروں میں پادریوں اور عام مذہبی گروپوں نے آمرانہ حکومتوں کی مخالفت میں اہم کردار ادا کیا اور مسلمان ملکوں میں علما، مساجد سے منسلک گروپوں اور اسلام پسندوں نے مخالفانہ کردار ادا کیا۔ پولینڈ میں کمیونسٹ حکومت ختم کرنے میں پوپ کا اور ایران میں شاہ کی حکومت گرانے میں آیت اللہ کا مرکزی کردار تھا۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں مسلمان ملکوں میں حکومت مخالف سرگرمیوں پر اسلام پسند تحریکیں چھائی ہوئی تھیں بلکہ اکثر ان سرگرمیوں پر انہی کی اجارہ داری تھی۔ ان کی مضبوطی کا جزوی سبب یہ تھا کہ حزب اختلاف کے متبادل ذرائع کمزور تھے۔ بائیں بازو کی اور کمیونسٹ تحریکیں بدنام ہو چکی تھیں اور پھر سوویت یونین اور بین الاقوامی کمیونزم کے خاتمے کے باعث جڑ سے اکھڑ گئی تھیں۔ بیشتر مسلمان معاشروں میں حزب اختلاف کے لبرل، جمہوری گروہ موجود تھے لیکن عموماً دانشوروں کی تھوڑی سی تعداد اور مغربی جڑیں یا روابط رکھنے والوں تک محدود تھے۔ اکا دکا مستثنیات کے علاوہ لبرل جمہوری لوگ مسلمان معاشروں میں عوامی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ فواد عجمی کا تبصرہ ہے کہ ''ایک کے بعد ایک مسلمان معاشروں میں لبرل ازم اور قومی بورژوا روایت کے بارے میں لکھنا ان افراد کا تعزیت نامہ لکھنے کے مترادف ہے جنھوں نے ناممکنات کو ممکن بنانے کی کوشش کی اور ناکام ہو گئے''۔[۲] لبرل جمہوریت کا مسلمان معاشروں میں قوت پکڑنے میں ناکام رہنا ایک پوری صدی کا مسلسل اور بار بار سامنے آنے والا عمل ہے جس کی ابتدا ۱۸۰۰ء کے عشرے کے اواخر میں ہوئی تھی۔ اس ناکامی کی وجہ کم از کم جزوی طور پر یہ ہے کہ اسلامی ثقافت اور معاشرے کی نوعیت مغربی لبرل تصورات کے لیے سازگار نہیں۔

اسلامی تحریکوں کی حزب اختلاف کی حیثیت سے اور خود کو موجودہ حکومتوں کے واحد متبادل کے طور پر کامیابی میں ان حکومتوں کی پالیسیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ سرد جنگ کے دوران کسی نہ کسی موقع

پر الجزائر، ترکی، اردن، مصر اور اسرائیل سمیت متعدد حکومتوں نے کمیونسٹ یا مخالف قوم پرست تحریکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام پسندوں کی حوصلہ افزائی اور مدد کی۔ کم از کم جنگ خلیج تک سعودی عرب اور دوسری خلیجی ریاستوں نے اخوان المسلمون اور اسلام پسند گروپوں کو بہت سے ملکوں میں بھاری مالی امداد فراہم کی۔ سیکولر حزب اختلاف کو دبانے کی حکومتی کوششوں سے بھی اسلام پسند تنظیموں کو حزب اختلاف میں اپنا مقام بنانے کا موقع ملا۔ بنیاد پرستوں کی قوت عموماً سیکولر اور جمہوری جماعتوں سے معکوس تناسب رکھتی تھی اور ان ملکوں میں، جیسے مراکش اور ترکی میں، کم تھی جہاں کسی حد تک کئی جماعتوں کو مقابلہ کرنے کی اجازت تھی بہ نسبت ان ملکوں کے جہاں تمام مخالفین کو دبایا جاتا تھا۔[۲۸] تاہم سیکولر حزب اختلاف کو مذہبی مخالفین کے مقابلے میں دبانا آسان ہے۔ مؤخر الذکر مساجد، رفاہی تنظیموں، فاؤنڈیشنوں اور دوسرے مسلمان اداروں کے جال کے پیچھے سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہیں جن کے بارے میں حکومت محسوس کرتی ہے کہ نہیں دبا سکتی۔ لبرل جمہوری گروپوں کے پاس ایسی کوئی ڈھال نہیں ہوتی اور حکومت انہیں آسانی سے قابو یا ختم کر سکتی ہے۔

اسلام پسندانہ رجحانات کے فروغ کو روکنے کے لیے حکومتوں نے سرکاری اسکولوں میں دینی تعلیم کا دائرہ وسیع کیا لیکن ہوا یہ کہ ان اسکولوں میں اکثر اسلام پسند اساتذہ اور خیالات کا دور دورہ ہو گیا جس سے مذہب اور دینی تعلیمی اداروں کے لیے حمایت و امداد بڑھ گئی۔ یہ اقدامات جزواً حکومت کی اسلام سے وابستگی کی علامت تھے۔ نیز مالیاتی امداد کے ذریعے اسلامی اداروں اور تعلیم پر سرکاری اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ تاہم اس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں اسلامی اقدار سے آگاہی رکھنے والے افراد پیدا ہوئے جو اسلام پسندی کی طرف مائل تھے۔ ان تعلیمی اداروں سے ایسے شدت پسند نکلے جنہوں نے اسلامی مقاصد کے لیے کام شروع کر دیا۔

اسلامی احیا اور اسلام پسندانہ تحریکوں کی کشش سے حکومتوں کو اسلامی اداروں اور رواجوں کو فروغ دینے اور سرکاری معاملات میں اسلامی علامات اور طور طریقوں کو رائج کرنے کی ترغیب ملی۔ وسیع ترین سطح پر اس کا مطلب تھا اپنی ریاست اور معاشرے کے اسلامی کردار کا اثبات یا اثبات نو۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں میں سیاسی رہنماؤں نے اپنی حکومتوں کو اور اپنے آپ کو اسلام سے شناخت کرنے کے لیے تیزی سے اقدامات کرنے شروع کر دیے۔ اردن کے شاہ حسین جنہیں یقین تھا کہ عرب دنیا میں سیکولر حکومتوں کا کوئی مستقبل نہیں، ''اسلامی جمہوریت'' اور ''جدیدیت پر مبنی اسلام'' کی ضرورت کا تذکرہ کیا۔ مراکش کے شاہ حسن نے رسول [ﷺ] سے اپنے نسبی رشتے اور امیر المؤمنین کی حیثیت سے اپنے کردار پر زور دیا۔ سلطان برونائی نے جو پہلے اسلامی رواجوں پر عمل

کے حوالے سے شہرت نہیں رکھتے تھے بے پناہ متقی بن گئے اور اپنی حکومت کو ''ملائی مسلم فرماں روائی'' قرار دیا۔ تیونس کے بن علی اپنی تقریروں میں اللہ کا نام لینے لگے اور اسلامی گروپوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے کے لیے ''خود کو اسلامی لبادے میں لپیٹ لیا''[29] ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں سوہارتو نے واضح انداز میں ''زیادہ مسلمان'' بننے کی پالیسی اپنالی۔ بنگلہ دیش میں ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں ''سیکولرزم'' کا اصول آئین سے حذف کر دیا گیا اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل تک ترکی کی سیکولر اور کمال ازم پر مبنی شناخت کو پہلی مرتبہ سنگین چیلنج در پیش ہوا۔[30] سرکاری رہنماؤں-- اوزال، سوہارتو، کریموف-- نے اپنی اسلام سے وابستگی کو نمایاں کرنے کے لیے جلدی جلدی حج کرنا شروع کر دیے۔

مسلمان ملکوں کی حکومتوں نے قوانین کو بھی اسلامی شکل دینے کے لیے اقدامات کیے۔ انڈونیشیا میں اسلامی قانونی تصورات اور رواج سیکولر قانونی نظام میں شامل کر دیے گئے۔ اس کے مقابلے میں ملائشیا میں جہاں غیر مسلم آبادی خاصی تھی دو علیحدہ قانونی نظاموں کی تشکیل کی طرف پیش رفت کی جن میں ایک اسلامی اور ایک سیکولر تھا۔[31] پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں قانون و معیشت کی اسلامائزیشن کی وسیع پیمانے پر کوششیں کی گئیں۔ اسلامی سزائیں متعارف کرائی گئیں، شرعی عدالتوں کا ایک نظام قائم کیا گیا اور شریعت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دیا گیا۔

عالمی سطح پر مذہب کے احیا کی دوسری شکلوں کی طرح اسلامی احیا بھی جدیدیت کی پیداوار اور اس سے نمٹنے کی کوشش ہے۔ اس کے پس پردہ اسباب وہ ہیں جنہیں بالعموم غیر مغربی معاشروں میں مقامیت کے رجحان کا ذمے دار سمجھا جاتا ہے: شہری آبادی کا بڑھنا، سماجی حرکت، خواندگی اور تعلیم میں اضافہ، مواصلات اور ابلاغ کا بڑھنا اور مغربی و دیگر ثقافتوں سے روابط میں توسیع۔ ان تبدیلیوں نے روایتی دیہی اور قبائلی بندھن توڑے اور تنہائی اور شناخت کا بحران پیدا کیا۔ اسلامی علامات، وابستگیاں اور عقائد ان نفسیاتی ضروریات کو اور اسلامی رفاہی تنظیمیں جدیدیت کے اس عمل سے گزرنے والے مسلمانوں کی معاشرتی، ثقافتی اور معاشی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ مسلمان اسلامی تصورات، طور طریقوں اور ان اداروں کی طرف لوٹنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو جدیدیت کے اس عمل میں انہیں سمت اور حرکت کی قوت فراہم کر سکیں۔[32]

یہ کہا گیا ہے کہ اسلامی احیا ''مغرب کی زوال پذیر طاقت اور وقار کی پیداوار [بھی تھا]... جب مغرب نے اپنی مکمل بالادستی چھوڑی تو اس کے آدرش اور ادارے اپنی چمک کھو بیٹھے۔'' مخصوص واقعات کی بات کی جائے تو احیائے اسلام کو ۱۹۷۰ء کی دہائی میں تیل کی دولت سے تحریک اور ہوا

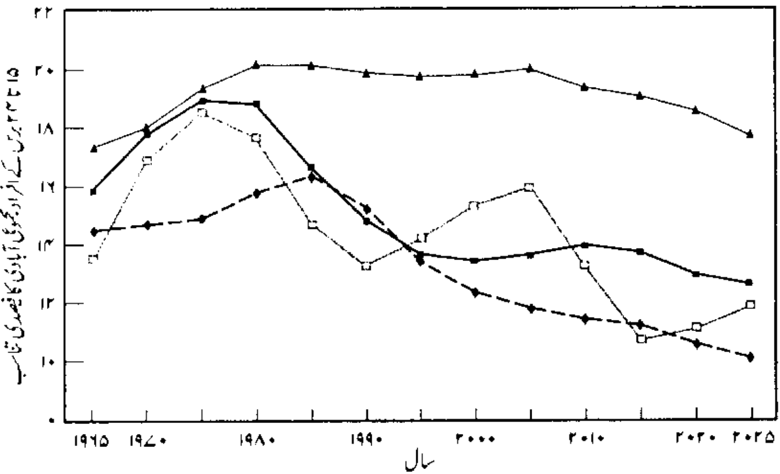
ملی جس سے بیشتر مسلمان ملکوں کی دولت اور طاقت بہت بڑھ گئی اور وہ غالب ومغلوب کے اس تعلق کو الٹ دینے میں کامیاب ہوئے جو مغرب کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ جیسا کہ جان بی کیلی نے اُس وقت کہا تھا ''سعودیوں کے لیے اہلِ مغرب کو توہین آمیز سزائیں دینا بلاشبہ دہرے اطمینان کا باعث ہے کیونکہ اس سے نا صرف سعودی عرب کی طاقت اور آزادی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ عیسائیت کی تحقیر اور اسلام کی برتری بھی ثابت ہوتی ہے، جو ثابت کرنا مقصود بھی ہے۔'' تیل کی دولت سے مالا مال مسلمان ملکوں کے اقدامات کو ''اگر تاریخی، مذہبی، نسلی اور ثقافتی پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ مسیحی مغرب کو مسلمان مشرق کے احسان تلے دبانے کی دلیرانہ کوشش سے کم نہیں''۔[۳۳] سعودی، لیبیائی اور دوسری حکومتوں نے احیائے اسلام کو تحریک دینے اور مالی مدد فراہم کرنے کے لیے اپنی تیل کی دولت استعمال کی اور مسلمانوں کی دولت نے مسلمانوں کو مغربی ثقافت کے سحر سے آزاد کر کے اپنی ثقافت سے گہری وابستگی اور غیر اسلامی معاشروں میں اسلام کے مقام واہمیت کا اثبات کرنے کی جانب مائل کیا۔ جیسے پہلے مغربی دولت کو مغربی ثقافت کی برتری کے ثبوت کے طور پر دیکھا گیا تھا اسی طرح اب تیل کی دولت کو اسلام کی برتری کے ثبوت کے طور پر دیکھا گیا۔

تیل کے نرخوں میں اضافے نے جو محرک فراہم کیا تھا وہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں مدھم پڑ گیا لیکن آبادی میں اضافہ ایک مسلسل قوت محرکہ بنا رہا۔ مشرقی ایشیا کا عروج اقتصادی نمو کی حیرت انگیز شرحوں کا مرہونِ منت تھا تو احیائے اسلام کو آبادی میں اضافے کی حیرت انگیز شرحوں سے طاقت ملی۔ اسلامی ممالک میں خصوصاً بلقان، شمالی افریقہ اور وسط ایشیا کے خطوں میں آبادی میں اضافے پڑوسی ملکوں اور عمومی طور پر دنیا کی بہ نسبت خاصے زیادہ تھے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان کرۂ ارض پر لوگوں کی کل تعداد ۳ء۳/ارب سے بڑھ کر ۵ء۳/ارب ہوگئی جو ۸۵ء۱/فیصد کی سالانہ شرح اضافہ کے مساوی ہے۔ مسلمان معاشروں میں اضافے کی شرحیں تقریباً ہمیشہ دو فیصد سے زیادہ، اکثر ۵ء۲/فیصد سے متجاوز اور بعض اوقات ۳/فیصد سے بھی زائد تھیں۔ مثال کے طور پر شمالی افریقہ کی آبادی ۶۵ء۲/فیصد کی شرح سے ۲/کروڑ ۹۸/لاکھ سے بڑھ کر ۵/کروڑ ۹۰/لاکھ ہوگئی۔ ان میں الجزائریوں کی آبادی ۳/فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھی۔ انہی برسوں کے دوران مصریوں کی تعداد ۳ء۲/فیصد کی شرح سے ۲/کروڑ ۹۴/لاکھ سے بڑھ کر ۵/کروڑ ۲۴/لاکھ ہوگئی۔ وسط ایشیا میں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۹۳ء کے درمیان تاجکستان میں ۹ء۲، ازبکستان میں ۶ء۲، ترکمانستان میں ۵ء۲، کرغزستان میں ۹ء۱ لیکن قازقستان میں، جہاں تقریباً نصف آبادی روسی ہے، صرف ۱ء۱/فیصد کی شرح سے آبادی بڑھی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں آبادی میں اضافے کی شرحیں

۲ء۵ رفیصد سالانہ سے زیادہ جبکہ انڈونیشیا میں ۲رفیصد سالانہ سے زیادہ رہی۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا، بحیثیت مجموعی مسلمان ۱۹۸۰ء میں عالمی آبادی کا شاید ۱۸رفیصد تھے جبکہ ۲۰۰۰ء میں ۲۰رفیصد اور ۲۰۲۵ء میں ۳۰رفیصد ہو جانے امکان ہے۔[۳۴]

شمالی افریقہ اور دوسرے خطوں میں آبادی کی شرحوں میں اضافے اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئے ہیں اور اب کم ہونے لگے ہیں لیکن مطلق تعداد میں اضافہ زیادہ ہوتا رہے گا اور اس اضافے کا اثر اکیسویں صدی کے پہلے حصے کے دوران محسوس کیا جاتا رہے گا۔ مستقبل میں برسوں تک مسلمان آبادیوں کا بہت بڑا حصہ جوانوں پر مشتمل ہوگا جن میں نوعمروں اور نوجوانوں کی واضح اکثریت ہوگی (دیکھئے شکل ۲ء۵)۔ مزید برآں اس عمر کے گروپ کے افراد غالب طور پر شہری ہوں گے اور کم از کم ثانوی درجے تک تعلیم یافتہ ہوں گے۔ عددی کثرت اور سماجی تحریک کے اس ملاپ کے تین اہم

شکل ۲ء۵
آبادیاتی چیلنج: اسلام، روس اور مغرب



ماخذ: اقوام متحدہ، آبادی ڈویژن، شعبہ برائے اقتصادی و معاشرتی ترقی و پالیسی تجزیہ *World Population Prospects, The 1994 Revision* (نیویارک: اقوام متحدہ، ۱۹۹۵ء)؛ اقوام متحدہ آبادی ڈویژن، شعبہ برائے اقتصادی و معاشرتی ترقی و پالیسی تجزیہ *Sex and Age Distribution of the World Populations, The 1994 Revision* (نیویارک: اقوام متحدہ، ۱۹۹۴ء)۔

سیاسی نتائج ہیں۔

اول، نوجوان احتجاج، عدم استحکام، اصلاح اور انقلاب کے حامی ہوتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ایسی تحریکوں اور نوجوانوں کے بڑے گروہوں کا وجود اکثر ایک ساتھ پایا گیا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ ''پروٹسٹنٹ اصلاح کلیسا تاریخ میں نوجوانوں کی شاندار تحریکوں کی ایک مثال ہے۔'' جیک گولڈسٹون نے اس بارے میں متاثر کن استدلال پیش کیا ہے کہ سترہویں صدی کے وسط اور اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یوریشیا میں اٹھنے والی انقلاب کی دولہروں میں آبادی کا اضافہ مرکزی عنصر تھا۔[۳۵] اٹھارہویں صدی کے آخری عشروں میں مغربی ممالک میں نوجوانوں کے تناسب میں نمایاں توسیع کے ساتھ ''جمہوری انقلاب کا دور'' آیا۔ انیسویں صدی میں کامیاب صنعت کاری اور ترک وطن نے یورپی سماجوں میں نوجوان آبادی کے سیاسی اثرات کم کردیے۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں نوجوانوں کی آبادی پھر بڑھی جس سے فاشسٹ اور دوسری انتہا پسند تحریکوں کو افرادی قوت میسر آئی۔[۳۶] چار دہائیاں گزریں تو دوسری جنگ عظیم کے بعد کی بے بی بوم والی نسل نے ۱۹۶۰ء کے عشرے کے احتجاجی مظاہروں میں اپنا سیاسی اثر دکھایا۔

احیائے اسلام میں نوجوانانِ اسلام اپنا اثر ڈالتے رہے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں جب احیا شروع ہوا اور جب ۱۹۸۰ء کے عشرے میں اس نے زور پکڑا تو بڑے مسلمان ممالک میں نوجوانوں کا تناسب (یعنی پندرہ سے چوبیس سال کی عمر کے افراد) خاصا بڑھا اور مجموعی آبادی کے ۲۰ فیصد سے متجاوز ہونے لگا۔ بیشتر مسلمان ملکوں میں نوجوانوں کی آبادی ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں نقطہ عروج پر پہنچ گئی، بعض میں اگلی صدی کی ابتدا میں پہنچے گی (جدول ۱ء ۵)۔ ان تمام ممالک میں اصل یا تخمین شدہ نقطہ ہائے عروج ایک استثنا کے سوا ۲۰ فیصد سے زائد ہیں۔ سعودی عرب میں اکیسویں صدی کے پہلے عشرے کا تخمین شدہ نقطہ عروج اس سے ذرا کم ہے۔ یہ نوجوان اسلامی تنظیموں اور سیاسی تحریکوں کو افرادی قوت فراہم کرتے ہیں۔ یہ شاید اتفاق نہیں ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ایران کی آبادی میں نوجوانوں کا تناسب ڈرامائی طور پر بڑھ گیا۔ اس دہائی کے پہلے نصف میں یہ ۲۰ فیصد تک جا پہنچا اور یہ کہ انقلاب ایران ۱۹۷۹ء میں آیا۔ الجزائر میں یہ صورت ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل میں ہوئی جب اسلام پسند ایف آئی ایس عوامی حمایت اور انتخابی فتوحات حاصل کر رہی تھی۔ نوجوان مسلمان آبادی میں اضافوں کے اندر ممکنہ طور پر اہم علاقائی اختلافات بھی ہوتے ہیں (شکل ۳ء۵)۔ ان معلومات پر محتاط انداز میں نظر ڈالنی چاہیے تاہم ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس صدی کے خاتمے پر بوسنیا اور البانیہ میں نوجوانوں کا تناسب تیزی سے گرے گا۔ دوسری طرف خلیجی ریاستوں

جدول ۵ء۱
مسلمان ممالک میں نوجوان آبادی کی کثرت

۱۹۷۰ء کا عشرہ	۱۹۸۰ء کا عشرہ	۱۹۹۰ء کا عشرہ	۲۰۰۰ء کا عشرہ	۲۰۱۰ء کا عشرہ
بوسنیا	شام	الجزائر	تاجکستان	کرغزستان
بحرین	البانیہ	عراق	ترکمانستان	ملائیشیا
متحدہ عرب امارات	یمن	اردن	مصر	پاکستان
ایران	ترکی	مراکش	ایران	شام
مصر	تیونس	بنگلہ دیش	سعودی عرب	یمن
قازقستان	پاکستان	انڈونیشیا	کویت	اردن
	ملائیشیا		سوڈان	عراق
	کرغزستان			عمان
	تاجکستان			لیبیا
	ترکمانستان			افغانستان
	آذربائیجان			

وہ عشرے جن میں ۱۵ تا ۲۴ برس عمر کے افراد کی آبادی سب سے زیادہ رہی یا ہونے کی توقع ہے، مجموعی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے (تقریباً ہمیشہ ۲۰ فیصد سے زیادہ)۔ بعض ملکوں میں یہ تناسب دوبار نقطہ عروج پر پہنچا۔

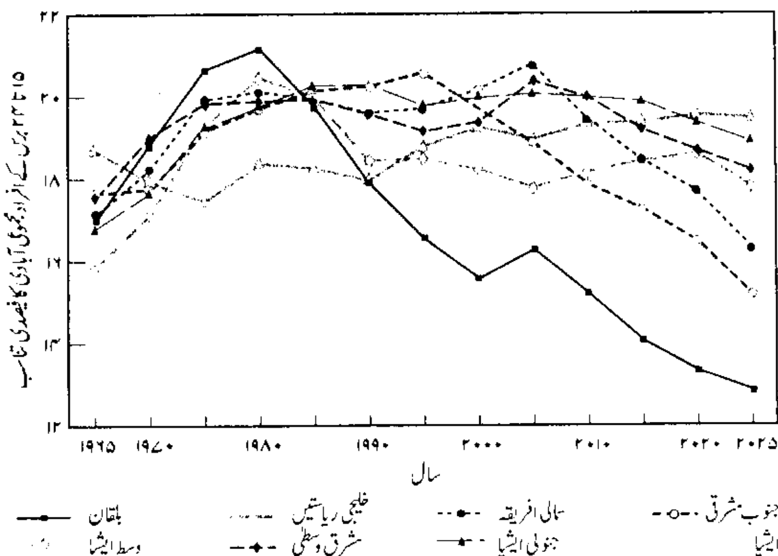
ماخذ: دیکھیے شکل ۵ء۲

میں نوجوانوں کی شرح زیادہ رہے گی۔ ۱۹۸۸ء میں سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ نے کہا کہ ان کے ملک کو سب سے بڑا خطرہ نوجوانوں میں اسلامی بنیاد پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان سے ہے۔[۳۷] ان تخمینوں کے مطابق یہ خطرہ اکیسویں صدی میں عرصے تک برقرار رہے گا۔

بڑے عرب ممالک (الجزائر، مصر، مراکش، شام اور تیونس) میں بیس سے پچیس سال کی عمروں کے ملازمت کے متلاشی افراد کی تعداد ۲۰۱۰ء تک بڑھے گی۔ ۱۹۹۰ء کے مقابلے میں ملازمت کی منڈی میں داخل ہونے والوں کی تعداد تیونس میں ۳۰ فیصد، الجزائر، مصر اور مراکش میں تقریباً ۵۰ فیصد اور شام میں ۱۰۰ فیصد سے زائد بڑھ جائے گی۔ عرب ملکوں میں خواندگی میں تیزی سے اضافہ بھی خواندہ نوجوان نسل اور زیادہ تر ناخواندہ پرانی نسل کے درمیان خلیج پیدا کر رہا ہے اور اس طرح امکان ہے کہ "علم اور اقتدار کے درمیان افتراق" "سیاسی نظاموں میں کھچاؤ کی کیفیت پیدا کرنے" کا باعث بنے گا۔[۳۸]

شکل ۳ء۵

نوجوان مسلم آبادی کی کثرت بلحاظ خطہ



ماخذ: اقوام متحدہ، آبادی ڈویژن، شعبہ برائے اقتصادی و معاشرتی ترقی و پالیسی تجزیہ، *World Population Prospects, The 1994 Revision* (نیو یارک: اقوام متحدہ، ۱۹۹۵ء)؛ اقوام متحدہ آبادی ڈویژن، شعبہ برائے اقتصادی و معاشرتی ترقی و پالیسی تجزیہ *Sex and Age Distribution of the World Populations, The 1994 Revision* (نیو یارک: اقوام متحدہ، ۱۹۹۴ء)۔

بڑی آبادیوں کو زیادہ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے گھنی اور/یا تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی والے معاشروں میں آگے بڑھنے، زمین پر قبضہ کرنے اور دوسری کم آبادی والی اقوام پر دباؤ ڈالنے کا رجحان ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ اسلامی دنیا میں مسلمانوں اور دوسری اقوام کے مابین تنازعات کا بڑا سبب ہے۔ آبادی کا دباؤ اور اس کے ساتھ اقتصادی جمود مغربی اور دیگر غیر مسلم معاشروں کی سمت مسلمانوں کی ہجرت کے رجحان میں اضافہ کرتا ہے جس سے ان معاشروں میں تارکین وطن ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔ ایک ثقافت کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی دوسری ثقافت کی سست رفتاری سے بڑھتی ہوئی یا رکی ہوئی آبادی ایک دوسرے کے مقابل ہوتی ہیں تو دونوں معاشروں میں معاشی اور/یا سیاسی تبدیلیوں کے لیے دباؤ پیدا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۰ء کے عشرے میں سابق سوویت یونین میں آبادی کا توازن بہت زیادہ بدلا۔ مسلمانوں

کی آبادی ۲۴ فیصد جبکہ روسیوں کی ۶٫۵ فیصد بڑھی جس سے وسط ایشیائی کمیونسٹ رہنما سخت تشویش میں مبتلا ہو گئے[۳۹] اسی طرح البانویوں کی تعداد میں تیزی سے ہونے والے اضافے سے سربوں، یونانیوں اور اطالویوں کو فکر لاحق ہوتی ہے۔ اسرائیلیوں کو فلسطینیوں کی شرح آبادی زیادہ ہونے پر تشویش ہے اور اسپین، جس کی آبادی ہر سال ۰٫۲ فیصد سے کم بڑھتی ہے، اس لیے پریشان ہے کہ شمالی افریقہ میں اس کے ہمسایوں کی آبادی اس سے دس گنا زیادہ رفتار سے بڑھ رہی ہے جبکہ فی کس مجموعی قومی پیداوار اس کے دس فیصد کے لگ بھگ ہے۔

بدلتے ہوئے چیلنج

کوئی بھی معاشرہ ہمیشہ دو ہندسوں کی معاشی نمو برقرار نہیں رکھ سکتا اور ایشیائی اقتصادی تیزی بھی اکیسویں صدی کی ابتدا میں کسی وقت یکساں سطح پر آ جائے گی۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں جاپانی معاشی نمو کی شرحیں خاصی کم ہوئیں اور اس کے بعد امریکا اور یورپی ملکوں سے بہت زیادہ بلند نہ رہیں۔ ایشیا کے ''اقتصادی معجزے'' دکھانے والی ریاستوں کی شرح ہائے نمو بھی ایک ایک کر کے کم ہوں گی اور پیچیدہ معیشتوں کی ''معمول'' کی سطح پر آ جائیں گی۔ اسی طرح کوئی مذہبی احیا یا ثقافتی تحریک ہمیشہ نہیں قائم رہتی اور کسی وقت احیائے اسلام بھی مدھم پڑ کر تاریخ کی پہنائیوں میں گم ہو جائے گا۔ اس کا امکان سب سے زیادہ اس وقت ہے جب اکیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں اسے قوت بخشنے والی آبادیاتی تحریک کمزور پڑے گی۔ اُس وقت تشدد پسندوں، جنگجوؤں اور تارکین کی صفیں خالی ہونے لگیں گی اور اسلام کے اندر اور مسلمانوں اور دوسروں کے درمیان (دیکھئے دسواں باب) تنازعے کی شدت میں کمی آنے لگے گی۔ اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات قریبی نہیں ہوں گے لیکن ان میں تصادم کا عنصر کم ہو جائے گا اور نیم جنگ کی صورتحال (دیکھئے نواں باب) سرد جنگ یا شاید سرد امن ہی میں بدل جائے۔

ایشیا میں معاشی ترقی کا ورثہ دولتمندتر اور پیچیدہ تر معیشتیں چھوڑ جائے گا جو بین الاقوامی امور میں خاصی شامل ہوں گی اور خوشحال بورژوا طبقات اور متمول درمیانے طبقات رکھتی ہوں گی۔ امکان ہے کہ ان کے نتیجے میں زیادہ تکثیریت پسندانہ اور ممکنہ طور پر زیادہ جمہوری سیاست پیدا ہو گی جس کا زیادہ مغرب کا حامی ہونا ضروری نہیں۔ اس کی بجائے طاقت میں اضافے سے بین الاقوامی امور میں مسلسل ایشیائی اثبات، عالمی رجحانات کو مغرب کے لیے ناسازگار راستوں پر موڑنے اور بین الاقوامی

اداروں کی مغربی نمونوں اور معمولات سے ہٹا کر تشکیلِ نو کرنے کی کوششوں کو فروغ ملے گا۔ احیائے اسلام بھی اس جیسی دوسری تحریکوں مثلاً اصلاحِ کلیسا کی طرح اہم ورثے چھوڑ جائے گا۔ مسلمانوں کو اس بارے میں زیادہ آگاہی ہو جائے گی کہ وہ آپس میں کیا کیا مشترک رکھتے ہیں اور غیر مسلموں سے انہیں کون سی چیز ممتاز کرتی ہے۔ نوجوانوں کی اکثریتی آبادی کی عمر بڑھنے کے ساتھ نظم ونسق سنبھالنے والی رہنماؤں کی نئی نسل ضروری نہیں کہ بنیاد پرست ہو لیکن وہ اپنے پیشروؤں کی بہ نسبت اسلام سے زیادہ وابستگی رکھتی ہوگی۔ مقامیت بڑھے گی۔ اسلام کا احیا معاشروں کے اندر اور ماورا معاشروں میں اسلام پسند سماجی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی اداروں کا ایک جال چھوڑ جائے گا۔ احیائے اسلام یہ بھی ثابت کر چکا ہوگا کہ اخلاقیات، شناخت، معانی اور عقیدے کے مسائل کے لیے ''اسلام حل ہے'' لیکن سماجی ناانصافی، سیاسی جبر، معاشی پسماندگی اور فوجی کمزوری کے لیے نہیں۔ یہ ناکامیاں سیاسی اسلام کے خلاف بڑے پیمانے مایوسی پھیلا سکتی ہیں، اس کے خلاف ردِعمل پیدا کر سکتی ہیں اور ان مسائل کے متبادل ''حل'' تلاش کرنے کی سعی کو تحریک دے سکتی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ شدید تر مغرب دشمن قوم پرست تحریکیں جنم لیں جو [عالم] اسلام کی ناکامیوں کا ذمے دار مغرب کو ٹھہرائیں۔ اس کی بجائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ملائشیا اور انڈونیشیا اپنی معاشی ترقی جاری رکھتے ہیں تو مغربی و ایشیائی ماڈلوں کے مقابلے میں ''اسلامی نمونہ'' پیش کریں۔

بہر حال کچھ بھی ہو آنے والے عشروں میں ایشیائی اقتصادی نمو موجودہ بین الاقوامی نظام کو جس پر مغرب کا غلبہ ہے، ہلا کر رکھ دے گی اور اگر چین کی ترقی جاری رہی تو تہذیبوں کے درمیان طاقت کے توازن میں بڑی تبدیلی واقع ہوگی۔ مزید برآں بھارت کی معاشی ترقی تیز ہو سکتی ہے اور وہ عالمی امور میں اہم مقام کا حامل بن سکتا ہے۔ اس دوران مسلمان آبادی کے اضافے سے مسلمان معاشروں اور ان کے ہمسایوں میں عدم استحکام پیدا ہو رہا ہوگا۔ ثانوی درجے تک تعلیم رکھنے والے نوجوانوں کی بڑی تعداد اسلام کے احیا کو قوت بخشتی رہے گی اور مسلمانوں میں تشدد پسندی، عسکریت پسندی اور ترک وطن کو بڑھاتی رہے گی۔ نتیجے کے طور پر اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں غیر مغربی طاقت اور ثقافت کا ابھرنا اور غیر مغربی تہذیبوں کے لوگوں کا مغرب سے اور آپس میں متصادم ہونا دیکھنے میں آئے گا۔

حصہ سوم

تہذیبوں کا اُبھرتا ہوا نظام

چھٹا باب

عالمی سیاست کی ثقافتی تشکیلِ نو

گروہ بندی کی کوششیں: شناخت کی سیاست

جدیدیت سے تحریک پاکر عالمی سیاست ثقافتی خطوط پر تشکیل پارہی ہے۔ ایک جیسی ثقافتوں والی اقوام اور ممالک قریب آرہے ہیں۔ مختلف ثقافتوں والی اقوام اور ممالک دور ہٹ رہے ہیں۔ ثقافت اور تہذیب سے طے ہونے والی وابستگیاں نظریات اور سپر طاقتوں کے روابط کے حوالے سے متعین ہونے والی وابستگیوں کی جگہ لے رہی ہیں۔ سیاسی سرحدیں نئے سرے سے کھینچی جارہی ہیں اور ثقافتی سرحدوں پر منطبق ہوتی جارہی ہیں یعنی نسلی، مذہبی اور تہذیبی سرحدوں پر۔ ثقافتی برادریاں سرد جنگ کے بلاکوں کی جگہ لے رہی ہیں اور تہذیبوں کے درمیان پائے جانے والے رخنے عالمی سیاست میں تصادم کے مرکزی خطوط بنتے جارہے ہیں۔

سرد جنگ کے دوران کوئی ملک ناوابستہ ہوسکتا تھا جیسے کہ متعدد ممالک تھے یا اپنی وابستگی بدل سکتا تھا جیسے بعض نے بدلی۔ کسی ملک کے رہنما اپنی سلامتی کے تصورات، طاقت کے توازن سے متعلق اندازوں اور اپنی نظریاتی ترجیحات کے مطابق یہ راستے چن سکتے تھے۔ لیکن نئی دنیا میں ثقافت ہی کسی ملک کی وابستگی اور مخالفتوں کا تعین کرنے والا مرکزی عنصر ہے۔ کوئی ملک سرد جنگ میں وابستگی سے گریز کرسکتا تھا لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کی کوئی شناخت نہ ہو۔ اس سوال کی جگہ کہ ''تم کس طرف ہو؟'' اس کہیں زیادہ بنیادی سوال نے لے لی ہے کہ ''تم کون ہو؟'' ہر ریاست کو کوئی نہ

کوئی جواب دینا ہے۔ وہ جواب، اس ریاست کی ثقافتی شناخت عالمی امور میں اس ریاست کے مقام اور اس کے دوستوں اور اس کے دشمنوں کا تعین کرے گی۔

۱۹۹۰ء کے عشرے میں عالمی سطح پر شناخت کا بحران آیا۔ جہاں دیکھو لوگ یہ پوچھ رہے ہیں کہ "ہم کون ہیں؟" "ہم کہاں سے تعلق رکھتے ہیں؟" اور "ہم کون نہیں ہیں؟" یہ سوالات نا صرف نئی قومی ریاستیں تشکیل دینے کے لیے کوشاں اقوام کے لیے مرکزی اہمیت رکھتے ہیں جیسے سابق یوگوسلاویہ میں، بلکہ عمومی طور پر بھی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں جن ملکوں میں قومی شناخت کے سوالوں پر سرگرمی سے بحث ہوئی ان میں دیگر کے علاوہ الجزائر، کینیڈا، چین، جرمنی، برطانیہ، بھارت، ایران، جاپان، میکسیکو، مراکش، روس، جنوبی افریقہ، شام، تیونس، ترکی، یوکرین اور امریکا شامل ہیں۔ شناخت کے مسائل منقسم ممالک میں خاص طور پر شدید ہیں جن میں مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بڑی تعداد میں ہیں۔

شناخت کے بحران سے نمٹنے میں لوگوں کے لیے خون دخاندان اور ایمان و ایقان کی اہمیت ہوتی ہے۔ لوگ مشابہ شجرے، مذہب، زبان، اقدار اور اداروں سے تعلق رکھنے والوں کے قریب آتے ہیں اور غیر مشابہ سے دور ہٹتے ہیں۔ یورپ میں آسٹریا، فن لینڈ اور سویڈن کو جو ثقافتی اعتبار سے مغرب کا حصہ ہیں، سرد جنگ کے دوران مغرب سے الگ ہوکر غیر جانبدار رہنا پڑا۔ اب یہ اپنی ثقافتی قرابت دار یورپی یونین میں شامل ہونے کے قابل ہوگئے۔ سابق معاہدۂ وارسا کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ممالک پولینڈ، ہنگری، چیک جمہوریہ اور سلوواکیہ یورپی یونین اور نیٹو کی رکنیت کی طرف پیشرفت کررہے ہیں اور بالٹک ریاستیں ان کے پیچھے ہیں۔ یورپی طاقتوں نے واضح کردیا ہے کہ وہ یورپی یونین میں مسلمان ملک ترکی نہیں چاہتیں اور براعظم یورپ میں ایک مسلمان ملک بوسنیا کی موجودگی پر خوش نہیں۔ شمال میں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد بالٹک جمہوریاؤں کے درمیان اور ان ملکوں کے سویڈن اور فن لینڈ سے اتحاد کے نئے (اور پرانے) روابط ابھر رہے ہیں۔ سویڈن کے وزیراعظم نے یاد دلایا ہے کہ بالٹک ریاستیں سویڈن کے قریب بیرون ملک کا حصہ ہیں اور ان کے خلاف روسی جارحیت کی صورت میں سویڈن غیرجانبدار نہیں رہ سکتا۔

بلقان میں بھی اسی طرح کے نئے اتحاد بن رہے ہیں۔ سرد جنگ کے دوران یونان اور ترکی نیٹو میں تھے، بلغاریہ اور رومانیہ معاہدۂ وارسا میں تھے، یوگوسلاویہ غیر وابستہ تھا اور البانیہ الگ تھلگ اور بعض اوقات کمیونسٹ چین کا اتحادی تھا۔ اب سرد جنگ کی ان وابستگیوں کی جگہ تہذیبی وابستگیاں آرہی ہیں جن کی جڑیں اسلام اور آرتھوڈوکسی میں ہیں۔ بلقان کے رہنما ایک یونانی سرب بلغاری

آرتھوڈوکس اتحاد تشکیل دینے کی بات کرتے ہیں۔ یونانی وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ ''بلقان کی جنگوں سے... آرتھوڈوکس تعلقات مضبوط تر ہوگئے ہیں... یہ ایک بندھن ہے۔ پہلے یہ خوابیدہ تھا لیکن بلقان میں جو حالات پیش آئے ہیں ان کے نتیجے میں یہ حقیقی صورت اختیار کررہا ہے۔ ایک بہت سیال دنیا میں لوگ شناخت اور سلامتی کے متلاشی ہیں۔ لوگ نامعلوم سے اپنا دفاع کرنے کے لیے جڑوں اور روابط کی تلاش میں ہیں۔'' سربیا میں حزب اختلاف کی سب سے بڑی جماعت کے رہنما کے بیان میں انہی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے: ''جنوب مشرقی یورپ کی صورتحال جلد ایک نئے بلقانی اتحاد کی تشکیل کا تقاضا کرے گی جو آرتھوڈوکس ممالک سربیا، بلغاریہ اور یونان پر مشتمل ہوتا کہ اسلام کے تجاوز کی مزاحمت کی جاسکے۔'' شمال کی طرف دیکھتے ہوئے آرتھوڈوکس سربیا اور رومانیہ کیتھولک ہنگری کے ساتھ اپنے مشترکہ مسائل کے حل کے لیے قریبی تعاون کررہے ہیں۔ سوویت خطرہ ختم ہونے کے بعد یونان اور ترکی کا ''غیر فطری'' اتحاد بے معنی ہوگیا ہے اور بحیرۂ ایجین میں قبرص کے مسئلے پر، فوجی توازن پر، نیٹو اور یورپی یونین میں ان کے کردار اور امریکا سے ان کے تعلقات کے حوالے سے ان کے تنازعات میں شدت آرہی ہے۔ ترکی اپنی بلقانی مسلمانوں کے محافظ کی حیثیت جتا رہا ہے اور بوسنیا کی مدد کررہا ہے۔ سابق یوگوسلاویہ میں روس آرتھوڈوکس سربیا کی حمایت کرتا ہے، جرمنی کیتھولک کروشیا کو سہارا دیتا ہے، مسلمان ممالک بوسنیائی حکومت کی امداد کے لیے اکٹھا ہوجاتے ہیں اور سرب کروشیائیوں، بوسنیائی مسلمانوں اور البانوی مسلمانوں سے لڑتے ہیں۔ مجموعی طور پر بلقان کے ممالک ایک بار پھر مذہبی خطوط پر صف آرا ہوگئے ہیں۔ جیسا کہ مشا گلینی نے کہا ''دو محور ابھر رہے ہیں، ایک مشرقی آرتھوڈوکسی کے لبادے میں، دوسرا اسلامی نقاب میں'' اور ''بلغراد/ایتھنز محور اور البانوی/ترکی اتحاد کے درمیان اثر و رسوخ کے لیے شدید تر مناقشہ'' پیدا ہونے کا امکان موجود ہے۔[1]

اس دوران سابق سوویت یونین میں آرتھوڈوکس ممالک بیلا روس، مالڈووا اور یوکرین روس کی طرف جھک رہے ہیں اور آرمینیائی اور آذری ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں جبکہ ان کے روسی اور ترکی قرابت داران کی مدد کرنے اور تنازعے کو محدود کرنے کی بھی کوشش کررہے ہیں۔ روسی فوج تاجکستان میں مسلمان بنیاد پرستوں سے اور چیچنیا میں مسلمان قوم پرستوں سے لڑ رہی ہے۔ سابق سوویت یونین کی سابق مسلمان جمہوریائیں آپس میں مختلف طریقوں سے معاشی و سیاسی اتحاد پیدا کررہی ہیں اور اپنے مسلمان ہمسایوں سے تعلقات وسیع کررہی ہیں جبکہ ترکی، ایران اور سعودی عرب ان نئی ریاستوں سے تعلقات بڑھانے کے لیے بے حد کوششیں کررہے ہیں۔ برصغیر میں

بھارت اور پاکستان کشمیر کے مسئلے پر اور فوجی توازن کے حوالے سے ایک دوسرے کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں اور کشمیر میں لڑائی تیز سے تیز تر ہو رہی ہے۔ بھارت کے اندر مسلمانوں اور ہندو بنیاد پرستوں کے درمیان نئے تنازعات رونما ہو رہے ہیں۔

مشرقی ایشیا میں، جو چھ مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے، اسلحے کی ذخیرہ اندوزیاں شدت پکڑ رہی ہیں اور سرحدی تنازعات سامنے آ رہے ہیں۔ تین چھوٹے چین یعنی تائیوان، ہانگ کانگ اور سنگاپور اور جنوب مشرقی ایشیا میں بیرون ملک مقیم چینی آبادیاں اپنا رخ مین لینڈ کی طرف موڑ رہی ہیں اور اس پر زیادہ سے زیادہ انحصار کر رہی ہیں۔ دونوں کوریا محتاط مگر معنی خیز انداز میں اتحاد کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیائی ممالک میں ایک جانب مسلمانوں اور دوسری جانب چینیوں اور عیسائیوں کے مابین روابط کشیدہ اور بعض اوقات متشدد ہوتے جا رہے ہیں۔

لاطینی امریکا میں معاشی اتحاد-- مرکوسر، اینڈین پیکٹ، سہ فریقی معاہدہ (میکسیکو، کولمبیا، وینز ویلا)، وسط امریکی مشترکہ منڈی-- میں نئی جان پڑ گئی ہے جس سے اس نکتے کی، جس کا مظاہرہ یورپی یونین نے نمایاں ترین انداز میں کیا ہے، پھر توثیق ہوئی ہے کہ معاشی اتحاد کا عمل ثقافتی اشتراک کی بنیاد پر ہو تو تیز تر ہوتا ہے اور زیادہ آگے بڑھتا ہے۔ ساتھ ہی امریکا اور کینیڈا میکسیکو کو شمالی امریکی آزاد تجارتی خطے (North American Free Trade Area, NAFTA) میں شامل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جس کی طویل المیعاد کامیابی کا انحصار میکسیکو کی اس صلاحیت پر ہے کہ وہ اپنی ثقافتی شناخت لاطینی امریکا کی بجائے شمالی امریکا کے ساتھ کرے۔

سرد جنگ کا نظام ختم ہونے کے بعد دنیا بھر کے ملکوں نے نئی دوستیاں اور دشمنیاں پیدا کرنا اور پرانی کو زندہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ ممالک گروہ بندیوں کی تلاش میں جدوجہد کر رہے ہیں اور انہیں ملتی جلتی ثقافتوں اور اپنی تہذیب کے اندر موجود ملکوں کے ساتھ یہ گروہ بندیاں مل رہی ہیں۔ سیاستداں قومی ریاستوں کی سرحدوں سے ماورا ''عظیم تر'' ثقافتی برادریوں کے ساتھ مشترک شناختیں ابھارتے ہیں اور عوام انہیں قبول کرتے ہیں۔ ان میں ''عظیم تر سربیا'' ''عظیم تر چین'' ''عظیم تر ترکی'' ''عظیم تر ہنگری'' ''عظیم تر کروشیا'' ''عظیم تر آذربائی جان'' ''عظیم تر روس'' ''عظیم تر البانیہ'' ''عظیم تر ایران'' اور ''عظیم تر ازبکستان'' شامل ہیں۔

کیا سیاسی اور اقتصادی اتحاد ہمیشہ ثقافت اور تہذیب سے مطابقت رکھیں گے؟ یقیناً نہیں۔ طاقت کے توازن کے حوالے سے سوچ بچار بعض اوقات مختلف تہذیبوں کے درمیان اتحاد تشکیل دینے کا باعث بنے گی جیسے اس وقت ہوا جب فرانسس اول نے ہیپس برگس کے خلاف عثمانیوں سے

اتحاد کیا۔ علاوہ ازیں کسی ایک دور میں ریاستوں کے مقاصد پورا کرنے کے لیے بننے والے اتحادوں کے تانے بانے نئے دور میں برقرار رہ سکتے ہیں۔ لیکن امکان یہ ہوتا ہے یہ تانے بانے کمزور پڑ جائیں اور کم معنی خیز ہوں اور نئے دور کے مقاصد پورے کرنے کے لیے ڈھل جائیں۔ یونان اور ترکی بلاشبہ نیٹو کے رکن رہیں گے لیکن نیٹو کی ریاستوں سے ان کے روابط کم ہونے کا امکان ہے۔ یہی صورت امریکا کے جاپان اور کوریا کے ساتھ اتحاد اور اسرائیل کے ساتھ اس کے ڈی فیکٹو اتحاد اور سلامتی کے حوالے سے پاکستان کے ساتھ اس کے روابط کے ساتھ پیش آنے کا امکان ہے۔ آسیان جیسی کثیر تہذیبی تنظیموں کو اپنا ربط ضبط قائم رکھنے میں دشواری ہوسکتی ہے۔ بھارت اور پاکستان جیسے ممالک جو سرد جنگ کے دوران مختلف سپر طاقتوں کے اتحادی تھے، اب اپنے مفادات کی نئی تشریح کررہے ہیں اور نئے اتحاد ڈھونڈ رہے ہیں جو ثقافتی سیاست کے حقائق کی عکاسی کرتے ہیں۔ افریقی ممالک جو مغربی امداد پر انحصار کرتے تھے تا کہ سوویت اثرات کی روک تھام کی جاسکے اب قیادت اور امداد کے لیے جنوبی افریقہ سے رجوع کرنے لگے ہیں۔

ثقافتی اشتراک لوگوں کے مابین تعاون اور ہم آہنگی کو کیوں تقویت دیتا ہے اور ثقافتی اختلافات خلیجیں اور تنازعات کیوں پیدا کرتے ہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر ایک کی کئی شناختیں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کے مقابلے پر بھی ہوسکتی ہیں اور ایک دوسرے کو تقویت بھی دے سکتی ہیں: قرابت دارانہ، پیشہ ورانہ، ثقافتی، ادارہ جاتی، علاقائی، تعلیمی، جماعتی، نظریاتی وغیرہ۔ جو شناختیں ایک جہت پر ہوتی ہیں وہ کسی مختلف جہت کی شناختوں سے ٹکرا سکتی ہیں: ایک کلاسیکی مثال ۱۹۱۴ء میں جرمن کارکنوں کو درپیش صورتحال کی ہے جنہیں بین الاقوامی پرولتاریوں کے ساتھ اپنی طبقاتی شناخت اور جرمن عوام اور سلطنت کے ساتھ اپنی قومی شناخت کے درمیان راستہ چننا تھا۔ ہم عصر دنیا میں شناخت کی دوسری جہتوں کے مقابلے میں ثقافتی شناخت کی اہمیت ڈرامائی انداز میں بڑھتی جارہی ہے۔

کسی ایک جہت پر شناخت عموماً فوری اور آمنے سامنے کی سطح پر سب سے بامعنی ہوتی ہے۔ لیکن تنگ شناختیں وسیع تر شناختوں سے لازمی طور پر متصادم نہیں ہوتیں۔ ایک فوجی افسر ادارے کی سطح پر کمپنی، رجمنٹ، ڈویژن اور سروس سے اپنی شناخت کرسکتا ہے۔ اسی طرح کوئی فرد ثقافتی لحاظ سے خود کو اپنے قبیلے، نسلی گروہ، قومیت، مذہب یا تہذیب سے پہچان سکتا ہے۔ نچلی سطحوں پر ثقافتی شناخت کا نمایاں ہونا اونچی سطحوں پر بھی اسے نمایاں کرسکتا ہے۔ جیسا کہ برک نے کہا: ''اِس ذیلی جانبداری سے کُل کی محبت ختم نہیں ہوتی... ذیلی گروہ سے منسلک ہونا، اس چھوٹی پلٹن سے محبت کرنا

جس سے معاشرے میں ہمارا تعلق ہے عوامی محبتوں کا پہلا اصول (بلکہ جرثومہ) ہے۔'' اس دنیا میں جہاں ثقافت اہمیت رکھتی ہے، پلٹنیں قبیلے اور نسلی گروہ ہیں، رجمنٹیں اقوام ہیں اور افواج تہذیبیں ہیں۔ ساری دنیا میں لوگ جس حد تک خود کو ثقافتی خطوط پر ایک دوسرے سے ممتاز کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ثقافتی گروہوں کے مابین تنازعات اہم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ تہذیبیں وسیع ترین ثقافتی اکائیاں ہیں چنانچہ مختلف تہذیبوں کے گروپوں کے درمیان تنازعات عالمی سیاست میں مرکزی حیثیت اختیار کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ تیسرے اور چوتھے ابواب میں بیان کیا گیا، ثقافتی شناخت کا نمایاں ہونا بڑی حد تک معاشرتی و معاشی جدیدیت کا نتیجہ ہے ایک تو انفرادی سطح پر جہاں نقل مکانی اور تنہائی زیادہ بامعنی شناختوں کی ضرورت پیدا کر رہی ہیں اور دوسرے سماجی سطح پر جہاں غیر مغربی معاشروں کی صلاحیتیں اور طاقت دیسی شناخت اور ثقافت کو نئی زندگی دے رہی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ذاتی، قبائلی، نسلی، تہذیبی کسی بھی سطح پر شناخت کو صرف کسی ''دوسرے'' کے تعلق سے متعین کیا جا سکتا ہے، کوئی مختلف فرد، قبیلہ، نسل یا تہذیب۔ تاریخی اعتبار سے ایک ہی تہذیب کی ریاستوں یا دوسری اکائیوں کے درمیان تعلقات مختلف تہذیبوں کی ریاستوں یا اکائیوں کے درمیان تعلقات سے مختلف رہے ہیں۔ جو لوگ ''اپنے جیسے'' ہوتے تھے ان کے ساتھ سلوک کے ضابطے ''وحشیوں'' کے ساتھ سلوک سے مختلف ہوتے تھے جو ''اپنے جیسے'' نہیں تھے۔ عالمِ مسیحیت کی اقوام کے ایک دوسرے کو برتنے کے اصول ترکوں اور دوسرے ''گمراہوں'' سے نمٹنے کے اصولوں سے الگ تھے۔ مسلمانوں کا رویہ دارالاسلام اور دارالحرب میں علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا۔ اہلِ چین غیر ملکی چینیوں اور غیر چینی غیر ملکیوں سے مختلف برتاؤ کرتے تھے۔ انسانی تاریخ میں تہذیبی ''ہم'' اور ماورائے تہذیب ''وہ'' مستقل رہے ہیں۔ دروں تہذیبی اور ماورائے تہذیبی رویوں میں یہ اختلافات جن باتوں سے ابھرتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ ان لوگوں کے مقابلے میں احساسِ برتری (اور کبھی کبھار احساسِ کمتری) جنہیں بہت مختلف سمجھا جاتا ہے؛

۲۔ ایسے لوگوں سے خوف اور ان پر اعتماد نہ ہونا؛

۳۔ زبان اور مبینہ مہذب رویے میں اختلافات کے نتیجے میں ان لوگوں کے ساتھ ابلاغ میں دشواری؛

۴۔ دوسرے لوگوں کے مفروضات، تحریکات، سماجی تعلقات اور معاشرتی رواجوں سے شناسائی

کا فقدان۔

آج کی دنیا میں نقل وحمل اور مواصلات کی ترقی نے مختلف تہذیبوں کے لوگوں کے درمیان زیادہ تعداد میں، شدید تر، زیادہ برابری کی سطح پر اور وسیع تر روابط کو جنم دیا ہے۔ نتیجے کے طور پر تہذیبی شناختیں زیادہ نمایاں ہوگئی ہیں۔ فرانسیسی، جرمن، بیلجیئن اور ولندیزی خود کو یورپی کی حیثیت میں دیکھنے لگے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان خود کو بوسنیا اور چیچنیا کے لوگوں کے ساتھ شناخت کرتے اور ان کی حمایت کرتے ہیں۔ پورے مشرقی ایشیا میں چینی اپنے مفادات کو مین لینڈ کے لوگوں کے مفادات سے شناخت کرتے ہیں۔ روسی سربوں اور دوسری آرتھوڈوکس اقوام کے ساتھ خود کو شناخت کرتے اور ان کو مدد فراہم کرتے ہیں۔ تہذیبی شناخت کی ان وسیع تر سطحوں کا مطلب تہذیبی اختلافات اور ''ہم'' اور ''وہ'' کے خطِ امتیاز کو تحفظ دینے کا عمیق تر شعور ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مختلف تہذیبوں کی ریاستوں اور گروہوں کے درمیان تنازعے کی بنیادیں بڑی حد تک وہی ہیں جنہوں نے ہمیشہ گروہوں کے مابین تنازع پیدا کیا ہے: افراد، زمین، دولت اور وسائل پر قبضہ اور تقابلی طاقت یعنی اپنی اقدار، ثقافت اور اداروں کو دوسرے گروہ پر ٹھونسنے کی کوشش بمقابلہ دوسرے گروہ کی ایسا کرنے کی طاقت کے۔ تاہم ثقافتی گروہوں کے مابین تنازعے میں ثقافتی معاملات بھی شامل ہوسکتے ہیں۔ مارکسسٹ لینن ازم اور لبرل جمہوریت کے درمیان سیکولر نظریات کے اختلافات ختم نہیں ہوسکتے تو کم از کم ان پر بحث ہوسکتی ہے۔ مادی مفاد کے اختلافات پر بات چیت ہوسکتی ہے اور ان پر سمجھوتا ہوسکتا ہے لیکن ثقافتی مسائل پر نہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایودھیا کا تنازع اس طرح طے نہیں ہوسکتا کہ مسجد اور مندر دونوں تعمیر کردیے جائیں یا کوئی بھی تعمیر نہ کیا جائے یا ایک ایسی عمارت بنادی جائے جو بیک وقت مسجد اور مندر ہو۔ نہ ہی یہودیوں اور عربوں کے مابین بیت المقدس کا تنازع، یا البانوی مسلمانوں اور آرتھوڈوکس سربوں کے درمیان کوسووا کا تنازع، جو سیدھا سادا زمین کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے، آسانی سے حل ہوسکتا ہے کیونکہ یہ مقامات دونوں اقوام کے لیے گہرے تاریخی، ثقافتی اور جذباتی معانی رکھتے ہیں۔ اسی طرح فرانسیسی حکام اور مسلمان والدین میں ایسا کوئی سمجھوتا ہوسکتا ہے کہ اسکول کی لڑکیاں سال کے دوران ہر دوسرے دن حجاب پہنیں۔ اس قسم کے ثقافتی سوالات کا 'ہاں' یا 'نہیں' کے علاوہ کوئی جواب نہیں ہوسکتا۔

پانچویں اور آخری بات تنازعے کا ہر جگہ پایا جانا ہے۔ نفرت کرنا انسانی فطرت ہے۔ اپنی ذات کے تعین اور تحریک کے لیے لوگوں کو دشمنوں کی ضرورت ہوتی ہے: تجارت میں حریف،

کارکردگی میں مقابل اور سیاست میں مخالفین درکار ہوتے ہیں۔ جو لوگ مختلف ہوتے ہیں اور نقصان پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں فطری طور پر ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا اور خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک تنازعے کا تصفیہ اور ایک دشمن کا خاتمہ ذاتی، معاشرتی اور سیاسی قوتیں پیدا کرتا ہے جس سے نئے دشمن سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ علی مزروئی کہتا ہے ''سیاسی اکھاڑے میں 'ہم' بمقابلہ 'وہ' کا رجحان تقریباً آفاقی ہے''[۲] ہم عصر دنیا میں ''وہ'' زیادہ تر مختلف تہذیبوں کے افراد ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے نے تنازعات ختم نہیں کیے بلکہ نئی شناختوں کو جنم دیا ہے جن کی جڑیں ثقافت میں ہیں اور مختلف ثقافتوں کے گروہوں کے افراد میں، جو وسیع ترین سطح پر تہذیبیں ہیں، تنازعات کے نئے سلسلے سامنے آئے ہیں۔ ساتھ ہی مشترک ثقافت ان ریاستوں اور گروہوں کے درمیان تعاون کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے جو اس ثقافت میں شریک ہوتے ہیں جیسا کہ ملکوں کے مابین بڑھتے ہوئے علاقائی تعاون کی صورت میں نظر آتا ہے خصوصاً معاشی شعبے میں۔

ثقافت اور اقتصادی تعاون

۱۹۹۰ء کے عشرے میں عالمی سیاست میں علاقائیت کی بحث بہت سننے میں آئی۔ دنیا کے سلامتی کے ایجنڈے پر عالمی تنازع کی جگہ علاقائی تنازعات نے لے لی۔ روس، چین اور امریکا جیسی بڑی طاقتوں نیز سویڈن اور ترکی جیسی ثانوی طاقتوں نے واضح طور پر علاقائی حوالوں سے اپنے سلامتی کے مفادات ازسرِنو متعین کیے۔ مختلف خطوں کے مابین تجارت کے مقابلے میں خطوں کے اندر تجارت زیادہ تیزی سے بڑھی اور بیشتر حلقوں کے خیال میں علاقائی اقتصادی بلاک ابھرے جن میں یورپی، شمالی امریکی، مشرقی ایشیائی اور شاید دیگر شامل ہیں۔

تاہم ''علاقائیت'' کی اصطلاح ہونے والے واقعات کو پورے طور پر بیان نہیں کرتی۔ خطے جغرافیائی اکائیاں ہیں، سیاسی یا ثقافتی نہیں۔ بلقان اور مشرقِ وسطیٰ کی طرح ان میں اندرونی یا دروں تہذیبی تنازعات ہو سکتے ہیں۔ خطے اسی حد تک ریاستوں کے درمیان تعاون کی بنیاد ہیں جس حد تک جغرافیہ ثقافت پر منطبق ہوتا ہے۔ ثقافت سے ہٹ کر جغرافیائی قربت اشتراک پیدا نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس ہو سکتا ہے۔ فوجی اتحاد اور معاشی تنظیمیں اپنے ارکان کے مابین تعاون کا تقاضا کرتی ہیں، تعاون اعتماد پر منحصر ہوتا ہے اور اعتماد سب سے آسانی سے مشترک اقدار اور ثقافت سے برآمد ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ، ہرچند زمانہ اور مقصد بھی کردار ادا کرتے ہیں لیکن علاقائی تنظیموں کی مجموعی

کارکردگی بالعموم اپنے ارکان کے تہذیبی تنوع سے بالعکس تناسب رکھتی ہے۔ بحیثیت مجموعی یک تہذیبی تنظیمیں کثیر تہذیبی تنظیموں کے مقابلے میں زیادہ کام کرتی ہیں اور کامیاب تر ہوتی ہیں۔ یہ بات سیاسی اور سلامتی کی تنظیموں کے بارے میں بھی درست ہے اور اقتصادی تنظیموں کے بارے میں بھی۔

نیٹو کی کامیابی کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ مشترکہ اقدار اور فلسفیانہ مفروضات رکھنے والے مغربی ملکوں کی مرکزی سلامتی کی تنظیم ہے۔ مغربی یورپی یونین مشترکہ یورپی ثقافت کی پیداوار ہے۔ دوسری جانب یورپ میں سلامتی و تعاون کی تنظیم (Organization for Security and Cooperation in Europe) میں مختلف اقدار اور مفادات رکھنے والے کم از کم تین تہذیبوں کے ممالک شامل ہیں جس کے باعث اس کو ادارے کی حیثیت سے اپنی شناخت بنانے اور وسیع پیمانے پر اہم سرگرمیاں جاری رکھنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ یک تہذیبی کیریبین کمیونٹی (CARICOM) نے جو انگریزی بولنے والی تیرہ سابق برطانوی نوآبادیوں پر مشتمل ہے، بہت وسیع پیمانے پر تعاون کا سلسلہ بڑھایا ہے اور اس کے ذیلی گروہوں میں اور بھی زیادہ تعاون ہے۔ لیکن جزائر غرب الہند میں انگریزی و ہسپانوی رخنے کو پاٹنے کے لیے وسیع تر کیریبین انجمنیں قائم کرنے کی کوششیں متواتر ناکام ہوئی ہیں۔ اسی طرح علاقائی تعاون کی جنوبی ایشیائی تنظیم (سارک) (South Asian Association for Regional Co-operation) جو ۱۹۸۵ء میں قائم ہوئی اور جس میں ہندو، مسلمان اور بدھ ممالک شامل ہیں، تقریباً ناکارہ ثابت ہوئی ہے، اس حد تک کہ بعض اوقات اس کے اجلاس بھی منعقد نہیں ہو پاتے۔[۳]

اقتصادی اتحاد کے حوالے سے ثقافت کا علاقائیت سے تعلق اظہر من الشمس ہے۔ ملکوں کے مابین اقتصادی تعاون کی چار تسلیم شدہ سطحیں ہیں، سب سے کم متحد سے لے کر انتہائی متحد تک:

۱۔ آزاد تجارتی خطہ؛

۲۔ کسٹم یونین؛

۳۔ مشترکہ منڈی؛

۴۔ اقتصادی یونین۔

یورپی یونین نے اتحاد کی شاہراہ پر آگے تک سفر کر لیا ہے۔ اس کی مشترکہ منڈی اور اقتصادی یونین کے متعدد عناصر ہیں۔ اینڈین پیکٹ اور مرکوسر جو نسبتاً ایک جیسے ممالک پر مشتمل ہیں ۱۹۹۴ء میں کسٹم یونینیں قائم کر رہے تھے۔ ایشیا میں کثیر تہذیبی آسیان (ASEAN) ۱۹۹۲ء میں صرف آزاد تجارتی خطے کی تشکیل کی طرف بڑھ سکی۔ دوسری کثیر تہذیبی علاقائی تنظیمیں اس سے بھی پیچھے تھیں۔

۱۹۹۵ء میں نیفٹا (NAFTA) کو چھوڑ کر، ایسی کوئی تنظیم آزاد تجارتی خطہ بھی تشکیل نہ دے سکی چہ جائیکہ اقتصادی اتحاد کی کوئی وسیع تر شکل قائم کرنا۔

مغربی یورپ اور لاطینی امریکا میں تہذیبی اشتراک تعاون اور علاقائی انضباط پیدا کر رہا ہے۔ مغربی یورپ اور لاطینی امریکا کے باشندے جانتے ہیں کہ ان میں بہت کچھ مشترک ہے۔ مشرقی ایشیا میں پانچ (روس کو شامل کریں تو چھ) تہذیبیں ہیں۔ نتیجتاً مشرقی ایشیا کا خطہ غیر مشترک تہذیبوں کے درمیان بامعنی تنظیموں کے قیام کے لیے ایک امتحان ہے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل تک نیٹو جیسی سلامتی کی کوئی تنظیم یا کوئی کثیر پہلو فوجی اتحاد مشرقی ایشیا میں وجود نہیں رکھتا تھا۔ ایک کثیر تہذیبی علاقائی تنظیم آسیان ۱۹۶۷ء میں قائم ہوئی تھی جس میں ایک صینی، ایک بدھ، ایک مسیحی اور دو مسلمان ممالک ہیں جن سب کو کمیونسٹ شورشوں اور شمالی ویت نام اور چین کی طرف سے ممکنہ خطرات کا سامنا تھا۔

آسیان کو اکثر مؤثر کثیر تہذیبی تنظیم کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مگر یہ اس قسم کی تنظیم کے محدود ہونے کی مثال ہے۔ یہ فوجی اتحاد نہیں۔ اس کے ارکان آپس میں دوطرفہ بنیادوں پر بعض اوقات تعاون کرتے ہیں لیکن وہ اپنے اپنے فوجی بجٹ میں بھی اضافہ کر رہے ہیں اور افواج بڑھا رہے ہیں جبکہ مغربی یورپی اور لاطینی امریکی ممالک میں افواج کم ہوئی ہیں۔ معاشی شعبے میں آسیان کا مقصد ابتدا سے ہی ''اقتصادی اتحاد کی بجائے اقتصادی تعاون'' پیدا کرنا تھا جس کے نتیجے میں علاقائیت میں ''معمولی رفتار'' سے پیشرفت ہوئی ہے اور اکیسویں صدی تک آزاد تجارتی خطے کی تشکیل کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔[۴] ۱۹۷۸ء میں آسیان نے پوسٹ منسٹیریل کانفرنس (PMC) قائم کی جس میں اس کے وزراء خارجہ اپنے ''مذاکراتی شرکا'' یعنی امریکا، جاپان، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی کوریا اور یورپی برادری کے ساتھ بیٹھ سکیں۔ مگر پی ایم سی بنیادی طور پر دوطرفہ بات چیت کا ایک فورم رہا ہے اور ''سلامتی کے اہم مسائل'' سے نمٹنے میں ناکام رہا ہے۔[۵] ۱۹۹۳ء میں آسیان نے ایک وسیع تر میدان آسیان ریجنل فورم میں قدم رکھا جس میں اس کے ارکان اور مذاکراتی شرکا کے علاوہ روس، چین، ویت نام، لاؤس اور پاپوانیوگنی شامل تھے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ انجمن اجتماعی عمل کی بجائے اجتماعی بات چیت کے لیے تھی۔ جولائی ۱۹۹۴ء میں اس کے پہلے اجلاس میں ارکان نے ''سلامتی کے علاقائی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار'' کیا لیکن متنازع معاملات سے گریز کیا گیا کیونکہ جیسا کہ ایک اہلکار نے تبصرہ کیا تھا، اگر ایسے معاملات اٹھائے جاتے تو ''شرکا ایک دوسرے پر برسنے لگتے''۔[۶] آسیان اور اس کے بطن سے نکلنے والی تنظیم

کثیر تہذیبی علاقائی انجمنوں کے محدود ہونے کا ثبوت ہیں۔

بامعنی مشرقی ایشیائی علاقائی تنظیمیں اسی وقت ابھریں گی جب ان کو برقرار رکھنے کے لیے کافی مشرقی ایشیائی ثقافتی اشتراک موجود ہوگا۔ مشرقی ایشیائی معاشروں میں بلاشبہ کچھ چیزیں مشترک ہیں جو انہیں مغرب سے الگ کرتی ہیں۔ ملائشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد کہتے ہیں کہ یہ مشترک پہلو تعاون کی بنیاد فراہم کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے ایسٹ ایشین اکنامک کاکس (EAEC) کی تشکیل میں مدد ملی ہے۔ اس میں آسیان کے ممالک، میانمار، تائیوان، ہانگ کانگ، جنوبی کوریا اور سب سے بڑھ کر چین اور جاپان شامل ہوں گے۔ مہاتیر کے مطابق ای اے ای سی کی جڑیں مشترکہ ثقافت میں ہیں۔ اسے ''مشرقی ایشیا میں ہونے کی وجہ سے محض ایک جغرافیائی گروپ نہیں، بلکہ ایک ثقافتی گروپ [سمجھنا چاہیے]۔ اگرچہ مشرقی ایشیائی باشندے جاپانی یا کوریائی یا انڈونیشیائی ہوسکتے ہیں تاہم ثقافتی اعتبار سے ان میں بعض ملتے جلتے خواص ہیں... یورپی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، امریکی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہم ایشیائیوں کو بھی ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیے۔'' اس کا مقصد، جیسا کہ مہاتیر کے ایک رفیق کار نے کہا، ''یہاں ایشیا میں مشترک خواص رکھنے والے ملکوں کے درمیان علاقائی تجارت'' میں اضافہ کرنا ہے۔[۷]

ای اے ای سی کے تصور کی اساس یہ ہے کہ اقتصادیات ثقافت کے نقش قدم پر چلتی ہے۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور امریکا اس سے خارج ہیں کیونکہ وہ ثقافتی لحاظ سے ایشیائی نہیں۔ بہرحال ای اے ای سی کی کامیابی زیادہ تر چین اور جاپان کی شرکت پر منحصر ہے۔ مہاتیر نے جاپانیوں سے شریک ہونے کی درخواست کی ہے۔ جاپانیوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''جاپان ایشیا ہے۔ جاپان مشرقی ایشیا کا ہے۔ آپ اس جغرافیائی و ثقافتی حقیقت سے صرف نظر نہیں کرسکتے۔ آپ یہیں کے ہیں''۔[۸] تاہم جاپانی حکومت ای اے ای سی میں شامل ہونے سے ہچکچا رہی تھی، جزواً امریکا کو ٹھیس پہنچنے کے خوف سے اور جزواً اس لیے کہ جاپان میں اس بات پر اختلاف تھا کہ وہ ایشیا سے تعلق رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر جاپان ای اے ای سی میں شامل ہوگیا تو اس پر حاوی ہوگا جس سے اس کے ارکان میں خوف اور بے یقینی پیدا ہوگی نیز چین میں سخت مخاصمانہ جذبات ابھریں گے۔ کئی سال تک اس موضوع پر بہت قیاس آرائیاں ہوتی رہیں کہ جاپان یورپی یونین اور نیفٹا کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایشیائی ''ین بلاک'' بنائے گا۔ تاہم جاپان ایک تنہا ملک ہے جس کے اپنے ہمسایوں سے بہت کم ثقافتی روابط ہیں اور ۱۹۹۵ء تک کوئی ین بلاک وجود میں نہیں آیا تھا۔

آسیان نے سست رفتاری سے پیشرفت کی، ین بلاک ایک خواب رہا، جاپان پس و پیش کرتا

رہا اور ای اے ای سی ٹھوس شکل اختیار نہ کر سکا تاہم مشرقی ایشیا میں اقتصادی ربط ضبط میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس اضافے کی جڑیں مشرقی ایشیائی چینی برادریوں کے ثقافتی بندھنوں پر تھیں۔ ان بندھنوں سے چینی بنیاد پر ایک بین الاقوامی معیشت کے ''مسلسل غیر رسمی اتحاد'' کو ترویج ملی جس کا موازنہ متعدد پہلوؤں سے ہانسیاٹک لیگ سے کیا جا سکتا ہے اور ''شاید یہ ایک حقیقی چینی مشترکہ منڈی کی طرف لے جائیں''[9] (دیکھیے صفحات ۱۶۸ تا ۱۷۴)۔ دوسرے خطوں کی مانند مشرقی ایشیا میں بھی ثقافتی اشتراک بامعنی معاشی اتحاد کے لیے لازمی ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے سے نئی علاقائی اقتصادی تنظیموں کے قیام اور پرانی تنظیموں کے احیا کی کوششوں کو تحریک ملی۔ ان کوششوں کا دارومدار زیادہ تر ریاستوں کی ثقافتی یکسانی پر رہا ہے۔ غالب امکان ہے کہ شمعون پیریز کا ۱۹۹۴ء کا مشرقِ وسطیٰ کی مشترکہ منڈی کا منصوبہ کچھ عرصہ ''سراب'' بنا رہے گا: ایک عرب عہدیدار کا تبصرہ تھا کہ ''عرب دنیا کو کسی ایسے ادارے یا ترقیاتی بینک کی ضرورت نہیں جس میں اسرائیل شریک ہو۔''[10] کیری کوم (CARICOM) کو ہیٹی اور خطے کے دوسرے اسپینی بولنے والے ملکوں سے منسلک کرنے کے لیے ۱۹۹۴ء میں قائم کی گئی تنظیم ریاست ہائے غرب الہند (Association of Caribbean States) کے حوالے سے یہ آثار دکھائی نہیں دیتے کہ اس کے متنوع ارکان کے باہمی لسانی و ثقافتی اختلافات اور سابق برطانوی نوآبادیوں کے تعصب اور امریکا کی طرف ان کے جھکاؤ پر قابو پالیا جائے گا۔[11] دوسری طرف ثقافتی یکسانی کی حامل تنظیموں کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں میں پیشرفت ہو رہی ہے۔ ذیلی تہذیبی خطوط پر مختلف ہونے کے باوجود پاکستان، ایران اور ترکی نے ۱۹۸۵ء میں علاقائی تعاون برائے ترقی (Regional Cooperation for Development) کو، جو انہوں نے ۱۹۷۷ء میں قائم کی تھی اور مردہ ہو چکی تھی، زندہ کیا اور اس کا نام اقتصادی تعاون کی تنظیم (Economic Cooperation Organization) رکھا۔ پھر ٹیرف گھٹانے کے اور دیگر اقدامات کیے گئے اور ۱۹۹۲ء میں ای سی او کے ارکان میں افغانستان اور چھ مسلمان سابق سوویت جمہوریاؤں کو شامل کر لیا گیا۔ اس دوران وسط ایشیا کی پانچ سابق سوویت جمہوریاؤں نے ۱۹۹۱ء میں ایک مشترکہ منڈی کے قیام پر اتفاق کیا اور ۱۹۹۴ء میں دو سب سے بڑے ممالک ازبکستان اور قازقستان نے ''اشیا، خدمات اور سرمایے کی آزادانہ گردش'' اور اپنی مالیاتی، سکہ جاتی اور ٹیرف کی پالیسیوں کو مربوط کرنے کے لیے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ ۱۹۹۱ء میں برازیل، ارجنٹینا، یوروگوئے اور پیراگوئے مرکوسر میں متحد ہو گئے تا کہ معاشی اتحاد کے معمول کے مراحل کو تیزی سے عبور کیا جا سکے اور

۱۹۹۵ء تک ایک جزوی کسٹم یونین بن چکی تھی۔ ۱۹۹۰ء میں وسط امریکا کی مشترکہ منڈی (Central American Common Market) نے جو پہلے جمود کا شکار تھی ایک آزاد تجارتی خطہ تشکیل دیا۔ ۱۹۹۲ء میں وائس گریڈ ممالک (پولینڈ، ہنگری، چیک جمہوریہ اور سلوواکیہ) نے ایک وسط یورپی آزاد تجارتی خطہ قائم کرنے پر اتفاق کیا اور ۱۹۹۴ء میں اس کے ٹھوس شکل کے قیام کے نظام الاوقات کو تیز کر دیا۔[۱۲]

اقتصادی اتحاد کے بعد تجارتی توسیع آتی ہے اور ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں کے دوران دروں علاقائی (intraregional) تجارت بین العلاقائی (interregional) تجارت کی بہ نسبت اہم تر ہوتی گئی۔ یورپی برادری کے اندر تجارت ۱۹۸۰ء میں برادری کے مجموعی کاروبار کا ۵۰ء۶ رفیصد تھی اور ۱۹۸۹ء تک بڑھ کر ۵۸ء۹ رفیصد ہو چکی تھی۔ شمالی امریکا اور مشرقی ایشیا میں بھی علاقائی تجارت میں اسی طرح کی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ لاطینی امریکا میں مرکوسر کے قیام اور اینڈین پیکٹ کے احیا سے ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل میں لاطینی امریکا کے اندر تجارت ایک دم بڑھ گئی۔ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء کے درمیان برازیل اور ارجنٹینا کے مابین کاروبار تگنا اور کولمبیا اور وینزویلا میں چوگنا ہو گیا۔ ۱۹۹۴ء میں برازیل ریاست ہائے متحدہ امریکا کی جگہ ارجنٹینا کا سب سے بڑا تجارتی شریک بن گیا۔ اسی طرز پر نیفٹا کے قیام سے میکسیکو اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کے درمیان کاروبار میں نمایاں اضافہ ہوا۔ مشرقی ایشیا کے اندر بھی تجارت خطے سے باہر کے مقابلے میں تیزی سے بڑھی لیکن جاپان کے اپنی منڈیاں بند رکھنے کے رجحان کے باعث اس کی توسیع کی راہ میں رکاوٹیں رہیں۔ چینی ثقافتی علاقے (آسیان، تائیوان، ہانگ کانگ، جنوبی کوریا اور چین) کے ممالک کے مابین تجارت ۱۹۷۰ء کے ۲۰ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۹۲ء میں تقریباً ۳۰ فیصد ہو گئی۔ اس تجارت میں جاپان کا حصہ ۲۳ فیصد سے گھٹ کر ۱۳ فیصد رہ گیا۔ ۱۹۹۲ء میں چینی علاقے کے ملکوں نے دوسرے علاقوں کے ممالک کو جو برآمدات کیں وہ امریکا کو ان کی برآمدات اور جاپان اور یورپی برادری کو کی جانے والی مجموعی برآمدات سے متجاوز ہو گئیں۔[۱۳]

جاپان کو ایک منفرد معاشرہ اور تہذیب ہونے کے باعث مشرقی ایشیا سے معاشی تعلقات استوار کرنے اور امریکا و یورپ سے معاشی اختلافات طے کرنے میں دشواریوں کا سامنا ہے۔ جاپان دوسرے مشرقی ایشیائی ملکوں سے کتنے ہی مضبوط تجارتی اور سرمایہ کارانہ روابط قائم کر لے، ان ممالک سے خصوصاً چینی معاشی اعلیٰ طبقات کے ساتھ ثقافتی اختلافات کے باعث وہ اپنی قیادت میں علاقائی سطح پر ایسا اقتصادی گروہ تشکیل نہیں دے سکتا جیسا نیفٹا یا یورپی یونین ہے۔ ساتھ ہی مغرب

سے اس کے ثقافتی اختلافات امریکا اور یورپ سے معاشی روابط میں غلط فہمیاں اور مخالفت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر اقتصادی اتحاد کا دارومدار ثقافتی اشتراک پر ہے، جو معلوم ہوتا ہے کہ ہے، تو جاپان ثقافتی اعتبار سے تنہا ملک ہونے کے باعث معاشی اعتبار سے تنہا مستقبل کا حامل ہوگا۔

ماضی میں اقوام کے مابین تجارت کے معاملات اقوام کے اتحادوں کے مطابق اور متوازی چلتے رہے ہیں[۲۱] ابھرتی ہوئی دنیا میں تجارت کے معاملات کا فیصلہ ثقافت کے حوالوں سے ہوگا۔ تاجران لوگوں سے کاروبار کرتے ہیں جنہیں وہ سمجھ سکیں اور اعتبار کرسکیں؛ ریاستیں اپنی خودمختاری ان بین الاقوامی تنظیموں کے حوالے کرتی ہیں جنہیں وہ سمجھ سکیں اور اعتبار کرسکیں۔ اقتصادی تعاون کی جڑیں ثقافتی اشتراک میں ہیں۔

تہذیبوں کی ساخت

سرد جنگ میں ریاستیں اتحادی، ذیلی، گاہک، غیر جانبدار یا ناوابستہ کی حیثیت سے دو سپر طاقتوں سے منسلک تھیں۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں وہ رکن ریاستوں، مرکزی ریاستوں، تنہا ملکوں، منقسم ملکوں اور ٹوٹے پھوٹے ملکوں کی حیثیت سے تہذیبوں سے منسلک ہیں۔ قبائل اور اقوام کی مانند تہذیبوں کے بھی سیاسی ڈھانچے ہوتے ہیں۔ ایک رکن ریاست وہ ملک ہوتا ہے جو ثقافتی اعتبار سے ایک تہذیب سے مکمل طور پر شناخت کیا جائے، جیسے مصر عرب اسلامی تہذیب سے اور اٹلی یورپی مغربی تہذیب سے متعلق ہے۔ کسی تہذیب میں ایسے لوگ بھی شامل ہوسکتے ہیں جو اس کی ثقافت میں شریک ہوں اور اسی سے اپنی شناخت کریں لیکن ان ریاستوں میں رہتے ہوں جہاں کسی اور تہذیب کے لوگوں کا غلبہ ہے۔ تہذیبوں میں عموماً ایک یا دو مقامات ہوتے ہیں جنہیں اس کے ارکان اپنی تہذیب کی ثقافت کا اہم ترین سرچشمہ خیال کرتے ہیں۔ یہ سرچشمے اکثر تہذیب کی مرکزی ریاست یا ریاستوں میں واقع ہوتے ہیں یعنی اس کی طاقتور ترین اور ثقافتی طور پر مرکزی ریاست یا ریاستیں۔

مرکزی ریاستوں کی تعداد اور کردار مختلف تہذیبوں اور زمانوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ جاپانی تہذیب اور جاپانی مرکزی ریاست تقریباً ایک ہی ہیں۔ چینی، آرتھوڈوکس اور ہندو تہذیبوں کی ایک ایک غالب مرکزی ریاست اور دوسری رکن ریاستیں ہیں نیز ان سے منسلک افراد ایسی ریاستوں میں رہتے ہیں جہاں دوسری تہذیبوں کے افراد کا غلبہ ہے (بیرون ملک چینی، ''قریب بیرون ملک'' کے

روسی، سری لنکن تامل)۔ تاریخی اعتبار سے مغرب کی کئی مرکزی ریاستیں رہی ہیں۔ اب اس کے دو مراکز ہیں، امریکا اور یورپ میں فرانکو جرمن مرکز، جبکہ برطانیہ ان کے درمیان طاقت کا ایک اضافی مرکز ہے۔ اسلام، لاطینی امریکا اور افریقہ میں مرکزی ریاستیں نہیں ہیں۔ اس کا جزوی سبب مغربی طاقتوں کی استعماریت ہے جس نے افریقہ کو، مشرقِ وسطی کو اور اس سے پہلے اور نسبتاً کم فیصلہ کن انداز میں لاطینی امریکا کو تقسیم کیا۔

اسلامی مرکزی ریاست کی عدم موجودگی مسلم اور غیر مسلم معاشروں دونوں کے لیے بڑے مسائل پیدا کرتی ہے۔ ساتویں باب میں اس پر بحث کی گئی ہے۔ لاطینی امریکا کے معاملے میں اسپینی بولنے والی بلکہ آئبیریائی تہذیب کی مرکزی ریاست اسپین بن سکتا تھا لیکن اس کے رہنماؤں نے قصداً یورپی تہذیب کی رکن ریاست بننے کا راستہ چنا اور ساتھ ہی سابق نوآبادیوں سے ثقافتی روابط برقرار رکھے۔ جسامت، وسائل، آبادی، فوجی و اقتصادی صلاحیت برازیل کو لاطینی امریکا کی قیادت کا اہل بناتے ہیں اور غالباً وہ بن جائے۔ تاہم برازیل لاطینی امریکا کے لیے ایسا ہی ہے جیسے اسلام کے لیے ایران۔ ویسے تو یہ مرکزی ریاست بننے کا اہل ہے لیکن ذیلی تہذیبی اختلافات (ایران کے معاملے میں مذہبی، برازیل کے معاملے میں لسانی) کے باعث اس کا یہ کردار حاصل کرنا مشکل ہے۔ پس لاطینی امریکا کی کئی ریاستیں ہیں، برازیل، میکسیکو، وینیزویلا اور ارجنٹینا جو قیادت میں تعاون اور اس کے لیے مسابقت کرتی ہیں۔ لاطینی امریکا کی صورتحال اس وجہ سے بھی پیچیدہ ہے کہ میکسیکو نے اپنی شناخت کا از سرِ نو تعین کرتے ہوئے خود کو لاطینی امریکا کی بجائے شمالی امریکا سے جوڑ لیا ہے اور چلی اور دیگر ریاستیں بھی اس کے نقشِ قدم پر چل سکتی ہیں۔ آخر میں لاطینی امریکی تہذیب سہ رخی مغربی تہذیب میں ضم ہوکر اس کی ایک ذیلی شکل بن سکتی ہے۔

کسی ممکنہ مرکزی ریاست کی صحرائے اعظم کے جنوب کے افریقہ کو قیادت فراہم کرنے کی صلاحیت اس لیے محدود ہوجاتی ہے کہ یہ فرانسیسی اور انگریزی بولنے والے ملکوں میں بٹا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ کوٹ ڈی آئیوری فرانسیسی بولنے والے افریقہ کی مرکزی ریاست تھا۔ تاہم خاصی حد تک فرانسیسی بولنے والے افریقہ کی مرکزی ریاست فرانس رہا ہے جس نے آزادی کے بعد اپنی سابق نوآبادیوں سے قریبی معاشی، فوجی اور سیاسی تعلقات برقرار رکھے۔ دو افریقی ممالک ہیں جن میں مرکزی ریاست بننے کی سب سے زیادہ اہلیت ہے جو دونوں انگریزی بولنے والے ہیں۔ جسامت، وسائل اور محلِ وقوع کے اعتبار سے نائجیریا ایک ممکنہ مرکزی ریاست ہے لیکن اس کے اندر کئی تہذیبی عناصر کی موجودگی، انتہائی بدعنوانی، سیاسی عدمِ استحکام، جابر حکومت اور معاشی مسائل نے اس کی یہ کردار ادا

کرنے کی صلاحیت کو سخت محدود کر دیا ہے، اگرچہ بعض موقعوں پر اس نے یہ کردار ادا کیا بھی ہے۔ جنوبی افریقہ میں نسل پرستانہ پالیسی کا پرامن طریقے سے خاتمہ، اس کی صنعتی قوت، دوسرے افریقی ملکوں کے مقابلے میں ترقی کی بلند تر شرح، اس کی فوجی صلاحیت اور اس کی نفیس سیاہ فام و سفید فام قیادت، یہ سب عوامل جنوبی افریقہ کو واضح طور پر افریقہ کے جنوبی ملکوں کا، غالباً انگلش افریقہ کا اور ممکنہ طور پر صحرائے اعظم کے جنوب کے تمام افریقہ کا رہنما بناتے ہیں۔

تنہا ملک میں دوسرے معاشروں کے ساتھ ثقافتی اشتراک کا فقدان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایتھوپیا اپنی غالب زبان ایمہارک، جو ایتھوپیائی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے؛ اپنے غالب مذہب قبطی آرتھوڈوکسی؛ اپنی شہنشاہی تاریخ؛ اور اپنے اردگرد کے بیشتر مسلمان اقوام سے مذہبی اختلاف کے باعث ثقافتی اعتبار سے کٹا ہوا ہے۔ ہیٹی کا اعلیٰ طبقہ روایتی طور پر فرانس سے اپنے ثقافتی روابط کا علمبردار بنا رہا ہے لیکن ہیٹی کی کریول زبان، جادو ٹونے کا مذہب، انقلابی غلاموں کی تاریخ اور خونریز ماضی اسے تنہا ملک بناتے ہیں۔ سڈنی منٹز نے کہا ہے کہ "ہر قوم منفرد ہے لیکن ہیٹی اپنی طرز کا ایک ہی ہے۔" نتیجہ یہ ہے کہ ہیٹی میں ۱۹۹۴ء کے بحران میں لاطینی امریکی ممالک نے اسے لاطینی امریکی مسئلہ نہیں سمجھا اور ہیٹی کے پناہ گزینوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے حالانکہ انہوں نے کیوبا کے پناہ گزینوں کو قبول کیا تھا۔ جیسا کہ پانامہ کے منتخب صدر نے کہا "لاطینی امریکا میں ہیٹی کو لاطینی امریکی ملک نہیں تسلیم کیا جاتا۔ ہیٹی والے مختلف زبان بولتے ہیں۔ ان کی نسلی جڑیں مختلف ہیں، مختلف ثقافت ہے۔ وہ قطعی مختلف ہیں۔" ہیٹی جزائر غرب الہند کے انگریزی بولنے والے ملکوں سے بھی اتنا ہی الگ تھلگ ہے۔ ایک مبصر کے مطابق ہیٹی کے لوگ "گریناڈا یا جمیکا کے کسی فرد کے لیے بھی اتنے ہی عجیب [ہیں] جتنے آئیووا یا مونٹانا کے کسی شخص کے لیے ہوں گے۔" ہیٹی، "وہ پڑوسی جسے کوئی پسند نہیں کرتا" صحیح معنوں میں قرابت داری سے عاری ملک ہے۔[15]

سب سے اہم تنہا ملک جاپان ہے۔ کوئی دوسرا ملک جاپان کی مخصوص ثقافت میں شریک نہیں اور جاپانی تارکین وطن یا تو دوسرے ملکوں میں تعداد میں زیادہ نہیں یا پھر ان ملکوں کی ثقافت میں گھل مل گئے ہیں (مثلاً جاپانی نژاد امریکی)۔ جاپان کی تنہائی اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کی ثقافت میں بہت تکثیریت ہے اور آفاقیت رکھنے والا کوئی مذہب (عیسائیت، اسلام) یا نظریہ (لبرل ازم، کمیونزم) شامل نہیں جو دوسرے معاشروں کو برآمد کیا جا سکے اور اس طرح ان معاشروں کے عوام کے ساتھ ثقافتی تعلق قائم کرے۔

تقریباً تمام ممالک اس لحاظ سے غیر متجانس ہیں کہ ان میں دو یا دو سے زائد قوی، نسلی یا

مذہبی گروہ شامل ہیں۔ بہت سے ممالک اس اعتبار سے منقسم ہیں کہ ان گروہوں کے درمیان اختلافات اور تنازعات ملک کی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس تقسیم کی شدت عموماً وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ کسی ملک کے اندر تقسیم بہت گہری ہو تو بڑے پیمانے پر تشدد کے واقعات ہو سکتے ہیں اور ملک کے وجود کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ یہ خطرہ اور خود مختاری یا علیحدگی کی تحریکیں ابھرنے کا امکان اس وقت سب سے زیادہ ہوتا ہے جب ثقافتی اختلافات جغرافیائی محلِ وقوع پر منطبق ہو جائیں۔ اگر ثقافت اور جغرافیہ منطبق نہ ہوں تو قتلِ عام یا جبری ترکِ وطن کے ذریعے انہیں منطبق کرایا جا سکتا ہے۔

ایک ہی تہذیب کے ممیز ثقافتی گروہ رکھنے والے ممالک علیحدگی واقع ہونے سے (چیکوسلوواکیہ) یا اس کا امکان پیدا ہونے سے (کینیڈا) انتہائی منقسم ہو سکتے ہیں۔ بہر حال کسی شکستہ ملک کے اندر جہاں بڑے گروہ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہوں گہری تقسیم ابھرنے کا امکان کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ تقسیم اور ان کے ساتھ جنم لینے والی کشیدگی اکثر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک تہذیب سے تعلق رکھنے والا کوئی اکثریتی گروہ ریاست کو اپنے سیاسی مقاصد کے حوالے سے استعمال کرنے اور اپنی زبان، مذہب اور علامات کو ریاست کی زبان، مذہب اور علامات بنانے کی کوشش کرتا ہے جیسے ہندوؤں، سنہالیوں اور مسلمانوں نے بھارت، سری لنکا اور ملائشیا میں کرنے کی کوشش کی۔

شکستہ ممالک جو جغرافیائی اعتبار سے تہذیبوں کے درمیان رخنوں کے دونوں اطراف واقع ہوں انہیں اپنی سالمیت قائم رکھنے میں خاص دشواری پیش آتی ہے۔ سوڈان میں مسلمان شمالی علاقوں اور بیشتر عیسائی جنوبی علاقوں کے مابین عشروں تک خانہ جنگی ہوتی رہی۔ اسی تہذیبی تقسیم نے تقریباً اتنا ہی عرصہ نائجیریا کی سیاست کو اپنا شکار بنائے رکھا اور اس کے نتیجے میں علیحدگی کی ایک جنگ کے علاوہ تختہ الٹنے، فسادات اور تشدد کے دیگر واقعات پیش آئے۔ تنزانیہ میں عیسائی مظاہر پرست مین لینڈ اور عرب مسلم زنجبار میں فاصلے بڑھے ہیں اور بہت سے پہلوؤں سے یہ دو ملک بن گئے ہیں۔ زنجبار ۱۹۹۲ء میں خفیہ طور پر اسلامی کانفرنس کی تنظیم میں شامل ہو گیا لیکن اگلے برس تنزانیہ نے اسے رکنیت چھوڑنے پر آمادہ کیا۔[۶] یہی عیسائی مسلم تقسیم کینیا میں کشیدگی اور تنازعات کا سبب بنی۔ ہارن آف افریقہ میں عیسائی ایتھوپیا اور مسلمان اریٹیریا ۱۹۹۳ء میں علیحدہ ہو گئے۔ بہر حال ایتھوپیا کے آرمو لوگوں کے درمیان خاصی تعداد میں مسلمان اقلیت باقی رہ گئی۔ تہذیبی رخنوں پر منقسم دوسرے ملکوں میں بھارت (مسلمان اور ہندو)، سری لنکا (سنہالی بدھ اور تامل ہندو)، ملائشیا اور

سنگاپور (چینی اور ملائی مسلمان)، چین (ہان چینی، تبتی بدھ، ترک مسلمان)، فلپائن (عیسائی اور مسلمان) اور انڈونیشیا (مسلمان اور تیموری عیسائی) شامل ہیں۔

ان شکستہ ملکوں میں تہذیبی رخنوں کا تقسیم کرنے کا یہ عمل سب سے نمایاں ہے جنہیں سرد جنگ کے دوران جابرانہ کمیونسٹ حکومتوں نے مارکسسٹ لیننسٹ نظریے کے جواز کے تحت یکجا رکھا۔ کمیونزم کے خاتمے کے ساتھ نظریے کی جگہ ثقافت کشش اور دفع کا مقناطیس بن گئی اور یوگوسلاویہ اور سوویت یونین ٹوٹ کر تہذیبی خطوط پر نئی اکائیاں بن گئے: سابق سوویت یونین میں بالٹک (پروٹسٹنٹ اور کیتھولک)، آرتھوڈوکس اور مسلمان جمہوریائیں؛ یوگوسلاویہ میں کیتھولک سلوویینیا اور کروشیا؛ جزوی مسلمان بوسنیا ہرزیگووینا؛ اور آرتھوڈوکس سربیا مونٹی نیگرو اور مقدونیہ۔ جہاں ان نئی اکائیوں میں اب بھی کثیر تہذیبی گروہ موجود تھے وہاں دوسرے مرحلے میں مزید تقسیم ظاہر ہوئی۔ بوسنیا ہرزیگووینا جنگ کے ذریعے سربیائی، مسلمان اور کروشیائی حصوں میں بٹ گیا اور کروشیا میں سرب اور کروٹس آپس میں لڑے۔ سلافی آرتھوڈوکس سربیا کے اندر البانوی مسلم کوسووا کا پرامن طریقے سے رہنا انتہائی غیریقینی ہے اور مقدونیہ میں البانوی مسلم اقلیت اور سلافی آرتھوڈوکس اکثریت کے مابین کشیدگی سامنے آئی ہے۔ کئی سابق سوویت جمہوریائیں بھی تہذیبی رخنوں کے اطراف میں واقع ہیں، جزواً اس لیے کہ سوویت حکومت نے ایسی سرحدیں کھینچیں کہ منقسم جمہوریائیں وجود میں آئیں، روسی کریمیا یوکرین کے پاس گیا، آرمینیائی نگورنو کاراباخ آذربائی جان کے حصے میں آیا۔ روس میں کئی نسبتاً چھوٹی اقلیتیں ہیں خصوصاً شمالی قفقاز اور وولگا کے علاقے میں۔ ایسٹونیا، لیٹویا اور قازقستان میں اچھی خاصی روسی اقلیتیں ہیں، وہ بھی زیادہ تر سوویت پالیسی کے نتیجے میں۔ یوکرین، یوکرینی بولنے والے یونیٹ قوم پرست مغربی علاقے اور روسی بولنے والے آرتھوڈوکس مشرقی علاقے میں بٹا ہوا ہے۔

شکستہ ملک میں دو یا دو سے زیادہ تہذیبوں سے وابستہ بڑے گروہ عملاً یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "ہم مختلف قومیں ہیں اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔" دفع کی قوتیں انہیں ایک دوسرے سے دور لے جاتی ہیں اور وہ دوسرے معاشروں میں تہذیبی مقناطیسوں کی طرف کھنچتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک مقطوع ملک وہ ہوتا ہے جس کی واحد غالب ثقافت ہو جو اسے کسی ایک تہذیب سے منسلک کرتی ہو لیکن اس کے رہنما اسے کسی اور تہذیب میں منتقل کرنا چاہتے ہوں۔ وہ عملاً یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "ہم ایک قوم ہیں اور ایک جگہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہم یہ جگہ بدلنا چاہتے ہیں۔" شکستہ ملکوں کے لوگوں کے برخلاف مقطوع ممالک کے لوگ اس بات پر متفق ہوتے

ہیں کہ وہ کون ہیں مگر اس بات پر اختلاف رکھتے ہیں کہ کون سی تہذیب ان کی ہے۔ رہنماؤں کی خاصی تعداد کمال ازم کا راستہ اختیار کرتی ہے، یہ فیصلہ کرتی ہے کہ ان کے معاشرے کو غیر مغربی ثقافت اور ادارے مسترد کر دینے چاہئیں، مغرب میں شامل ہو جانا چاہیے اور جدیدیت اور مغربیت دونوں کو اپنانا چاہیے۔ روس پیٹر اعظم کے زمانے سے مقطوع ملک ہے اور اس مسئلے پر بٹا رہا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کا حصہ ہے یا علیحدہ یوریشیائی آرتھوڈوکس تہذیب کا مرکز ہے۔ مصطفیٰ کمال کا ملک بلاشبہ مقطوع ملک کی کلاسیک مثال ہے جو ۱۹۲۰ء کی دہائی سے جدید و مغربی اور مغرب کا حصہ بننے کے لیے کوشاں ہے۔ میکسیکو کے دو صدیوں تک خود کو لاطینی امریکی ملک قرار دینے کے بعد ۱۹۸۰ء کے عشرے میں اس کے رہنماؤں نے اسے شمالی امریکی معاشرے کی حیثیت دینے کی کوشش کر کے اس کو مقطوع ملک بنا دیا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں آسٹریلیا کے رہنما مغرب سے اپنے ملک کے روابط توڑ کر اسے ایشیا کا حصہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس طرح اسے ایک معکوس مقطوع ملک بنا دیا ہے۔ مقطوع ممالک دو مظاہر سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے رہنما دو ثقافتوں کے درمیان ''پل'' کی بات کرتے ہیں اور مبصرین انہیں ذووجہین قرار دیتے ہیں۔ ''روس مغرب کی طرف دیکھتا ہے-- اور مشرق کی طرف''؛ ''ترکی: مشرق، مغرب، کون بہترین ہے؟''؛ ''آسٹریلوی قوم پرستی: منقسم وفاداریاں'' یہ وہ سرخیاں ہیں جو مقطوع ممالک کے شناخت کے مسائل کو نمایاں کرتی ہیں۔[۱۷]

مقطوع ممالک: تہذیب کی تبدیلی میں ناکامی

کسی مقطوع ملک کو کامیابی سے اپنی تہذیبی شناخت ازسرِنو متعین کرنے کے لیے کم از کم تین تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اول، ملک کا اعلیٰ سیاسی اور اقتصادی طبقہ اس اقدام کا عمومی حامی ہو اور اس کے بارے میں پرجوش ہو۔ دوم، عوام شناخت کے ازسرِنو تعین پر کم از کم آمادہ ہوں۔ سوم، میزبان تہذیب کے غالب عناصر، جو زیادہ تر مغربی تہذیب ہوتی ہے، تبدیل ہونے والوں کو قبول کرنے پر تیار ہوں۔ شناخت کے ازسرِنو تعین کا عمل سیاسی، سماجی، ادارہ جاتی اور ثقافتی لحاظ سے طویل اور تکلیف دہ ہوتا ہے اور اس میں جابجا رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔

روس۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں میکسیکو کئی سال سے ایک مقطوع ملک تھا اور ترکی کئی عشروں سے۔ ان کے مقابلے میں روس کئی صدیوں سے مقطوع ملک تھا اور میکسیکو یا جمہوری ترکی کے برخلاف، یہ ایک بڑی تہذیب کی مرکزی ریاست بھی ہے۔ اگر ترکی یا میکسیکو نے کامیابی سے خود کو

مغربی تہذیب کا رکن بنالیا تو اسلامی یا لاطینی امریکی تہذیب پر اس کے اثرات برائے نام یا تھوڑے بہت ہوں گے۔ اگر روس مغربی بن گیا تو آرتھوڈوکس تہذیب کا وجود ختم ہوجائے گا۔ سودیت یونین کے انہدام نے روسیوں میں روس اور مغرب کے مسئلے پر بحث کو پھر زندہ کردیا ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ روس کے تعلقات ارتقا کے چار مراحل سے گزرے ہیں۔ پہلے مرحلے میں جو پیٹر اعظم (۱۶۸۹ء تا ۱۷۲۵ء) کے دور تک رہا، کیفن روس اور مسکووی، مغرب سے الگ وجود رکھتے تھے اور مغربی یورپی سماجوں سے ان کا بہت کم تعلق تھا۔ روسی تہذیب بازنطینی تہذیب کے بطن سے نکلی اور پھر دو صدیوں تک، یعنی تیرہویں صدی کے وسط سے پندرہویں صدی کے وسط تک روس منگولوں کے ماتحت تھا۔ مغربی تہذیب کی پہچان بننے والے تاریخی مظاہر، رومن کیتھولک مسلک، جاگیرداریت، نشاۃ ثانیہ، اصلاحِ کلیسا، بیرونِ ملک توسیع اور استعماریت، روشن خیالی کی تحریک اور قومی ریاستوں کے ابھرنے سے اس کا ربط ضبط نہ ہونے کے برابر تھا۔ مغربی تہذیب کے جو آٹھ خواص بیان کیے گئے ہیں ان میں سے سات-- مذہب، زبانیں، کلیسا اور ریاست کی علیحدگی، قانون کی حکمرانی، سماجی تکثیریت، نمائندہ ادارے، فرد پسندی-- روسیوں کے تجربے میں تقریباً آئے ہی نہیں۔ واحد ممکنہ استثنا کلاسیکی ورثہ ہے جو بازنطیم کے راستے روس تک پہنچا اور اسی لیے مغرب سے کافی مختلف تھا جہاں وہ براہِ راست روم سے آیا۔ روسی تہذیب کیفن روس اور مسکووی میں اپنی مقامی جڑوں، خاصے بازنطینی اثرات اور طویل منگول حکمرانی کی پیداوار تھی۔ ان اثرات نے جس معاشرے اور ثقافت کی تشکیل کی وہ مغربی یورپ کے معاشرے اور ثقافت سے مشابہت نہیں رکھتی تھی جو بہت مختلف قوتوں کے زیرِ اثر پروان چڑھی۔

سترہویں صدی کے آخر میں روس نا صرف یورپ سے مختلف تھا بلکہ اس کے مقابلے میں پسماندہ بھی تھا جو پیٹر اعظم کو اپنے ۱۶۹۷ء تا ۱۶۹۸ء کے یورپی دورے سے معلوم ہوا۔ اس نے اپنے ملک کو جدید اور مغربی دونوں بنانے کا تہیہ کرلیا۔ اپنے عوام کو اہلِ یورپ کی طرح کا بنانے کے لیے پیٹر نے ماسکو واپسی پر پہلا کام یہ کیا کہ اپنے امرا کی ڈاڑھیاں منڈوا دیں اور لمبے چغوں اور مخروطی ٹوپیوں پر پابندی عائد کردی۔ پیٹر نے سریلیک رسم الخط تو ختم نہیں کیا مگر اس کی اصلاح کی اور اسے سادہ بنایا اور مغربی الفاظ اور تراکیب متعارف کرائیں۔ تاہم اس نے پہلی ترجیح روس کی افواج کو بہتر اور جدید بنانے پر دی: بحریہ قائم کی، جبری بھرتی کا سلسلہ شروع کیا، دفاعی صنعتیں لگائیں، تیکنیکی اسکول قائم کیے، لوگوں کو حصولِ تعلیم کے لیے مغرب بھیجا اور ہتھیاروں، جہازوں اور جہازوں کی تعمیر، نیوی گیشن، افسر شاہی پر مشتمل انتظامیہ اور دوسرے موضوعات پر جو فوجی قوت کے

لیے لازمی ہیں، مغرب سے علم درآمد کیا۔ ان اختراعات کی خاطر اس نے محصول کے نظام میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کردیں اور اس میں توسیع کی۔ اپنے دور کے آخر میں اس نے حکومتی ڈھانچے کی بھی تشکیلِ نو کی۔ روس کو نا صرف یورپی طاقت بلکہ یورپ میں طاقت بنانے کے لیے پیٹر نے ماسکو چھوڑ دیا، سینٹ پیٹرز برگ میں نیا دارالحکومت قائم کیا اور بالٹک میں روس کو غالب قوت کے طور پر مستحکم کرنے کی خاطر سویڈن میں عظیم شمالی جنگ (Great Northern War) چھیڑی۔

تاہم اپنے ملک کو جدید اور مغربی بنانے کے لیے پیٹر نے آمریت کو مضبوط کرکے اور معاشرتی یا سیاسی تکثیریت کے ممکنہ ذرائع کو ختم کرکے روس کی ایشیائی خصوصیات کو بھی تقویت دی۔ روسی امرا کبھی طاقتور نہیں تھے۔ پیٹر نے ان کی قوت مزید کم کردی، خدمتی امرا کو پروان چڑھایا اور ولادت یا سماجی رتبے کی بجائے میرٹ کی بنیاد پر عہدوں کی درجہ بندی کی۔ کسانوں جیسے امرا کو ریاست کی ملازمت میں جبری بھرتی کیا گیا، جس سے ایک ''جی حضوری کرنے والی اشرافیہ'' پیدا ہوئی جس نے بعد میں کسٹائن کو مشتعل کیا۔[۱۸] غلاموں کی خودمختاری کو مزید محدود کیا گیا اور انہیں اپنی زمین اور اپنے آقا سے زیادہ مضبوطی سے منسلک کردیا گیا۔ آرتھوڈوکس کلیسا تو ہمیشہ ریاست کے زیرنگیں رہا تھا۔ اس کی تنظیمِ نو کی گئی اور براہِ راست زار کے مقرر کیے ہوئے سنوڈ کے ماتحت کردیا گیا۔ زار کو وراثت کے مروجہ طور طریقوں سے ہٹ کر اپنا جانشین مقرر کرنے کا اختیار بھی دے دیا گیا۔ ان تبدیلیوں کے ذریعے پیٹر نے روس میں جدیدیت و مغربیت اور مطلق العنانی کے مابین قریبی تعلق کا آغاز کیا اور اس کی مثالیں قائم کیں۔ اس نمونے کی تقلید کرتے ہوئے لینن، اسٹالن اور کسی حد تک کیتھرین دوم اور الیگزینڈر دوم نے بھی مختلف طریقوں سے روس کو جدید و مغربی بنانے کے ساتھ آمرانہ قوت بڑھانے کی کوشش کی۔ کم از کم ۱۹۸۰ء کے عشرے تک روس میں جمہوریت کے حامی مغربیت کے حامی تھے لیکن مغربیت کے حامی جمہوریت کے حامی نہ تھے۔ روسی تاریخ کا سبق یہ ہے کہ اقتدار کی مرکزیت معاشرتی و معاشی اصلاحات کی لازمی شرط ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں گورباچیف کے رفقا نے اس حقیقت کا ادراک نہ کرنے میں اپنی ناکامی پر اظہارِ تاسف کیا جو معاشی آزادی کی خاطر گلاسنوسٹ کی پیدا کردہ دشواریوں کو معمولی سمجھنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

پیٹر یورپ کو روس کا حصہ بنانے سے زیادہ روس کو یورپ کا حصہ بنانے میں کامیاب رہا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے برخلاف روسی سلطنت کو یورپی بین الاقوامی نظام کا اہم اور جائز شریک سمجھا جانے لگا۔ ملک کے اندر پیٹر کی اصلاحات سے کچھ تبدیلیاں آئیں لیکن معاشرہ مخلوط رہا: ایک چھوٹے سے اعلیٰ طبقے کے سوا ایشیائی اور بازنطینی طور طریقے، ادارے اور عقائد روسی معاشرے میں چھائے رہے

اور یورپی و روسی دونوں معاشرے کو اسی طرز کا تصور بھی کرتے تھے۔ ڈی میسٹری نے تبصرہ کیا ہے کہ ''کسی روسی کو کھجاؤ تو ایک تا تار کو زخم پہنچے گا۔'' پیٹر نے ایک مقطوع ملک تخلیق کیا اور انیسویں صدی کے دوران سلاف پسند اور مغربیت پسند دونوں نے اس ناخوشگوار صورتحال پر افسوس ظاہر کیا اور اس بات پر شدت سے اختلاف کیا کہ اس صورتحال کو ختم کرنے کے لیے مکمل یورپی رنگ اختیار کرلیا جائے یا یورپی اثرات کو خارج کر کے روس کی سچی روح تک پہنچا جائے۔ چاڈیئف جیسے مغربیت پسند نے کہا کہ ''سورج مغرب کا سورج ہے'' اور روس کو روشن ہونے کے لیے اور اپنے موروثی اداروں کو بدلنے کے لیے اس کی روشنی استعمال کرنی چاہیے۔ ڈینی لیفسکی جیسے سلاف پسند نے، ان الفاظ میں جو ۱۹۹۰ء کے عشرے میں بھی سنے گئے، یورپی رنگ اختیار کرنے کی کوششوں کی یہ کہہ کر مذمت کی کہ ان سے ''عوام کی زندگی مسخ ہو رہی ہے اور اس کی جگہ اجنبی اور غیر ملکی شکلیں آ رہی ہیں''، ''غیر ملکی اداروں کو مستعار لے کر انہیں روسی زمین پر لگایا جا رہا ہے'' اور ''ملکی و غیر ملکی تعلقات اور روسی زندگی کے مسئلوں کو غیر ملکی، یورپی نقطہ نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے گویا کسی ایسے شیشے میں جو یورپی زاویۂ انعطاف کے مطابق بنایا گیا ہو۔''[۱۹] بعد کی روسی تاریخ میں پیٹر مغربیت پسندوں کا ہیرو اور ان کے مخالفین کے لیے شیطان بن گیا۔ انتہا پسند مخالفین کی نمائندگی ۱۹۲۰ء کی دہائی میں یوریشیائیوں نے کی جنھوں نے پیٹر کو غدار کہا اور مغربیت کو مسترد کرنے، یورپ کو چیلنج کرنے اور دارالحکومت کو ماسکو واپس لے جانے پر بالشویکوں کا خیر مقدم کیا۔

بالشویک انقلاب نے روس اور مغرب کے درمیان تعلقات کے تیسرے مرحلے کا آغاز کیا جو اس پسند و ناپسند کے امتزاج والے تعلق سے بہت مختلف تھا جو دو صدیوں سے چل رہا تھا۔ اس انقلاب نے جو سیاسی و معاشی نظام پیدا کیا وہ مغرب میں اس نظریے کے نام پر وجود نہیں رکھ سکتا تھا جو مغرب میں پیدا ہوا تھا۔ سلاف پسندوں اور مغرب پسندوں میں اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی تھی کہ آیا روس مغرب کی بہ نسبت پسماندہ رہے بغیر مغرب سے مختلف ہو سکتا ہے۔ کمیونزم نے یہ مسئلہ شاندار طریقے سے حل کیا: روس مغرب سے مختلف اور اساسی طور پر اس کا مخالف اس لیے تھا کہ وہ مغرب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ وہ پرولتاری انقلاب کی قیادت کر رہا تھا جو بالآخر پوری دنیا میں آئے گا۔ روس کسی پسماندہ ایشیائی ماضی کا نہیں بلکہ ترقی پسندانہ سوویت مستقبل کا حامل ہے۔ انقلاب نے روس کو مغرب سے سبقت لے جانے اور خود کو ممتاز کرنے کے قابل بنایا، اس لیے نہیں کہ ''تم مختلف ہو اور ہم تم جیسے نہیں بنیں گے'' جو سلاف پسند کہتے تھے، بلکہ اس لیے کہ ''ہم مختلف ہیں اور آخر کار تم ہم جیسے بن جاؤ گے'' جو کمیونسٹ انٹرنیشنل کا پیغام تھا۔

کمیونزم نے کمیونسٹ رہنماؤں کو مغرب سے خود کو ممتاز کرنے کا اہل بنانے کے علاوہ مغرب سے طاقتور روابط بھی پیدا کیے۔ مارکس اور اینگلز جرمن تھے؛ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ان کے خیالات کی اشاعت کرنے والے اہم افراد مغربی یورپی تھے؛ ۱۹۱۰ء تک مغربی معاشروں میں بیشتر لیبر یونینیں اور سوشل ڈیموکریٹک اور لیبر پارٹیاں ان نظریات سے وابستہ تھیں اور یورپی سیاست میں ان کا اثر ورسوخ بڑھ رہا تھا۔ بالشویک انقلاب کے بعد بائیں بازو کی جماعتیں کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں میں بٹ گئیں اور اکثر دونوں یورپی ملکوں میں مضبوط قوتیں تھیں۔ بیشتر مغرب میں مارکسسٹ نقطہ نظر کا دوردورہ تھا: کمیونزم اور سوشلزم کو مستقبل کی لہر سمجھا جا رہا تھا اور سیاسی و دانشور طبقات کسی نہ کسی انداز میں انہیں اپنا رہے تھے۔ چنانچہ روس میں سلاف پسندوں اور مغربیت پسندوں کے مابین روس کے مستقبل پر بحث کی بجائے یورپ میں بائیں اور دائیں بازو کے درمیان مغرب کے مستقبل پر اور اس بات پر بحث چھڑ گئی کہ آیا سوویت یونین اُس مستقبل کا نمونہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویت یونین کی قوت نے مغرب میں، اور زیادہ اہم بات یہ کہ اُن غیر مغربی تہذیبوں میں بھی کمیونزم کی کشش میں اضافہ کیا جو اب مغرب کے خلاف ردِعمل ظاہر کر رہی تھیں۔ مغرب کو راغب کرنے کے خواہشمند غیر مغربی معاشروں کے اعلیٰ طبقات نے خود ارادیت اور جمہوریت کی باتیں شروع کر دیں؛ جو مغرب سے ٹکر لینے کے خواہاں تھے انہوں نے انقلاب اور قومی آزادی کی باتیں کیں۔

مغربی نظریہ اپنا کر اور اس کی مدد سے مغرب کو للکار کر روسی ایک لحاظ سے مغرب سے اتنا قریب اور اس کے امور میں اتنا شامل ہو گئے جتنا اپنی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں رہے تھے۔ اگرچہ لبرل جمہوریت اور کمیونزم کے نظریات میں بہت فرق تھا لیکن ایک مفہوم میں دونوں ایک زبان بول رہے تھے۔ کمیونزم اور سوویت یونین کے انہدام نے مغرب اور روس کے مابین اس سیاسی و نظریاتی تعامل کا خاتمہ کر دیا۔ مغرب کو امید تھی اور یقین تھا کہ اس کا نتیجہ تمام سابق سوویت سلطنت میں لبرل جمہوریت کی صورت میں نکلے گا مگر یہ مقدر نہ تھا۔ ۱۹۹۵ء تک روس اور دوسری آرتھوڈوکس جمہوریاؤں میں لبرل جمہوریت کا مستقبل غیر یقینی تھا۔ مزید برآں، جب روسیوں نے مارکسسٹوں والا طرزِ عمل چھوڑ دیا اور روسیوں جیسا انداز اختیار کر لیا تو روس اور مغرب کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ لبرل جمہوریت اور مارکسسٹ لینن ازم کا تنازع نظریات کے درمیان تھا جو، اپنے بڑے اختلافات کے باوجود، جدید اور سیکولر نظریات تھے اور بظاہر ان میں آزادی، مساوات اور مادی خوشحالی کے مقاصد مشترک تھے۔ ایک مغربی جمہوریت پسند فرد کسی سوویت مارکسسٹ سے علمی بحث

کرسکتا تھا لیکن اس کے لیے کسی روسی آرتھوڈوکس قوم پرست سے ایسا کرنا ناممکن ہوگا۔

سوویت دور نے سلاف پسندوں اور مغربیت پسندوں کے درمیان لڑائی معطل کردی کیونکہ سولزنٹسنوں اور سخاروفوں دونوں نے کمیونسٹ ملاپ کو چیلنج کیا۔ یہ ملاپ ختم ہوا تو روس کی سچی شناخت کی بحث پھر پورے زوروں سے شروع ہوگئی۔ کیا روس کی روسی اقدار، اداروں اور رواجوں کو اپنانا چاہیے اور مغرب کا حصہ بننے کی کوشش کرنی چاہیے؟ یا کیا روس کی ایک علیٰحدہ آرتھوڈوکس اور یوریشیائی تہذیب ہے جو مغرب سے مختلف ہے اور جس کی منفرد تقدیر یورپ اور ایشیا کو منسلک کرنا ہے؟ علمی و سیاسی اعلیٰ طبقات اور عام لوگوں میں ان سوالوں پر گہرے اختلافات تھے۔ ایک طرف مغرب پسند، ''آفاقیت پسند'' یا ''اوقیانوسی'' تھے اور دوسری طرف سلاف پسندوں کے جانشین تھے جنہیں ''قوم پرست''، ''یوریشیائی پسند'' یا ''ڈرزاونیکی'' (شدید ریاستی حامی) کہا جاتا تھا۔[20]

ان گروہوں میں اہم اختلافات خارجہ پالیسی اور کسی حد تک معاشی اصلاحات اور ریاستی ڈھانچے کے بارے میں تھے۔ ان میں ایک انتہا سے دوسری انتہا تک ہر رائے کے لوگ شامل تھے۔ ایک انتہا پر وہ تھے جو گورباچیف کی ''نئی سوچ'' کے حامی تھے جس کا اظہار اس کے ایک ''مشترکہ یورپی وطن'' کے مقصد میں ہوتا تھا۔ یلسن کے کئی معاونین اعلیٰ نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ روس ''ایک نارمل ملک'' بن جائے اور اسے بڑے صنعتی ممالک کے کلب جی سیون کے آٹھویں رکن کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ نسبتاً اعتدال پسند قوم پرستوں مثلاً سرگئی اسٹانکوچ نے کہا کہ روس کو ''اوقیانوسی'' راہ ترک کردینی چاہیے اور دوسرے ملکوں میں روسیوں کے تحفظ کو ترجیح دینی چاہیے، اپنے ترک اور مسلم رابطوں پر زور دینا چاہیے اور ''اپنے وسائل، دستیاب راستوں، رابطوں اور مفادات کی تقسیم نو ایشیا کے حق میں یا مشرقی سمت میں'' کرنے کی ترویج کرنی چاہیے۔[21] اس تصور کے حامیوں نے یلسن پر تنقید کی کہ وہ روس کے مفادات کو مغرب کے تابع کررہے ہیں، روسی فوجی قوت کو گھٹا رہے ہیں، سربیا جیسے روایتی دوستوں کی حمایت نہیں کررہے اور اقتصادی و سیاسی اصلاحات جن طریقوں سے کررہے ہیں وہ روسی قوم کے لیے مضر ہیں۔ اس رجحان کی نشاندہی پیٹر ساوٹسکی کے خیالات کی دوبارہ مقبولیت سے سامنے آتی ہے جس نے ۱۹۲۰ء کے عشرے میں روس کو منفرد یوریشیائی تہذیب قرار دیا تھا۔

زیادہ انتہا پسند قوم پرست، روسی قوم پرستوں مثلاً سولزینٹیسن اور شہنشاہی قوم پرستوں مثلاً ولادیمیر زرونوفسکی میں بٹے ہوئے تھے۔ اول الذکر نے روس میں تمام روسیوں نیز قریبی تعلق رکھنے والے سلاف آرتھوڈوکس بیلوروسیوں اور یوکرینیوں کو شامل کرنے کی حمایت کی لیکن کسی اور کو نہیں۔

مؤخر الذکر سوویت سلطنت اور روسی فوجی قوت کی بحالی چاہتے تھے۔ یہ لوگ بعض اوقات یہود مخالف اور مغرب مخالف تھے اور مشرق اور جنوب کے حوالے سے روسی خارجہ پالیسی کو نئی جہت دینا چاہتے تھے، یا تو مسلمان جنوبی علاقوں پر غالب آکر (جس کی حمایت زرونوفسکی نے کی) یا مغرب کے خلاف مسلمان ملکوں اور چین سے تعاون کرکے۔ قوم پرستوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں سربوں کی مزید مدد کی حمایت بھی کی۔ آفاقیت پسندوں اور قوم پرستوں میں اختلافات کی عکاسی وزارتِ خارجہ اور فوج کے اداروں کے نقطہ ہائے نگاہ میں ہوئی۔ یہ اختلافات یلسن کی امورِ خارجہ اور سلامتی کی پالیسیوں میں بھی نظر آئے جن کی سمت میں تبدیلیاں آئیں۔

روسی عوام بھی اعلیٰ طبقات کی طرح بٹے ہوئے تھے۔ ۲۰۶۹ یورپی روسیوں کے ۱۹۹۲ء کے ایک پول سے معلوم ہوا کہ ۴۰ فیصد جواب دہندگان ''مغرب کے لیے کھلا ذہن'' رکھتے تھے، ۳۶ فیصد ''مغرب کے لیے بند ذہن'' رکھتے تھے اور ۲۴ فیصد نے اس بارے میں ''فیصلہ نہیں کیا تھا۔'' دسمبر ۱۹۹۳ء میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں اصلاح پسند جماعتوں کو ۳۴ء۲ فیصد، اصلاح کی مخالف اور قوم پرست جماعتوں کو ۴۳ء۳ فیصد اور مرکزیت پسند جماعتوں کو ۱۳ء۷ فیصد ووٹ ملے۔[۲۲] اسی طرح جون ۱۹۹۶ء کے صدارتی انتخابات میں بھی عوام بٹے ہوئے تھے۔ ۴۳ فیصد لوگوں نے مغرب کے امیدوار یلسن اور دیگر اصلاح پسندوں کو جبکہ ۵۲ فیصد نے قوم پرست اور کمیونسٹ امیدواروں کو ووٹ دیے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں روس اپنی شناخت کے مرکزی مسئلے پر واضح طور پر ایک مقطوع ملک تھا اور مغربی وسلاف پسند دہرا پن اس کے ''قومی کردار... کا اٹوٹ خاصہ تھا''۔[۲۳]

ترکی۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے عشروں میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے عوام کو اپنے عثمانی اور مسلم ماضی سے دور لے جانے کے لیے محتاط اور سوچی سمجھی اصلاحات کیں۔ کمال ازم کے بنیادی اصول یا ''چھ تیر'' عام پسندی، جمہوریت، قوم پرستی، سیکولرزم، ریاست پسندی (statism)، اور اصلاح پسندی تھے۔ کمال کا ہدف کثیر قومی سلطنت کا تصور مسترد کرتے ہوئے ایک متجانس قومی ریاست تخلیق کرنا تھا اور اس عمل کے دوران آرمینیائی اور یونانی باشندوں کو ملک بدر اور ہلاک کیا گیا۔ پھر انھوں نے سلطان کو برطرف کیا اور سیاسی حکمرانی کا مغربی طرز کا جمہوری نظام قائم کر دیا۔ انھوں نے خلافت ختم کر دی جو مذہبی حکمرانی کا مرکزی ذریعہ تھی، تعلیم و مذہبی امور کی روایتی وزارتیں ختم کیں، علیحدہ مذہبی اسکولوں اور کالجوں کا سلسلہ ختم کیا، سرکاری تعلیم کا ایک متحدہ سیکولر نظام قائم کیا اور شرعی عدالتیں بند کر کے ان کی جگہ ایک نیا قانونی نظام لے آئے جس کی بنیاد سوئس شہری ضابطے پر

تھی۔ انہوں نے روایتی کیلنڈر کی جگہ جارجین کیلنڈر نافذ کیا اور اسلام کی ریاستی مذہب کی حیثیت باقاعدہ طور پر ختم کردی۔ پیٹر اعظم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے ترکی ٹوپی پہننے پر پابندی عائد کردی کیونکہ وہ مذہبی روایت پسندی کی علامت تھی، لوگوں کے ہیٹ پہننے کی حوصلہ افزائی کی اور حکم جاری کیا کہ ترکی زبان عربی رسم الخط کی بجائے رومن میں لکھی جائے گی۔ مؤخرالذکر اصلاح بنیادی نوعیت کی تھی۔ ''اس سے رومن رسم الخط میں تعلیم پانے والی نئی نسل کی روایتی کتابوں کے ذخائر تک رسائی تقریباً ناممکن ہوگئی، یورپی زبانیں سیکھنے کی حوصلہ افزائی ہوئی اور خواندگی میں اضافے کا مسئلہ حل کرنا بہت آسان ہوگیا''۔[۲۴] ترک قوم کی قومی، سیاسی، مذہبی اور ثقافتی شناخت کا ازسرنو تعین کرنے کے بعد کمال نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ترکی کی معاشی ترقی کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ مغربیت جدیدیت کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اسے جدیدیت کا ذریعہ بننا تھا۔

۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان مغرب کی خانہ جنگی میں ترکی غیر جانبدار رہا۔ تاہم اس جنگ کے بعد اس نے خود کو مغرب کے ساتھ مزید شناخت کرنے کی کوششیں تیز کردیں۔ واضح طور پر مغربی نمونوں کی پیروی کرتے ہوئے اس نے یک جماعتی حکمرانی کی جگہ مسابقتی جماعتی نظام نافذ کیا۔ اس نے نیٹو کی رکنیت کے لیے کوشش کی اور ۱۹۵۲ء میں حاصل کرلی۔ اس طرح اس کے آزاد دنیا کے رکن کی حیثیت کی تصدیق ہوگئی۔ ترکی مغرب سے اربوں ڈالر معاشی و سلامتی کی امداد وصول کرنے لگا۔ مغرب نے اس کی افواج کو تربیت دی اور انہیں نیٹو کے کمانڈ اسٹرکچر میں شامل کیا گیا۔ اس نے امریکا کو فوجی اڈے دیے۔ ترکی کو مغربی ممالک اپنا مشرقی قلعہ سمجھنے لگے جو بحیرۂ روم، مشرقِ وسطیٰ اور خلیج فارس کی طرف سوویت یونین کے پھیلاؤ کو روکے ہوئے تھا۔ مغرب سے اس تعلق اور اس کے ساتھ اپنی شناخت طے کرنے کے عمل کے باعث ترکوں کی ۱۹۵۵ء کی بندونگ کانفرنس میں غیر مغربی، ناوابستہ ممالک نے مذمت کی اور اسلامی ملکوں نے انہیں دین کا دشمن قرار دیا۔[۲۵]

سرد جنگ کے بعد ترک اعلیٰ طبقات ترکی کی مغربی اور یورپی شناخت برقرار رکھنے کے حامی رہے۔ نیٹو کی رکنیت جاری رہنا ان کی نظر میں ناگزیر ہے کیونکہ اس سے مغرب سے قریبی تنظیمی ربط فراہم ہوتا ہے اور یونان کے ساتھ توازن قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ تاہم ترکی کی مغرب کے ساتھ وابستگی، جس کا اظہار اس کی نیٹو کی رکنیت سے ہوتا ہے، سرد جنگ کی پیداوار تھی۔ سرد جنگ کے خاتمے سے اس وابستگی کی وجہ موجود نہیں رہی۔ یہ تعلق کمزور ہورہا ہے اور اس کو نئے سرے سے متعین کیا جارہا ہے۔ ترکی اب مغرب کے لیے شمالی خطرات کے خلاف قلعے کی حیثیت سے زیادہ مفید نہیں رہا بلکہ جنوب کے کمتر خطرات سے نمٹنے میں ممکنہ ساتھی ہے، جیسے خلیج کی جنگ میں۔ اس

جنگ کے دوران ترکی نے صدام حسین کے خلاف اتحاد کی اہم حمایت اس طرح کی کہ اپنے علاقے سے گزرنے والی وہ پائپ لائن بند کردی جس کے ذریعے عراقی تیل بحیرۂ روم پہنچتا تھا، اور امریکی طیاروں کو ترکی میں قائم اڈوں سے عراق کے خلاف کارروائی کی اجازت دی۔ بہرحال صدر اوزال کے ان فیصلوں پر ترکی میں خاصی نکتہ چینی ہوئی، وزیر خارجہ، وزیر دفاع اور چیف آف جنرل اسٹاف مستعفی ہوگئے اور بڑے پیمانے پر عوامی مظاہرے ہوئے جن میں اوزال کے امریکا سے قریبی تعاون پر احتجاج کیا گیا۔ بعد میں صدر دیمرل اور وزیر اعظم چلر دونوں نے عراق کے خلاف اقوامِ متحدہ کی پابندیاں جلد ختم کرنے پر زور دیا جس نے ترکی پر خاصا اقتصادی بوجھ لاد دیا تھا۔[26] ترکی سوویت خطرے کے خلاف مغرب کے ساتھ کھڑے ہونے پر جس قدر آمادہ تھا جنوب کے اسلامی خطرات سے نمٹنے میں مغرب کی مدد کرنے پر اتنا آمادہ نہیں۔ خلیج کے بحران کے دوران جرمنی نے، جو ترکی کا روایتی دوست ہے، ترکی پر عراقی میزائل کے حملے کو نیٹو پر حملہ تصور کرنے کی مخالفت کی۔ اس سے بھی پتا چلا کہ ترکی جنوبی خطرات کے معاملے میں مغربی مدد پر انحصار نہیں کرسکتا۔ سوویت یونین سے سرد جنگ کے زمانے کے محاذ آرائی کے دوران ترکی کی تہذیبی شناخت کا سوال نہیں اٹھا تھا؛ عرب ملکوں سے مابعد سرد جنگ کے تعلقات میں اٹھ رہا ہے۔

۱۹۸۰ء کے عشرے سے ترکی کے مغرب پسند اعلیٰ طبقے کی خارجہ پالیسی کا بنیادی، بلکہ شاید واحد بنیادی مقصد یورپی یونین کی رکنیت کا حصول رہا ہے۔ ترکی نے اپریل ۱۹۸۷ء میں باقاعدہ طور پر رکنیت کے لیے درخواست دی۔ دسمبر ۱۹۸۹ء میں ترکی سے کہا گیا کہ ۱۹۹۳ء سے پہلے اس کی درخواست پر غور نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۹۹۴ء میں یورپی یونین نے آسٹریا، فن لینڈ، سویڈن اور ناروے کی درخواستیں منظور کرلیں اور بہت توقع کی جارہی تھی کہ آنے والے برسوں میں پولینڈ، ہنگری اور چیک جمہوریہ اور بعد میں ممکنہ طور پر سلووینیا، سلوواکیہ اور بالٹک جمہوریاؤں کے معاملوں پر ہمدردانہ اقدامات کیے جائیں گے۔ ترکی کو خاص طور پر اس لیے مایوسی ہوئی کہ ایک بار پھر جرمنی نے، جو یورپی برادری کا بااثر ترین رکن ہے، اس کی رکنیت کی سرگرمی سے حمایت نہیں کی اور اس کی بجائے وسطی یورپی ریاستوں کو ترجیح دی۔[27] امریکا کے دباؤ پر یورپی یونین نے ترکی کے ساتھ کسٹم یونین تو قائم کرلی لیکن مکمل رکنیت کا امکان بہت بعید اور مشکوک ہے۔

ترکی کو نظرانداز کیوں کیا گیا اور وہ ہمیشہ قطار کے آخر میں کیوں ہوتا ہے؟ ظاہری طور پر یورپی عہدیداروں نے ترکی کی اقتصادی ترقی کی نچلی سطح اور انسانی حقوق کے سکینڈے نیویائی احترام نہ کرنے کا حوالہ دیا۔ نجی طور پر یورپی اور ترک دونوں متفق تھے کہ اصل سبب یونانیوں کی شدید

مخالفت نیز ترکی کا مسلمان ملک ہونا ہے جو اہم تر وجہ ہے۔ یورپی ممالک اس امکان کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے کہ انہیں چھ کروڑ مسلمانوں اور بہت سے بے روزگاروں کے ملک سے ترک وطن کرنے والوں کے لیے اپنی سرحدیں کھولنی پڑیں۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ترکوں کا تعلق یورپ سے نہیں۔ جیسا کہ صدر اوزال نے ۱۹۹۲ء میں کہا، ترکی کا انسانی حقوق کا ریکارڈ ''بنی بنائی وجہ ہے کہ ترکی کو یورپی یونین میں کیوں شامل نہ کیا جائے۔ حقیقی وجہ یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور وہ عیسائی ہیں۔'' ساتھ ہی انہوں نے یہ اضافہ کیا کہ ''لیکن وہ یہ کہتے نہیں۔'' ادھر یورپی عہدیداروں نے اتفاق کیا کہ یورپی یونین ''ایک عیسائی کلب'' ہے اور یہ کہ ''ترکی ضرورت سے زیادہ غریب، ضرورت سے زیادہ آبادی والا، ضرورت سے زیادہ مسلمان، ضرورت سے زیادہ کرخت، ثقافتی طور پر ضرورت سے زیادہ مختلف، ضرورت سے زیادہ سب کچھ ہے۔'' ایک مبصر کے مطابق اہلِ یورپ کے لیے ''مغربی یورپ میں صحرانشین حملہ آوروں اور ویانا کے دروازوں پر ترکوں'' کی تاریخی یادیں ''نجی طور پر بھیانک خواب'' سے کم نہیں۔ ان رویوں نے ''ترکوں میں اس عام خیال'' کو جنم دیا کہ ''مغرب یورپ کے اندر مسلمان ترکی کے لیے کوئی جگہ نہیں پاتا''[۲۸]

مکہ کو مسترد کر کے اور برسلز سے مسترد ہو کر ترکی نے سوویت یونین کی تحلیل سے پیدا ہونے والے موقعے سے فائدہ اٹھا کر تاشقند کی جانب رخ کیا۔ صدر اوزال اور دوسرے ترک رہنماؤں نے ترک اقوام کی برادری کا تصور پیش کیا اور ترکی کے ''قریب بیرون ملک'' میں ''ایڈریاٹک سے چین کی سرحدوں تک'' پھیلے ہوئے ''بیرونی ترکوں'' کے ساتھ روابط استوار کرنے کے لیے بڑی کوششیں کیں۔ آذر بائی جان اور ترک زبانیں بولنے والی چار وسط ایشیائی جمہوریاؤں ازبکستان، ترکمانستان، قازقستان اور کرغزستان کی جانب بطورِ خاص توجہ کی۔ ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء میں ترکی نے ان نئی جمہوریاؤں سے تعلقات اور ان میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے وسیع پیمانے پر اقدامات کیے۔ اِن میں کم سودی شرحوں کے طویل مدتی قرضوں کی مد میں ڈیڑھ ارب ڈالر، براہِ راست امداد کی مد میں سات کروڑ نوے لاکھ ڈالر، سیٹلائٹ ٹیلی وژن (جس نے روسی زبان کے چینل کی جگہ لی)، ٹیلی فون مواصلات، فضائی سروس، ترکی میں طلبہ کی تعلیم کے لیے ہزاروں وظیفے اور وسط ایشیائی اور آذری بینکاروں، تاجروں، سفارتکاروں اور سیکڑوں فوجی افسروں کے لیے ترکی میں تربیت شامل ہیں۔ ترکی زبان سکھانے کے لیے نئی جمہوریاؤں میں اساتذہ بھیجے گئے اور لگ بھگ دو ہزار ساجھے کے کاروبار شروع کیے گئے۔ ثقافتی اشتراک نے ان اقتصادی روابط میں ہمواری پیدا کی۔ جیسا کہ ایک ترک تاجر نے تبصرہ کیا ''آذر بائی جان یا ترکمانستان میں کامیابی کے لیے اہم ترین چیز صحیح

تجارتی شریک تلاش کرنا ہے۔ ترک لوگوں کے لیے یہ اتنا مشکل نہیں۔ ہماری ایک ثقافت ہے، لگ بھگ ایک زبان ہے اور ہم ایک ہی طعام خانے سے کھاتے ہیں''۔[29]

ترکی کے قفقاز اور وسط ایشیا کی طرف رخ موڑنے کو نا صرف اس بات سے تقویت ملی کہ وہ اقوام کی ایک ترک برادری کا رہنما بننے کا خواب دیکھ رہا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ایران اور سعودی عرب کو اس خطے میں اپنے اثرات پھیلانے اور اسلامی بنیاد پرستی کو فروغ دینے سے روکنا چاہتا تھا۔ ترک خود کو اس حیثیت میں دیکھ رہے تھے کہ وہ ایک ''ترک نمونہ'' یا منڈی کی معیشت کی حامل سیکولر، جمہوری، مسلمان ریاست والے ''ترکی کا تصور'' ایک متبادل کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ مزید برآں، ترکی روسی اثرات کے احیا کو بھی روکنا چاہتا تھا۔ روس اور اسلام کا متبادل فراہم کر کے ترکی نے یورپی یونین سے حمایت کے حصول اور بالآخر رکنیت کے دعوے کی قوت بھی بڑھالی۔

ترک جمہوریاؤں کے ساتھ ترکی کی ابتدائی سرگرمیاں ۱۹۹۳ء میں اس وقت بہت محدود ہوگئیں جب اس کے وسائل پر بوجھ پڑنے لگا، اوزال کی وفات کے بعد سلیمان دیمرل نے صدارت سنبھالی اور روس نے اس علاقے میں اپنا اثر و رسوخ دوبارہ بڑھانا شروع کیا جسے وہ اپنا ''قریب بیرون ملک'' قرار دیتا تھا۔ جب ترک نسل کی سابق سوویت جمہوریائیں پہلی بار آزاد ہوئیں تو ان کے رہنماؤں نے ترکی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بے ساختہ انقرہ کا رخ کیا تھا۔ بعد میں جب روس نے دباؤ ڈالا اور ترغیبات دیں تو وہ پیچھے ہٹ گئے اور اپنے ثقافتی قرابت دار اور سابق سامراجی آقا کے درمیان ''متوازن'' تعلقات کی ضرورت پر زور دینے لگے۔ تاہم ترکوں نے اپنے معاشی و سیاسی روابط وسیع تر کرنے کے لیے ثقافتی وابستگیوں کو استعمال کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ وہ متعلقہ حکومتوں اور تیل کی کمپنیوں کو ایک پائپ لائن کی تعمیر پر رضامند کرنے میں کامیاب ہوگئے تاکہ وسط ایشیا اور آذربائی جان کا تیل ترکی کے راستے بحیرۂ روم پہنچ سکے۔[30]

جب ترکی ترک نسل کی سابق سوویت جمہوریاؤں سے روابط بڑھانے میں مصروف تھا، ملک کے اندر اس کی کمالسٹ سیکولر شناخت کو چیلنج درپیش تھا۔ اول، سرد جنگ کے خاتمے اور اس کے ساتھ معاشرتی و معاشی ترقی کی پیدا کردہ تبدیلیوں نے دوسرے ملکوں کی مانند ترکی میں بھی ''قومی و دیگر شناختوں'' کے اہم سوالات کو جنم دیا[31] جن کا جواب دینے کے لیے مذہب موجود تھا۔ ایک صدی کے دو تہائی عرصے کا اتاترک اور ترک اعلیٰ طبقے کا سیکولر ورثہ شدید تنقید کا نشانہ بننے لگا۔ بیرون ملک ترکوں کے تجربے سے ملک کے اندر اسلام پسندانہ جذبات کو ہوا ملی۔ مغربی جرمنی سے واپس آنے

والے ترکوں نے ''وہاں مخالفتوں کا ردعمل اس طرح ظاہر کیا کہ اس چیز کی جانب مائل ہو گئے جس سے وہ مانوس تھے اور وہ اسلام تھا۔'' اصل دھارے کی آرا اور عمل اسلام پسندانہ ہوتا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں بتایا گیا کہ ''اسلامی طرز کی ڈاڑھیاں اور نقاب دار خواتین ترکی میں بہت دکھائی دینے لگی ہیں، مساجد میں بڑے بڑے ہجوم آنے لگے ہیں اور کتابوں کی بعض دکانوں میں ایسی کتابیں، کیسٹوں، کمپیکٹ ڈسکس اور وڈیوز کی بھرمار ہوگئی ہے جن میں اسلامی تاریخ، تصورات اور طرزِ حیات کی عظمت اجاگر کی گئی ہے اور رسول اللہ [ﷺ] کی اقدار کو قائم رکھنے پر سلطنت عثمانیہ کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔'' اطلاعات کے مطابق ''نشر و طباعت کے کم سے کم ۲۹۰ ادارے، چار روزناموں سمیت ۳۰۰ مطبوعات، سو کے قریب بغیر لائسنس ریڈیو اسٹیشن اور لگ بھگ ۳۰ بغیر لائسنس ٹیلی وژن چینل سب کے سب اسلامی نظریات کی ترویج کر رہے تھے''۔[۳۲]

اسلامی جذبات سے دوچار ترکی کے حکمرانوں نے بنیاد پرست طور طریقے اختیار کرنے اور بنیاد پرستوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں ترک حکومت نے جو سیکولر سمجھی جاتی تھی، مذہبی امور کا ایک دفتر قائم کیا ہوا تھا جس کا بجٹ بعض وزارتوں سے زیادہ تھا، مسجدوں کی تعمیر میں مالی امداد دے رہی تھی، تمام سرکاری اسکولوں میں دینی تعلیم لازمی قرار دے دی تھی اور اسلامی اسکولوں کو رقوم فراہم کر رہی تھی۔ ان اسکولوں کی تعداد ۱۹۸۰ء کی دہائی کے دوران چار گنا ہوگئی۔ ان میں ثانوی درجوں کے ۱۵ فیصد بچے زیرِ تعلیم تھے، اسلامی عقائد پڑھائے جاتے تھے اور ان سے ہزاروں سند یافتہ افراد نکلے جنہوں نے سرکاری ملازمتیں کیں۔ فرانس کی صورتحال سے علامتی مگر ڈرامائی تضاد یہ تھا کہ حکومت نے طالبات کو حجاب پہننے کی اجازت دے دی۔ ستر سال قبل اتاترک نے ترکی ٹوپی پر پابندی لگائی تھی۔[۳۳] یہ اقدامات جن کا بڑا مقصد اسلام پسندوں کے بادبانوں سے ہوا نکالنا تھا، یہ ثابت کرتے ہیں کہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں یہ ہوا کتنی زوردار تھی۔

دوم، اسلام کے احیا نے ترک سیاست کی نوعیت بدل دی۔ سیاسی رہنماؤں نے جن میں ترگت اوزال نمایاں ترین ہیں، واضح طور پر مسلمان علامات اور پالیسیوں کو اپنی پہچان بنایا۔ دوسرے ملکوں کی طرح ترکی میں بھی جمہوریت نے مقامیت اور مذہب کی طرف واپسی کو تقویت دی۔ ''عوام کو خوش کرنے اور ووٹ حاصل کرنے کی خاطر سیاستدانوں کو بلکہ فوج تک کو جو سیکولرزم کا قلعہ اور محافظ تھی لوگوں کی مذہبی امنگوں کا خیال کرنا پڑا: ان کی دی ہوئی بیشتر رعایات سے جذبات انگیزی کی بو آتی تھی۔'' عام پسندانہ تحریکوں کا رجحان مذہبی تھا۔ اعلیٰ طبقات اور افسرشاہی

خصوصاً فوج کا میلان تو سیکولر تھا مگر مسلح افواج کے اندر اسلام پسندانہ جذبات ظاہر ہونے لگے اور ۱۹۸۷ء میں کئی سو کیڈٹوں کو اسلامی جذبات رکھنے کے شبہے میں فوجی تربیتی اداروں سے نکال دیا گیا۔ اہم سیاسی جماعتوں کو احیا شدہ مسلمان طریقوں یا منتخب انجمنوں سے، جن پر اتاترک نے پابندی عائد کردی تھی، انتخابی حمایت کی زیادہ سے زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی۔[۳۴] مارچ ۱۹۹۴ء کے مقامی انتخابات میں پانچ بڑی جماعتوں میں سے صرف بنیاد پرست رفاہ پارٹی کے ووٹوں کی تعداد بڑھی۔ اس نے وزیراعظم تانسو چلر کی صراطِ مستقیم پارٹی کے ۲۱ فیصد اور اوزال مرحوم کی وطن پارٹی کے ۲۰ فیصد کے مقابلے میں لگ بھگ ۱۹ فیصد ووٹ حاصل کیے۔ رفاہ پارٹی ترکی کے دو سب سے اہم شہروں استنبول اور انقرہ پر قابض اور ملک کے جنوب مشرقی حصے میں بھی انتہائی مضبوط ہوگئی۔ دسمبر ۱۹۹۵ء کے انتخابات میں رفاہ پارٹی نے تمام جماعتوں سے زیادہ ووٹ اور پارلیمانی نشستیں حاصل کیں اور چھ ماہ بعد ایک سیکولر جماعت کے ساتھ مخلوط حکومت بنالی۔ دوسرے ممالک کی طرح، بنیاد پرستوں کو نوجوان نسل اور واپس آنے والے مہاجرین، ''محروم و مفلس'' افراد اور ''بغیر جاگیر والے'' ''نئے شہری مہاجرین'' سے حمایت ملی۔[۳۵]

سوم، اسلامی احیا نے ترکی کی خارجہ پالیسی کو متاثر کیا۔ صدر اوزال کی قیادت میں ترکی نے خلیج کی جنگ میں فیصلہ کن طور پر مغرب کا ساتھ دیا تھا، اس توقع کے ساتھ کہ اس اقدام سے یورپی برادری میں اس کی رکنیت کے دعوے کو تقویت ملے گی۔ تاہم یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ نیٹو کا موقف اس بارے میں واضح نہیں تھا کہ اگر عراق نے اس جنگ کے دوران ترکی پر حملہ کر دیا تو اسے کیا جواب دینا چاہیے۔ چنانچہ ترک اس سلسلے میں مطمئن نہ تھے کہ نیٹو ان کے ملک کو درپیش غیر روسی خطرے کا کیا جواب دے گی۔[۳۶] ترک رہنماؤں نے اسرائیل سے فوجی تعلقات بڑھانے کی کوشش کی جس سے ترک اسلام پسندوں کی طرف سے شدید نکتہ چینی ہوئی۔ اہم تر بات یہ کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں ترکی نے عرب اور دیگر مسلمان ملکوں سے اپنے روابط وسیع کیے اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں بوسنیائی مسلمانوں اور آذربائی جان کو مدد فراہم کر کے اسلامی مفادات کو فعال انداز میں فروغ دیا۔ بلقان، وسط ایشیا یا مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں ترکی کی خارجہ پالیسی اسلام پسندانہ ہوتی جا رہی تھی۔

کئی سال تک ترکی ان تین میں سے کم از کم دو شرائط پر پورا اترتا تھا جو اپنی تہذیبی شناخت بدلنے والے کسی مقطوع ملک میں ہوتی ہیں۔ ترکی کے اعلیٰ طبقات نے ان اقدامات کی بھرپور حمایت کی اور عوام آمادہ تھے۔ تاہم وصول کنندہ تہذیب کے اعلیٰ طبقات تیار نہ تھے۔ ابھی یہ مسئلہ تعطل میں تھا کہ ترکی کے اندر اسلام کے احیا نے عوام میں مغرب دشمن جذبات پیدا کر دیے اور ترکی کے

اعلیٰ طبقات کے سیکولر، مغرب پسند رجحان کی جڑیں اکھاڑنی شروع کر دیں۔ ترکی کے مکمل یورپی بننے میں درپیش رکاوٹیں، ترک نسل کی سابق سوویت جمہوریاؤں کے حوالے سے اس کے بالادست کردار ادا کرنے کی محدود اہلیت اور اتاترک کے ورثے کو زائل کرنے والے اسلامی رجحانات، ان سب کے باعث یہ یقینی معلوم ہو رہا تھا کہ ترکی ایک مقطوع ملک رہے گا۔

ان متضاد قوتوں کی وجہ سے ترک رہنماؤں نے بار بار اپنے ملک کو ثقافتوں کے مابین ''پل'' قرار دیا۔ ۱۹۹۳ء میں وزیراعظم تانسو چلر نے کہا کہ ترکی ''مغربی جمہوریت'' بھی ہے اور ''مشرقِ وسطیٰ کا حصہ'' بھی اور ''طبیعی و فلسفیانہ حوالوں سے دو تہذیبوں کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے۔'' یہ بھی ان ملے جلے جذبات کی عکاسی تھی کہ چلر اپنے ملک میں تو مسلمان کی روپ میں سامنے آتی تھیں لیکن نیٹو سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''جغرافیائی و سیاسی حقیقت یہ ہے کہ ترکی یورپی ملک ہے۔'' اسی طرح صدر سلیمان دیمرل نے ترکی کو ''مغرب سے مشرق تک یعنی یورپ سے چین تک پھیلے ہوئے خطے کا بہت اہم پل'' قرار دیا۔[۳۷] بہرحال، پل ایک مصنوعی تخلیق ہے جو دو ٹھوس اکائیوں کو ملاتی ہے لیکن ان میں سے کسی کا بھی حصہ نہیں ہوتی۔ جب ترکی کے رہنما اپنے ملک کو پل ٹھہراتے ہیں تو خوشنما الفاظ میں محض یہ تصدیق کر رہے ہوتے ہیں کہ ترکی مقطوع ملک ہے۔

میکسیکو۔ ترکی ۱۹۲۰ء کی دہائی میں مقطوع ملک بنا لیکن میکسیکو ۱۹۸۰ء کی دہائی سے پہلے تک مقطوع نہیں تھا۔ اس کے باوجود مغرب سے اس کے تعلقات ترکی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ترکی کی مانند میکسیکو کی ایک مخصوص غیر مغربی ثقافت ہے۔ جیسا کہ آکٹیویو پاز نے کہا، بیسویں صدی تک میں ''میکسیکو بنیادی طور پر انڈین☆ ہے۔ یہ غیر یورپی ہے''۔[۳۸] انیسویں صدی میں میکسیکو بھی عثمانی سلطنت کی طرح مغربی قوتوں کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو گیا۔ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائیوں میں ترکی کی طرح میکسیکو میں انقلاب آیا جس نے قومی شناخت کی نئی بنیاد ڈالی اور نیا یک جماعتی نظام قائم کیا۔ تاہم ترکی میں انقلاب کے نتیجے میں روایتی اسلامی اور عثمانی ثقافت دونوں کو مسترد کر دیا گیا تھا اور مغربی ثقافت کو درآمد کرنے اور مغرب کے ساتھ شامل ہونے کو کوشش کی گئی تھی۔ روس کی مانند میکسیکو میں انقلاب میں مغربی ثقافت کے عناصر کو شامل کیا گیا اور اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی جس سے ایک نئی قوم پرستی نے جنم لیا جو مغرب کی جمہوریت اور سرمایہ داری کی مخالف تھی۔ اس طرح ساٹھ سال تک ترکی نے اپنی شناخت یورپی کے طور پر متعین

☆ نوٹ از مترجم: یہاں مراد ریڈ انڈین ہے، ہندوستانی نہیں۔

کرنی چاہی جبکہ میکسیکو امریکا کی مخالفانہ روش پر چلتا رہا۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی سے ۱۹۸۰ء کی دہائی تک میکسیکو کے رہنماؤں نے امریکی مفادات کو چیلنج کرنے والی اقتصادی اور خارجہ پالیسیاں اختیار کیں۔

۱۹۸۰ء کے عشرے میں یہ صورتحال بدل گئی۔ صدر میکیول ڈی لا میڈرڈ نے میکسیکو کے مقاصد، رواجوں اور شناخت کی اتنے بڑے پیمانے پر ازسرِنو تعین کی کوششیں شروع کیں جو ۱۹۱۰ء کے انقلاب کے بعد نہیں ہوئی تھیں۔ ڈی لا میڈرڈ کے جانشین صدر کارلوس سیلیناس ڈی گورٹاری نے تبدیلی کا یہ عمل جاری رکھا۔ سیلیناس عملاً میکسیکو کا مصطفیٰ کمال بن گیا۔ اتاترک نے اپنے دور کے مغرب کے غالب نظریات سیکولرزم اور قوم پرستی کو پروان چڑھایا تھا تو سیلیناس نے اپنے زمانے کے مغرب کے دو غالب نظریات میں سے ایک یعنی اقتصادی آزادی کو فروغ دیا (دوسرے نظریے یعنی جمہوریت کو اس نے نہیں اپنایا)۔ جیسے اتاترک کے معاملے میں تھا اسی طرح میکسیکو میں اعلیٰ سیاسی اور معاشی طبقات ان نظریات کے حامی تھے جن میں سے بیشتر نے، سیلیناس اور ڈی لا میڈرڈ کی طرح امریکا میں تعلیم پائی تھی۔ سیلیناس نے افراطِ زر بے حد کم کردی، بڑی تعداد میں سرکاری اداروں کی نجکاری کی، غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دیا، ٹیرف اور رعایات گھٹائیں، غیر ملکی قرضوں کی شرائط آسان کرائیں، لیبر یونینوں کی طاقت کو چیلنج کیا، پیداواری صلاحیت بڑھائی اور میکسیکو کو امریکا اور کینیڈا کے ساتھ نیفٹا میں شامل کرایا۔ جس طرح اتاترک کی اصلاحات کا مقصد ترکی کو مشرقِ وسطیٰ کے ملک کی بجائے سیکولر یورپی ملک بنانا تھا اسی طرح سیلیناس کی اصلاحات کا مقصد میکسیکو کو لاطینی امریکی ملک کی بجائے شمالی امریکی ملک بنانا تھا۔

یہ میکسیکو کے لیے ناگزیر راستہ نہیں تھا۔ میکسیکو کے اعلیٰ طبقات امریکا مخالف اور تیسری دنیا کی قوم پرستی و تنہائی پسندی کی راہ پر گامزن رہ سکتے تھے جس پر وہ صدی کے بیشتر عرصے کے دوران چلتے رہے تھے۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ میکسیکو کے بعض لوگوں نے کہا تھا، وہ اسپین، پرتگال اور جنوبی امریکی ملکوں کے ساتھ اقوام کا ایک آئبیریائی اتحاد بھی بنا سکتے تھے۔

کیا میکسیکو شمالی امریکی بننے کے راستے پر کامیابی حاصل کرلے گا؟ اونچے سیاسی، اقتصادی اور علمی طبقے زیادہ تر اس راستے پر چلنے کے حامی ہیں۔ پھر ترکی کی صورتحال کے برخلاف، قبول کی جانے والی تہذیب کے سیاسی، اقتصادی اور علمی طبقے بھی بڑی حد تک میکسیکو کی ثقافتی جہت میں تبدیلی کی حمایت میں ہیں۔ ترکِ وطن کا حساس بین التہذیبی مسئلہ اس فرق کو اجاگر کرتا ہے۔ بڑے پیمانے پر ترکِ نقلِ مکانی کے خوف کے باعث یورپی اعلیٰ طبقات اور عوام دونوں نے ترکی کو یورپ میں لانے کی مزاحمت کی۔ اس کے برعکس بڑے پیمانے پر میکسیکو کے باشندوں کی امریکا میں قانونی و

… سیلیناس نے استدلال کا حصہ تھا: "یا آپ ہماری اشیا کو قبول
… مزید برآں، میکسیکو اور امریکا کے درمیان ثقافتی فاصلہ ترکی اور
… میکسیکو کا مذہب کیتھولک، زبان اسپینی اور اعلیٰ طبقات تاریخی طور
… تعلیم کے لیے بھیجتے تھے) اور اب امریکا (جہاں وہ اب اپنے بچوں
… شمالی امریکا اور اسپینی انڈین میکسیکو کے درمیان تفاوت
… اختلافات کی بہ نسبت آسان ہونا چاہیے۔ ان مشترکہ خواص
… میکسیکو سے مزید قربت کی مخالفت کی گئی اور نقل مکانی کو
… کی طرف منتقل ہونے کی شکایات اور آزادی و قانون
… وابستگی کے بارے میں سوالات سامنے آنے لگے۔[29]

… اپنی شناخت تبدیل کرنے کی تیسری شرط عوام کی طرف
… کی اہمیت کس حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ ملک کے
… کتنے اہم ہیں۔ میکسیکو کی مغرب پسندی کی ۱۹۹۵ء تک
… چیاپاس میں یوم سال نو پر چند ہزار منظم اور بیرونی
… شمالی امریکی رنگ اختیار کرنے کے خلاف مزاحمت کو ظاہر نہیں کرتی
… اور عوامی آرا کے دوسرے حلقوں کی جانب سے اس پر جو
… شمالی امریکی رنگ میں رنگنے کی بالخصوص اور نیفٹا میں شمولیت کی
… عوام کی طرف سے مخالفت کی جاسکتی ہے۔ صدر سیلیناس نے
… اور مغربیت کو سیاسی اصلاحات اور جمہوری عمل پر ترجیح دی۔ تاہم
… روابط دونوں سے وہ قوتیں مضبوط ہوں گی جو میکسیکو
… حامی ہیں۔ میکسیکو کے مستقبل کے لیے کلیدی سوال
… ہونے سے مغربیت کو ترک کرنے کو کس حد تک تحریک ملے
… زیادہ تر غیر مؤثر ہونے پر منتج ہو اور ساتھ ہی ان پالیسیوں
… اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں اس کے مغرب پسند اونچے طبقات نے
… شمالی امریکی رنگ میں رنگنا وہاں جمہوریت کے قیام کے عمل سے

… اور میکسیکو کے برخلاف آسٹریلیا ابتدا سے مغربی معاشرہ رہا ہے۔

پوری بیسویں صدی میں یہ پہلے برطانیہ اور پھر امریکا کا قریبی اتحادی رہا اور سرد جنگ کے دوران یہ نا صرف مغرب کا رکن تھا بلکہ مغرب کے امریکی برطانوی کینیڈین آسٹریلوی فوجی و جاسوسی مرکز کا بھی رکن تھا۔ تاہم ۱۹۹۰ء کی دہائی اوائل میں آسٹریلیا کے سیاسی رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ آسٹریلیا کو مغرب سے الگ ہو جانا چاہیے، خود کو ایک ایشیائی معاشرے کے طور پر شناخت کرنا چاہیے اور اپنے جغرافیائی ہمسایوں سے قریبی روابط بڑھانے چاہئیں۔ وزیر اعظم پال کیٹنگ نے اعلان کر دیا کہ آسٹریلیا کو ''سلطنت کے برانچ آفس'' کی حیثیت ترک کرنی چاہیے، جمہوریہ بننا چاہیے اور ایشیا میں اپنے روابط میں اضافہ کرنا چاہیے۔ بقول ان کے، آسٹریلیا کی آزاد ملک کے طور پر شناخت قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ ''آسٹریلیا ایک اعتبار سے، کم از کم آئینی حوالے سے، ایک ماخوذ معاشرہ رہتے ہوئے خود کو دنیا میں کثیر ثقافتی معاشرے کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتا، ایشیا سے منسلک نہیں ہو سکتا، اس رشتے کو معتبر انداز میں قائم نہیں رکھ سکتا۔'' کیٹنگ نے کہا کہ آسٹریلیا ''انگریز پرستی اور سستی'' کا طویل زمانہ جھیل چکا ہے اور برطانیہ سے ربط ضبط جاری رہنا ''ہماری قومی ثقافت، ہمارے معاشی مستقبل اور ایشیا اور بحرالکاہل میں ہماری تقدیر کے لیے مضر ہو گا۔'' وزیر خارجہ گیرتھ ایونز نے بھی اس سے ملتے جلتے جذبات کا اظہار کیا۔[۴]

آسٹریلیا کی پہچان ایشیائی ملک کے طور پر متعین کرنے کے موقف کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ اقوام کی تقدیر بنانے میں اقتصادیات ثقافت سے بازی لے جاتی ہے۔ اس موقف کو اصل تحریک مشرقی ایشیائی معیشتوں کی تیز رفتار ترقی سے ملی جس کے باعث ایشیا سے آسٹریلوی تجارت بہت بڑھ گئی۔ ۱۹۷۱ء میں آسٹریلیا کی ۳۹ فیصد برآمدات مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کو ہوئی تھیں اور ۲۱ فیصد درآمدات اس خطے سے کی گئی تھیں۔ ۱۹۹۴ء تک مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک آسٹریلیا کی ۶۲ فیصد برآمدات وصول اور ۴۱ فیصد درآمدات فراہم کر رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۹۱ء میں ۸ء۱۱ فیصد آسٹریلوی برآمدات یورپی برادری اور ۱ء۱۰ فیصد امریکا کو کی گئیں۔ ایشیا سے گہرے ہوتے ہوئے ان روابط کا خیال آسٹریلوی ذہنوں میں اس یقین کی وجہ سے راسخ ہو گیا کہ دنیا تین بڑے اقتصادی بلاکوں کی سمت میں بڑھ رہی ہے اور آسٹریلیا کا مقام مشرقی ایشیائی بلاک میں ہے۔

ان معاشی تعلقات کے باوجود آسٹریلیوں کے ایشیائی ڈھونگ کا ان شرائط پر پورا اترنے کا امکان نہیں جو کسی مقطوع ملک کی کامیاب تہذیبی تبدیلی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک تو ۱۹۹۰ء کے وسط تک آسٹریلوی اعلیٰ طبقات یہ راستہ اپنانے کے بارے میں زیادہ پُر جوش نہیں تھے۔ کسی حد

تک یہ سیاسی جماعتوں کا مسئلہ تھا جس میں لبرل پارٹی کے رہنما متذبذب یا مخالف تھے۔ لیبر حکومت پر بھی مختلف دانشوروں اور صحافیوں نے خاصی تنقید کی۔ ایشیائی راستہ اختیار کرنے کے حق میں اعلیٰ طبقات میں کوئی واضح اتفاق رائے نہیں تھا۔ دوسرے عوامی آرا بھی ملی جلی تھیں۔ ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۳ء تک بادشاہت کے خاتمے کی حمایت کرنے والے آسٹریلوی عوام کا تناسب ۲۱ فیصد سے بڑھ کر ۴۶ فیصد ہوگیا۔ لیکن پھر حمایت کمزور پڑنے لگی۔ آسٹریلیا کے پرچم سے یونین جیک ختم کرنے کے بارے میں عوامی حمایت مئی ۱۹۹۲ء میں ۴۲ فیصد سے گر کر اگست ۱۹۹۴ء میں ۳۵ فیصد رہ گئی۔ جیسا کہ ایک آسٹریلوی عہدیدار نے ۱۹۹۲ء میں کہا،'' عوام کے لیے اسے ہضم کرنا دشوار ہے۔ جب وقتاً فوقتاً میں کہتا ہوں کہ آسٹریلیا کو ایشیا کا حصہ ہونا چاہیے تو آپ کو بتا نہیں سکتا کہ گالیوں سے بھرے کتنے خطوط میرے پاس آتے ہیں''۔[41]

تیسری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ایشیائی ملکوں کے اعلیٰ طبقات آسٹریلیا کو قبول کرنے میں اس سے بھی کم پُرجوش ہیں جتنے یورپی اعلیٰ طبقات ترکی کو قبول کرنے کے سلسلے میں رہے ہیں۔ انہوں نے واضح کردیا ہے کہ اگر آسٹریلیا ایشیا کا جز بننا چاہتا ہے تو اسے سچ مچ ایشیائی بننا پڑے گا، جو ان کے خیال میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ انڈونیشیا کے ایک عہدیدار نے کہا کہ'' آسٹریلیا کے ایشیا سے اتحاد کی کامیابی کا انحصار ایک چیز پر ہے-- ایشیائی ممالک آسٹریلوی ارادے کا کس حد تک خیر مقدم کرتے ہیں۔ ایشیا میں آسٹریلیا کی قبولیت اس پر منحصر ہے کہ آسٹریلیا کی حکومت اور عوام ایشیائی ثقافت اور معاشرے کو کتنا سمجھتے ہیں۔'' ایشیائیوں کو آسٹریلیا کے ایشیا پسندانہ بیانات اور اس کی گمراہ مغربی حقیقت کے درمیان خلیج نظر آتی ہے۔ ایک آسٹریلوی سفارتکار کے مطابق تھائی باشندے آسٹریلیا کے ایشیائی ہونے پر اصرار کو'' پریشان ہوکر لیکن تحمل'' کے ساتھ دیکھتے ہیں۔[42] ملائشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد نے اکتوبر ۱۹۹۴ء میں کہا کہ'' ثقافتی اعتبار سے آسٹریلیا اب بھی یورپی ہے... ہم اسے یورپی سمجھتے ہیں'' چنانچہ آسٹریلیا کو ای اے ای سی کا رکن نہیں بننا چاہیے۔ ہم ایشیائی '' دوسرے ملکوں پر براہ راست نکتہ چینی کرنے یا ان کے بارے میں فیصلے صادر کرنے کا اتنا رجحان نہیں رکھتے۔ لیکن آسٹریلیا ثقافتی طور پر یورپی ہونے کے ناتے محسوس کرتا ہے کہ اسے دوسروں کو یہ بتانے کا حق ہے کہ وہ کیا کریں، کیا نہ کریں، کیا درست ہے اور کیا غلط ہے۔ یقیناً یہ چیز گروپ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ [ای اے ای سی میں اس کی شمولیت کے لیے میری مخالفت کی] یہی وجہ ہے۔ یہ جلد کی رنگت نہیں، ثقافت کی وجہ سے ہے''۔[43] مختصر یہ کہ ایشیائی آسٹریلیا کو اسی سبب سے اپنے کلب سے باہر رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں جس سبب سے یورپی ترکی کو باہر رکھے ہوئے ہیں: وہ ہم

سے مختلف ہیں۔ وزیراعظم کیٹنگ یہ کہنا پسند کرتے تھے کہ وہ آسٹریلیا کو ایشیا کے ''باہر کے مختلف آدمی کی جگہ اندر کا مختلف آدمی'' بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ اجتماع ضدین کی ایک مثال ہے: مختلف آدمی اندر داخل نہیں ہوتے۔

جیسا کہ مہاتیر نے بیان کیا، آسٹریلیا کے ایشیا میں شامل ہونے کی راہ میں بنیادی رکاوٹیں ثقافت اور اقدار ہیں۔ جمہوریت، انسانی حقوق، آزاد پریس سے آسٹریلویوں کی وابستگی کے بارے میں اور اس کے تقریباً تمام ہمسایوں کی حکومتوں کی جانب سے ان حقوق کی پامالی پر احتجاج کے حوالے سے تنازعات مستقل ابھرتے رہتے ہیں۔ ایک سینئر آسٹریلوی سفارتکار نے کہا کہ ''خطے میں آسٹریلیا کے لیے اصل مسئلہ ہمارا جھنڈا نہیں بلکہ ہمارے سماجی اقدار کی جڑیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کوئی ایسا آسٹریلوی نہیں ملے گا جو خطے میں قبولیت حاصل کرنے کے لیے ان اقدار کو ترک کرنے پر آمادہ ہو''۔[۴۴] کردار، انداز اور برتاؤ میں بھی نمایاں اختلافات ہیں۔ جیسا کہ مہاتیر نے کہا، ایشیائی عموماً دوسروں کے ساتھ اپنے مقاصد کے حصول پر جن طریقوں سے گامزن رہتے ہیں وہ نازک، بالواسطہ، لچکدار، ایچ پیچ والے، غیر فیصلہ کن، اخلاقیات کے عنوان سے ہٹ کر اور محاذ آرائی سے گریز کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریزی بولنے والوں کی دنیا میں آسٹریلوی سب سے دوٹوک، اکھڑ، صاف گو، اور بعض افراد کی نظر میں، بے حس لوگ ہیں۔ ثقافتوں کے اس تصادم کا اظہار ایشیائیوں کے ساتھ پال کیٹنگ کے اپنے معاملات میں سب سے ڈرامائی طور پر نمایاں ہوا۔ کیٹنگ میں آسٹریلیا کی قومی خصوصیات انتہا پر تھیں۔ انہیں ''داخلی طور پر اشتعال انگیز اور جھگڑالو'' طرز رکھنے والا ''پائل ڈرائیور سیاستداں'' کہا گیا اور انہوں نے اپنے سیاسی مخالفین کو scumbags، perfumed gigolos اور brain-damaged looney crims کہنے سے گریز نہیں کیا۔[۴۵] آسٹریلیا کو ایشیائی بنانے کی بات کرنے کے باوجود کیٹنگ اپنی سفاکانہ صاف گوئی سے ایشیائی رہنماؤں کو جھلاہٹ میں مبتلا کرتے رہے، ذہنی دھچکے پہنچاتے رہے اور انہیں مخالف بناتے رہے۔ ثقافتوں کے مابین خلیج کی وسعت نے ثقافتی اتحاد کے علمبردار کو اس قدر اندھا کر دیا کہ اس کے اپنے رویے نے ان لوگوں کو دور ہٹایا جنہیں وہ اپنے ثقافتی برادر کہتا تھا۔

کیٹنگ اور ایونز کے چنیدہ راستے کو اقتصادی عوامل کو ضرورت سے زیادہ وزن دینے اور ملک کی ثقافت کو بحال کرنے کی بجائے نظر انداز کرنے کا نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے جس کا سبب کوتاہ بینی تھی یا اسے آسٹریلیا کے معاشی مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے سیاسی چال تصور کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف اسے مشرقی ایشیا کے اقتصادی، سیاسی اور آخرکار فوجی طاقت کے ابھرتے ہوئے مراکز کے

مسترد کرنا ناممکن ہے تو کمال ازم والا ردِعمل ناکام رہا ہے۔ اگر غیر مغربی معاشروں کو جدید بننا ہے تو انہیں یہ کام اپنے طریقے سے کرنا ہوگا، مغرب کے طریقے سے نہیں اور جاپان سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی روایات، اداروں اور قدروں کو تعمیر اور استعمال کرنا ہوگا۔

جو سیاسی رہنما یہ گھمنڈ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے معاشروں کی ثقافتی اساس کو نئی شکل دے سکتے ہیں، ان کو ناکام ہو کر رہنا ہے۔ وہ مغربی ثقافت کے کچھ عناصر تو متعارف کرا سکتے ہیں مگر اپنی دیسی ثقافت کے بنیادی عناصر کو دبا سکتے ہیں نہ خارج کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر مغربی وائرس ایک بار کسی معاشرے میں داخل ہو گیا تو اسے نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ وائرس زندہ رہتا ہے لیکن مہلک نہیں۔ مریض بچ جاتا ہے لیکن پوری طرح صحت یاب نہیں ہوتا۔ سیاسی رہنما تاریخ بنا سکتے ہیں مگر تاریخ سے بچ نہیں سکتے۔ وہ مقطوع ممالک پیدا کرتے ہیں، مغربی معاشرے تخلیق نہیں کر پاتے۔ وہ اپنے ملک کو ثقافتی مخبوط الحواسی میں مبتلا کر دیتے ہیں جو اس کی مستقل خاصیت اور کردار کا حصہ بن جاتی ہے۔

مسترد کرنا ناممکن ہے تو کمال ازم والا ردِعمل ناکام رہا ہے۔ اگر غیر مغربی معاشروں کو جدید بننا ہے تو انہیں یہ کام اپنے طریقے سے کرنا ہوگا، مغرب کے طریقے سے نہیں اور جاپان سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی روایات، اداروں اور قدروں کو تعمیر اور استعمال کرنا ہوگا۔

جو سیاسی رہنما یہ گھمنڈ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے معاشروں کی ثقافتی اساس کو نئی شکل دے سکتے ہیں، ان کو ناکام ہوکر رہنا ہے۔ وہ مغربی ثقافت کے کچھ عناصر تو متعارف کرا سکتے ہیں مگر اپنی دیسی ثقافت کے بنیادی عناصر کو دبا سکتے ہیں نہ خارج کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر مغربی وائرس ایک بار کسی معاشرے میں داخل ہوگیا تو اسے نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ وائرس زندہ رہتا ہے لیکن مہلک نہیں۔ مریض بچ جاتا ہے لیکن پوری طرح صحت یاب نہیں ہوتا۔ سیاسی رہنما تاریخ بنا سکتے ہیں مگر تاریخ سے بچ نہیں سکتے۔ وہ مقطوع ممالک پیدا کرتے ہیں، مغربی معاشرے تخلیق نہیں کر پاتے۔ وہ اپنے ملک کو ثقافتی مخبوط الحواسی میں مبتلا کر دیتے ہیں جو اس کی مستقل خاصیت اور کردار کا حصہ بن جاتی ہے۔

ساتواں باب

مرکزی ریاستیں، ہم مرکز دائرے اور تہذیبی نظام

تہذیبیں اور نظام

ابھرتی ہوئی عالمی سیاست میں کشش و دفع کے اہم قطبوں کی حیثیت سے سرد جنگ کی دو سپر طاقتوں کی جگہ بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں لے رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں مغربی، آرتھوڈوکس اور صینی تہذیبوں میں سب سے نمایاں ہیں۔ ان میں مرکزی ریاستوں، رکن ریاستوں، ملحق ریاستوں میں ثقافتی مشابہت کی حامل اقلیتی آبادیوں اور پڑوسی ریاستوں میں دوسری ثقافتوں کے افراد پر مشتمل تہذیبی گروہ بندیاں ابھر رہی ہیں۔ ان تہذیبی بلاکس میں ریاستیں مرکزی ریاست یا ریاستوں کے گرد ہم مرکز دائروں میں، جن سے اس بلاک کے ساتھ ان کی شناخت اور یکجہتی کے درجے کا تعین ہوتا ہے، بٹی ہوئی ہیں۔ اسلام کی مشترکہ آگاہی میں شدت آ رہی ہے مگر کوئی تسلیم شدہ مرکزی ریاست نہ ہونے کے باعث ابھی تک اس کا مشترکہ سیاسی ڈھانچہ بہت خام اور ابتدائی نوعیت کا ہے۔

ملکوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ ملتی جلتی ثقافت والے ممالک کے ساتھ دوڑنے اور ثقافتی مشابہت نہ رکھنے والے ملکوں کے خلاف توازن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرکزی ریاستوں کے بارے میں یہ بات خاص طور پر درست ہے۔ ان کی طاقت ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے جو ثقافتی اعتبار سے مشابہ ہوتے ہیں اور انہیں دور ہٹنے پر مائل کرتی ہے جو ثقافتی اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ تحفظ و سلامتی کے پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرکزی ریاستیں دوسری تہذیبوں کے افراد کو

اپنے ساتھ شامل کرسکتی ہیں یا ان پر غالب آسکتی ہیں جبکہ ان تہذیبوں کے لوگ اس غلبے کے خلاف مزاحمت یا اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں (چینی بمقابلہ تبتی اور یوغور؛ روسی بمقابلہ تاتار، چیچن، وسط ایشیائی مسلمان)۔ تاریخی تعلقات اور طاقت کے توازن سے متعلق خدشات و خیالات بھی بعض ملکوں کو اپنی مرکزی ریاست کے اثرات کی مزاحمت کرنے کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ جارجیا اور روس دونوں آرتھوڈوکس ممالک ہیں لیکن اہلِ جارجیا نے تاریخ میں روسی بالادستی اور روس سے قربت کی مزاحمت کی ہے۔ ویت نام اور چین دونوں کنفیوشین ممالک ہیں لیکن ان میں بھی اسی طرح دشمنی کی تاریخ رہی ہے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ثقافتی اشتراک کے باعث اور وسیع تر اور مضبوط تر تہذیبی شعور پروان چڑھنے پر یہ ممالک قریب آسکتے ہیں جیسے مغربی یورپ کے ممالک قریب آئے ہیں۔

سرد جنگ کے دوران جو نظام بھی تھا وہ دونوں سپر طاقتوں کے اپنے بلاک پر غلبے اور تیسری دنیا میں سپر طاقتوں کے اثر ورسوخ کی پیداوار تھا۔ نئی دنیا میں عالمی طاقت متروک چیز بن چکی ہے اور عالمی برادری محض خواب ہے۔ امریکا سمیت کسی ملک کے سلامتی کے اہم عالمی مفادات نہیں۔ آج کی زیادہ پیچیدہ اور غیر متجانس دنیا میں جو نظام ہے اس کے عناصر تہذیبوں کے اندر اور ان کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ دنیا کا نظام تہذیبوں کی بنیاد پر بنے گا یا پھر بنے گا ہی نہیں۔ اِس دنیا میں تہذیبوں کے اندر، اور دوسری مرکزی ریاستوں سے گفت وشنید کے توسط سے، تہذیبوں کے مابین ترتیب و نظام کا سرچشمہ تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں ہیں۔

ایک ایسی دنیا جس میں مرکزی ریاستیں قائدانہ یا غالب کردار ادا کرتی ہیں دائرہ ہائے اثر کی دنیا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی دنیا بھی ہے جس میں مرکزی ریاست کے اثر ورسوخ کو اس کی تہذیب کی رکن ریاستوں کی مشترکہ ثقافت کم اور معتدل کردیتی ہے۔ ثقافتی اشتراک رکن ریاستوں اور بیرونی طاقتوں اور اداروں کے لیے مرکزی ریاست کے قائدانہ اور نافذانہ کردار کا جواز فراہم کرتا ہے۔ پس اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بطروس غالی کی طرح ''دائرۂ اثر کے قیام'' کا قاعدہ لاگو کرنا فضول ہے جنہوں نے ۱۹۹۴ء میں اس قاعدے کا اعلان کیا تھا جس کے تحت خطے کی بالادست طاقت اقوام متحدہ کی ایک تہائی سے زیادہ امن افواج فراہم نہ کرے۔ یہ شرط اس جغرافیائی و سیاسی حقیقت سے متصادم ہے کہ کسی بھی خطے میں جہاں کوئی غالب ریاست ہو امن قائم کرنا اور برقرار رکھنا صرف اس ریاست کی قیادت کے ذریعے ممکن ہے۔

کوئی مرکزی ریاست ترتیب و نظم قائم رکھنے کا وظیفہ اس لیے سرانجام دے سکتی ہے کہ رکن

ریاستیں اسے اپنا ثقافتی قرابت دار سمجھتی ہیں۔ تہذیب ایک بھرے خاندان کی طرح ہوتی ہے اور مرکزی ریاستیں خاندان کے بزرگوں کی مانند سہارا اور نظم وضبط دیتی ہیں۔ یہ قرابت داری نہ ہو تو کسی طاقتور ریاست کی اپنے خطے کے تنازعات سلجھانے اور نظم قائم رکھنے کی قوت محدود ہوتی ہے۔ پاکستان، بنگلہ دیش بلکہ سری لنکا بھی بھارت کو جنوبی ایشیا میں نظم وضبط قائم کرنے والے کی حیثیت سے تسلیم نہیں کریں گے اور مشرقی ایشیا کی کوئی ریاست جاپان کو اس کردار میں قبول نہیں کرے گی۔

جب تہذیبوں میں مرکزی ریاستیں نہ ہوں تو تہذیبوں کے اندر نظم کے قیام اور تہذیبوں کے مابین نظم کے معاملات طے کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اسلامی مرکزی ریاست کی عدم موجودگی نے، جو خود کو بوسنیائیوں سے جائز اور محکم طور پر منسلک کرسکتی، جیسے روس نے سربوں اور جرمنی نے کروٹس کے ساتھ خود کو منسلک کیا تھا، امریکا کو یہ کردار ادا کرنے کو کوشش پر مجبور کیا۔ امریکا کا یہ کردار اس لیے غیرمؤثر رہا کہ اُس کو اِس مسئلے سے عسکری دلچسپی نہیں تھی کہ سابق یوگوسلاویہ میں سرحدیں کہاں کھینچی جائیں، امریکا اور بوسنیا میں کوئی ثقافتی ربط نہیں تھا اور یورپی ممالک یورپ میں ایک مسلمان ریاست کی تشکیل کی مخالفت کررہے تھے۔ افریقہ اور عرب دنیا دونوں میں مرکزی ریاستوں کی عدم موجودگی نے سوڈان میں جاری خانہ جنگی کا تصفیہ کرنے کی کوششوں کو بہت الجھا دیا ہے۔ دوسری طرف جہاں مرکزی ریاستیں موجود ہیں، وہاں وہ تہذیبوں کی بنیاد پر نئے بین الاقوامی نظام کے مرکزی عناصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مغرب کی حد بندی

سرد جنگ کے دوران امریکا ملکوں کے ایک بڑے، متنوع اور کثیر تہذیبی گروہ کا مرکز تھا۔ یہ ممالک سوویت یونین کی مزید توسیع روکنے کا مشترکہ ہدف رکھتے تھے۔ اس گروہ میں جسے ''آزاد دنیا''، ''مغرب'' یا ''اتحادی'' کہا جاتا تھا، تمام نہیں مگر بیشتر مغربی معاشرے، ترکی، یونان، جاپان، کوریا، فلپائن، اسرائیل اور کسی حد تک دیگر ممالک جیسے تائیوان، تھائی لینڈ اور پاکستان شامل تھے۔ اس کی مخالفت نسبتاً کم غیر ہم جنس ملکوں کا ایک گروہ کررہا تھا جس میں یونان کے سوا تمام آرتھوڈوکس ممالک، کئی ممالک جو تاریخی طور پر مغربی تھے، ویت نام، کیوبا اور کسی حد تک بھارت اور بعض موقعوں پر ایک یا زیادہ افریقی ممالک شامل تھے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ یہ کثیر تہذیبی اور کئی ثقافتوں پر مشتمل گروہ بندی منتشر ہوگئی۔ سوویت نظام، علی الخصوص معاہدۂ وارسا کی تحلیل ڈرامائی انداز میں

ہوئی۔ اس کے مقابلے میں آہستہ رفتار سے لیکن اسی طرز پر سرد جنگ کی کثیر تہذیبی ''آزاد دنیا'' کی نئے گروہ کی صورت میں تشکیل ہو رہی ہے جو کم و بیش مغربی تہذیب ہے۔ حد بندی کا ایک عمل جاری ہے جس کے تحت مغربی بین الاقوامی اداروں کی رکنیت کی تعریف متعین کی جا رہی ہے۔

یورپی یونین کی مرکزی ریاستوں فرانس اور جرمنی کے گرد سب سے پہلے جو دائرہ ہے اس میں بیلجیئم، نیدرلینڈز اور لکسمبرگ پر مشتمل اندرونی گروپ ہے جس نے اشیا اور افراد کے نقل و حرکت پر عائد تمام پابندیاں ختم کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ پھر اٹلی، اسپین، پرتگال، ڈنمارک، برطانیہ، آئرلینڈ اور یونان جیسے دوسرے رکن ممالک ہیں؛ ۱۹۹۵ء میں رکن بننے والے ممالک (آسٹریا، فن لینڈ، سوئیڈن) ہیں؛ اور وہ ممالک ہیں جو ابھی تک ایسوسی ایٹ رکن ہیں (پولینڈ، ہنگری، چیک جمہوریہ، سلوواکیہ، بلغاریہ اور رومانیہ)۔ اس حقیقت کی عکاسی کرتے ہوئے، ۱۹۹۴ء کے موسمِ خزاں میں جرمنی کی حکمراں جماعت اور اعلیٰ فرانسیسی عہدیداروں نے ایک طبقاتی یورپی یونین کے قیام کی تجویز پیش کی۔ جرمن تجویز میں کہا گیا کہ ''اصل مغز'' اٹلی کو چھوڑ کر ابتدائی ارکان پر مشتمل ہے اور یہ کہ ''جرمنی اور فرانس اصل مغز کا مرکزی حصہ ہیں۔'' اصل مغز کے ممالک جلد از جلد ایک مشترکہ کرنسی رائج کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی خارجہ اور دفاع کی پالیسیوں کو باہم متحد کریں گے۔ تقریباً اس کے ساتھ ہی فرانسیسی وزیر اعظم ایدورد بیلادر نے ایک سہ طبقاتی یونین کے قیام کی تجویز پیش کی جس میں کہا گیا کہ اتحاد کی حامی پانچ ریاستیں اصل مغز میں، دیگر موجودہ رکن ریاستیں دوسرے دائرے میں اور رکن بننے کے راستے پر گامزن نئی ریاستیں بیرونی دائرے میں شامل ہوں۔ بعد میں فرانسیسی وزیر خارجہ ایلین یوپے نے اس تصور کو مزید تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ''مشرقی اور وسطی یورپ سمیت 'پارٹنر' ریاستوں کا ایک بیرونی دائرہ ہو؛ رکن ریاستوں کا ایک وسطی دائرہ ہو جن کے لیے بعض شعبوں میں (واحد منڈی، کسٹم یونین وغیرہ) مشترکہ قواعد کو تسلیم کرنا ضروری ہو؛ اور 'مضبوط سالمیت' کی حامل ریاستوں کے کئی اندرونی دائرے ہوں جن میں وہ ملک شامل ہوں جو دفاع، کرنسی کے اتحاد اور خارجہ پالیسی جیسے امور میں دوسروں سے تیز چلنے کے لیے آمادہ اور اہل ہوں''۔[1] دوسرے سیاسی رہنماؤں نے دوسری قسم کے انتظامات تجویز کیے لیکن ان سب میں قریبی اتحاد رکھنے والی ریاستوں کا ایک اندرونی گروپ، پھر مرکزی ریاست سے کم وابستگی رکھنے والے ملکوں کے بیرونی گروپ شامل تھے حتیٰ کہ وہ حد آ جاتی ہے جو ارکان کو غیر رکن ملکوں سے جدا کرتی ہے۔

یورپ میں اس حد کا تعین سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں مغرب کو درپیش بڑے چیلنجوں میں



نقشہ ۱ء۷

مغربی تہذیب
کی مشرقی سرحد

سے ہے۔ سرد جنگ کے دوران یورپ بحیثیت مجموعی وجود نہیں رکھتا تھا۔ تاہم کمیونزم کے انہدام کے ساتھ اس سوال کا سامنا کرنا اور جواب دینا ضروری ہوگیا: یورپ کیا ہے؟ شمال، مغرب اور جنوب میں یورپ کی سرحدیں سمندروں نے مقرر کی ہوئی ہیں جو جنوب کی طرف ثقافت کے واضح اختلافات پر منطبق ہوتی ہیں لیکن یورپ کی مشرقی سرحد کہاں ہے؟ کن ملکوں کو سمجھا جائے کہ وہ یورپی ہیں لہٰذا یورپی یونین، نیٹو اور اس جیسی تنظیموں کے ممکنہ رکن ہیں؟

ان سوالات کا سب سے متاثر کن جواب وہ عظیم تاریخی سرحد فراہم کرتی ہے جو صدیوں سے مغربی عالمِ مسیحیت کی اقوام کو مسلمان اور آرتھوڈوکس قوموں سے جدا کرتی آئی ہے۔ اس سرحد کی ابتدا چوتھی صدی میں سلطنت روما کی تقسیم اور دسویں صدی میں مقدس سلطنت روما کے قیام سے ہوئی۔ کم ازکم پانچ سو سال سے یہ لگ بھگ موجودہ مقام پر ہے۔ شمال سے آغاز کریں تو یہ سرحد فن لینڈ و روس اور بالٹک ریاستوں (ایسٹونیا، لیٹویا، لیتھوینیا) اور روس کے درمیان سرحدوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، مغربی بیلاروس سے گزرتی ہے، یوکرین سے گزر کر اسے یونیٹ مغرب اور آرتھوڈوکس مغرب میں تقسیم کرتی ہوئی، رومانیہ سے گزر کر اسے کیتھولک ہنگرین آبادی والے ٹرانسلوانیا اور بقیہ ملک میں بانٹتی ہوئی اور سابق یوگوسلاویہ میں سے گزر کر سلووینیا اور کروشیا کو دوسری جمہوریاؤں سے علیحدہ کرنے والی سرحد پر چلتی ہے۔ بلاشبہ بلقان میں یہ سرحد آسٹرو ہنگرین اور عثمانی سلطنتوں کی تاریخی تقسیم پر منطبق ہوتی ہے۔ یہ یورپ کی ثقافتی سرحد اور مابعد سرد جنگ کی دنیا میں یہ یورپ اور مغرب کی سیاسی اور معاشی سرحد بھی ہے۔

پس تہذیبی خاکہ مغربی یورپی باشندوں کو درپیش اس سوال کا بالکل واضح اور متاثر کن جواب فراہم کرتا ہے: یورپ کہاں ختم ہوتا ہے؟ یورپ وہاں ختم ہوتا ہے جہاں مغربی عیسائیت ختم ہوتی ہے اور اسلام اور آرتھوڈوکسی شروع ہوتی ہے۔ یہی وہ جواب ہے جو مغربی یورپ والے سننا چاہتے ہیں، جس کی وہ بھرپور حمایت کرتے ہیں اور جس کی دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں نے کھل کر توثیق کی ہے۔ جیسا کہ مائیکل ہاورڈ نے کہا، وسطی یورپ اور مشرقی یورپ میں فرق کو، جو سوویت دور میں دھندلا گیا تھا، سمجھنا ضروری ہے۔ 'وسط یورپ' میں یہ علاقے شامل ہیں: ''وہ زمینیں جو کسی زمانے میں مغربی عالمِ مسیحیت کا حصہ تھیں؛ ہیپسبرگ سلطنت کی قدیم سرزمینیں، آسٹریا، ہنگری اور چیکوسلوواکیہ اور ان کے ساتھ پولینڈ اور جرمنی کے مشرقی علاقے۔ 'مشرقی یورپ' کی اصطلاح ان خطوں کے لیے مخصوص ہونی چاہیے جو آرتھوڈوکس کلیسا کے سائے میں پروان چڑھے: بلغاریہ اور رومانیہ کی بحیرۂ اسود والی آبادیاں جو انیسویں صدی میں عثمانی بالادستی سے ابھریں، اور سوویت یونین

کے 'یورپی' علاقے۔'' ہاورڈ کے مطابق مغربی یورپ کا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ''وسطی یورپ کی اقوام کو دوبارہ اپنی ثقافتی و اقتصادی برادری میں جذب کیا جائے جہاں سے ان کا تعلق بنتا ہے تا کہ لندن، پیرس، روم، میونخ اور لیپزیگ، وارسا، پراگ اور بڈاپیسٹ کے رشتے دوبارہ استوار ہو جائیں۔'' پیری بیہر نے دو سال بعد تبصرہ کیا کہ ''مغربی عیسائیت (رومن کیتھولک یا پروٹسٹنٹ یورپ) والے اور مشرقی عیسائیت اور اسلامی روایات کے حامل یورپ کے مابین ایک نیا رخنہ پیدا ہو رہا ہے۔'' فن لینڈ کی ایک ممتاز شخصیت کی نظر میں آہنی پردے کی جگہ یورپ میں ایک حساس تقسیم پیدا ہو رہی ہے جو ''مشرق اور مغرب کے درمیان قدیم ثقافتی رخنہ'' ہے جس کے تحت ''سابق آسٹرو ہنگرین سلطنت کی سرزمینیں نیز پولینڈ اور بالٹک ریاستیں'' یورپ کے مغرب میں آتے ہیں، اور دیگر مشرقی یورپی اور بلقانی ممالک اس کے باہر۔ ایک معروف انگریز شخصیت نے اس بات سے اتفاق کیا کہ یہ ''مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے درمیان... عظیم مذہبی تقسیم [ہے] جو عمومی اعتبار سے ان اقوام کی تقسیم ہے جنہیں روم سے براہِ راست عیسائیت ملی یا کیلٹک یا جرمن واسطوں کے توسط سے ملی اور مشرق اور جنوب مشرق کے لوگ جن تک قسطنطنیہ (بازنطیم) کے راستے پہنچی''۔[۲]

وسطی یورپ کے لوگ بھی اس تقسیم کرنے والی سرحد پر زور دیتے ہیں۔ جن ملکوں نے کمیونسٹ ورثے سے چھٹکارا پانے اور جمہوری سیاست اور منڈی کی معیشت کی طرف بڑھنے میں پیشرفت کی وہ ان ملکوں سے جنہوں نے پیشرفت نہیں کی اس سرحد کی مدد سے ممیز کیے جاتے ہیں جو ''ایک جانب کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسالک اور دوسری جانب آرتھوڈوکسی'' کو الگ کرتی ہے۔ لیتھوینیا کے صدر نے کہا کہ صدیوں قبل لیتھوینیائیوں کو ''دو تہذیبوں'' میں چناؤ کرنا پڑا تھا اور انہوں نے ''لاطینی دنیا کا انتخاب کیا، رومن کیتھولک مسلک اختیار کیا اور قانون پر قائم ریاستی تنظیم کی ایک شکل چنی۔'' اسی سے ملتے جلتے انداز میں پولینڈ والے کہتے ہیں کہ وہ دسویں صدی میں بازنطیم کے مقابلے میں لاطینی عیسائیت کا انتخاب کرنے کے بعد سے مغرب کا حصہ رہے ہیں۔[۳] اس کے برعکس مشرقی یورپی آرتھوڈوکس ممالک اس ثقافتی رخنے پر اصرار کو ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ بلغاریہ اور رومانیہ کے لوگوں کو مغرب کا حصہ ہونے اور اس کے اداروں میں شامل ہونے میں بڑے فائدے نظر آتے ہیں لیکن وہ خود کو اپنی آرتھوڈوکس روایات سے بھی شناخت کرتے ہیں اور جہاں تک بلغاریوں کا تعلق ہے وہ روس اور بازنطیم سے اپنی تاریخی قربت کے حوالے سے بھی اپنی شناخت کرتے ہیں۔

یورپ کی مغربی عالمِ مسیحیت کے ساتھ شناخت مغربی اداروں میں نئے ارکان کے داخلے

کے لیے واضح پیمانہ فراہم کر دیتی ہے۔ یورپی یونین، یورپ میں مغرب کی بنیادی اکائی ہے اور ۱۹۹۴ء میں اس کی رکنیت میں دوبارہ اضافہ شروع ہوا اور مغربی ثقافت رکھنے والے آسٹریا، فن لینڈ اور سویڈن کو شامل کیا گیا۔ ۱۹۹۴ء کے موسمِ بہار میں یورپی یونین نے بالٹک ریاستوں کے سوا تمام سابق سوویت ریاستوں کو رکنیت سے باہر رکھنے کا عارضی فیصلہ کیا۔ اس نے چار وسط یورپی ریاستوں (پولینڈ، ہنگری، چیک جمہوریہ اور سلوواکیہ) اور دو مشرقی یورپی ملکوں (رومانیہ، بلغاریہ) کے ساتھ ''معاہدہ ہائے رفاقت'' پر بھی دستخط کیے۔ تاہم ان میں سے کسی ریاست کے اکیسویں صدی سے پہلے یورپی یونین کے مکمل رکن بننے کا امکان نہیں اور بلاشک و شبہ رومانیہ اور بلغاریہ سے قبل وسط یورپی ممالک کو یہ حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اس دوران بالٹک ریاستوں اور سلووینیا کی رکنیت کے لیے امکانات سازگار معلوم ہوتے ہیں جبکہ مسلمان ترکی، بہت چھوٹے مالٹا اور آرتھوڈوکس قبرص کی درخواستوں پر ۱۹۹۵ء تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ یورپی یونین کی رکنیت کی توسیع کے حوالے سے ان ملکوں کو صاف ترجیح حاصل ہے جو مغربی ثقافت رکھتے ہیں اور اقتصادی طور پر ترقی کے طرف مائل ہیں۔ اگر یہ معیار لاگو کیا جائے تو وائس گریڈ ریاستیں (پولینڈ، چیک جمہوریہ، سلوواکیہ، ہنگری)، بالٹک جمہوریائیں، سلووینیا، کروشیا اور مالٹا بالآخر یورپی یونین کے ارکان بن جائیں گے اور یونین مغربی تہذیب کے، جیسی وہ تاریخ میں رہی ہے، ہم معنی ہو جائے گی۔

تہذیبوں کی منطق نیٹو کی توسیع کے بارے میں بھی اسی طرح کے نتائج متعین کرتی ہے۔ سرد جنگ وسطی یورپ میں سوویت سیاسی و فوجی اثر و نفوذ کے ساتھ شروع ہوئی۔ امریکا اور مغربی یورپی ممالک نے مزید سوویت جارحیت کو روکنے، اور ضرورت ہو تو، شکست دینے کے لیے نیٹو قائم کی۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں نیٹو مغربی تہذیب کی سلامتی کی تنظیم ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد نیٹو کا ایک مرکزی اور متاثر کن مقصد ہے: وسطی یورپ میں روسی سیاسی و فوجی اثر و نفوذ کو دوبارہ داخل ہونے سے روک کر اس خاتمے کو برقرار رکھنا۔ مغرب کی سلامتی کی تنظیم نیٹو کی رکنیت ان مغربی ملکوں کے لیے کھلی ہے جو اس میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور جن میں فوجی صلاحیت، سیاسی جمہوریت اور فوج سویلین اقتدار کے ماتحت ہے۔

مابعد سرد جنگ کے یورپی سلامتی کے انتظامات کے بارے میں امریکی پالیسی ابتدائی طور پر ایک زیادہ آفاقی موقف کی حامل تھی۔ یہ پالیسی پارٹنرشپ فار پیس کی صورت میں سامنے آئی جو عمومی طور پر پہلے یورپی اور پھر یوریشین ملکوں کے لیے کھلی ہوگی۔ اس موقف میں یورپ میں سلامتی و تعاون کی تنظیم (Organization on Security and Cooperation in Europe) کے

کردار پر بھی زور دیا گیا۔ اس کی عکاسی صدر کلنٹن کے الفاظ میں ہوتی ہے جو انہوں نے جنوری ۱۹۹۴ء میں یورپ کے دورہ کے موقعے پر کہے: ''آزادی کی حدود اب نئے رویے سے طے ہونی چاہئیں، پرانی تاریخ سے نہیں۔ میں سب سے کہتا ہوں... یورپ میں نئی سرحد کون کھینچے گا: ہمیں یورپ کے لے بہترین مستقبل کے امکانات کا دروازہ بند نہیں کرنا چاہیے-- ہر جگہ جمہوریت، ہر جگہ منڈی کی معیشتیں، باہمی تحفظ کے لیے ملکوں کا ہر جگہ ایک دوسرے سے تعاون۔ ہمیں اس سے کمتر نتیجے کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔'' لیکن ایک سال بعد کلنٹن انتظامیہ کو ''پرانی تاریخ'' کی طے کردہ حدود کی اہمیت ماننی پڑی اور ایک ''کمتر نتیجے'' کو قبول کرنا پڑا جو تہذیبی اختلافات کے حقائق کا آئینہ دار تھا۔ انتظامیہ نے پہلے پولینڈ، ہنگری، چیک جمہوریہ اور سلوواکیہ، پھر سلوونیا اور بعد میں غالباً بالٹک جمہوریاؤں کو نیٹو میں شامل کرنے کے لیے قواعد اور نظام الاوقات مقرر کرنے کے سلسلے میں تیزی سے اقدامات کیے۔

روس نے شدت سے نیٹو کی توسیع کی مخالفت کی۔ جو روسی زیادہ لبرل اور مغرب پسند سمجھے جاتے تھے انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ اس توسیع سے روس میں قوم پرست اور مغرب دشمن سیاسی قوتیں مضبوط ہوں گی۔ تاہم اگر نیٹو کی توسیع ان ملکوں تک محدود رہے جو تاریخی اعتبار سے مغربی عالمِ مسیحیت کا حصہ رہے ہیں تو روس کو یہ ضمانت ملے گی کہ اس میں سربیا، بلغاریہ، رومانیہ، مالڈووا، بیلاروس اور یوکرین، جب تک یوکرین متحد رہتا ہے، شامل نہیں ہوں گے۔ مغربی ریاستوں تک نیٹو کی توسیع محدود رہنے سے روس کا ایک علیحدہ، آرتھوڈوکس تہذیب کی مرکزی ریاست کا کردار بھی نمایاں ہوگا۔ اس طرح روس وہ ملک ہوگا جو آرتھوڈوکسی کی سرحدوں کے اندر نظم قائم رکھنے کا ذمے دار ہوگا۔

تہذیب کے حوالے سے ملکوں کے درمیان امتیاز کی افادیت بالٹک جمہوریاؤں کے معاملے میں عیاں ہے۔ صرف یہی سابق سوویت جمہوریائیں اپنی تاریخ، ثقافت اور مذہب کے حوالوں سے واضح طور پر مغربی ہیں اور ان کی تقدیر مغرب کے لیے مسلسل تشویش کا باعث رہی ہے۔ امریکا نے باقاعدہ طور پر ان جمہوریاؤں کی سوویت یونین میں شمولیت کو کبھی تسلیم نہیں کیا، سوویت یونین کے انہدام کے وقت ان کی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کی اور اس مطالبے پر اصرار کیا کہ روس ان سے اپنی فوج کے انخلا کے متفقہ نظام الاوقات پر عمل کرے۔ روسیوں کو یہ پیغام دیا جاتا رہا کہ دوسری سابق سوویت جمہوریاؤں کے بارے میں وہ اپنا جو بھی دائرۂ اثر قائم کرنا چاہیں، انہیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ بالٹک ریاستیں اس دائرے سے باہر ہیں۔ کلنٹن انتظامیہ کا یہ کارنامہ سویڈن کے وزیراعظم کے الفاظ میں ''یورپی سلامتی اور استحکام کے لیے اس کی اہم ترین خدمات میں سے'' تھا جس سے

روسی جمہوریت پسندوں کو مدد ملی کیونکہ اس سے یہ طے ہوگیا کہ ان بالٹک جمہوریاؤں سے واضح مغربی وابستگی کے مقابلے میں انتہا پسند روسی قوم پرستوں کے جارحانہ عزائم بے کار ہوں گے۔[۳]

یورپی یونین اور نیٹو کی توسیع پر بہت توجہ دی گئی ہے لیکن ان تنظیموں کی ثقافتی تشکیلِ نو سے ان کی رکنیت میں ممکنہ کمی کا مسئلہ بھی ابھرتا ہے۔ ایک غیر مغربی ملک یونان دونوں تنظیموں کا رکن ہے۔ ایک اور ملک ترکی نیٹو کا رکن ہے اور یورپی یونین کی رکنیت کا امیدوار ہے۔ یہ تعلقات سرد جنگ کی پیداوار تھے۔ کیا مابعد سردِ جنگ کی تہذیبوں کی دنیا میں ان کا کوئی مقام ہے؟

یورپی یونین میں ترکی کی مکمل رکنیت ایک مسئلہ ہے اور نیٹو کی رکنیت پر رفاہ پارٹی نے تنقید کی ہے۔ تاہم ترکی کے اس وقت تک نیٹو میں رہنے کا امکان ہے جب تک رفاہ پارٹی انتخابی فتح حاصل نہ کرے یا ترکی کسی اور طریقے سے اپنے اتاترک کے ورثے کو مسترد کرکے اپنی شناخت اسلام کے رہنما کے طور پر ازسرِ نو متعین نہ کرے۔ یہ سوچا جاسکتا ہے اور ترکی کے حق میں پسندیدہ راستہ بھی ہوسکتا ہے لیکن مستقبل قریب میں اس کا امکان نہیں۔ نیٹو میں ترکی کا کردار کچھ بھی ہو، وہ بلقان، عرب دنیا اور وسط ایشیا میں اپنے مخصوص مفادات کی راہ پر گامزن رہے گا۔

یونان مغربی تہذیب کا حصہ نہیں لیکن یہ کلاسیکی تہذیب کا گہوارہ ہے جو مغربی تہذیب کا ایک اہم سرچشمہ تھا۔ ترکوں کی مخالفت میں یونانیوں نے خود کو مسیحیت کا نیزہ بردار تصور کیا ہے۔ سربوں، رومانویوں اور بلغاریوں کے برخلاف ان کی تاریخ مغرب سے بہت جڑی ہوئی ہے۔ تاہم یونان مغربی تنظیموں میں شامل ایک آرتھوڈوکس رکن کی حیثیت سے بے قاعدگی کی ایک مثال بھی ہے۔ اسے یورپی یونین اور نیٹو کی رکنیت میں آسانی کبھی نہیں ہوئی اور دونوں کے اصول وقواعد کے مطابق خود کو ڈھالنے میں مشکل کا سامنا رہا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے وسط سے ۱۹۷۰ء کے عشرے کے وسط تک یونان پر فوجی جنتا کی حکومت رہی اور جب تک جمہوریت نہیں آئی وہ یورپی برادری میں شامل نہیں ہوسکا۔ اس کے رہنما اکثر مغربی معمولات سے ہٹ جاتے ہیں اور مغربی حکومتوں کو ناراض کرتے ہیں۔ یونان یورپی برادری اور نیٹو کے دوسرے ملکوں سے غریب تھا اور اکثر ان معاشی پالیسیوں پر گامزن رہا جو برسلز کے معیارات کے خلاف تھیں۔ ۱۹۹۴ء میں یورپی کونسل کے صدر کی حیثیت سے اس کے رویے نے دوسرے ارکان کو برافروختہ کردیا اور مغربی یورپی عہدیدار اس کی رکنیت کو نجی طور پر غلطی قرار دیتے ہیں۔

مابعد سرد جنگ کی دنیا میں یونان کی پالیسیاں مغرب سے زیادہ سے زیادہ انحراف کررہی ہیں۔ مقدونیہ کے خلاف اس کے بلاکیڈ کی مغربی حکومتوں نے شدت سے مخالفت کی جس کے نتیجے میں

یورپی کمیشن نے یورپی عدالت انصاف سے یونان کے خلاف حکم جاری کرنے کی درخواست کی۔ سابق یوگوسلاویہ کے تنازعات میں یونان نے خود کو اہم مغربی طاقتوں کی پالیسیوں سے الگ کرلیا، سربوں کی بھرپور حمایت کی اور ان کے خلاف اقوام متحدہ کی پابندیوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی۔ سوویت یونین اور کمیونزم کے خطرے کے خاتمے پر یونان اور روس کے اپنے مشترکہ دشمن ترکی کے خلاف ایک جیسے مفادات ہیں۔ یونان نے یونانی قبرص میں روسی موجودگی کی اجازت دی ہے اور ''اپنے مشترکہ مشرقی آرتھوڈوکس مذہب'' کے باعث یونانی قبرصیوں نے روسیوں اور سربوں دونوں کو جزیرے پر خوش آمدید کہا ہے۔[5] ۱۹۹۵ء میں قبرص میں لگ بھگ دو ہزار روسی کاروبار چل رہے تھے، روسی اور سربوکروشیائی اخبارات شائع ہورہے تھے اور یونانی قبرص کی حکومت روس سے بھاری اسلحہ خرید رہی تھی۔ یونان نے ترکی اور دوسرے مسلمان ملکوں کے راستے سے ہٹ کر بلغاری یونانی پائپ لائن کے ذریعے قفقاز اور وسط ایشیا سے تیل لانے کے امکان پر بھی روس سے بات چیت کی۔ مجموعی طور پر یونانی خارجہ پالیسیاں بہت زیادہ آرتھوڈوکس جہت کی حامل رہی ہیں۔ یونان بلاشبہ نیٹو اور یورپی یونین کا باقاعدہ رکن رہے گا۔ تاہم جوں جوں ثقافتی تشکیلِ نو کا عمل شدت اختیار کرے گا، اس رکنیت کی اہمیت اور معنی خیزی بلاشبہ کم ہوگی اور فریقوں کے لیے اس کو برقرار رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ سرد جنگ کے زمانے کا سوویت یونین کا دشمن مابعد سرد جنگ کے دور میں روس کا اتحادی بنتا جارہا ہے۔

روس اور اس کا قریب بیرونِ ملک

زار اور کمیونسٹ سلطنتوں کا جانشین ایک تہذیبی بلاک ہے جس کا موازنہ متعدد پہلوؤں سے یورپ میں مغرب سے کیا جاسکتا ہے۔ مرکزی ریاست کی حیثیت سے روس فرانس اور جرمنی کے مماثل ہے، ایک اندرونی دائرے سے منسلک ہے جس میں دو غالب طور پر سلافی آرتھوڈوکس جمہوریائیں بیلاروس اور مالڈووا، قازقستان، جس کی ۴۰ فیصد آبادی روسی ہے اور آرمینیا، جو تاریخی اعتبار سے روس کا قریبی اتحادی رہا ہے، شامل ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں ان تمام ملکوں کی حکومتیں روس کی حامی تھیں اور عموماً انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آئی تھیں۔ روس اور جارجیا (غالب طور پر آرتھوڈوکس) اور یوکرین (بڑی حد تک آرتھوڈوکس) کے درمیان قریبی لیکن نسبتاً کم شدت رکھنے والے روابط ہیں۔ ان دونوں ممالک میں قومی شناخت اور ماضی کی آزادی کا گہرا احساس پایا جاتا ہے۔ آرتھوڈوکس بلقان میں روس کے بلغاریہ، یونان، سربیا اور قبرص سے قریبی تعلقات ہیں اور

رومانیہ سے کچھ کم قریبی ہیں۔ سابق سوویت یونین کی مسلم جمہوریائیں اقتصادیات اور سلامتی کے شعبوں میں روس پر انتہائی انحصار کرتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں بالٹک جمہوریاؤں نے یورپ کی کشش پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے خود کو روسی دائرۂ اثر سے نکال لیا۔

مجموعی طور پر روس اپنی قیادت میں ایک ایسا بلاک تشکیل دے رہا ہے جس کا قلب آرتھوڈوکس ہے اور اردگرد نسبتاً کمزور اسلامی ملک پھیلے ہوئے ہیں جن پر وہ مختلف درجوں میں بالادستی قائم رکھے گا اور جن سے وہ دوسری طاقتوں کے اثرات خارج کرنے کی کوشش کرے گا۔ روس دنیا سے یہ توقع بھی کرتا ہے کہ وہ اس نظام کو قبول اور منظور کرے۔ جیسا کہ یلسن نے فروری ۱۹۹۳ء میں کہا، غیر ملکی حکومتوں اور بین الاقوامی تنظیموں کو چاہیے کہ "یو ایس ایس آر کے سابق خطوں میں امن و استحکام کے ضمانت دہندہ کی حیثیت سے روس کو خصوصی اختیارات عطا کریں۔" سوویت یونین عالمی مفادات کے حوالے سے سپر طاقت تھا تو روس علاقائی اور تہذیبی مفادات کے حوالے سے بڑی طاقت ہے۔

سابق سوویت یونین کے آرتھوڈوکس ممالک یوریشین اور عالمی امور میں مربوط روسی بلاک کی تشکیل کے لیے مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ سوویت یونین کی شکست وریخت کے دوران یہ پانچوں ممالک ایک انتہائی قوم پرستانہ سمت میں آگے بڑھے اور اپنی آزادی اور ماسکو سے فاصلے پر زور دینے لگے۔ بعد میں معاشی، جغرافیائی وسیاسی اور ثقافتی حقائق نے ان میں سے چار کے ووٹروں کو روس کی حامی حکومتیں منتخب کرنے اور روس کی حمایت میں پالیسیاں اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ان ممالک کے عوام سہارے اور تحفظ کے لیے روس کی طرف دیکھتے ہیں۔ پانچویں ریاست جارجیا میں روس کی فوجی مداخلت نے حکومت کو اپنے موقف میں اس سے مشابہ تبدیلی پر مجبور کیا۔

آرمینیا تاریخی اعتبار سے اپنے مفادات کی شناخت روس کے ساتھ کرتا رہا ہے اور روس اس بات پر فخر کرتا رہا ہے کہ وہ آرمینیا کے مسلمان ہمسایوں کے خلاف اس کا محافظ ہے۔ مابعد سوویت دور میں یہ تعلق پھر زندہ ہوگیا ہے۔ آرمینیا والے روسی معاشی وفوجی امداد پر انحصار کرتے رہے ہیں اور سابق سوویت جمہوریاؤں کے باہمی تعلقات کے تنازعات میں روس کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ دونوں ملکوں کے عسکری مفادات ایک جیسے ہیں۔

آرمینیا کے برخلاف بیلاروس قومی شناخت کا زیادہ شعور نہیں رکھتا اور روسی امداد پر اور بھی زیادہ انحصار کرتا ہے۔ اس کے بیشتر باشندے روس سے بھی خود کو اتنا ہی شناخت کرتے ہیں جتنا اپنے ملک سے کرتے ہیں۔ جنوری ۱۹۹۴ء میں مقننہ نے مرکزیت پسند اور معتدل سربراہ مملکت کو ہٹا کر ایک

قدامت پرست روس کے حامی کا تقرر کر دیا۔ جولائی ۱۹۹۴ء میں ۸۰ فیصد ووٹروں نے ولادی میر زرونوفسکی کے اتحادی اور روس کے انتہاپسند حامی کو صدر منتخب کر لیا۔ بیلا روس نے شروع میں ہی آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ (Commonwealth of Independent States,CIS) میں شمولیت اختیار کی۔ وہ ۱۹۹۳ء میں وجود میں آنے والی اقتصادی یونین کا روس اور یوکرین کے ساتھ چارٹر رکن تھا، روس کے ساتھ یکساں کرنسی رکھنے پر متفق ہوا، اپنے جوہری ہتھیار روس کے حوالے کر دیے اور اس صدی کے بقیہ برسوں کے دوران اپنی سرزمین پر روسی فوج کی تعیناتی پر اتفاق کیا۔ ۱۹۹۵ء میں بیلا روس سوائے نام کے ہر لحاظ سے عملاً روس کا حصہ تھا۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد مالڈووا آزاد ہوا تو بہت سے حلقے اس کے بالآخر رومانیہ سے متحد ہونے کے منتظر تھے۔ اس خدشے کے باعث مشرقی علاقے میں، جو روسی رنگ میں رنگا ہوا تھا، علیحدگی پسندگی کی ایک تحریک پیدا ہوئی جسے ماسکو کی درپردہ اور روسی چودھویں آرمی کی کھلی حمایت حاصل تھی جس کے نتیجے میں ٹرانس ڈنسٹر ری پبلک قائم ہوئی۔ تاہم رومانیہ سے ملاپ کے لیے مالڈوویائی جذبات دونوں ملکوں کے معاشی مسائل اور روسی اقتصادی دباؤ کے باعث سرد پڑ گئے۔ مالڈووا سی آئی ایس میں شامل ہو گیا اور روس کے ساتھ تجارت بڑھ گئی۔ فروری ۱۹۹۴ء میں روس کی حامی جماعتیں پارلیمانی انتخابات میں بہت زیادہ کامیاب رہیں۔

ان تین ریاستوں میں رائے عامہ عسکری و معاشی مفادات کے پیش نظر ایسی حکومتیں لائی جو روس سے قریبی روابط کے حق میں تھیں۔ یوکرین میں بھی اس سے کسی حد تک ملتی جلتی صورتحال بالآخر پیدا ہوئی۔ جارجیا میں واقعات کا رخ مختلف تھا۔ جارجیا ۱۸۰۱ء تک آزاد ملک تھا جب اس کے حکمراں شاہ جارج سیزدہم نے ترکوں کے خلاف روسی تحفظ چاہا۔ انقلابِ روس کے بعد تین سال تک یعنی ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک جارجیا پھر آزاد تھا لیکن بالشویکوں نے اسے زبردستی سوویت یونین میں شامل کر لیا۔ جب سوویت یونین ختم ہوا تو جارجیا نے ایک بار پھر آزادی کا اعلان کر دیا۔ انتخابات کے نتیجے میں ایک قوم پرست مخلوط حکومت بنی لیکن اس کا رہنما اپنی ظلم و جبر کی پالیسیوں کا خود شکار ہو گیا اور اسے پرتشدد انداز میں برطرف کر دیا گیا۔ ایڈورڈ اے شیورڈناڈزے، جو سوویت یونین کے وزیر خارجہ رہے تھے، اس ملک کی قیادت کے لیے واپس آئے اور ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۵ء کے صدارتی انتخابات کے نتیجے میں مسندِ اقتدار پر مضبوطی سے جم گئے۔ تاہم انہیں ابکازیا میں علیحدگی پسندانہ تحریک کا سامنا کرنا پڑا جسے بھاری روسی امداد ملنے لگی۔ اس کے علاوہ برطرف شدہ گم سکوردیا کی قیادت میں بھی شورش اٹھی۔ شاہ جارج کی تقلید میں شیورڈناڈزے اس نتیجے پر پہنچے کہ "ہمارے

پاس کوئی اور راستہ نہیں'' اور مدد کے لیے ماسکو سے رجوع کر لیا۔ روسی افواج نے ان کی حمایت میں مداخلت کی جس کی قیمت جارجیا نے سی آئی ایس میں شمولیت کر کے ادا کی۔ ۱۹۹۴ء میں جارجیا نے روس کو غیر معینہ مدت کے لیے تین فوجی اڈے قائم رکھنے کی اجازت دی۔ پہلے جارجیا کی حکومت کو کمزور کرنے اور پھر یہ صورتحال برقرار رکھنے کے لیے کی گئی روسی فوجی مداخلت نے آزادی پسند جارجیا کو روسی کیمپ میں لا کھڑا کیا۔

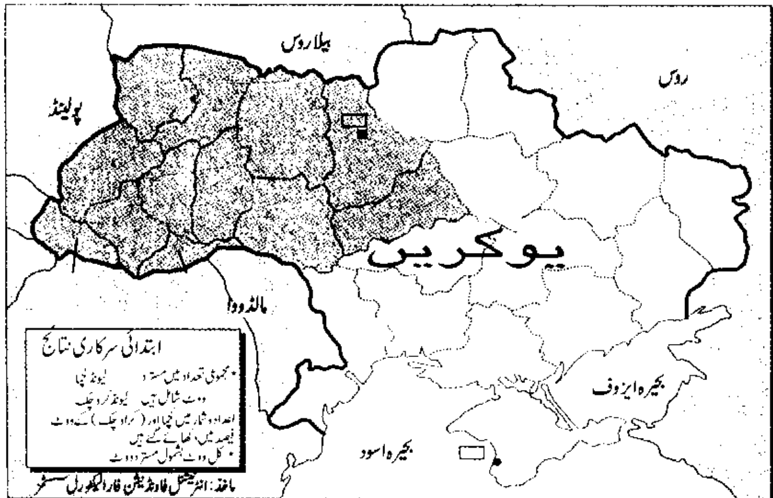
روس کو چھوڑ کر سب سے زیادہ آبادی والی اور اہم ترین سابق سوویت جمہوریہ یوکرین ہے۔ تاریخ میں مختلف مواقع پر یوکرین آزاد رہا ہے۔ لیکن جدید زمانے میں زیادہ تر یہ ماسکو کے ماتحت آنے والی کسی سیاسی اکائی کا جز رہا ہے۔ فیصلہ کن واقعہ ۱۶۵۴ء میں پیش آیا جب پولش اقتدار کے خلاف شورش کے کوسیک رہنما بوہڈن کمل نیتسکی نے پولینڈ والوں کے خلاف مدد کے عوض زار کی محکومی قبول کرنے پر اتفاق کیا۔ تب سے ۱۹۹۱ء تک، ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان مختصر عرصے کے سوا جب یہ آزاد جمہوریہ تھا، یوکرین کا علاقہ سیاسی طور پر ماسکو کے ماتحت رہا۔ تاہم یوکرین ایک شکستہ ملک ہے جس میں دو مختلف ثقافتیں ہیں۔ مغرب اور آرتھوڈوکسی کے درمیان رخنہ اس کے عین بیچ میں سے گزرتا ہے اور صدیوں سے یہی صورت رہی ہے۔ ماضی میں مختلف موقعوں پر یوکرین پولینڈ، لیتھوینیا اور آسٹروہنگرین سلطنت میں شامل رہا۔ اس کی آبادی کا بڑا حصہ یونیٹ چرچ کے پیروکاروں پر مشتمل ہے جو آرتھوڈوکس رسومات پر عمل کرتے ہیں لیکن پوپ کو مانتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مغربی یوکرینی باشندے یوکرینی زبان بولتے رہے ہیں اور ان کا رجحان بہت قوم پرستانہ رہا ہے۔ دوسری طرف مشرقی یوکرین کے باشندے زیادہ تر آرتھوڈوکس ہیں اور روسی زبان بولتے رہے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں یوکرینی آبادی کا ۲۲ فیصد روسی تھے اور روسی بولنے والے اہلِ زبان ۳۱ فیصد تھے۔ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کی اکثریت میں طلبہ کو روسی میں تعلیم دی جاتی تھی[۶]۔ کریمیا زیادہ تر روسی ہے اور ۱۹۵۴ء تک روسی فیڈریشن کا حصہ تھا جب خروشیف نے ۳۰۰ برس قبل کمل نیتسکی کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے اسے یوکرین کے ساتھ شامل کر دیا۔

مشرقی اور مغربی یوکرین کے اختلافات ان کے عوام کے رویوں میں عیاں ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۲ء کے اواخر میں مغربی یوکرین کے ایک تہائی روسیوں نے کہا کہ انہیں روسی مخالفت جذبات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ کیف میں صرف ۱۰ فیصد نے ان احساسات کا اظہار کیا[۷]۔ مشرقی اور مغربی علاقوں کی یہ تقسیم جولائی ۱۹۹۴ء کے انتخابات میں ڈرامائی انداز میں نمایاں تھی۔ صدر لیونڈ کراوچک، جو روسی رہنماؤں سے قریبی روابط کے باوجود خود کو قوم پرست کے طور پر شناخت کرتے

تھے مغربی یوکرین کے تیرہ صوبوں میں جیت گئے جن میں بعض مقامات پر انہوں نے ۹۰ فیصد سے بھی زیادہ اکثریت حاصل کی۔ ان کے مخالف لیونڈ کچما، جنھوں نے انتخابی مہم کے دوران یوکرینی زبان میں خطابت سیکھی، اتنی ہی اکثریت سے تیرہ مشرقی صوبوں میں کامیاب ہوئے۔ کچما نے ۵۲ فیصد ووٹ لیے۔ ۱۹۹۴ء میں یوکرینی عوام کی معمولی اکثریت نے عملاً ۱۶۵۴ء کی کمل نیتسکی کے موقف کی توثیق کی۔ جیسا کہ ایک امریکی ماہر نے تبصرہ کیا، ان انتخابات سے "مغربی یوکرین کے یورپی رنگ میں رنگے ہوئے سلافوں اور اس روسی سلافی تصور کے مابین مناقشے کی عکاسی ہوتی ہے کہ یوکرین کو کیا ہونا چاہیے۔ یہ اتنا نسلی اختلاف نہیں جتنا مختلف ثقافتوں کا تنازع ہے"[۸]۔

اس تقسیم کے نتیجے میں یوکرین اور روس کے تعلقات تین میں سے کسی ایک طریقے سے پروان چڑھ سکتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں جوہری اسلحے، کریمیا، یوکرین میں روسیوں کے حقوق، بحیرۂ اسود کے بیڑے اور اقتصادی روابط کے مسائل پر دونوں ملکوں کے درمیان اہم اختلافات تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ مسلح تصادم ہوسکتا ہے جس کے نتیجے میں بعض مغربی تجزیہ نگاروں نے کہا کہ مغرب کو روسی جارحیت روکنے کے لیے یوکرین کے جوہری ہتھیار رکھنے کی حمایت کرنی چاہیے[۹]۔ تاہم اگر تہذیب اہمیت رکھتی ہے تو یوکرینیوں اور روسیوں کے درمیان تشدد کا امکان نہیں۔ یہ دو سلافی اور بنیادی طور پر آرتھوڈوکس اقوام ہیں جن میں صدیوں سے قریبی روابط

نقشہ ۲ء۷ یوکرین: شکستہ ملک



رہے ہیں اور آپس میں شادیاں عام ہیں۔ دونوں جانب انتہائی متنازع معاملات اور انتہاپسند قوم پرستوں کے دباؤ کے باوجود دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے ان تنازعات کو کم کرنے کے لیے بہت محنت کی اور زیادہ تر کامیاب رہے ہیں۔ وسط ۱۹۹۴ء میں یوکرین میں واضح روسی رجحانات رکھنے والے صدر کے چناؤ سے دونوں ملکوں میں تنازعے کے شدت پکڑنے کا امکان اور کم ہوگیا۔ سابق سوویت یونین کے دوسرے علاقوں میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان شدید لڑائی ہوئی اور روسیوں اور بالٹک اقوام میں خاصی کشیدگی اور کچھ لڑائی ہوئی لیکن ۱۹۹۵ء تک روسیوں اور یوکرینیوں کے درمیان تشدد کا تقریباً کوئی بھی واقعہ نہیں ہوا تھا۔

ایک اور صورت جس کا امکان تھوڑا زیادہ ہے یہ ہے کہ یوکرین اپنے رہنے کے ساتھ ساتھ دو علیٰحدہ اکائیوں میں بٹ جائے جس کا مشرقی حصہ روس میں ضم ہوجائے۔ علیٰحدگی کا مسئلہ پہلے کریمیا کے حوالے سے سامنے آیا تھا۔ کریمین عوام نے جو ۷۰ فیصد روسی ہیں دسمبر ۱۹۷۱ء کے ریفرنڈم میں سوویت یونین سے یوکرین کی آزادی کی حمایت کی۔ مئی ۱۹۹۲ء میں کریمیا کی پارلیمنٹ نے بھی یوکرین سے آزادی کا اعلان کیا اور یوکرین کے دباؤ کے باعث اس ووٹ کو منسوخ کردیا۔ تاہم روسی پارلیمنٹ نے کریمیا کی یوکرین سے ۱۹۵۴ء میں علیٰحدگی کو منسوخ کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔ جنوری ۱۹۹۴ء میں کریمیائیوں نے ایک ایسے صدر کو منتخب کیا جس نے ''روس سے اتحاد'' کے پلیٹ فارم پر مہم چلائی تھی۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ سوال اٹھانے کی تحریک ملی: ''کیا کریمیا اگلا نگورنو کاراباخ یا ابکازیا ہوگا؟''[۱۰] اس کا جواب ایک گونجیلی ''نہیں!'' تھا کیونکہ کریمیا کے صدر آزادی پر ریفرنڈم کرانے کے وعدے سے مکر گئے اور اس کی بجائے کیف حکومت سے گفت وشنید کرنے لگے۔ مئی ۱۹۹۴ء میں صورتحال میں اس وقت اور گرما گرمی پیدا ہوگئی جب کریمیائی پارلیمنٹ نے ۱۹۹۲ء کے دستور کو بحال کرنے کے حق میں ووٹ دیا جس کے تحت وہ یوکرین سے تقریباً آزاد تھا۔ لیکن روسی و یوکرینی رہنماؤں کے تحمل نے اس مسئلے کو تشدد سے دور رکھا اور دو ماہ بعد روس نواز کچما کے یوکرینی صدر کے عہدے پر چناؤ نے کریمیا کی علیٰحدگی کی تحریک کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔

بہرحال اس چناؤ نے ملک کے مغربی حصے کی اُس یوکرین سے، جو روس سے قریب سے قریب تر ہورہا تھا، علیٰحدگی کا امکان پیدا کردیا۔ بعض روسیوں نے اس کا خیرمقدم کیا۔ جیسا کہ ایک روسی جنرل نے کہا ''یوکرین بلکہ مشرقی یوکرین پانچ، دس یا پندرہ برس میں ہمارے پاس واپس آجائے گا۔ مغربی یوکرین جہنم میں جائے''[۱۱] لیکن اس قدرِ ضمنی حیثیت رکھنے والا یونیٹ اور مغرب پسند یوکرین اسی صورت میں قائم رہ سکے گا جب اسے مضبوط اور مؤثر مغربی حمایت حاصل ہو

اور یہ حمایت اسی وقت ملے گی جب مغرب اور روس کے تعلقات بے حد خراب اور سرد جنگ کے زمانے سے مشابہ ہو جائیں۔

تیسرا منظر نامہ جس کا سب سے زیادہ امکان ہے، یہ ہے کہ یوکرین متحد رہے گا، شکستہ رہے گا، آزاد رہے گا اور عام طور پر روس سے قریبی تعاون کرے گا۔ جوہری اسلحے اور فوج کے بارے میں عبوری مسائل حل ہونے کے بعد سنگین ترین طویل مدتی مسئلہ معاشی ہوگا جس کا حل جزوی طور پر مشترکہ ثقافت اور قریبی ذاتی تعلقات کی بنیاد پر نکلے گا۔ جان موریسن نے نشاندہی کی ہے کہ مشرقی یورپ میں روس اور یوکرین کا تعلق اسی طرح ہے جیسے مغربی یورپ میں فرانس اور جرمنی کا تعلق ہے۔[۱۲] جیسے مؤخر الذکر یورپی یونین کا مرکز ہے اسی طرح اول الذکر آرتھوڈوکس دنیا کے اتحاد کے لیے لازمی مرکز ہے۔

عظیم تر چین اور اس کا ہم خوشحالی دائرہ

چین تاریخ میں خود کو ایک ''صینی خطے'' ایک ''اندرونی ایشیائی خطے'' اور ایک ''بیرونی خطے'' پر محیط تصور کرتا آیا ہے۔ صینی خطے میں کوریا، ویت نام، لیو چیو جزائر اور بعض اوقات جاپان آتا تھا۔ اندرونی ایشیائی خطے میں غیر چینی منچو، منگول، یوغور، ترک اور تبّتی آتے تھے جنہیں سلامتی کی وجوہ کی بنا پر قابو میں رکھنا تھا۔ بیرونی خطے میں وحشی آتے تھے جن سے بہرکیف یہ ''توقع کی جاتی تھی کہ چین کی برتری کو خراجِ تحسین پیش کریں اور تسلیم کریں''۔[۱۳] ہم عصر صینی تہذیب بھی اسی طرز پر تشکیل پا رہی ہے: ہان چین والا مرکزی حصہ، باہر والے صوبے جو چین کا حصہ ہیں لیکن خاصی خودمختاری رکھتے ہیں، وہ صوبے جو قانوناً چین میں شامل ہیں لیکن ان میں دوسری تہذیبوں کے غیر چینی افراد کی بہت آبادی ہے (تبت، زن جیانگ)، وہ چینی معاشرے جو متعینہ شرائط پر بیجنگ کے مرکز والے چین کا حصہ بنیں گے یا بننے کا امکان ہے (ہانگ کانگ، تائیوان)، غالب چینی آبادی والی ایک ریاست جو بیجنگ کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہے (سنگاپور)، تھائی لینڈ، ویت نام، ملائشیا، انڈونیشیا اور فلپائن میں بہت بااثر چینی آبادیاں اور غیر چینی معاشرے (شمالی اور جنوبی کوریا، ویت نام) جن میں بہرحال چین کی کنفیوشین ثقافت بہت حد تک موجود ہے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی کے دوران چین نے خود کو سوویت یونین کے اتحادی کے طور پر شناخت کیا۔ پھر چین اور سوویت یونین میں پھوٹ پڑنے کے بعد اس نے دونوں سپر طاقتوں کے خلاف خود کو

تیسری دنیا کے رہنما کی حیثیت سے دیکھا جس کی قیمت بہت ادا کرنی پڑی اور فوائد برائے نام ہوئے۔ نکسن انتظامیہ کے دور میں امریکی پالیسی میں تبدیلی کے بعد چین نے دونوں سپر طاقتوں کے طاقت کے توازن کے کھیل میں تیسرا فریق بننا چاہا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں جب امریکا کمزور محسوس ہورہا تھا، چین نے اس ساتھ دیا اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب امریکی فوجی طاقت بڑھ گئی اور سوویت یونین اقتصادی طور پر زوال پذیر ہوگیا اور افغانستان میں پھنس گیا تو چین سوویت یونین کی طرف جھک گیا۔ تاہم سپر طاقتوں کا مقابلہ ختم ہونے کے بعد ''چینی کارڈ'' اہمیت کھو بیٹھا اور چین ایک بار پھر عالمی امور میں اپنا مقام ازسرِ نو متعین کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے دو اہداف مقرر کیے: چینی ثقافت کا علمبردار بننا یعنی مرکزی ریاست کے طور پر وہ تہذیبی مقناطیس بننا جس کے مطابق تمام دوسری چینی برادریاں اپنی سمت متعین کریں، اور مشرقی ایشیا میں بالادست طاقت کی حیثیت سے اپنا تاریخی مقام بحال کرنا جس سے وہ انیسویں صدی میں محروم ہوگیا تھا۔

چین کے یہ ابھرتے ہوئے کردار تین پہلوؤں سے دیکھے جاسکتے ہیں: اول اس حوالے سے کہ چین عالمی امور میں اپنا مقام کس طرح مقرر کرتا ہے، دوم، اس لحاظ سے کہ بیرون ملک آباد چینی باشندے معاشی طور پر چین سے کس حد تک وابستہ ہورہے ہیں اور سوم، تین دیگر بڑی چینی اکائیوں ہانگ کانگ، تائیوان اور سنگاپور سے چین کے بڑھتے ہوئے اقتصادی، سیاسی اور سفارتی روابط نیز جنوب مشرقی ممالک کے، جہاں چینیوں کا خاصا سیاسی اثر ہے، چین کی جانب راغب ہونے کے ضمن میں۔

چینی حکومت مین لینڈ چین کو چینی تہذیب کی مرکزی ریاست تصور کرتی ہے جس کو دیکھ کر تمام دوسری چینی برادریوں کو اپنا رخ متعین کرنا چاہیے۔ چین مقامی کمیونسٹ پارٹیوں کے ذریعے اپنے بیرون ملک مفادات کے فروغ کی کوششیں تو عرصہ پہلے ترک کرچکا ہے اس لیے حکومت اب خود کو ''چینی پن کے عالمی نمائندے کے طور پر پیش کرنا'' چاہتی ہے۔[۱۱] چینی حکومت کی نگاہ میں چینی نسل کے لوگ، خواہ کسی اور ملک کے باشندے ہوں، چینی برادری کے ارکان ہیں، لہٰذا کسی حد تک چینی حکومت کے زیرِ سایہ آتے ہیں۔ چینی شناخت نسلی حوالوں سے متعین کی جاتی ہے۔ جیسا کہ عوامی جمہوریہ چین کے ایک دانشور نے کہا چینی وہ ہیں جو ایک ہی ''نسل، خون اور ثقافت'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں یہ نظریہ سرکاری و نجی چینی ذرائع کی طرف سے سننے میں آیا۔ چینیوں اور غیر چینی معاشروں میں مقیم چینی نسل کے افراد کے لیے ''آئینہ کسوٹی'' (mirror test) اس سوال کی کسوٹی ہے کہ وہ کون ہیں: ''جاؤ آئینے میں دیکھو۔'' یہ سرزنش بیجنگ پسند چینی ان افراد کو

کرتے ہیں جو چینی نسل کے ہیں لیکن غیر ملکی معاشروں میں رچنے بسنے کی کوشش کررہے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں بکھرے ہوئے چینیوں یعنی ہاؤرن یا چینی نسل کی افراد نے، جن کے مقابلے پر زونگاؤرن یا چینی ریاست کے افراد ہیں، ''ثقافتی چین'' کے تصور کو پروان چڑھایا ہے جو ان کی گونشی یا مشترکہ شعور کا اظہار بن گیا ہے۔ چینی شناخت بیسویں صدی میں مغرب کے متعدد حملوں کا شکار ہونے کے بعد اب چینی ثقافت کے عناصر کے حوالوں سے نئے سرے سے تشکیل پارہی ہے[15]

تاریخی طور پر یہ شناخت چینی ریاست کے مرکزی مقتدر قوتوں کے بدلتے ہوئے روابط سے ہم آہنگ رہی ہے۔ ثقافتی شناخت کے اس احساس کے باعث کئی چینی ممالک کے درمیان اقتصادی تعلقات کی توسیع میں سہولت ہوئی ہے جو مین لینڈ چین اور دوسرے مقامات پر تیز رفتار معاشی ترقی کو فروغ دینے میں اہم عامل ہیں اور اس کے نتیجے میں چینی ثقافتی شناخت کو نمایاں کرنے میں مادی و نفسیاتی تحریک ملی ہے۔

پس ''عظیم تر چین'' محض مجرد تصور نہیں۔ یہ تیزی سے پروان چڑھتی ہوئی ثقافتی و معاشی حقیقت ہے اور سیاسی حقیقت بننا شروع ہوگئی ہے۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں ڈرامائی اقتصادی ترقی چینیوں کے طفیل ہوئی: مین لینڈ پر، ٹائیگرز (جن چار میں سے تین چینی ہیں) میں اور جنوب مشرقی ایشیا میں۔ مشرقی ایشیا کی معیشت میں چین کی حیثیت مرکزی ہوتی جارہی ہے اور اس کا غلبہ بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں مین لینڈ کی ترقی کے لیے زیادہ تر سرمایہ ہانگ کانگ، تائیوان اور سنگاپور نے فراہم کیا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں دوسرے مقامات پر بسے ہوئے غیر ملکی چینی ان ملکوں کی معیشتوں پر چھائے رہے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل میں چینی باشندے فلپائن کی آبادی کا ایک فیصد تھے لیکن ملکی فرموں کی ۳۵ فیصد بکری انہی کی بدولت ہوئی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں انڈنیشیا میں چینی باشندے آبادی کا دو سے تین فیصد تھے لیکن لگ بھگ ۷۰ فیصد نجی ملکی سرمائے کے مالک تھے۔ پچیس سب سے بڑے تجارتی اداروں میں سے سترہ چینیوں کے پاس تھے اور ایک چینی ادارے کا انڈونیشیا کی مجموعی قومی پیداوار میں ۵ فیصد حصہ تھا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں چینی باشندے تھائی لینڈ کی آبادی کا ۱۰ فیصد تھے لیکن دس سب سے بڑے کاروباری گروپوں میں سے نو کے مالک تھے اور اس کی مجموعی قومی پیداوار میں ان کا حصہ ۵۰ فیصد تھا۔ چینی باشندے ملائشیا کی آبادی کا ایک تہائی ہیں لیکن معیشت پر تقریباً مکمل طور پر چھائے ہوئے ہیں۔[16] جاپان اور کوریا کو چھوڑ کر مشرقی ایشیا کی معیشت بنیادی طور پر چینی معیشت ہے۔

عظیم تر چین کے ہم خوشحالی دائرے (co-prosperity sphere) کے ابھرنے میں

خاندانی و ذاتی تعلقات کے تانے بانے اور مشترکہ ثقافت کا بڑا دخل ہے۔ غیر ملکی چینیوں کی چین میں کاروبار کرنے کی اہلیت مغربی اور جاپانی باشندوں سے کہیں زیادہ ہے۔ چین میں اعتماد اور وابستگی کا انحصار ذاتی تعلقات پر ہوتا ہے، ٹھیکوں یا قوانین یا دوسری قانونی دستاویزات پر نہیں۔ مغربی تاجروں کو بھارت میں کاروبار کرنا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے بہ نسبت چین کے، جہاں کسی معاہدے کے تقدس کا دارومدار فریقوں کے ذاتی تعلقات پر ہوتا ہے۔ ایک ممتاز جاپانی شخصیت نے ۱۹۹۳ء میں رشک سے کہا کہ چین ''ہانگ کانگ، تائیوان اور جنوب مشرقی ایشیا میں چینی تاجروں کے سرحدوں سے ماورا نظام'' سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔[۱۷] ایک امریکی تاجر کو بھی اس سے اتفاق تھا کہ بیرون ملک آباد چینی ''کاروباری صلاحیتیں رکھتے ہیں، ان کے پاس زبان ہے اور رشتہ داریوں اور تعلقات کا تانا بانا بھی موجود ہے۔ یہ ایسے کسی شخص کے حالات کے مقابلے میں کہیں سازگار صورتحال ہے جسے ایکرن یا فلاڈلفیا میں کسی بورڈ کو رپورٹ بھیجنی ہو۔'' مین لینڈ سے باہر کے چینی باشندوں کو مین لینڈ والوں سے روابط رکھنے میں جو فوائد ہیں انہیں لی کوآن یو نے بہت اچھی طرح بیان کیا ہے: ''ہم نسلی چینی ہیں۔ مشترکہ آباؤاجداد اور ثقافت کے باعث ہمارے اندر کچھ خواص ایک جیسے ہیں... اپنے جسمانی حلیے سے مشابہ افراد سے فطری طور پر ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔ ثقافت اور زبان کی بنیاد بھی مشترک ہو تو قربت کا یہ احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس سے باہمی ربط ضبط اور اعتماد کی فضا قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے جو تمام تجارتی تعلقات کی اساس ہے''۔[۱۸] ۱۹۸۰ء کے عشرے کے اواخر اور ۱۹۹۰ء میں بیرون ملک آباد نسلی چینیوں نے ''شک وشبہے میں مبتلا دنیا پر ثابت کر دیا کہ ایک جیسی زبان اور ثقافت کے توسط سے گوانزی تعلقات قانون کی حکمرانی اور شفاف قواعد وضوابط کی کمی پوری کر سکتے ہیں۔'' مشترکہ ثقافت میں اقتصادی ترقی کی جڑیں نومبر ۱۹۹۳ء میں ہانگ کانگ میں ہونے والی دوسری عالمی چینی تاجروں کی کانفرنس (Second World Chinese Enterpreneurs Conference) میں نمایاں ہوئیں جسے ''چینی فتح کی خوشی کی تقریب [قرار دیا گیا جس میں] دنیا بھر سے نسلی چینی تاجروں نے شرکت کی''۔[۱۹] دوسرے جگہوں کی طرح صینی دنیا میں بھی ثقافتی اشتراک اقتصادی تعلقات کو فروغ دیتا ہے۔

تیانن من اسکوائر کے واقعے کے بعد چین سے مغربی دنیا کی دلچسپی کم ہونے پر، تیز رفتار چینی معاشی ترقی کے ایک عشرے بعد بیرون ملک مقیم چینیوں کے لیے اپنی مشترکہ ثقافت اور ذاتی روابط سے فائدہ اٹھانے کا موقع اور ترغیب پیدا ہوگئی اور انہوں نے چین میں بھاری سرمایہ کاری شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ چینی برادریوں کے درمیان اقتصادی روابط میں ڈرامائی اضافے کی صورت میں

نکلا۔ ۱۹۹۲ء میں چین میں ۸۰ فیصد (۱۱٫۳ ارب ڈالر) براہِ راست غیر ملکی سرمایہ کاری بیرون ملک مقیم چینیوں نے کی، جو زیادہ تر ہانگ کانگ (۶۸٫۳ فیصد) سے آئی، لیکن تائیوان (۹٫۳ فیصد)، سنگاپور، مکاؤ اور دوسرے مقامات کی طرف سے بھی ہوئی۔ اس کے مقابلے میں جاپان نے ۶٫۶ فیصد اور امریکا نے ۴٫۶ فیصد سرمایہ فراہم کیا۔ ۵۰/ارب ڈالر کے مجموعی سرمائے میں سے ۶۷ فیصد چینی ذرائع سے آیا۔ کاروبار میں اضافہ بھی اتنا ہی متاثر کن تھا۔ چین کو تائیوان کی برآمدات ۱۹۸۶ء میں تقریباً صفر سے بڑھ کر ۱۹۹۲ء میں مجموعی تائیوانی برآمدات کا ۸ فیصد ہوگئیں۔ اُس سال یہ برآمدات ۳۵ فیصد کی شرح سے بڑھیں۔ چین کو سنگاپور کی برآمدات ۱۹۹۲ء میں ۲۲ فیصد بڑھ گئیں جبکہ اس کی مجموعی برآمدات میں ۲ فیصد سے بھی کم اضافہ ہوا تھا۔ جیسا کہ ۱۹۹۳ء میں مرے وائیڈن بام نے کہا ''خطے پر اس وقت جاپانی غلبے کے باوجود، ایشیا کی چینی اساس کی حامل معیشت تیزی سے صنعت، تجارت اور مالیات کے نئے مرکز کے طور پر ابھر رہی ہے۔ اس اہم خطے میں ٹیکنالوجی اور اشیا سازی کی زبردست صلاحیت (تائیوان)، کاروبار، مارکیٹنگ اور خدمات کے حوالے سے فراست (ہانگ کانگ)، ایک شاندار مواصلاتی ڈھانچا (سنگاپور)، مالیاتی سرمائے کا زبردست ذخیرہ (تینوں)، اور زمین، وسائل اور افرادی قوت کا خزانہ موجود ہے (مین لینڈ چین)''۔[۲۰] مزید برآں، مین لینڈ چین تمام پھیلتی ہوئی منڈیوں سے زیادہ امکانات رکھتا تھا اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط تک مین لینڈ میں فروخت اور وہاں سے برآمدات کا سلسلہ بڑھنا شروع ہوگیا تھا۔

جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں کے چینی مختلف درجوں میں مقامی آبادی کے ساتھ گھلے ملے ہیں۔ مقامی آبادی میں اکثر چینی مخالف جذبات ہوتے ہیں جو بعض مواقع پر تشدد پر منتج ہوتے ہیں جیسے اپریل ۱۹۹۴ء میں انڈونیشیا کے میڈون کے فسادات میں ہوا۔ ملائشیا اور انڈونیشیا کے بعض حلقوں نے چینی سرمایہ کاری کے مین لینڈ کا رخ کرنے کو ''سرمائے کا فرار'' کہتے ہوئے اس پر تنقید کی اور صدر سوہارتو کی قیادت میں سیاسی رہنماؤں کو اپنے عوام کو تسلی دینی پڑی کہ اس سے ان کی معیشت کو نقصان نہیں ہوگا۔ جواب میں جنوبی مشرقی ایشیائی چینیوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ ان کی وفاداریاں مکمل طور پر اپنی جائے پیدائش سے ہیں اپنے آباؤاجداد کے ملک سے نہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں جنوب مشرقی ایشیا سے چینی سرمائے کی چین منتقلی کا جواب اس طرح سامنے آیا کہ فلپائن، ملائشیا اور ویت نام کو تائیوانی سرمایہ بھاری مقدار میں منتقل ہوا۔

بڑھتی ہوئی معاشی طاقت اور مشترکہ چینی ثقافت کے امتزاج نے ہانگ کانگ، تائیوان اور سنگاپور کو چینی وطن سے زیادہ سے زیادہ منسلک کردیا۔ ہانگ کانگ کے چینی، مستقبل قریب میں

اقتدار کی منتقلی سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے لندن کی بجائے بیجنگ کی حکومت کے طور طریقوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے لگے۔ تاجر اور دوسرے رہنما چین پر نکتہ چینی یا ایسے اقدامات سے گریز کرنے لگے جن سے چین کو ٹھیس پہنچے۔ جب جب انہوں نے ٹھیس پہنچائی، چینی حکومت نے بلا تامل جوابی کارروائی کی۔ ۱۹۹۴ء تک سیکڑوں تاجر بیجنگ سے تعاون کر رہے تھے اور ایک طرح کی شیڈو حکومت میں ''ہانگ کانگ کے مشیر'' بنے ہوئے تھے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کی ابتدا میں ہانگ کانگ میں چینی اقتصادی اثرات بھی ڈرامائی انداز میں پھیلے اور ۱۹۹۳ء تک مین لینڈ کی سرمایہ کاری جاپان اور امریکا کی مجموعی سرمایہ کاری سے زیادہ بتائی گئی۔[۲۱] ۱۹۹۰ء کے عشرے کے وسط تک ہانگ کانگ اور مین لینڈ چین کا معاشی اتحاد تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور سیاسی انضمام ۱۹۹۷ء میں تکمیل پاتا ہے۔

مین لینڈ کے ساتھ تائیوان کے روابط ہانگ کانگ کی بہ نسبت کم بڑھے۔ بہرحال ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اہم تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ۱۹۴۹ء کے بعد تین عشروں تک دونوں چینی جمہوریاؤں نے ایک دوسرے کے وجود یا جواز کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، ان کا ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور وہ تقریباً حالتِ جنگ میں تھے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ساحل کے قریبی جزائر پر فائرنگ کے تبادلے سے ہوتا تھا۔ تاہم جب ڈینگ ژیاؤپنگ نے اپنا اقتدار مضبوط کر لیا اور معاشی اصلاحات کا آغاز کیا تو مین لینڈ کی حکومت نے مفاہمانہ اقدامات کرنے شروع کر دیے۔ ۱۹۸۱ء میں تائیوانی حکومت جواباً اپنی ''تین نہیں'' والی پالیسی سے ہٹنے لگی جس کے تحت اس نے طے کیا ہوا تھا کہ مین لینڈ سے 'رابطہ نہیں، مذاکرات نہیں، سمجھوتا نہیں'۔ مئی ۱۹۸۶ء میں فریقین کے نمائندوں کے مابین تائیوان کے ایک طیارے کی واپسی کے معاملے پر مذاکرات ہوئے جسے اغوا کر کے مین لینڈ لے جایا گیا تھا۔ اگلے سال تائیوان نے مین لینڈ کا سفر کرنے پر پابندی ختم کر دی۔[۲۲]

تائیوان اور مین لینڈ کے درمیان معاشی تعلقات کے تیزی سے پھیلنے میں ''مشترکہ چینی پن'' نے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے باہمی اعتماد نے بہت مدد دی۔ جیسا کہ تائیوان کے مذاکرات کار نے تبصرہ کیا، تائیوان اور چین کے افراد میں '' 'خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے، جیسے جذبات'' ہیں اور وہ ایک دوسرے کی کامیابیوں پر فخر کرتے ہیں۔ ۱۹۹۳ء کے آخر تک تائیوانی باشندے مین لینڈ کے ۴۲/لاکھ اور مین لینڈ والے تائیوان کے ۴۰ ہزار دورے کر چکے تھے۔ چالیس ہزار خطوط اور ۱۳/ہزار فون کالوں کا روز تبادلہ ہو رہا تھا۔ دونوں میں تجارت ۱۹۹۳ء میں ۱۴/ارب ۴۰ کروڑ ڈالر تک پہنچ گئی اور ۲۰ ہزار تائیوانی کاروباری اداروں نے مین لینڈ میں ۱۵ سے ۳۰/ارب ڈالر کے درمیان سرمایہ کاری کی۔ تائیوان کی توجہ اور اس کی کامیابی کا انحصار مین لینڈ

پر ہوتا گیا۔ ایک تائیوانی اہلکار نے ۱۹۹۳ء میں تبصرہ کیا کہ "۱۹۸۰ء سے قبل تائیوان کے لیے اہم ترین منڈی امریکا تھا لیکن ۱۹۹۰ء کی دہائی کے لیے ہم جانتے ہیں کہ تائیوان کی معیشت کی کامیابی میں اہم ترین عامل مین لینڈ ہے۔" مین لینڈ کی سستی لیبر تائیوانی سرمایہ کاروں کے لیے سب سے بڑی کشش تھی جنہیں اپنے ہاں لیبر کی قلت کا سامنا تھا۔ ۱۹۹۴ء میں دونوں ملکوں کے درمیان سرمائے اور لیبر کے عدم توازن کو درست کرنے کے لیے بالعکس عمل شروع ہوا اور تائیوانی ماہی گیر کمپنیوں نے اپنی کشتیوں کے لیے مین لینڈ کے دس ہزار باشندوں کو بھرتی کیا۔[۲۳]

معاشی روابط بڑھنے کی وجہ سے دونوں حکومتوں میں مذاکرات شروع ہو گئے۔ آبنائے تائیوان کے آر پار رابطے کے لیے تائیوان نے سٹریٹس ایکس چینج فاؤنڈیشن اور مین لینڈ نے ایسوسی ایشن فار ریلیشنز قائم کی۔ پہلا اجلاس اپریل ۱۹۹۳ء میں سنگاپور میں ہوا، پھر مین لینڈ اور تائیوان میں اجلاس ہوئے۔ اگست ۱۹۹۴ء میں ایک "شاندار" معاہدہ طے پایا جس میں متعدد کلیدی مسائل کا احاطہ کیا گیا اور دونوں حکومتوں کے سربراہوں کی ملاقات کے بارے میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں تائی پے اور بیجنگ میں بڑے بڑے تنازعات برقرار ہیں جن میں خود مختاری کا سوال، بین الاقوامی اداروں میں تائیوان کی شرکت اور یہ امکان شامل ہے کہ تائیوان ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے اپنی شناخت متعین کرے۔ مؤخرالذکر امکان کا حقیقت بننا مشکل ہوتا جارہا ہے کیونکہ آزادی کی اہم ترین حامی جماعت جمہوری ترقی پسند پارٹی (Democratic Progressive Party,DPP) نے دیکھا کہ تائیوانی ووٹر مین لینڈ سے موجودہ تعلقات نہیں توڑنا چاہتے اور یہ کہ اس مسئلے پر اصرار سے انتخابی کامیابی مخدوش ہو جائے گی۔ چنانچہ ڈی پی پی کے رہنماؤں نے اس بات پر زور دیا کہ اگر وہ اقتدار میں آگئے تو آزادی ان کے ایجنڈے پر فوری نکتہ نہیں ہوگا۔ دونوں حکومتیں اس معاملے سے بھی مشترکہ دلچسپی رکھتی تھیں کہ بحیرۂ جنوبی چین میں اسپریٹلی اور دیگر جزائر پر چینی بالادستی جتلائی جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ امریکا مین لینڈ سے پسندیدہ ترین قوم (most favored nation) کا برتاؤ کرے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے آغاز میں دونوں ملک ایک دوسرے کی طرف آہستہ آہستہ مگر ناگزیر طور پر اور محسوس انداز میں قدم بڑھا رہے تھے اور اپنے پھیلتے ہوئے اقتصادی تعلقات اور ایک جیسی ثقافتی شناخت کی مدد سے مشترکہ مفادات کو پروان چڑھا رہے تھے۔

۱۹۹۵ء میں مفاہمت کی جانب یہ پیشرفت اس وقت اچانک معطل ہوگئی جب تائیوانی حکومت نے جارحانہ انداز میں سفارتی حیثیت تسلیم کرانے اور بین الاقوامی اداروں کی رکنیت کے

لیے اقدامات کیے۔ صدر لی تنگ ہوئی نے امریکا کا ''نجی'' دورہ کیا اور دسمبر ۱۹۹۵ء میں تائیوان میں مقننہ کے انتخابات ہوئے جس کے بعد مارچ ۱۹۹۶ء میں صدارتی انتخابات ہوئے۔ جواب میں چینی حکومت نے اہم تائیوانی بندرگاہوں کے قریب سمندری علاقوں میں میزائلوں کے تجربات کیے اور تائیوان کے زیر قبضہ ساحل کے قریبی جزائر کے نزدیک فوجی مشقیں شروع کر دیں۔ ان حالات سے دو کلیدی سوالات سامنے آئے: کیا فی الوقت تائیوان باقاعدہ آزاد ہوئے بغیر جمہوریت قائم رکھ سکتا ہے؟ کیا مستقبل میں تائیوان سچ مچ آزاد رہے بغیر جمہوری رہ سکتا ہے؟

مین لینڈ سے تائیوان کے تعلقات دو مراحل سے گزرے ہیں اور تیسرے مرحلے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ عشروں تک قوم پرست حکومت پورے چین کی حکومت ہونے کی دعویدار رہی۔ اس دعوے کا مطلب ظاہر ہے اس حکومت سے تصادم تھا جو تائیوان کے سوا پورے چین کی حکومت تھی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں تائیوانی حکومت اس دعوے سے دستبردار ہو گئی اور خود کو تائیوان کی حکومت کہنے لگی جس سے اس سے اپنے آپ کو مین لینڈ کے ''ایک ملک، دو نظام'' کے تصور کو ہم آہنگ کرنے کی بنیاد مل گئی۔ بہرحال تائیوان میں مختلف افراد اور گروہ تائیوان کی مختلف ثقافتی شناخت، چینی اقتدار کے ماتحت اس کے نسبتاً مختصر دور اور اس کی مقامی زبان پر زور دینے لگے جو مینڈارین بولنے والوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ دراصل تائیوانی معاشرے کو غیر چینی قرار دینے، اور اس طرح چین سے جائز طور پر آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ جب تائیوانی حکومت بین الاقوامی طور پر مزید فعال ہوئی تو وہ بھی گویا یہ اشارہ کر رہی تھی کہ وہ علیحدہ ملک ہے جو چین کا حصہ نہیں۔ المختصر، تائیوانی حکومت کی شناخت کا ارتقا یوں ہوا کہ پہلے اس نے خود کو سارے چین کی حکومت کہا، پھر چین کے ایک حصے کی حکومت اور پھر وہ چین کے کسی بھی حصے نہ رہی۔ مؤخرالذکر موقف، جو دراصل اس کی آزادی کا دعویٰ ہے، بیجنگ حکومت کے لیے قطعی ناقابل قبول ہوگا جس نے بار بار اس دعوے کو حقیقت بننے سے روکنے کے لیے قوت استعمال کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ چینی حکومت کے رہنماؤں نے یہ بھی کہا کہ ۱۹۹۷ء میں ہانگ کانگ اور ۱۹۹۹ء میں مکاؤ کے عوامی جمہوریہ چین سے انضمام کے بعد وہ تائیوان کے مین لینڈ سے ملاپ کے لیے قدم اٹھائیں گے۔ یہ ملاپ کس طرح ہوتا ہے، اس کا انحصار شاید اس بات پر ہے کہ تائیوان میں باقاعدہ آزادی کی حمایت میں شدت آئے، بیجنگ میں جانشینی کی لڑائی کا تصفیہ اس طرح ہو جو سیاسی و فوجی رہنماؤں کے انتہائی قوم پرست ہونے کی حوصلہ افزائی کرے اور چینی فوجی صلاحیتوں میں اضافہ ہو جو تائیوان کا گھیراؤ یا اس پر حملہ قابل عمل بنا دے۔ امکان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں جبر، مفاہمت یا غالباً

ان دونوں کے امتزاج سے تائیوان مین لینڈ چین سے زیادہ قریبی تعلق میں بندھ جائے گا۔

۱۹۷۰ء کے عشرے کے اواخر تک سخت کمیونسٹ دشمن سنگاپور اور عوامی جمہوریہ کے درمیان تعلقات سرد مہری پر مبنی تھے اور لی کوآن یو اور دوسرے سنگاپوری رہنما چینی پسماندگی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تاہم ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب چینی معاشی ترقی کی ابتدا ہوئی تو سنگاپور نے بالکل بھیڑ چال کی طرز پر خود کو مین لینڈ سے وابستہ کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۹۲ء تک سنگاپور چین میں ۱۹ء ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کر چکا تھا اور اگلے برس شنگھائی کے باہر ایک صنعتی ٹاؤن شپ "سنگاپور دوم" تعمیر کرنے کے منصوبے کا اعلان کیا گیا جس میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری ہوگی۔ لی چین کے اقتصادی امکانات کے پُر جوش حامی اور اس کی طاقت کے مداح بن گئے۔ ۱۹۹۳ء میں انہوں نے کہا "جہاں چین ہے وہاں عمل ہے"۔[۲۴] سنگاپوری غیر ملکی سرمایہ کاری جو ملائشیا اور انڈونیشیا تک محدود تھی چین کی طرف منتقل ہوگئی۔ ۱۹۹۳ء میں سنگاپوری حکومت کے نصف بیرون ملک منصوبے چین میں تھے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اپنے بیجنگ کے پہلے دورے میں لی کوآن یو نے چینی رہنماؤں سے مینڈارین کی بجائے انگریزی میں گفتگو کرنے پر اصرار کیا تھا۔ یہ امکان نہیں کہ دو عشروں بعد انہوں نے ایسا کیا ہوگا۔

اسلام: اتحاد کے بغیر آگاہی

عربوں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی وفاداری کا ڈھانچا عموماً جدید مغرب کے برعکس رہا ہے۔ مغرب میں قومی ریاست سیاسی وفاداری کا نقطہ عروج رہا ہے۔ اس سے چھوٹی سطح کی وفاداریاں اس کے ماتحت ہیں اور قومی ریاست سے وفاداری کے اندر مدغم ہو جاتی ہیں۔ قومی ریاستوں سے ماورا گروہ-- لسانی یا مذہبی برادریاں یا تہذیبیں-- کم شدت والی وفاداری اور وابستگی کی حامل رہی ہیں۔ اس طرح تنگ اور وسیع اکائیوں کے اس سلسلے میں مغربی وفاداریاں بیچ میں نقطہ عروج پر ہوتی ہیں۔ وفاداری کی شدت کا خط کسی حد تک الٹے U کی شکل کا ہوتا ہے۔ اسلامی دنیا میں وفاداری کا ڈھانچا تقریباً اس کے برعکس رہا ہے۔ اسلام کی وفاداریوں کے مختلف مدارج میں بیچ کا حصہ کھوکھلا ہے۔ جیسا کہ ایرا لیپڈس نے کہا "دو اساسی، اصل اور مسلسل ڈھانچے" ایک طرف خاندان، برادری اور قبیلہ ہیں اور دوسری طرف "وسیع تر پیمانے پر ثقافت، مذہب اور سلطنت کے اتحاد"۔[۲۵] اسی طرح ایک لیبیائی دانشور نے کہا ہے کہ "قبائلی وابستگی اور مذہب (اسلام) نے عرب معاشروں اور سیاسی

نظاموں کے سماجی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی ارتقا میں اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ اس انداز میں آپس میں گندھے ہوئے ہیں کہ انہیں عرب سیاسی ثقافت اور عرب سیاسی ذہن کی صورت پذیری کرنے والے اہم ترین عوامل اور متغیرات سمجھا جاتا ہے۔'' عرب ریاستوں کی سیاست میں قبائل کی اہمیت مرکزی رہی ہے جن میں سے بیشتر، جیسا کہ تحسین بشیر نے کہا، محض ''پرچم بردار قبائل'' ہیں۔ سعودی عرب کے بانی کی کامیابی بڑی حد تک شادی اور دوسرے طریقوں سے قبائلی اتحاد قائم کرنے کا نتیجہ تھی اور سعودی سیاست زیادہ تر قبائلی سیاست رہی ہے جس میں سدیریوں کی شاروں اور دوسرے قبائل سے کشمکش رہی ہے۔ لیبیا کے ارتقا میں کم از کم اٹھارہ بڑے قبائل نے اہم کردار ادا کیا ہے اور لگ بھگ پانچ سو قبائل سوڈان میں مقیم بتائے جاتے ہیں جن میں سب سے بڑا ملک کی آبادی کے ۱۲ فیصد پر محیط ہے۔[۲۶]

وسط ایشیا میں تاریخی اعتبار سے قومی شناختوں کا وجود نہیں تھا۔ '' وفاداری برادری، قبیلے اور وسیع تر خاندان سے تھی، ریاست سے نہیں۔'' دوسری انتہا پر لوگوں کی '' زبان، مذہب، ثقافت اور طرز ہائے حیات'' مشترک تھیں اور '' اسلام لوگوں کو متحد کرنے والی مضبوط ترین قوت تھی، امیر کی قوت سے بھی زیادہ۔'' چیچنوں اور شمالی قفقاز کی منسلکہ اقوام میں لگ بھگ سو '' پہاڑی'' اور ستر '' میدانی'' قبائل رہے ہیں اور اس حد تک سیاست اور معیشت پر غالب رہے ہیں کہ منصوباتی سوویت معیشت کے مقابلے میں چیچنوں میں مبینہ طور پر '' قبائلی'' معیشت تھی۔[۲۷]

پوری اسلامی دنیا میں چھوٹا گروہ اور بڑا عقیدہ، قبیلہ اور اُمہ، وفاداری اور وابستگی کے اصل مراکز رہے ہیں۔ عرب دنیا میں موجودہ ریاستوں کو جواز کے مسائل درپیش ہیں کیونکہ ان میں بیشتر یورپی سامراجیت کی من مانی نہیں تو آزادانہ پیداوار ہیں اور ان کی سرحدیں اکثر بربروں اور کردوں جیسے نسلی گروہوں سے بھی میل نہیں کھاتیں۔ ان ریاستوں نے عرب قوم کو تقسیم کر دیا لیکن دوسری طرف یہ بھی ہے کہ کوئی ہمہ گیر عرب ریاست حقیقت کا روپ نہیں دھار سکی ہے۔ علاوہ ازیں خود مختار قومی ریاستوں کا تصور اللہ کی حاکمیت اور امہ کی بالادستی کے عقیدے سے متصادم ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی ایک انقلابی تحریک کی حیثیت سے اسلامی اتحاد کے حق میں قومی ریاست کو مسترد کرتی ہے جیسے مارکسزم نے بین الاقوامی پرولتاریت کے حق میں اسے مسترد کیا تھا۔ اسلام میں قومی ریاست کی کمزوری کی عکاسی اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد کے برسوں میں مسلمان گروہوں میں تو متعدد تنازعات ہوئے لیکن مسلمان ریاستوں میں بڑی جنگیں شاذونادر ہی ہوئیں۔ سب سے اہم جنگ عراق اور اس کے ہمسایہ ممالک میں تھی۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں میں انہی عوامل نے، جنہوں نے اسلامی احیا کو ابھارا تھا، اُمّہ یا بحیثیت مجموعی اسلامی تہذیب کے ساتھ شناخت کو مضبوط بنایا۔ جیسا کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں ایک دانشور نے کہا:

> استعماریت کے خاتمے، آبادی میں اضافے، صنعت کاری، شہروں کی جانب منتقلی اور بدلتے ہوئے بین الاقوامی معاشی نظام نے، جو دوسری چیزوں کے علاوہ مسلمان سرزمینوں میں تیل کی دولت سے منسلک ہے، مسلم شناخت اور اتحاد کا جذبہ متحرک کیا ہے... جدید مواصلات نے مسلمان اقوام کے درمیان بندھنوں کو مضبوط تر اور وسیع تر کیا ہے۔ حج کرنے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے، جس سے بہت دور دراز کے علاقوں مثلاً چین اور سینیگال، یمن اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے مابین مشترکہ شناخت کے شدید احساس نے جنم لیا ہے۔ انڈونیشیا، ملائشیا، جنوبی فلپائن اور افریقہ کے زیادہ سے زیادہ طلبہ مشرق وسطیٰ کی جامعات میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں قومی سرحدوں سے ماورا ذاتی روابط پیدا ہو رہے ہیں اور خیالات پھیل رہے ہیں۔ مسلمان دانشوروں اور علما کی کانفرنسیں اور مذاکرات باقاعدگی سے اور زیادہ تعداد میں تہران، مکہ اور کوالالمپور جیسے مراکز میں منعقد ہو رہے ہیں... کیسٹیں (آواز والی، اور اب تصویر والی بھی) بین الاقوامی سرحدوں سے بے نیاز مساجد کے خطبوں میں چھا گئی ہیں اس طرح اب بااثر مبلغین اپنی مقامی برادریوں سے کہیں آگے سامعین و ناظرین تک پہنچ رہے ہیں۔[۲۸]

مسلم اتحاد کے اس احساس کی عکاسی اور حوصلہ افزائی ریاستوں اور بین الاقوامی تنظیموں کے اقدامات میں بھی ہوتی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں سعودی عرب کے رہنماؤں نے، پاکستان، مراکش، ایران، تیونس اور ترکی کے لیڈروں سے مل کر رباط میں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس سے اسلامی کانفرنس کی تنظیم یا او آئی سی کی بنیاد پڑی جس کا قیام باقاعدہ طور پر ۱۹۷۲ء میں عمل میں آیا اور صدر دفتر جدہ میں قائم کیا گیا۔ اب زیادہ مسلمان آبادی رکھنے والے تقریباً تمام ممالک اس کے رکن ہیں اور یہ اپنی نوعیت کی واحد بین الریاستی تنظیم ہے۔ عیسائی، آرتھوڈوکس، بدھ، ہندو حکومتوں کی مذہب کی بنیاد پر قائم بین الریاستی تنظیمیں نہیں، مسلمان حکومتوں کی ہے۔ علاوہ ازیں سعودی عرب، پاکستان، ایران اور لیبیا کی حکومتوں نے ورلڈ مسلم کانگریس (پاکستان کی تخلیق) اور مسلم ورلڈ لیگ (سعودی تخلیق) جیسی غیر سرکاری تنظیموں کو، نیز ''متعدد اور اکثر دور دراز حکومتوں، جماعتوں، تحریکوں اور مقاصد کو، جو ان کی نظریاتی جہتوں میں شریک خیال کیے جاتے ہیں، حمایت و تعاون فراہم کیا ہے''۔[۲۹]

بہرحال اسلامی آگاہی سے اسلامی اتحاد کی طرف سفر میں دو تضادات ہیں۔ اول، اسلام

طاقت کے باہم مخالف مراکز کے درمیان بٹا ہوا ہے جو سب کے سب اپنی قیادت میں اسلامی اتحاد کے فروغ کے لیے اُمّہ کے ساتھ شناخت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس مقابلے میں ایک طرف جمی ہوئی حکومتیں اور ان کی تنظیمیں ہیں اور دوسری طرف اسلام پسندانہ حکومتیں اور ان کی تنظیمیں۔ سعودی عرب اسلامی کانفرنس کی تنظیم قائم کرنے میں آگے آگے اس لیے بھی رہا کہ اسے عرب لیگ کے مقابلے پر ایک قوت درکار تھی جس پر اس وقت ناصر کا غلبہ تھا۔ ۱۹۹۱ء میں جنگ خلیج کے بعد سوڈانی رہنما حسن الترابی نے او آئی سی کے مقابلے پر، جس پر سعودی عرب چھایا ہوا تھا، مقبول عرب اور اسلامی کانفرنس (Popular Arab and Islamic Conference,PIAC) بنائی۔ پی آئی اے سی کی تیسری کانفرنس میں، جو ۱۹۹۵ء کے آغاز میں خرطوم میں ہوئی، ۸۰ ملکوں کی اسلام پسند تنظیموں اور تحریکوں کے کئی سو وفود نے شرکت کی۔[30] ان باضابطہ تنظیموں کے علاوہ افغانستان کی جنگ نے غیر رسمی اور زیر زمین گروپوں کا ایک وسیع جال پیدا کیا ہے جو الجزائر، چچنیا، مصر، تیونس، بوسنیا، فلسطین، فلپائن اور دوسرے مقامات میں مسلم یا اسلام پسندانہ مقاصد کے لیے برسرِپیکار نظر آتے ہیں۔ جنگ کے بعد پشاور کے قریب دعوۃ و جہاد یونیورسٹی میں اور مختلف دھڑوں اور افغانستان میں ان کے غیر ملکی سرپرستوں کے کیمپوں میں تربیت یافتہ جنگجوؤں سے ان کی صفیں بھر گئیں۔ انقلابی خیالات کی حامل حکومتوں اور تحریکوں کے مشترکہ مفادات بعض اوقات روایتی دشمنیوں پر غالب آ گئے ہیں اور ایرانی حمایت سے سنی اور شیعہ بنیاد پرست گروپوں میں روابط پیدا ہوئے ہیں۔ سوڈان اور ایران میں قریبی فوجی تعاون موجود ہے، ایرانی فضائیہ اور بحریہ نے سوڈانی سہولتیں استعمال کی ہیں اور دونوں حکومتوں نے الجزائر اور دوسرے مقامات پر بنیاد پرست تنظیموں کی مدد کرنے میں باہم تعاون کیا ہے۔ حسن الترابی اور صدام حسین کے درمیان ۱۹۹۴ء میں مبینہ طور پر قریبی روابط پیدا ہوئے اور ایران اور عراق نے مفاہمت کی طرف پیشرفت کی۔[31]

دوم، امہ کے تصور میں یہ مفروضہ موجود ہے کہ قومی ریاست ناجائز ہے، تاہم امہ صرف کسی ایک یا ایک سے زیادہ مرکزی ریاست کے اقدامات سے ہی متحد ہو سکتی ہے جو فی الحال موجود نہیں۔ ایک متحد مذہبی و سیاسی برادری کی حیثیت سے اسلام کے تصور کے باعث ماضی میں مرکزی ریاستیں عموماً اسی وقت حقیقت بنی ہیں جب مذہبی اور سیاسی قیادت -- خلافت اور سلطنت -- کسی واحد حکمران ادارے میں یکجا ہو گئی ہوں۔ ساتویں صدی میں شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں عربوں کی برق رفتار فتوحات کے نتیجے میں بنو امیہ کی خلافت قائم ہوئی جس کا دارالخلافہ دمشق تھا۔ اس کے بعد آٹھویں صدی میں خلافت عباسیہ آئی۔ اس کا دارالخلافہ بغداد تھا اور اس پر ایرانی اثرات تھے جبکہ

قاہرہ اور قرطبہ میں دسویں صدی میں ذیلی خلافتیں قائم ہوئیں۔ چار سو سال بعد عثمانی ترک پورے مشرق وسطیٰ کو فتح کرتے چلے گئے، ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کیا اور ۱۵۱۷ء میں ایک نئی خلافت قائم کردی۔ تقریباً اسی وقت ترک نسل کی اقوام نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ مغرب کے عروج نے عثمانی اور مغل سلطنت دونوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے نتیجے میں اسلام کسی مرکزی ریاست سے محروم ہوگیا۔ اس کے علاقے زیادہ تر مغربی طاقتوں نے آپس میں بانٹ لیے اور جب یہ طاقتیں پسپا ہوئیں تو اپنے پیچھے مغربی طرز پر کمزور ریاستیں چھوڑ گئیں جن کا اسلامی روایات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہٰذا بیسویں صدی کے بیشتر عرصے کے دوران کسی مسلمان ملک میں اتنا ثقافتی اور مذہبی جواز نہیں رہا کہ وہ یہ کردار سنبھال سکے اور دوسری اسلامی ریاستوں اور غیر اسلامی ممالک کی طرف سے اسلام کا رہبر تسلیم کیا جاسکے۔

اسلام میں جابجا داخلی و خارجی تنازعات کا بڑا سبب کسی اسلامی مرکزی ریاست کی عدم موجودگی ہے۔ اتحاد کے بغیر آگاہی اسلام کی کمزوری اور دوسری تہذیبوں کے لیے خطرے کی وجہ ہے۔ کیا یہ صورتحال جاری رہنے کا امکان ہے؟

اسلامی مرکزی ریاست کے پاس معاشی وسائل، فوجی قوت، تنظیمی اہلیت، اسلامی شناخت اور امہ کو سیاسی و دینی قیادت فراہم کرنے کا جذبہ ہونا چاہیے۔ چھ ریاستوں کو وقتاً فوقتاً اسلام کا ممکنہ رہبر کہا جاتا رہا ہے۔ فی الحال ان میں سے کوئی بھی مؤثر مرکزی ریاست ہونے کی شرائط پوری نہیں کرتی۔ انڈونیشیا سب سے بڑا مسلمان ملک ہے اور تیزی سے معاشی ترقی کررہا ہے مگر یہ اسلام کے نواح میں، عرب مرکز سے بہت دور واقع ہے۔ اس کا اسلام نرم اور جنوب مشرقی ایشیائی قسم کا ہے اور اس کے لوگ اور ثقافت مقامی، مسلمان، ہندو، چینی اور عیسائی اثرات کا ملغوبہ ہے۔ مصر بڑی آبادی والا عرب ملک ہے اور مشرق وسطیٰ میں مرکزی، عسکری اہمیت والا جغرافیائی محل وقوع اور اسلامی علوم کا صف اول کا ادارہ جامعہ الازہر رکھتا ہے۔ لیکن مصر غریب ملک ہے اور اقتصادی اعتبار سے امریکا، مغربی بین الاقوامی اداروں اور تیل کی دولت سے مالا مال عرب ریاستوں پر انحصار کرتا ہے۔

ایران، پاکستان اور سعودی عرب نے اپنی شناخت واضح طور پر مسلم ممالک کی حیثیت سے متعین کی ہے اور سرگرمی سے امہ پر اثرات ڈالنے اور اسے قیادت فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس عمل میں یہ ممالک تنظیموں کی سرپرستی کرنے، اسلامی گروہوں کو مالی امداد فراہم کرنے، افغانستان میں جنگجوؤں کی مدد کرنے اور وسط ایشیا کی اقوام کو اپنی جانب کھینچنے میں باہم مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ ایران اپنے رقبے، مرکزی محل وقوع، آبادی، تاریخی روایات، تیل کے وسائل اور اوسط درجے

کی معاشی ترقی کے باعث اسلامی مرکزی ریاست ہونے کے لیے درکار شرائط پوری کرتا ہے مگر دنیا کے نوے فیصد مسلمان سنی ہیں اور ایران شیعہ۔ اسلام کی زبان کے طور پر فارسی، عربی کے مقابلے میں کافی نیچے دوسرے درجے پر آتی ہے اور ایرانیوں اور عربوں کے مابین تعلقات تاریخ میں مخاصمانہ رہے ہیں۔

پاکستان رقبہ، آبادی اور فوجی قوت رکھتا ہے اور اس کے رہنما خاصے استقلال سے اس بات کے مدعی رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی ریاستوں کے درمیان تعاون کا فروغ دہندہ اور بقیہ دنیا کے لیے اسلام کا ترجمان ہے۔ تاہم پاکستان نسبتاً غریب ہے، سنگین داخلی نسلی و علاقائی گروہ بندیوں کا شکار ہے، سیاسی عدم استحکام کی تاریخ رکھتا ہے اور بھارت کے ساتھ تحفظ و سلامتی کے مسئلے میں الجھا ہوا ہے، جو بڑی حد تک دوسرے اسلامی ملکوں نیز چین اور امریکا جیسی غیر مسلم طاقتوں سے قریبی تعلقات بڑھانے میں اس کی دلچسپی کا سبب ہے۔

سعودی سرزمین اسلام کا اصل منبع ہے۔ اسلام کے مقدس ترین مقامات وہیں ہیں۔ اس کی زبان اسلام کی زبان ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر کا مالک ہے اور اس کے نتیجے میں مالیاتی اثر ورسوخ رکھتا ہے۔ اس کی حکومت نے سعودی معاشرے کو سخت اسلامی خطوط پر ڈھالا ہے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں کے دوران سعودی عرب اسلام کی بااثر ترین قوت تھا۔ اس نے پوری دنیا میں مساجد اور نصاب کی کتابوں سے لے کر سیاسی جماعتوں، اسلامی تنظیموں اور دہشت گرد تحریکوں تک مسلم مقاصد پر اربوں ڈالر خرچ کیے اور ایسا کرنے میں زیادہ تر بلاامتیاز اقدامات کیے۔ دوسری جانب اس کی نسبتاً کم آبادی اور جغرافیائی طور پر کمزور محل وقوع اسے اپنی حفاظت کے لیے مغرب پر انحصار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

آخر میں ترکی کی تاریخ، آبادی، اوسط درجے کی معاشی ترقی، قومی ہم آہنگی اور فوجی روایت و صلاحیت اس کے اسلام کی مرکزی ریاست ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ تاہم اتاترک نے ترکی کو واضح طور پر سیکولر معاشرہ بنانے کی کوشش کی اور ترک جمہوریہ کو سلطنت عثمانیہ کا اسلامی دنیا کی مرکزی ریاست کا کردار اختیار نہیں کرنے دیا۔ ترکی اپنے آئین میں سیکولرزم سے وابستگی کے باعث او آئی سی کا چارٹر رکن تک نہیں بن سکا۔ جب تک ترکی خود کو سیکولر ریاست قرار دیتا رہے گا، اسے اسلام کی قیادت نہیں مل سکتی۔

لیکن اگر ترکی نے اپنی پہچان ازسرنو متعین کی تو؟ کسی موقعے پر ترکی اپنے اس پریشان کن اور ذلت آمیز کردار کو ترک کرسکتا ہے کہ بھکاری کی طرح مغرب کی رکنیت کی درخواست کرتا رہے،

اور اسلامی ترجمان اور مغرب کے مخالف کا اپنا کہیں زیادہ متاثر کن اور بلند تاریخی کردار اپنا سکتا ہے۔ ترکی میں بنیاد پرستی میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اوزال کے دور میں ترکی نے خود کو عرب دنیا کے ساتھ شناخت کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر کوششیں کیں۔ وسط ایشیا میں تھوڑا بہت کردار ادا کرنے کے لیے اس نے اپنے نسلی ولسانی روابط سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس نے بوسنیائی مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور حمایت کی ہے۔ مسلمان ملکوں میں ترکی کی حیثیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کے بلقان، مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ اور وسط ایشیا میں وسیع تاریخی روابط رہے ہیں۔ یہ سوچا جاسکتا ہے کہ ترکی جنوبی افریقہ جیسا کردار ادا کرسکے یعنی سیکولرزم کو ترک کردے جیسے جنوبی افریقہ نسل پرستی کی پالیسی ترک کرکے اپنی تہذیب کی اچھوت ریاست کی بجائے اس کی صف اول کی ریاست بن گیا ہے۔ عیسائیت اور نسل پرستی کی شکل میں مغرب کے خیر وشر کا تجربہ کرنے کے بعد ملک جنوبی افریقہ براعظم افریقہ کی رہبری کا عجیب انداز میں اہل ہوگیا ہے؛ سیکولرزم اور جمہوریت کی صورت میں مغرب کے خیر وشر کے تجربے کے بعد ممکن ہے ترکی بھی اسلام کی رہبری کا اتنا ہی اہل ہوگیا ہو۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے اسے اتاترک کا ورثہ اس سے بھی زیادہ بھرپور طریقے سے مسترد کرنا پڑے گا جتنا روس نے لینن کے ورثے کو کیا ہے۔ اس کے لیے اتاترک جیسے بلند قامت رہنما کی ضرورت ہوگی، ایسا رہنما جو ترکی کو مقطوع ملک سے مرکزی ریاست بنانے کے لیے مذہبی اور سیاسی جواز رکھتا ہو۔

حصہ چہارم

تہذیبوں کے تصادم

آٹھواں باب

مغرب اور دیگر: بین التہذیبی مسائل

مغربی آفاقیت

ابھرتی ہوئی دنیا میں ریاستوں اور مختلف تہذیبوں کے گروہوں کے درمیان تعلقات قریبی نہیں ہوں گے اور اکثر مخاصمانہ ہوں گے۔ بعض بین التہذیبی روابط میں تنازعے پیدا کرنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ جزئیاتی سطح پر سب سے تشدد آمیز رخنے اسلام اور اس کے آرتھوڈوکس، ہندو، افریقی اور مغربی عیسائی پڑوسیوں کے درمیان ہیں۔ کلیاتی سطح پر سب سے اہم تقسیم ''مغرب اور دیگر'' کے درمیان ہے جس میں سب سے شدید تنازعات مسلمانوں اور ایشیائی معاشروں کے مغرب سے ہیں۔ مستقبل کے خطرناک تصادم کے واقعات مغربی غرور، مسلمانوں کی عدم برداشت اور چینی جارحانہ رویے کے نتیجے میں ہونے کا امکان ہے۔

مغرب واحد تہذیب ہے جس نے ہر دوسری تہذیب پر گہرا اور بعض اوقات تباہ کن اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ مغرب کی قوت و ثقافت اور دوسری تہذیبوں کی قوت و ثقافت کے درمیان تعلق تہذیبوں کی دنیا کی سب سے زیادہ پائی جانے والی خاصیت ہے۔ دوسری تہذیبوں کی قوت بڑھنے کے ساتھ مغربی ثقافت کی کشش مدھم پڑ رہی ہے اور غیر مغربی اقوام کا اپنی مقامی ثقافت پر اعتماد اور اس سے وابستگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پس مغرب اور بقیہ تہذیبوں کے درمیان تعلق میں مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ مغرب، خصوصاً امریکا کی ایک آفاقی مغربی ثقافت رائج کرنے کی کوشش اور ایسا کرنے کی زوال

پذیر صلاحیت کے درمیان عدم مطابقت ہے۔

کمیونزم کے انہدام نے اس عدم مطابقت کو اس لیے اور بھی شدید کر دیا کہ مغرب میں اس خیال نے زور پکڑا کہ اس کا جمہوری لبرل ازم کا نظریہ عالمی سطح پر کامیاب رہا ہے، لہٰذا آفاقی سچائی کا حامل ہے۔ اہلِ مغرب، اور علی الخصوص امریکا جو ہمیشہ مبلغ قوم رہی ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مغربی اقوام کو جمہوریت، آزاد معیشتی، محدود حکومت، انسانی حقوق، فرد پسندی اور قانون کی حکمرانی کی مغربی اقدار سے وابستگی اختیار کرنی چاہیے اور ان اقدار کو اپنے اداروں میں شامل کرنا چاہیے۔ دوسری تہذیبوں کی اقلیتیں اِن اقدار کو اپناتی اور فروغ دیتی ہیں لیکن غیر مغربی ثقافتوں میں زیادہ تر ان اقدار کو شک وشبہے کی نگاہ سے دیکھنے سے لے کر سخت مخالفت تک مختلف نوعیت کے رویے اختیار کیے جاتے ہیں۔ جو چیز مغرب کی نظر میں آفاقیت ہے وہ دوسروں کے لیے سامراجیت ہے۔

مغرب اپنا ممتاز مقام برقرار رکھنے اور اپنے مفادات کو ''عالمی برادری'' کے مفادات قرار دے کر ان کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ ''عالمی برادری'' کی اصطلاح (جو ''آزاد دنیا'' کی جگہ استعمال ہونا شروع ہوئی ہے) امریکا اور دوسری مغربی طاقتوں کے مفادات کی عکاسی کرنے والے اقدامات کو عالمی جواز فراہم کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مغرب، غیر مغربی معاشروں کی معیشتوں کو اُس عالمی اقتصادی نظام میں جس پر وہ چھایا ہوا ہے شامل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آئی ایم ایف اور دوسرے بین الاقوامی اقتصادی اداروں کے ذریعے مغرب اپنے معاشی مفادات کو فروغ دیتا ہے اور جو اقتصادی پالیسیاں مناسب سمجھتا ہے ان پر تھوپتا ہے۔ غیر مغربی اقوام کا کوئی بھی سروے کرا لیا جائے، آئی ایم ایف بلاشبہ وزراء خزانہ اور چند دیگر لوگوں کی حمایت حاصل کرے گا مگر تقریباً ہر دوسرا شخص اس کی مخالفت کرے گا اور آئی ایم ایف کے عہدیداروں کے بارے میں جارجی آرباتوف کے ان الفاظ سے اتفاق کرے گا کہ یہ لوگ ''نوبالشویکی [ہیں] جو دوسروں کے پیسے کو سرکاری استعمال میں لانا، اقتصادی اور سیاسی برتاؤ کے غیر جمہوری اور اجنبی اصول نافذ کرنا اور معاشی آزادی کا گلا گھونٹنا بہت پسند کرتے ہیں''۔[۱]

غیر مغربی افراد مغربی اصول اور مغربی عمل کے درمیان فرق کی نشاندہی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ آفاقیت کے دعووں کی قیمت منافقت، دہرے معیار اور ''لیکن... نہیں'' ہیں۔ جمہوریت کو فروغ دیا جاتا ہے لیکن اسلامی بنیاد پرست اقتدار میں آ جائیں تب نہیں؛ جوہری عدم پھیلاؤ کی تبلیغ ایران اور عراق کے لیے کی جاتی ہے لیکن اسرائیل کے لیے نہیں؛ آزاد تجارت اقتصادی نمو کے لیے آبِ حیات ہے لیکن زراعت کے لیے نہیں؛ انسانی حقوق چین کے لیے مسئلہ

ہیں لیکن سعودی عرب کے لیے نہیں؛ تیل کے مالک کویتیوں کے خلاف جارحیت کو پوری قوت سے دبا دیا جاتا ہے لیکن تیل سے محروم بوسنیائیوں کے خلاف نہیں۔ اصول کے آفاقی معیاروں کی قیمت عمل کے دہرے معیاروں کی صورت میں لازماً ادا کرنی پڑتی ہے۔

سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد غیر مغربی معاشرے مغرب کی معاشی، فوجی اور ثقافتی بالادستی سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ مشرقی ایشیائی معاشرے اقتصادی میدان میں مغرب کی ہمسری کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ ایشیائی اور اسلامی ممالک فوجی قوت میں مغرب کی طاقت کے خلاف توازن پیدا کرنے کے لیے مختصر راستے تلاش کر رہے ہیں۔ مغربی تہذیب کے آفاقیت کے عزائم، مغرب کی زوال پذیر قوت اور دیگر تہذیبوں کے بڑھتے ہوئے ثقافتی اثبات کی وجہ سے مغرب اور دیگر کے مابین دشوار تعلقات یقینی ہو گئے ہیں۔ ان تعلقات کی نوعیت اور ان کے مخالفانہ ہونے کی حد مختلف مقامات پر مختلف ہے اور اسے تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ للکارنے یا چیلنج کرنے والی تہذیبوں اسلام اور چین کے معاملے میں امکان یہ ہے کہ مغرب کے تعلقات مسلسل کشیدہ اور اکثر انتہائی مخاصمانہ رہیں گے۔ لاطینی امریکا اور افریقہ کے معاملے میں جو نسبتاً کمزور تہذیبیں ہیں اور کسی حد تک مغرب پر انحصار کرتی رہی ہیں، تعلقات میں اتنے تصادم نہیں ہوں گے خاص طور پر لاطینی امریکا کے ساتھ۔ روس، جاپان اور بھارت سے مغرب کے تعلقات مذکورہ دونوں گروپوں کے بین بین ہوں گے یعنی ان میں تعاون اور تصادم دونوں کے عناصر ہوں گے اور یہ تینوں مرکزی ریاستیں بعض اوقات چیلنج کرنے والی تہذیبوں کا ساتھ دیں گی اور بعض اوقات مغرب کا۔ یہ مغرب اور اسلامی و صینی تہذیبوں کے مابین ''جھولتی ہوئی'' تہذیبیں ہیں۔

اہلِ اسلام اور چین کی عظیم ثقافتی روایات ہیں جو مغرب سے بہت مختلف اور اُن کی نظر میں مغرب سے کہیں برتر ہیں۔ مغرب کے مقابلے میں ان دونوں کی قوت اور اپنا اثبات کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور ان دونوں کی اقدار اور مفادات کے مابین تنازعات کی تعداد اور شدت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چونکہ اسلام کی کوئی مرکزی ریاست نہیں اس لیے اس کے مغرب سے تعلقات مختلف ملکوں میں مختلف ہیں۔ تاہم ۱۹۷۰ء کے عشرے سے خاصا مستقل مغرب دشمن میلان نظر آ رہا ہے جس میں بنیاد پرستی کا ابھرنا، مسلمان ملکوں میں اقتدار مغرب نوازوں سے مغرب دشمنوں کے ہاتھ میں آنا، بعض اسلامی گروپوں اور مغرب کے درمیان نیم جنگ کی کیفیت پیدا ہونا اور مسلمان ریاستوں اور امریکا کے مابین سرد جنگ کے زمانے کی سلامتی کے روابط کا کمزور ہو جانا شامل ہیں۔ مخصوص مسائل پر اختلافات کی تہہ میں یہ سوال پوشیدہ ہے کہ یہ تہذیبیں دنیا کے مستقبل کی

صورت پذیری میں مغرب کے مقابلے میں کیا کردار ادا کریں گی۔ کیا اکیسویں صدی میں عالمی ادارے، طاقت کی تقسیم اور اقوام کی سیاست اور معیشت مغربی اقدار و مفادات کی آئینہ دار ہوں گی یا اسلام اور چین کے ہاتھوں تشکیل پائیں گی؟

بین الاقوامی تعلقات کا حقیقت پسندانہ نظریہ یہ پیشگوئی کرتا ہے کہ غیر مغربی تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں مغرب کی غالب قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے باہم مدغم ہوسکتی ہیں۔ بعض شعبوں میں یہ ہوا بھی ہے۔ تاہم کسی عمومی مغرب مخالف اتحاد کے بننے کا مستقبل قریب میں امکان دکھائی نہیں دیتا۔ اسلام اور صینی تہذیبیں مذہب، معاشرتی ڈھانچے، روایات، سیاست اور طرز حیات کی جڑوں کے بارے میں بنیادی مفروضات پر آپس میں اختلاف رکھتی ہیں۔ داخلی طور پر غالباً ان میں مشترکہ عناصر اس سے بھی کم ہیں جتنے ان میں سے ہر ایک کے مغربی تہذیب کے ساتھ ہیں۔ تاہم سیاست میں مشترکہ دشمن مشترکہ مفاد پیدا کر دیتا ہے۔ اسلامی اور صینی معاشرے جو مغرب کو دشمن کے طور پر دیکھتے ہیں، اس کے خلاف ایک دوسرے سے تعاون کر سکتے ہیں، جیسے اتحادیوں اور اسٹالن نے ہٹلر کے خلاف کیا تھا۔ یہ تعاون مختلف و متنوع مسائل پر ہوسکتا ہے جن میں انسانی حقوق، معاشیات اور سب سے بڑھ کر دونوں معاشروں کی اپنی فوجی صلاحیتیں، خصوصاً بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار اور انہیں استعمال کرنے کے لیے میزائل بنانے کی کوششیں شامل ہیں تاکہ وہ مغرب کی روایتی فوجی برتری کا مقابلہ کرسکیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل تک ان مسائل پر مغرب کا مقابلہ کرنے کے لیے چین اور شمالی کوریا کا مختلف درجوں میں پاکستان، ایران، عراق، شام، لیبیا اور الجزائر کے ساتھ ایک ''کنفیوشین اسلامی ربط'' قائم ہو چکا تھا۔

مغرب اور دوسرے معاشروں کو تقسیم کرنے والے مسائل بین الاقوامی ایجنڈے پر اہم سے اہم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے تین مسائل کا تعلق مغربی کوششوں سے ہے: (۱) جوہری عدم پھیلاؤ اور جوہری، حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں اور ان کے استعمال کے وسائل کے پھیلاؤ کی مخالف پالیسیوں کے ذریعے اپنی فوجی بالادستی برقرار رکھنا؛ (۲) دوسرے معاشروں کو مغرب کے تصورات کے مطابق انسانی حقوق کے احترام اور مغربی خطوط پر جمہوریت اختیار کرنے پر مجبور کرنے کی خاطر مغربی سیاسی اقدار اور اداروں کا فروغ؛ اور (۳) تارکین یا پناہ گزینوں کی تعداد محدود کر کے مغربی معاشروں کی ثقافتی، معاشرتی اور نسلی سالمیت کو تحفظ دینا۔ ان تینوں شعبوں میں مغرب کو غیر مغربی معاشروں کے خلاف اپنے مفادات کا دفاع کرنے میں دشواریاں پیش آئی ہیں اور آتے رہنے کا امکان ہے۔

ہتھیاروں کا پھیلاؤ

فوجی صلاحیتوں کا نفوذ عالمی معاشی و معاشرتی ترقی کا نتیجہ ہے۔ جاپان، چین اور دیگر ایشیائی ممالک اقتصادی طور پر امیر ہونے کے ساتھ فوجی اعتبار سے طاقتور بھی ہوتے جا رہے ہیں اور اسلامی معاشرے بھی آخر کار ہوں گے۔ اسی طرح روس بھی ہوگا اگر وہ اپنی معیشت کی اصلاح میں کامیاب رہا۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں میں متعدد غیر مغربی اقوام نے مغربی معاشروں، روس، اسرائیل اور چین سے اسلحے کی منتقلی کے ذریعے جدید ترین ہتھیار حاصل کر لیے ہیں۔ یہ عمل اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں جاری رہے گا بلکہ غالباً تیز ہوگا۔ بہرحال اس صدی میں آگے جا کر مغرب، جس کا مطلب امریکا اور کسی حد تک برطانیہ اور فرانس ہیں، تنہا اس قابل ہوگا کہ دنیا کے تقریباً کسی بھی حصے میں فوجی مداخلت کر سکے۔ اور صرف امریکا ہی اس قدر فضائی قوت رکھتا ہوگا کہ دنیا کے تقریباً کسی بھی علاقے میں بمباری کر سکے۔ یہ عالمی طاقت کی حیثیت سے امریکا کے، اور دنیا کی غالب تہذیب کی حیثیت سے مغرب کے فوجی مقام کے مرکزی عناصر ہیں۔ مستقبل قریب میں مغرب اور بقیہ تہذیبوں کے مابین روایتی فوجی قوت کا توازن مغرب کے حق میں بہت زیادہ جھکا ہوا ہوگا۔

بہترین روایتی فوجی صلاحیت حاصل کرنے میں جو وقت، کاوش اور خرچ درکار ہوتا ہے اس کی وجہ سے غیر مغربی ریاستوں کے لیے بے انتہا ترغیبات موجود ہیں کہ مغربی روایتی فوجی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کریں۔ آسان ترین راستہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار اور ان کے استعمال کرنے کے وسائل حاصل کر لیے جائیں۔ تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں اور خطے میں غالب قوت بننے کے عزائم رکھنے والے ممالک میں بطور خاص ان ہتھیاروں کے حصول کے لیے رغبت پائی جاتی ہے۔ یہ ہتھیار اول تو ان ملکوں کو اپنی تہذیب اور خطے کی دوسری ریاستوں پر بالادستی قائم کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ دوم، امریکا یا کسی اور بیرونی طاقت کی جانب سے اپنی تہذیب اور خطے میں مداخلت روکنے کے وسائل فراہم کرتے ہیں۔ اگر صدام حسین نے دو یا تین سال تک کے لیے اس وقت تک کویت پر حملہ ملتوی کر دیا ہوتا جب تک عراق کے پاس جوہری ہتھیار نہ آجاتے تو امکان یہ ہے کہ وہ کویت پر قابض ہوتا اور شاید سعودی تیل کے ذخائر پر بھی۔ غیر مغربی ریاستوں نے جنگ خلیج سے واضح سبق حاصل کیا ہے۔ شمالی کوریائی فوج کے لیے وہ سبق یہ تھا: ''امریکیوں کو اپنی فوجیں اکٹھا نہ کرنے دو؛ انہیں فضائی قوت نہ لانے دو؛ انہیں پہل نہ کرنے دو؛ انہیں کم امریکی ہلاکتوں والی جنگ نہ لڑنے دو۔'' ایک اعلیٰ بھارتی عہدیدار کے لیے یہ سبق اور بھی واضح تھا: ''امریکا سے نہ لڑو تاوقتیکہ تمہارے پاس جوہری ہتھیار نہ ہوں''۔[۲] پوری غیر مغربی دنیا میں

سیاسی رہنماؤں اور فوجی سربراہوں نے یہ بات پلّو سے باندھ لی ہے جس کے ساتھ ہی ایک قابل یقین ضمنی بات اور بھی ہے: ''اگر تمہارے پاس جوہری ہتھیار ہوں تو امریکا تم سے نہیں لڑے گا۔''

لارنس فریڈ مین کا تبصرہ ہے کہ ''جوہری اسلحے نے طاقت کی سیاست کو تقویت دینے کی بجائے بین الاقوامی نظام کو ٹکڑوں میں بانٹنے کا رجحان پیدا کیا ہے جس میں سابق بڑی طاقتوں کا کردار کم ہوگیا ہے۔'' لہٰذا مابعد سرد جنگ کی دنیا میں مغرب کے لیے جوہری ہتھیاروں کا کردار سرد جنگ کے زمانے کے برعکس ہے۔ پھر جیسا کہ وزیر دفاع لیس ایسپن نے نشاندہی کی، جوہری ہتھیاروں نے سوویت یونین کے مقابلے میں مغرب کے روایتی اسلحے کی کمتری کی تلافی کردی۔ یہ ہتھیار ''برابری پیدا کرنے والی چیز'' تھے۔ تاہم مابعد سرد جنگ کی دنیا میں امریکا'' کی روایتی فوجی طاقت کا کوئی ہمسر نہیں اور ہمارے ممکنہ حریف ہیں جو جوہری ہتھیار حاصل کرسکتے ہیں۔ آخر میں یہ ہم ہوں گے جن کی برابری کی جائے گی''۔[3]

پس یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ روس نے اپنی دفاعی منصوبہ بندی میں جوہری اسلحے کے کردار پر زور دیا ہے اور ۱۹۹۵ء میں یوکرین سے اضافی بین البراعظمی میزائل اور بمبار طیارے خریدنے کے انتظامات کیے ہیں۔ اسلحے کے ایک امریکی ماہر نے تبصرہ کیا کہ ''ہم وہ بات سن رہے ہیں جو ہم ۱۹۵۰ء کی دہائی میں روسیوں کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ اب روسی کہہ رہے ہیں: 'ہمیں ان کی روایتی ہتھیاروں کی برتری کی تلافی کے لیے جوہری ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔''' اس کے برعکس سرد جنگ کے دوران امریکا مزاحمتی (deterrent) جوہری اسلحے کے استعمال میں پہل کے حق سے دستبردار ہونے سے منکر تھا۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں جوہری ہتھیاروں کے نئے مزاحمتی مقاصد کے پیش نظر روس نے ۱۹۹۳ء میں استعمال میں پہل نہ کرنے کے سابق سوویت عہد کو عملاً مسترد کردیا۔ ساتھ ہی چین نے بھی مابعد سرد جنگ کی دنیا میں محدود مزاحمت کی نئی جوہری حکمت عملی تشکیل دینے کے دوران اپنے ۱۹۶۴ء کے استعمال میں پہل نہ کرنے کے عہد پر تنقید کرنا اور اسے کمزور کرنا شروع کردیا۔[4] دوسری مرکزی ریاستیں اور علاقائی طاقتیں بھی جوں جوں جوہری اور بڑے پیمانے پر تباہی کے دوسرے ہتھیار حاصل کررہی ہیں، امکان ہے کہ ان مثالوں کی پیروی کریں گی تاکہ اپنے خلاف مغرب کی روایتی اسلحے کی فوجی کارروائی پر ان ہتھیاروں کا اثر زیادہ سے زیادہ ڈال سکیں۔

جوہری ہتھیار مغرب کے لیے زیادہ بلاواسطہ انداز میں بھی خطرہ بن سکتے ہیں۔ چین اور روس کے پاس جو بیلسٹک میزائل ہیں وہ جوہری اسلحہ لے کر یورپ اور شمالی امریکا پہنچ سکتے ہیں۔ شمالی کوریا، پاکستان اور بھارت اپنے اپنے میزائلوں کی حدود بڑھا رہے ہیں اور کسی موقعے پر ان میں

مغرب کو نشانہ بنانے کی صلاحیت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں جوہری اسلحہ دوسرے ذرائع سے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فوجی تجزیہ کاروں نے تشدد کی کارروائیوں کو ایک طیف کی شکل دی ہے جس میں بہت کم شدت کی جنگ، مثلاً دہشت گردی اور ہلکی چھاپہ مار لڑائی، سے لے کر محدود جنگیں، پھر بھاری روایتی افواج والی بڑی جنگیں اور آخر میں جوہری جنگ تک شامل ہیں۔ دہشت گردی تاریخی طور پر کمزوروں کا ہتھیار رہا ہے یعنی وہ لوگ جن کے پاس روایتی فوجی قوت نہ ہو۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کمزور فریق اپنی روایتی ہتھیاروں کے فقدان کی تلافی جوہری اسلحے سے بھی کر رہے ہیں۔ ماضی میں دہشت گرد تشدد کی محدود کارروائیاں ہی کر سکتے تھے، کہیں چند افراد کو ہلاک کر دیا اور کہیں کوئی عمارت تباہ کر دی۔ بھاری نقصان پہنچانے کے لیے بھاری افواج درکار تھیں۔ لیکن کسی مرحلے بھی چند دہشت گرد بڑے پیمانے پر تشدد کی کارروائی کرنے اور بڑی تباہی کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ دہشت گردی اور جوہری ہتھیار غیر مغربی کمزوروں کے الگ الگ ہتھیار ہیں۔ اگر یہ مل گئے تو غیر مغربی کمزور مضبوط ہو جائیں گے۔

مابعد سرد جنگ کی دنیا میں بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار اور ان کو استعمال کرنے کے وسائل تیار کرنے کی کوششیں زیادہ تر اسلامی اور کنفیوشین ریاستوں میں ہوتی رہی ہیں۔ پاکستان اور ممکنہ طور پر شمالی کوریا کے پاس جوہری ہتھیاروں کی تھوڑی سی تعداد یا کم از کم انہیں تیزی سے تیار کرنے کی صلاحیت موجود ہے، اور وہ ان ہتھیاروں کو ہدف پر پہنچانے کے لیے طویل فاصلوں تک مار کرنے والے میزائل بھی حاصل یا تیار کر رہے ہیں۔ عراق کے پاس کیمیائی جنگ کی خاصی صلاحیت تھی اور وہ حیاتیاتی اور جوہری ہتھیاروں کے حصول کے لیے بڑی کوششیں کر رہا تھا۔ ایران جوہری ہتھیار بنانے کا وسیع پروگرام رکھتا ہے اور انہیں ہدف تک پہنچانے کی صلاحیت میں اضافہ کر رہا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں صدر رفسنجانی نے اعلان کیا کہ ایرانیوں کو ''کیمیائی، بیکٹیریائی اور ریڈیالوجیکل ہتھیاروں کے جارحانہ اور مدافعانہ دونوں اقسام کے استعمال کی بھرپور صلاحیت حاصل کرنی چاہیے۔'' تین سال بعد ان کے نائب صدر نے ایک اسلامی کانفرنس میں کہا ''چونکہ اسرائیل کے پاس بدستور جوہری اسلحہ ہے، اس لیے ہم مسلمانوں کو اقوام متحدہ کی جوہری عدم پھیلاؤ کی کوششوں کے باوجود جوہری بم بنانے کے لیے باہم تعاون کرنا چاہیے۔'' ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء میں امریکی سراغرساں اداروں کے اعلیٰ عہدیداروں نے کہا کہ ایران جوہری ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ۱۹۹۵ء میں وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر نے صاف کہہ دیا کہ ''آج ایران جوہری اسلحہ بنانے کے لیے ہنگامی کوششیں کر رہا ہے۔'' جو دیگر مسلمان ممالک جوہری ہتھیاروں کے حصول کے لیے

کوشاں بتائے جاتے ہیں ان میں لیبیا، الجزائر اور سعودی عرب شامل ہیں۔علی مزروئی کے رنگا رنگ استعارے میں بیان کیا جائے تو ''کھمبی نما بادل☆ کے اوپر ہلال'' نظر آ رہا ہے اور مغرب کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔ اس کا انجام یہ ہو سکتا ہے کہ اسلام'' دو دیگر ریاستوں کے ساتھ جوہری جوا کھیل رہا ہو-- جنوبی ایشیا میں ہندومت کے ساتھ اور مشرق وسطیٰ میں صیہونیت اور سیاست زدہ یہودیت کے ساتھ''۔[5]

کنفیوشین اور مسلمان ریاستوں کے مابین سب سے وسیع اور سب سے ٹھوس تعلقات ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے شعبے میں ہیں اور چین متعدد مسلمان ملکوں کو روایتی وغیر روایتی ہتھیار منتقل کرنے میں مرکزی کردار ادا کر رہا ہے۔ منتقلی کی ان کارروائیوں میں مندرجہ ذیل شامل ہیں: الجزائر کے صحرا میں ایک خفیہ جوہری ری ایکٹر کی تعمیر جس کی انتہائی حفاظت کی جاتی ہے اور جو بظاہر تحقیق کے لیے ہے لیکن مغربی ماہرین زیادہ تر اسے پلوٹونیم پیدا کرنے کا اہل سمجھتے ہیں؛ لیبیا کو کیمیائی ہتھیاروں کی فروخت؛ سعودی عرب کو درمیانی مار کے سی ایس ایس ٹو میزائلوں کی فراہمی؛ عراق، لیبیا، شام اور شمالی کوریا کو جوہری ٹیکنالوجی یا سامان دینا؛ اور عراق کو بڑی تعداد میں روایتی ہتھیار منتقل کرنا۔ چین کی جانب سے ان اقدامات کے علاوہ شمالی کوریا نے ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں شام کو ایران کے راستے اسکڈ سی میزائل اور پھر ان کو چلانے کے لیے موبائل چیسس فراہم کیے۔[6]

کنفیوشین اسلامی اسلحہ منتقلی کے تعلق میں مرکزی حیثیت چین کی اور کسی حد تک شمالی کوریا کا پاکستان اور ایران سے سمبندھ ہے۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۱ء کے درمیان سب سے زیادہ چینی اسلحہ وصول کرنے والے دو ممالک ایران اور پاکستان تھے اور دوسرے نمبر پر عراق تھا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے سے چین اور پاکستان کے مابین جو تعلق شروع ہوا وہ انتہائی قریبی فوجی روابط پر منتج ہوا۔ ۱۹۸۹ء میں دونوں ملکوں نے ''خریداری، مشترکہ تحقیق و ترقی، مشترکہ پیداوار، ٹیکنالوجی کی منتقلی نیز باہمی اتفاق سے کسی تیسرے ملک کو برآمد میں [فوجی] تعاون'' کے لیے مفاہمت کی دس سالہ یادداشت پر دستخط کیے۔ ایک اور ضمنی معاہدے پر ۱۹۹۳ء میں دستخط ہوئے جس کے تحت چین پاکستان کو ہتھیاروں کی خریداری کے لیے قرضے فراہم کرے گا۔ نتیجتاً چین ''پاکستان کو فوجی سامان کا معتبر ترین اور سب سے بڑا فراہم کنندہ [بن گیا] جو پاکستانی فوج کے ہر شعبے کے لیے تقریباً ہر قسم کی فوجی برآمدات مہیا کر رہا'' ہے۔ چین نے جیٹ طیارے، ٹینک، توپخانہ اور میزائل بنانے کی سہولتیں بھی پاکستان کو

☆ نوٹ از مترجم: کھمبی نما بادل (mushroom cloud) گرد و غبار کی وہ شکل جو جوہری دھماکے کے نتیجے میں بنتی ہے۔

دیں۔ اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ چین نے پاکستان کو جوہری اسلحے کی صلاحیت پیدا کرنے میں مدد دی۔ اس نے مبینہ طور پر پاکستان کو افزودگی کے لیے یورینیم مہیا کیا، بم کے ڈیزائن پر مشاورت دی اور شاید پاکستان کو ایک چینی مقام پر جوہری ہتھیار کا دھاکا کرنے کی بھی اجازت دی۔ پھر چین نے پاکستان کو ۳۰۰ کلومیٹر تک جوہری ہتھیار لے جانے والے ایم ۱۱ میزائل فراہم کیے اور اس عمل میں امریکا سے کیا ہوا ایک وعدہ توڑا۔ اس کے عوض چین نے پاکستان سے فضا میں ایندھن بھرنے کی ٹیکنالوجی اور اسٹنگر میزائل حاصل کیے۔

۱۹۹۰ء کے عشرے تک چین اور ایران کے درمیان بھی اسلحے کے حوالے سے گہرے تعلقات ہو چکے تھے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کی ایران عراق جنگ کے دوران ایران کو ملنے والے ۲۲ فیصد ہتھیار چین نے مہیا کیے اور ۱۹۸۹ء میں وہ ایران کو ہتھیاروں کا سب سے بڑا فراہم کنندہ بن گیا۔ چین نے ایران کی جانب سے جوہری اسلحے کے حصول کی کھلم کھلا کوششوں میں بھی سرگرمی سے مدد کی ہے۔ دونوں ملکوں نے ''ایک ابتدائی چینی ایرانی معاہدۂ تعاون'' پر دستخط کے بعد جنوری ۱۹۹۰ء میں سائنسی تعاون اور فوجی ٹیکنالوجی کی منتقلی کی دس سالہ مفاہمت پر اتفاق کیا۔ ستمبر ۱۹۹۲ء میں صدر رفسنجانی نے ایران کے جوہری ماہرین کے ہمراہ پاکستان کا دورہ کیا اور پھر وہ چین گئے جہاں انہوں

جدول ۸ء۱
چین کی جانب سے اسلحے کی منتقلی، منتخب واقعات، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۱ء

	ایران	پاکستان	عراق
لڑاکا ٹینک	۵۴۰	۱۱۰۰	۱۳۰۰
بکتر بند گاڑیاں	۳۰۰	—	۶۵۰
ٹینک شکن گائیڈڈ میزائل	۷۵۰۰	۱۰۰	—
توپخانہ/راکٹ لانچر	*۱۲۰۰	۵۰	۷۲۰
لڑاکا طیارے	۱۴۰	۲۱۲	—
بحری جہاز شکن میزائل	۳۳۲	۳۲	—
سطح سے فضا میں مار کرنے والے میزائل	*۷۸۸	*۲۲۲	—

*اسلحے کی حوالگی کے غیر توثیق شدہ واقعات بھی شامل ہیں۔

ماخذ: کارل ڈبلیو ایکن بیری Explaining and Influencing Chinese Arms Transfers (واشنگٹن: نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ فار نیشنل اسٹرے ٹیجک اسٹڈیز مک نائر پیپر نمبر ۳۶، فروری ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۲۔

نے جوہری تعاون کے لیے ایک اور معاہدے پر دستخط کیے اور فروری ۱۹۹۳ء میں چین ایران میں ۳۰۰ میگاواٹ کے دو جوہری ری ایکٹر لگانے پر رضامند ہوا۔ ان معاہدوں کے تحت چین نے ایران کو جوہری ٹیکنالوجی اور معلومات منتقل کیں، ایرانی سائنسدانوں اور انجینئروں کو تربیت دی اور ایران کو کیلوٹران☆ فراہم کیا۔ ۱۹۹۵ء میں امریکا کے مستقل دباؤ کے بعد چین ۳۰۰ میگاواٹ کے دو ری ایکٹروں کی فروخت کا سودا، امریکا کے مطابق ''منسوخ'' اور چین کے مطابق ''معطل'' کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ چین ایران کو میزائلوں اور میزائل ٹیکنالوجی کا بھی بڑا فراہم کنندہ تھا جن میں ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں دیے جانے والے سلک ورم میزائل، جو شمالی کوریا کے توسط سے پہنچائے گئے اور ۹۵-۱۹۹۴ء میں دیے گئے ''درجنوں بلکہ شاید سیکڑوں میزائل گائیڈنس نظام اور کمپیوٹرائزڈ آلات'' شامل ہیں۔ چین نے ایران میں سطح سے سطح پر مار کرنے والے چینی میزائلوں کی تیاری کی بھی اجازت دی۔ شمالی کوریا نے اس امداد میں یہ اضافہ کیا کہ ایران کو اسکڈ پہنچائے، ایران کو اپنے پیداواری اداروں کو بہتر بنانے میں مدد دی اور پھر ۱۹۹۳ء میں ایران کو اپنے ۶۰۰ میل مار والے نوڈونگ اول میزائل فراہم کرنے پر راضی ہوگیا۔ اس مثلث کے تیسرے ضلع پر ایران اور پاکستان نے بھی جوہری میدان میں وسیع تعاون کیا، پاکستان نے ایرانی سائنسدانوں کو تربیت دی اور پاکستان، ایران اور چین نے نومبر ۱۹۹۲ء میں جوہری منصوبوں پر اکٹھے کام کرنے پر اتفاق کیا۔[۸] پاکستان اور ایران کو بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار بنانے میں چین کی اتنی زیادہ امداد ظاہر کرتی ہے کہ ان ملکوں کے مابین باہم تعاون اور وابستگی غیر معمولی سطح کی ہے۔

ان حالات اور ان کے باعث مغربی مفادات کو درپیش خطرات کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا مسئلہ مغرب کے تحفظ و سلامتی کے ایجنڈے پر سرفہرست آگیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۰ء میں ۵۹ فیصد امریکی عوام یہ سمجھتے تھے کہ جوہری اسلحے کو پھیلنے سے روکنا خارجہ پالیسی کا اہم ہدف ہے۔ ۱۹۹۴ء میں یہ رائے ۸۲ فیصد عوام اور ۹۰ فیصد خارجہ پالیسی کے رہنماؤں کی تھی۔ صدر کلنٹن نے ستمبر ۱۹۹۳ء میں عدم پھیلاؤ کی ترجیح کو اجاگر کیا اور ۱۹۹۴ء کے موسم خزاں میں ''جوہری، حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں اور ان کو استعمال کرنے کے وسائل کے پھیلاؤ'' کے باعث ''امریکا کی قومی سلامتی، خارجہ پالیسی اور معیشت کو درپیش غیر معمولی خطرے'' سے نمٹنے کے لیے ''ملک گیر ہنگامی حالت'' کا اعلان کردیا۔ ۱۹۹۱ء میں سی آئی اے نے سورکنی عملے

☆ نوٹ از مترجم: کیلوٹران (calutron)، ایک آلہ جو یورینیم کے ہم جاؤں کو یورینیم کچ دھات سے علیحدہ کرتا ہے۔

پر مشتمل ایک ''عدم پھیلاؤ مرکز'' قائم کیا، اور دسمبر ۱۹۹۳ء میں وزیر دفاع ایسپن نے پھیلاؤ کے انسداد کے ایک نئے دفاعی پروگرام اور جوہری سلامتی اور انسداد پھیلاؤ کے امور کے لیے نائب وزیر کے نئے عہدے کی تخلیق کا اعلان کیا۔[9]

سرد جنگ کے دوران امریکا اور سوویت یونین ہتھیاروں کی کلاسیکی دوڑ میں مصروف تھے، زیادہ سے زیادہ جدید ترین جوہری ہتھیار اور ان کو ہدف پر پہنچانے کے آلات بنا رہے تھے۔ یہ ذخیرہ اندوزی بمقابلہ ذخیرہ اندوزی کا معاملہ تھا۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں اسلحے کی مسابقت دوسری طرز کی ہے۔ مغرب کے دشمن بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور مغرب انہیں روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ذخیرہ اندوزی بمقابلہ ذخیرہ اندوزی نہیں، ذخیرہ اندوزی کے مقابلے میں پست کو پست رکھنے کی کوشش ہے۔ بیان بازی سے قطع نظر مغرب کے جوہری اسلحہ خانے کا معیار اور مقدار مسابقت میں شامل نہیں۔ ذخیرہ اندوزی بمقابلہ ذخیرہ اندوزی والی ہتھیاروں کی دوڑ کا نتیجہ وسائل، عزم اور دونوں فریقوں کی تیکنیکی اہلیت پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتا۔ ذخیرہ اندوزی کے مقابلے میں پست کو پست رکھنے والی اسلحے کی دوڑ کے نتیجے کی پیشگوئی کی جاسکتی ہے۔ مغرب کی دوسرے معاشروں کو روکنے کی کوششیں ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی سست کرسکتی ہیں لیکن روک نہیں سکتیں۔ غیر مغربی معاشروں کی معاشی و معاشرتی ترقی، مغربی و غیر مغربی تمام معاشروں کے لیے اسلحہ، ٹیکنالوجی اور مہارت بیچ کر دولت کمانے کی تجارتی ترغیبات اور مرکزی ریاستوں اور علاقائی طاقتوں کی اپنی مقامی بالادستی کو تحفظ دینے کے سیاسی محرکات، یہ سب عوامل اسلحے کا پھیلاؤ روکنے کی مغربی کوششوں کو ناکام بنا رہے ہیں۔

مغرب عدم پھیلاؤ کی جو ترویج کرتا ہے اس کے مطابق یہ بین الاقوامی نظام اور استحکام کے لیے تمام اقوام کے مفاد میں ہے لیکن دوسری اقوام کی نگاہ میں عدم پھیلاؤ کا مقصد مغربی بالادستی کے مفادات کی تکمیل ہے۔ یہ فرق ہتھیاروں کے پھیلاؤ پر مغرب، اور خصوصاً امریکا کی تشویش اور ان علاقائی طاقتوں کے موقف میں نظر آتا ہے جن کی سلامتی پھیلاؤ سے متاثر ہوتی ہے۔ کوریا کے معاملے میں یہ فرق واضح تھا۔ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۴ء میں امریکا نے شمالی کوریا کے جوہری ہتھیار بنا لینے کے امکان پر خود کو بحرانی ذہنی کیفیت میں مبتلا کرلیا۔ نومبر ۱۹۹۳ء میں صدر کلنٹن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ''شمالی کوریا کو جوہری بم بنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہمیں اس بارے میں بہت مضبوط موقف رکھنا ہے۔'' سینیٹروں، ایوان نمائندگان کے ارکان اور بش انتظامیہ کے سابق عہدیداروں نے شمالی کوریا کی جوہری تنصیبات پر حملے میں پہل کرنے کی ممکنہ ضرورت پر بحث کی۔

شمالی کوریا کے پروگرام کے بارے میں امریکی تشویش کا سبب خاصی حد تک عالمی جوہری پھیلاؤ پر اس کی تشویش تھی۔ شمالی کوریا کی اس صلاحیت سے نا صرف مشرقی ایشیا میں ممکنہ امریکی اقدامات محدود اور پیچیدہ ہو جائیں گے بلکہ اگر شمالی کوریا نے اپنی ٹیکنالوجی اور/یا ہتھیار فروخت کر دیے تو جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں بھی امریکا پر اسی طرح کے اثرات مرتب ہوں گے۔

دوسری طرف جنوبی کوریا میں اس بم کو علاقائی مفادات کے حوالے سے دیکھا گیا۔ جنوبی کوریا کے بہت سے حلقوں نے شمالی کوریائی بم کو کوریائی بم کہا، جو دوسرے کوریائی باشندوں کے خلاف کبھی استعمال نہیں ہوگا مگر جاپان اور دیگر ممکنہ خطرات سے کوریائی آزادی اور مفادات کے دفاع کے لیے استعمال ہوگا۔ جنوبی کوریا کے سویلین عہدیداروں اور فوجی افسران نے کھل کر یہ امید ظاہر کی کہ ایک متحدہ کوریا اس صلاحیت کا حامل ہو۔ جنوبی کوریا کے مفادات کو بہت فائدہ پہنچا: بم بنانے کا خرچ اور بین الاقوامی لعن طعن شمالی کوریا برداشت کرے؛ جنوبی کوریا آخر کار اس ورثے کا مالک بن جائے؛ اور شمالی جوہری ہتھیاروں اور جنوبی صنعتی قوت متحدہ کوریا کو مشرقی ایشیائی منظر نامے پر اہم کردار ادا کرنے کے قابل بنا دے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ۱۹۹۴ء میں واشنگٹن کو جزیرہ نما کوریا میں بہت بڑا بحران دکھائی دے رہا تھا جبکہ سیول کو کوئی بحران نظر نہیں آرہا تھا اور دونوں دارالحکومتوں میں ایک ''بحرانی خلیج'' پیدا ہو گئی تھی۔ جون ۱۹۹۴ء میں اس ''بحران'' کے عروج پر ایک صحافی نے یہ تبصرہ کیا کہ شمالی کوریا کی جوہری کشیدگی کی کئی عجیب خاصیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''کوریا سے جتنی دور جائیں، بحران کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔'' جنوبی ایشیا میں بھی امریکا اور علاقائی طاقتوں کی سلامتی کے مفادات کے درمیان اسی طرح کی خلیج پیدا ہوئی۔ علاقے کے باشندوں میں جوہری پھیلاؤ کے خطرے کے بارے میں اتنی تشویش نہیں تھی جتنی امریکا کو تھی۔ بھارت اور پاکستان کو اپنی جوہری صلاحیت روکنے، کم کرنے یا ختم کرنے کی امریکی تجاویز کے مقابلے میں ایک دوسرے کے جوہری خطرے کو قبول کرنا زیادہ آسان لگا۔[1]

امریکا اور دوسرے مغربی ممالک کی بڑے پیمانے پر تباہی کے ''برابری پیدا کرنے والے'' ہتھیاروں کا پھیلاؤ روکنے کی کوششیں محدود کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہیں اور یہی صورتحال جاری رہنے کا امکان ہے۔ صدر کلنٹن کے اس اعلان کے ایک ماہ بعد کہ شمالی کوریا کو جوہری ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، امریکی جاسوس اداروں نے انہیں مطلع کیا کہ شمالی کوریا کے پاس غالباً ایک یا دو ہتھیار موجود ہیں۔[1] نتیجتاً امریکا کی پالیسی میں تبدیلی ہوئی اور وہ شمالی کوریا کو جوہری اسلحہ خانے میں توسیع سے روکنے کے لیے ترغیبات دینے لگا۔ امریکا بھارت اور پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کی

تیاری کا عمل معکوس کرنے یا روکنے میں ناکام رہا اور ایران کی جوہری پیشرفت کو بھی نہیں روک سکا۔

معاہدۂ جوہری عدم پھیلاؤ (Nuclear Nonproliferation Treaty) پر اپریل ۱۹۹۵ء میں منعقدہ کانفرنس میں کلیدی مسئلہ یہ تھا کہ آیا اس معاہدے کی غیر معینہ مدت کے لیے تجدید کی جائے یا پچیس برس کے لیے۔ امریکا مستقل توسیع کے حامیوں کی قیادت کر رہا تھا۔ تاہم دوسرے بہت سے ملکوں نے مستقل توسیع پر اعتراض کیا جب تک کہ پانچ تسلیم شدہ جوہری طاقتیں اپنے ایٹمی ہتھیاروں میں بڑے پیمانے پر کمی پر تیار نہ ہو جائیں۔ مزید برآں مصر نے توسیع کی مخالفت کی تاوقتیکہ اسرائیل معاہدے پر دستخط نہ کر دے اور تنصیبات کے معائنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ آخر میں امریکا نے دھونس دھمکی اور رشوتیں دینے کی انتہائی کامیاب حکمت عملی کے ذریعے غیر معینہ مدت کے لیے توسیع کے حق میں بڑے پیمانے پر اتفاق رائے حاصل کر لیا۔ مثال کے طور پر مصر اور میکسیکو، جو دونوں غیر معینہ توسیع کے مخالف تھے، اپنا موقف برقرار نہیں رکھ سکے کیونکہ وہ امریکا پر اقتصادی انحصار کرتے تھے۔ معاہدے میں اتفاق رائے سے توسیع تو ہو گئی لیکن سات مسلمان ملکوں (شام، اردن، ایران، عراق، لیبیا، مصر اور ملائشیا) اور ایک افریقی ملک (نائجیریا) کے نمائندوں نے آخری بحث میں اختلافی آرا کا اظہار کیا۔[۲۱]

۱۹۹۳ء میں امریکی پالیسی کے مطابق مغرب کے بنیادی اہداف عدم پھیلاؤ سے پھیلاؤ کے انسداد میں بدل گئے۔ یہ تبدیلی اس بات کا حقیقت پسندانہ اعتراف تھا کہ کچھ جوہری پھیلاؤ ناگزیر ہے۔ مناسب وقت آنے پر امریکی پالیسی پھیلاؤ کے انسداد سے پھیلاؤ سے مفاہمت میں بدل جائے گی اور اگر حکومت اپنی سرد جنگ والی ذہنیت سے چھٹکارا پا سکی تو یہی پالیسی پھیلاؤ کے فروغ کی حمایت سے امریکی و مغربی مفادات کو فائدہ پہنچانے کے لیے استعمال ہونے لگے گی۔ تاہم ۱۹۹۵ء تک امریکا اور مغرب دوسروں کو نیچا رکھنے کی پالیسی پر چل رہے تھے جو بالآخر ناکام ہو کر رہنی ہے۔ جوہری اور بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کا پھیلاؤ کثیر تہذیبی دنیا کی مرکزی حقیقت ہے جس کے تحت طاقت کا پھیلاؤ سست رفتاری سے مگر لازمی طور پر ہوتا ہے۔

انسانی حقوق اور جمہوریت

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں کے دوران تیس سے زائد ملکوں میں آمریت کا خاتمہ ہوا اور جمہوریت آ گئی۔ تبدیلی کی اس لہر کے کئی اسباب تھے۔ ان سیاسی تبدیلیوں کو پیدا کرنے والا سب

سے اہم عامل بلاشبہ اقتصادی ترقی تھا۔ علاوہ ازیں امریکی پالیسیاں اور اقدامات، بڑی مغربی یورپی طاقتوں اور بین الاقوامی اداروں نے بھی اسپین اور پرتگال، متعدد لاطینی امریکی ممالک، فلپائن، جنوبی کوریا اور مشرقی یورپ میں جمہوریت لانے میں مدد دی۔ جمہوری عمل ان ممالک میں سب سے کامیاب رہا جہاں مسیحی اور مغربی اثرات سب سے زیادہ تھے۔ جنوبی اور وسطی یورپ کے ملکوں میں، جو غالب طور پر کیتھولک یا پروٹسٹنٹ تھے، نئی جمہوری حکومتیں سب سے مستحکم معلوم ہورہی تھیں اور لاطینی امریکا کے ممالک میں نسبتاً کم۔ مشرقی ایشیا میں کیتھولک اور امریکی اثرات سے انتہائی مغلوب فلپائن ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جمہوریت کی طرف لوٹا جبکہ عیسائی رہنماؤں نے جنوبی کوریا اور تائیوان میں جمہوری تحریکوں کو فروغ دیا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے، سابق سوویت یونین میں بالٹک جمہوریاؤں میں جمہوریت کے کامیابی سے مستحکم ہونے کا امکان نظر آتا ہے؛ آرتھوڈوکس جمہوریاؤں میں جمہوریت کے استحکام کے درجے مختلف اور غیر یقینی ہیں؛ مسلمان جمہوریاؤں میں جمہوریت کے امکانات تاریک ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے تک افریقہ کو چھوڑ کر بیشتر ایسے ممالک میں جہاں کے لوگوں نے مغربی مسیحیت قبول کی یا جہاں بہت زیادہ مسیحی اثرات تھے، جمہوریت آچکی تھی سوائے کیوبا کے۔

ان تبدیلیوں اور سوویت یونین کے انہدام نے مغرب، بالخصوص امریکا میں یہ خیال پیدا کیا کہ عالمی سطح پر ایک جمہوری انقلاب آرہا ہے اور یہ کہ بہت جلد انسانی حقوق کے مغربی تصورات اور سیاسی جمہوریت کی مغربی شکلیں پوری دنیا میں رائج ہوں گی۔ پس جمہوریت کے اس پھیلاؤ کو فروغ دینا اہلِ مغرب کا انتہائی ترجیحی ہدف بن گیا۔ اس کی تائید بش انتظامیہ نے کی اور وزیر خارجہ جیمز بیکر نے اپریل ۱۹۹۰ء میں اعلان کیا کہ ''تحدید سے آگے جمہوریت ہے'' اور یہ کہ مابعد سرد جنگ کی دنیا کے لیے ''صدر بش نے ہمارا نیا مشن جمہوریت کا فروغ اور استحکام متعین کیا ہے۔'' ۱۹۹۲ء میں اپنی صدارتی مہم میں بل کلنٹن نے باربار کہا کہ جمہوریت کا فروغ کلنٹن انتظامیہ کی اولین ترجیح ہوگا اور جمہوریت کا عمل خارجہ پالیسی کا واحد موضوع تھا جس کے لیے انہوں نے مہم کی پوری ایک تقریر وقف کردی۔ صدارت کے عہدے پر متمکن ہونے کے بعد انہوں نے نیشنل اینڈاؤمنٹ فار ڈیموکریسی کے لیے رقم میں دو تہائی اضافے کی سفارش کی۔ ان کے قومی سلامتی کے معاون نے کلنٹن کی خارجہ پالیسی کا مرکزی نکتہ ''جمہوریت کی توسیع'' بتایا اور ان کے وزیر دفاع نے چار اہم مقاصد میں سے ایک جمہوریت کا فروغ قرار دیا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اپنے محکمے میں ایک سینئر عہدہ تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ اس سے کم درجے پر اور کم نمایاں انداز میں یورپی ملکوں کی

خارجہ پالیسیوں اور مغرب کے ماتحت بین الاقوامی اقتصادی اداروں کے ان قواعد وضوابط میں بھی، جن کے تحت ترقی پذیر ممالک کو قرضے اور عطیات دیے جاتے ہیں، انسانی حقوق اور جمہوریت کے فروغ کو ممتاز حیثیت حاصل ہوگئی۔

۱۹۹۵ء تک یہ مقاصد حاصل کرنے کی یورپی اور امریکی کوششوں میں محدود کامیابی ہوئی تھی۔ تقریباً تمام غیر مغربی تہذیبوں نے مغرب کے اس دباؤ کی مزاحمت کی۔ ان میں ہندو، آرتھوڈوکس، افریقی اور کسی حد تک لاطینی امریکی ممالک بھی شامل تھے۔ لیکن مغرب کی جمہوریت لانے کی کوششوں کی سب سے زیادہ مزاحمت اسلام اور ایشیا کی طرف سے ہوئی۔ اس مزاحمت کی جڑیں ثقافتی اثبات کی وسیع تر تحریکوں میں تھیں جو اسلامی احیا اور ایشیائی اثبات کی صورت میں سامنے آئیں۔

ایشیا کے حوالے سے امریکا کی ناکامیوں کا ماخذ بنیادی طور پر بڑھتی ہوئی معاشی ترقی اور ایشیائی حکومتوں کی خود اعتمادی میں اضافہ تھا۔ ایشیائی کامیابی کے مشتہرین نے بار بار مغرب کو یاد دلایا کہ انحصار اور مغلوبیت کا پرانا زمانہ لد گیا اور مغرب، جو ۱۹۴۰ء کے عشرے میں نصف عالمی اقتصادی پیداوار میں شریک تھا، اقوام متحدہ پر چھایا ہوا تھا اور جس نے انسانی حقوق کا آفاقی اعلان تحریر کیا تھا، تاریخ کی پہنائیوں میں غائب ہو چکا ہے۔ ایک سنگاپوری عہدیدار نے کہا ''ایشیا میں انسانی حقوق کے فروغ کی کوششوں میں مابعد سرد جنگ کی دنیا کی بدلی ہوئی طاقت کی تقسیم کو مدنظر رکھنا ہوگا... مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا میں مغرب کی قوت بہت گھٹ چکی ہے''[۱۳]

اس کی بات درست ہے۔ امریکا اور شمالی کوریا کے مابین جوہری معاملات پر اتفاق کو ''شرائط کے تحت ہتھیار ڈالنے کا عمل'' کہنا مناسب ہوگا لیکن چین اور دوسری ایشیائی طاقتوں کے ساتھ انسانی حقوق کے مسائل پر امریکا کی پسپائی ''غیر مشروط اعتراف شکست'' تھا۔ کلنٹن انتظامیہ نے پہلے چین کو دھمکی دی کہ اگر اس نے انسانی حقوق کے مسئلے پر تعاون نہ کیا تو اسے پسندیدہ ترین قوم (most favored nation, MFN) کی حیثیت سے محروم رکھا جائے گا۔ اس کے بعد بیجنگ میں اپنے وزیر خارجہ کی توہین ہوتے دیکھی جسے اپنی عزت بچانے کا بھی موقع نہ دیا گیا اور پھر اس برتاؤ کا جواب اس طرح دیا کہ اپنی سابقہ پالیسی کو مسترد کر کے پسندیدہ ترین قوم کی حیثیت اور انسانی حقوق کے معاملات کو علیحدہ کر دیا۔ جواباً چین نے کمزوری کے اس مظاہرے پر اس طرح ردعمل ظاہر کیا کہ اس رویے کو جاری رکھا اور اس میں شدت پیدا کر دی جس پر کلنٹن انتظامیہ نے اعتراض کیا تھا۔ انتظامیہ کو سنگاپور کے ساتھ ایک امریکی شہری کو کوڑے مارنے اور انڈونیشیا کے ساتھ مشرقی تیمور میں جابرانہ تشدد کے واقعات پر بھی اسی طرح پسپائی اختیار کرنی پڑی۔

مغرب کی جانب سے انسانی حقوق کے بارے میں دباؤ کی مزاحمت کرنے کی ایشیائی حکومتوں کی اہلیت کو کئی عوامل سے تقویت ملی۔ امریکی اور یورپی تجارتی ادارے تیزی سے ترقی کرتے ہوئے ان ملکوں میں اپنا کاروبار پھیلانے اور سرمایہ کاری بڑھانے کے لیے سخت بے قرار تھے اور انہوں نے اپنی حکومتوں پر شدید دباؤ ڈالا کہ ان سے اقتصادی روابط نہ توڑیں۔ علاوہ ازیں ایشیائی ملکوں نے اس دباؤ کو اپنی خودمختاری کی پامالی سمجھا اور جب یہ مسائل ابھرے تو ایک دوسرے کی حمایت میں وہ اکٹھا ہوگئے۔ تائیوان، جاپان اور ہانگ کانگ کے تاجر، جنھوں نے چین میں سرمایہ کاری کی ہوئی تھی، امریکا کے ساتھ چین کی پسندیدہ ترین قوم کی اعزازی حیثیت برقرار رہنے سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ جاپانی حکومت نے عام طور پر خود کو امریکا کی انسانی حقوق کی پالیسیوں سے دور رکھا: وزیراعظم کی چی میازوا نے تیانن من اسکوائر کے واقعے کے کچھ عرصے بعد کہا کہ ہم ''انسانی حقوق کے مجرد تصورات'' کو چین سے اپنے تعلقات خراب نہیں کرنے دیں گے۔ آسیان کے ممالک میانمار پر دباؤ ڈالنے پر آمادہ نہیں تھے بلکہ ۱۹۹۴ء میں انہوں نے میانمار کی فوجی حکومت کی اپنے اجلاس میں شرکت کا خیرمقدم کیا جبکہ، اس کے ترجمان نے کہا کہ یورپی یونین کو تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کی پالیسی ''بہت کامیاب نہیں رہی'' اور یہ کہ اسے میانمار کے بارے میں آسیان کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اس کے علاوہ ملائشیا اور انڈونیشیا جیسی ریاستوں کی بڑھتی ہوئی معاشی قوت نے انہیں ان ملکوں اور فرموں پر ''الٹی شرائط'' عائد کرنے کے لائق بنا دیا جو ان پر تنقید کرتی ہیں یا ان کی نظر میں کوئی اور قابل اعتراض رویہ اختیار کرتی ہیں۔[۱۴]

بحیثیت مجموعی ایشیائی ملکوں کی بڑھتی ہوئی اقتصادی طاقت انہیں انسانی حقوق اور جمہوریت کے حوالے سے مغربی دباؤ سے آزاد کرتی جا رہی ہے۔ رچرڈ نکسن نے ۱۹۹۴ء میں کہا ''آج چین کی معاشی قوت کے باعث انسانی حقوق کے بارے میں امریکی وعظ بے موقع ہوگئے ہیں۔ ایک دہائی بعد غیر متعلق ہو جائیں گے اور دو دہائیوں کے اندر مضحکہ خیز بن سکتے ہیں''[۱۵] لیکن اس وقت تک چین کی معاشی ترقی مغربی وعظوں کو غیرضروری بنا چکی ہوگی۔ اقتصادی نمو ایشیائی حکومتوں کو مغربی حکومتوں کے مقابلے میں مضبوط بنا رہی ہے۔ طویل مدت میں یہ ایشیائی معاشروں کو بھی مغربی حکومتوں کے مقابلے میں مضبوط بنا دے گی۔ اگر مزید ایشیائی ملکوں میں جمہوریت آئی تو اس لیے آئے گی کہ مضبوط ہوتے ہوئے ایشیائی بورژوا اور متوسط طبقے اسے لانا چاہیں گے۔

عدم پھیلاؤ کے معاہدے میں غیرمعینہ مدت تک کے لیے توسیع پر اتفاق کے برعکس اقوام متحدہ کی ایجنسیوں میں انسانی حقوق اور جمہوریت کو فروغ دینے کی مغربی کوششیں عموماً لاحاصل رہی

ہیں۔ چند استثنائی واقعات کے سوا، جیسے عراق کی مذمت کے بارے میں، انسانی حقوق کی قراردادیں اقوام متحدہ کے ووٹوں میں تقریباً ہمیشہ ناکام ہوئیں۔ لاطینی امریکا کے بعض ملکوں کو چھوڑ کر دیگر حکومتیں ان کوششوں میں شرکت پر پس و پیش کرتی رہی ہیں جنہیں متعدد حلقے ''انسانی حقوق کی سامراجیت'' سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۰ء میں سویڈن نے بیس مغربی ممالک کی طرف سے ایک قرارداد پیش کی جس میں میانمار کی فوجی حکومت کی مذمت کی گئی تھی لیکن ایشیائی اور دوسرے ملکوں کی مخالفت کے باعث ناکام ہوگئی۔ انسانی حقوق کی پامالی سے متعلق ایران کی مذمت میں پیش کی جانے والی قراردادیں بھی مسترد ہوگئیں اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں پانچ مسلسل برسوں تک چین ایشیائی حمایت کو متحرک کر کے ان مغربی قراردادوں کو مسترد کرانے میں کامیاب رہا جن میں چین کی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر تشویش ظاہر کی گئی تھی۔ ۱۹۹۴ء میں پاکستان نے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انسانی حقوق میں کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی کے بارے میں بھارت کے خلاف قرارداد پیش کی۔ بھارت کے دوست ممالک اس کی حمایت میں اکٹھا ہوگئے لیکن پاکستان کے دو قریب ترین دوستوں چین اور ایران نے بھی، جو اسی طرح کے اقدامات کا ہدف رہے تھے، قرارداد کی مخالفت کی اور پاکستان کو تجویز واپس لینے پر آمادہ کرلیا۔ دی اکنامسٹ نے تبصرہ کیا کہ کشمیر میں بھارتی مظالم کی مذمت کرنے میں ناکامی کے ذریعے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن نے ''بزبان خاموشی اس کو جائز قرار دے دیا۔ دوسرے ممالک بھی قتل و غارتگری کر کے بچنے میں کامیاب ہورہے ہیں: ترکی، انڈونیشیا، کولمبیا اور الجزائر سب تنقید سے محفوظ رہے ہیں۔ اس طرح کمیشن قتل و اذیت رسانی کرنے والی حکومتوں کو سہارا دے رہا ہے جو اس کے بانیوں کی نیت کے بالکل برعکس ہے۔''[۱۶]

مغرب اور دوسری تہذیبوں کے درمیان انسانی حقوق کے مسئلے پر اختلافات اور مغرب کی اپنے مقاصد حاصل کرنے کی محدود صلاحیت جون ۱۹۹۳ء میں ویانا میں منعقدہ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق عالمی کانفرنس میں کھل کر سامنے آگئی۔ ایک جانب یورپی اور شمالی امریکی ممالک تھے، دوسری جانب پچاس غیرمغربی ملکوں کا بلاک تھا جس کے پندرہ فعال ترین ارکان میں ایک لاطینی امریکی ملک (کیوبا)، ایک بدھ ملک (میانمار)، بہت مختلف سیاسی نظریات، معاشی نظام اور ترقی کی سطحوں کے حامل چار کنفیوشین ممالک (سنگاپور، ویت نام، شمالی کوریا اور چین) اور نو مسلمان ممالک (ملائشیا، انڈونیشیا، پاکستان، ایران، عراق، شام، یمن، سوڈان اور لیبیا) شامل تھے۔ اس ایشیائی اسلامی گروہ کی قیادت چین، شام اور ایران کررہے تھے۔ دونوں گروہوں کے درمیان کیوبا کے سوا دیگر لاطینی امریکی ممالک تھے جو اکثر مغرب کی حمایت کرتے تھے، اور افریقی اور آرتھوڈوکس ممالک تھے جو بعض

اوقات مغرب کی حمایت لیکن زیادہ تر مخالفت کرتے تھے۔

وہ مسائل جن پر تہذیبی خطوط پر ملکوں کے درمیان اختلاف ہوا وہ یہ تھے: انسانی حقوق کے ضمن میں آفاقیت بمقابلہ ثقافتی اضافیت؛ اقتصادی و معاشرتی حقوق کی ترجیحی حیثیت بشمول ترقی کا حق بمقابلہ سیاسی وشہری حقوق؛ اقتصادی امداد کے لیے سیاسی شرائط عائد کرنا؛ اقوام متحدہ میں انسانی حقوق کمشنر کے عہدے کی تخلیق؛ یہ سوال کہ ویانا میں سرکاری کانفرنس کے ساتھ ہی اجلاس منعقد کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کو کس حد تک سرکاری کانفرنس میں شرکت کی اجازت دی جائے؛ کانفرنس میں کن کن حقوق کی توثیق کی جائے؛ اور مخصوص مسائل جیسے آیا دلائی لامہ کو کانفرنس سے خطاب کرنے کی اجازت دی جائے یا آیا بوسنیا میں انسانی حقوق کی پامالی کی واضح طور پر مذمت کی جائے۔

ان مسائل پر مغربی ملکوں اور ایشیائی اسلامی بلاک کے مابین بڑے اختلافات تھے۔ ویانا کانفرنس سے دو ماہ قبل بنکاک میں ایشیائی ملکوں کا ایک اجلاس ہوا تھا جس میں ایک اعلان کی توثیق کی گئی تھی۔ اس اعلان میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ انسانی حقوق کو ''مخصوص قومی و علاقائی خصوصیات اور مختلف تاریخی مذہبی اور ثقافتی پس منظر... کے تناظر'' میں دیکھا جانا چاہیے، انسانی حقوق کی نگرانی سے ریاستی خود مختاری کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور معاشی امداد کو انسانی حقوق سے متعلق کارکردگی سے منسلک کرنا ترقی کے حق کے خلاف ہے۔ ان اور دیگر مسائل پر اختلافات اس قدر تھے کہ ویانا کانفرنس سے قبل جنیوا میں تیاری کے لیے مئی کے اوائل میں ہونے والے حتمی اجلاس میں جو دستاویز سامنے آئی وہ تقریباً پوری کی پوری قوسین میں تھی جس سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ ملکوں کی اختلافی آرا کا اظہار ہوتا تھا۔

مغربی اقوام ویانا کے لیے صحیح طور پر تیار نہیں تھیں، کانفرنس میں تعداد میں مار کھا گئیں اور کارروائی کے دوران انہوں نے اپنے مخالفین کی بہ نسبت زیادہ نکات پر سمجھوتا کیا۔ نتیجتاً خواتین کے حقوق کی مضبوطی کی توثیق کے سوا، کانفرنس کا منظور کردہ اعلان معمولی سا تھا۔ جیسا کہ انسانی حقوق کے ایک حامی نے تبصرہ کیا، یہ ''ایک ناقص اور متضاد'' دستاویز تھی اور ایشیائی اسلامی اتحاد کی فتح اور مغرب کی شکست ظاہر کرتی تھی۔[۷] ویانا کے اعلان میں تقریر، اخبارات، اجتماع اور مذہب کی آزادی کے حقوق کی بین توثیق موجود نہ تھی اور اس طرح بہت سے پہلوؤں سے انسانی حقوق کے اس آفاقی اعلان سے کمزور تھی جو اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں منظور کیا تھا۔ یہ تبدیلی مغرب کی طاقت میں زوال کی آئینہ دار تھی۔ انسانی حقوق کے ایک امریکی حامی نے کہا'' ۱۹۴۵ء کا بین الاقوامی انسانی حقوق کا نظام اب کہیں نہیں۔ امریکی بالادستی ختم ہو چکی ہے۔ ۱۹۹۲ء کے واقعات کے بعد بھی، یورپ ایک

جزیرہ نما ہے اور بس۔ دنیا اب عرب، ایشیائی اور افریقی بھی اتنی ہی ہے جتنی مغربی ہے۔ آج انسانی حقوق کا آفاقی اعلان اور بین الاقوامی معاہدے کرۂ ارض کے بیشتر حصے کے لیے اتنے اہم نہیں رہے جتنے جنگ عظیم دوم کے فوری بعد کے دور میں تھے۔'' مغرب کے ایک ایشیائی ناقد کے بھی یہی خیالات تھے: ''۱۹۴۸ء میں آفاقی اعلان کی منظوری کے بعد پہلی مرتبہ وہ ممالک پہلی صف میں ہیں جو یہودی عیسائی اور فطری قوانین کی روایات میں سرتا پا ڈوبے ہوئے نہیں۔ یہ بے نظیر صورتحال انسانی حقوق کی نئی بین الاقوامی سیاست کے پیمانے مقرر کرے گی۔ اس سے تنازعے کے مواقع بھی بڑھیں گے''۔[۱۸]

جیسا کہ ایک اور مبصر نے کہا، ''فاتح اعظم صاف طور پر چین تھا، کم از کم اس صورت میں ضرور تھا کہ دوسروں کو اپنی راہ سے ہٹانے کی اہلیت کو کامیابی کا پیمانہ مقرر کیا جائے۔ بیجنگ پورے اجلاس کے دوران اپنا وزن ڈالکر جیتتا رہا''۔[۱۹] ویانا میں بری طرح ہارنے کے بعد مغرب چند ماہ بعد چین کے خلاف ایک فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جو اتنی غیر اہم نہ تھی۔ چینی حکومت کے لیے ۲۰۰۰ء کے اولمپک کھیل بیجنگ میں منعقد کرانا اہم ہدف تھا اور اس نے اس کے لیے بے پناہ وسائل استعمال کیے۔ چین میں اس بارے میں بہت تشہیر کی گئی اور عوامی توقعات بلند تھیں۔ چین نے دوسری حکومتوں کو ملانے کی کوشش کی۔ تائیوان اور ہانگ کانگ مہم میں شامل ہوگئے۔ ادھر امریکی کانگریس، یورپی پارلیمنٹ اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے بیجنگ کے انتخاب کی شدید مخالفت کی۔ بین الاقوامی اولمپک کمیٹی میں رائے شماری خفیہ ہوتی ہے تاہم یہ واضح تھا کہ تہذیبی خطوط پر ووٹ ڈالے گئے۔ پہلے بیلٹ میں بیجنگ افریقہ کی مدد سے پہلے اور سڈنی دوسرے نمبر پر تھا۔ بعد کے بیلٹوں میں جب استنبول خارج ہوگیا، کنفیوشین اسلامی اتحاد نے بھاری اکثریت سے بیجنگ کو جتوایا؛ جب برلن اور

☆ چاروں انتخابی مراحل میں ووٹوں کی تعداد مندرجہ ذیل تھی:

	پہلا	دوسرا	تیسرا	چوتھا
بیجنگ	۳۲	۳۷	۴۰	۴۳
سڈنی	۳۰	۳۰	۳۷	۴۵
مانچسٹر	۱۱	۱۳	۱۱	
برلن	۹	۹		
استنبول	۷			
غیر حاضر			۱	۱
کل تعداد	۸۹	۸۹	۸۹	۸۹

مانچسٹر خارج ہوگئے تو ان کے ووٹ بھاری تعداد میں سڈنی کے حق میں گئے جس سے اسے چوتھے بیلٹ پر فتح اور چین کو توہین آمیز شکست ہوئی۔ چین نے اس کا الزام امریکا پر دھرا۔ لی کوآن یو نے تبصرہ کیا کہ ''امریکا اور برطانیہ چین کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہو گئے... ظاہری وجہ 'انسانی حقوق' تھے۔ اصل وجہ سیاسی تھی، مغربی سیاسی اثر و رسوخ کا اظہار''۔[۲۰] بلاشبہ دنیا میں انسانی حقوق کے مقابلے میں کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے لیکن ویانا اور دوسری جگہوں پر مغرب کو انسانی حقوق کے میدان میں جو شکست ہوئی اس سے مغربی ''اثر و رسوخ'' کے اس اظہار سے مغربی کمزوری کا بھی اظہار ہوا۔

ناصرف مغربی اثر و رسوخ میں کمی آ گئی ہے بلکہ جمہوریت کے تضاد نے مابعد سرد جنگ کی دنیا میں جمہوریت کو فروغ دینے کا مغربی عزم بھی کمزور کیا ہے۔ سرد جنگ کے دوران مغرب خصوصاً امریکا نے ''دوست جابر'' کے مسئلے کا سامنا کیا: ان فوجی جنتاؤں اور آمروں سے تعاون کرنے کا مخمصہ جو کمیونسٹ دشمن ہونے کے باعث سرد جنگ میں فائدہ مند اتحادی تھے۔ اس تعاون سے اُس وقت بے چینی اور بعض اوقات شرمندگی پیدا ہوتی تھی جب یہ آمرانہ حکومتیں انسانی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتی تھیں۔ تاہم اس تعاون کو کمتر برائی کے طور پر جائز ٹھہرایا جاسکتا تھا: کمیونسٹ حکومتوں کی بہ نسبت یہ حکومتیں عموماً کم جابر تھیں اور ان سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ کم پائیدار ہوں گی اور امریکی و دیگر بیرونی قوتوں سے زیادہ متاثر ہوں گی۔ کم سفاک دوست جابر سے تعاون کیوں نہ کیا جائے اگر اس کا متبادل ایک سفاک تر دشمن ہو؟ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں ایک دوست جابر اور دشمن جمہوریت کے درمیان انتخاب مشکل ہوسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ مغرب کا یہ من پسند مفروضہ کہ جمہوری طور پر منتخب حکومتیں تعاون کریں گی اور مغرب نواز ہوں گی ان غیر مغربی معاشروں میں درست ثابت ہو جہاں انتخابی مسابقت کے نتیجے میں مغرب دشمن قوم پرست اور بنیاد پرست اقتدار میں آسکتے ہوں۔ ۱۹۹۲ء میں جب الجزائر کی فوج نے مداخلت کر کے وہ انتخابات منسوخ کر دیے جن میں بنیاد پرست ایف آئی ایس کی جیت صاف دکھائی دے رہی تھی تو مغربی حکومتوں نے سکون کا سانس لیا۔ ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء میں جب ترکی میں رفاہ پارٹی اور بھارت میں قوم پرست بی جے پی انتخابی فتوحات حاصل کرنے کے بعد اقتدار سے محروم رہیں تب بھی مغربی حکومتوں کو تسلی ہوئی۔ دوسری طرف ایران انقلاب کے دائرے کے اندر بعض پہلوؤں سے اسلامی دنیا کی نسبتاً جمہوری حکومتوں میں سے ہے اور سعودی عرب اور مصر سمیت بیشتر عرب ملکوں میں انتخابی مقابلے ہوں تو تقریباً یقینی ہے کہ وہاں اپنے غیر جمہوری پیشروؤں کی بہ نسبت مغربی مفادات سے کم ہمدردی رکھنے

والی حکومتیں اقتدار میں آئیں گی۔ چین میں عوام کی منتخب کردہ حکومت بہت قوم پرست ہوسکتی ہے۔ جوں جوں مغربی رہنماؤں کو یہ احساس ہورہا ہے کہ غیر مغربی معاشروں میں جمہوری عمل سے اکثر مغرب دشمن حکومتیں اقتدار میں آتی ہیں، وہ ان انتخابات پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی کررہے ہیں اور ان معاشروں میں جمہوریت کو فروغ دینے کے سلسلے میں ان کا جوش وخروش بھی سرد پڑتا جارہا ہے۔

نقلِ مکانی

اگر آبادیوں کی تقسیم اور تانا بانا ہی مقدر ہے تو لوگوں کی نقل وحرکت کو تاریخ کا پہیہ سمجھنا چاہیے۔ ماضی کے ادوار میں آبادی میں اضافے کی مختلف شرحوں، اقتصادی حالات اور سرکاری پالیسیوں کے باعث یونانیوں، یہودیوں، جرمانک قبائل، نورس، ترکوں، روسیوں، چینیوں اور دیگر اقوام میں بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی۔ بعض مواقع پر نقلِ مکانی نسبتاً پر امن تھی اور بعض اوقات متشدد۔ تاہم انیسویں صدی کے یورپی باشندے آبادیاتی حملے کی ماہر نسل تھے۔ ۱۸۲۱ء سے ۱۹۲۴ء کے دوران تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ یورپی باشندوں نے بیرون ملک نقل مکانی کی جن میں سے ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ امریکا منتقل ہوئے۔ مغربی باشندوں نے دوسری اقوام کو فتح کیا اور بعض اوقات مٹا دیا اور کم گنجان آبادی کے علاقے دریافت اور آباد کیے۔ سولہویں اور بیسویں صدی کے درمیان مغرب کے عروج کی اہم ترین جہت شاید لوگوں کی نقلِ مکانی ہی تھی۔

بیسویں صدی کے اواخر میں مختلف اور اس سے بھی بڑی ترک وطن کی تحریک سامنے آئی۔ ۱۹۹۰ء میں قانونی بین الاقوامی تارکینِ وطن کی تعداد لگ بھگ ۱۰ کروڑ، پناہ گزینوں کی ایک کروڑ ۹۰ لاکھ اور غیر قانونی تارکین کی غالباً کم سے کم ایک کروڑ یا زائد تھی۔ نقلِ مکانی کی یہ نئی لہر جزواً استعماریت کے خاتمے، نئی ریاستوں کے قیام اور ان ریاستی پالیسیوں کا نتیجہ تھی جن کے تحت لوگوں کی ترکِ وطن کی حوصلہ افزائی کی گئی یا انہیں اس پر مجبور کیا گیا۔ تاہم یہ جدیدیت اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا بھی نتیجہ تھی۔ ذرائع نقل وحمل میں بہتری نے ترکِ وطن کو آسان، تیز اور ارزاں بنا دیا۔ مواصلات میں بہتری نے معاشی مواقع کے حصول کے لیے ترغیبات میں اضافہ کیا اور تارکین کے ان کے وطن میں موجود اہل خانہ سے روابط بڑھائے۔ علاوہ ازیں، جیسا کہ مغرب کی اقتصادی نمو انیسویں صدی میں نقلِ مکانی کا محرک بنی تھی اسی طرح غیر مغربی معاشروں کی معاشی ترقی بیسویں صدی میں نقل مکانی کا سبب بنی ہے۔ نقلِ مکانی ایسا عمل ہے جو خود کو تقویت دیتا چلا جاتا ہے۔ مائرن وائنر کے

مطابق ''اگر نقلِ مکانی کا کوئی ایک 'قانون' ہے تو وہ یہ ہے کہ جب ایک بار تارکین کا بہاؤ شروع ہو جائے تو اپنی روانی کا خود باعث بنتا ہے۔ تارکین اپنے احباب اور اعزہ و اقارب کو نقلِ مکانی کے بارے میں معلومات، وسائل اور سہولتیں فراہم کرتے ہیں اور روزگار و اقامت تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔'' اس کا نتیجہ وائنر کے الفاظ میں ''نقلِ مکانی کا عالمی بحران'' ہے۔[۲۱]

اہلِ مغرب جوہری پھیلاؤ کی مخالفت اور جمہوریت اور انسانی حقوق کی حمایت مستقل مزاجی اور بھرپور طریقے سے کرتے رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں نقلِ مکانی کے بارے میں ان کے خیالات ملے جلے رہے ہیں اور بیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں توازن میں نمایاں تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی تک یورپی ممالک عام طور پر نقلِ مکانی کے حق میں تھے اور بعض صورتوں میں، جن میں نمایاں ترین مثالیں جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی ہیں، انہوں نے لیبر کی کمی پوری کرنے کے لیے نقلِ مکانی کی حوصلہ افزائی کی۔ ۱۹۶۵ء میں امریکا نے ۱۹۲۰ء کے عشرے سے رائج کوٹے، جو یورپی باشندوں کے لیے مقرر کیے گئے تھے، ختم کر دیے اور اپنے قوانین میں بڑی تبدیلیاں کر کے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں میں تارکین میں زبردست اضافوں اور نئے علاقوں کے تارکین کی آمد کو ممکن بنایا۔ لیکن ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر تک بے روزگاری کی بلند شرحیں، تارکین کی تعداد میں اضافے اور ان کا بہت زیادہ ''غیر یورپی'' کردار یورپی رویوں اور پالیسیوں میں نمایاں تبدیلیوں کا باعث بنا۔ چند سال بعد اس سے ملتے جلتے مسائل نے امریکی پالیسیوں کو اسی طرح بدل دیا۔

بیسویں صدی کے اواخر کے تارکین اور پناہ گزینوں کی اکثریت ایک غیر مغربی سماج سے دوسرے میں منتقل ہوئی ہے۔ تاہم مغربی معاشروں میں تارکین کی آمد مطلق تعداد کے اعتبار سے انیسویں صدی کی مغربی نقلِ مکانی تک پہنچ گئی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں تخمینے کے مطابق پہلی نسل کے دو کروڑ تارکین امریکا، ایک کروڑ ۵۵ لاکھ یورپ اور ۸۰ لاکھ آسٹریلیا اور کینیڈا میں تھے۔ امریکا میں تارکین کی ۱۹۹۴ء میں آبادی کا ۸ء۷ فیصد تھے جو ۱۹۷۰ء کا دگنا ہے، جبکہ کیلیفورنیا میں ۲۵ فیصد اور نیویارک میں ۱۶ فیصد افراد تارکین تھے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں لگ بھگ ۸۳ لاکھ اور ۱۹۹۰ء کے عشرے کے پہلے چار برسوں میں ۴۵ لاکھ افراد امریکا میں داخل ہوئے۔

نئے تارکین کی بہت بڑی تعداد غیر مغربی معاشروں سے تعلق رکھتی ہے۔ جرمنی میں ترک غیر ملکی باشندے ۱۹۹۰ء میں ۱۶۷۵۰۰۰ تھے اور ان کے بعد یوگوسلاویہ، اٹلی اور یونان کے افراد زیادہ تعداد میں تھے۔ اٹلی میں زیادہ تر تارکین مراکش، امریکا (شاید واپس جانے والے اطالوی نژاد

امریکیوں کی وجہ سے)، تیونس اور فلپائن کے تھے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے وسط تک تقریباً ۴۰ لاکھ مسلمان فرانس اور ایک کروڑ ۳۰ لاکھ پورے مغربی یورپ میں مقیم تھے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں امریکا میں آنے والے دو تہائی تارکین یورپ اور کینیڈا کے تھے جبکہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں تارکین کی کہیں زیادہ تعداد میں سے ۳۵ فیصد ایشیا، ۴۵ فیصد لاطینی امریکا اور ۱۵ فیصد سے بھی کم یورپ اور کینیڈا کے تھے۔ امریکا میں آبادی کی فطری نمو بہت کم اور یورپ میں تقریباً صفر ہے۔ تارکین میں ولادت کی شرحیں بلند ہیں اور مستقبل میں مغربی معاشروں میں آبادی کے اضافے میں زیادہ تر انہی کا حصہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب میں یہ خوف بڑھ رہا ہے" کہ اب ان پر افواج اور ٹینک نہیں، تارکین دھاوا بول رہے ہیں جو دوسری زبانیں بولتے ہیں، دوسرے خداؤں کی پرستش کرتے ہیں، دوسری ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور، ڈر ہے کہ، ان کے روزگار پر قابض ہو جائیں گے"۔[۲۲] اسٹینلے ہوف مین نے کہا کہ یہ نفسیاتی خدشے، جن کی جڑیں آبادیاتی زوال میں ہیں، "حقیقی ثقافتی تصادموں اور قومی شناخت سے متعلق تفکرات کی بنیاد پر ہیں"۔[۲۳]

۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل تک یورپ کے دو تہائی مہاجرین مسلمان تھے اور نقلِ مکانی کے بارے میں یورپ کی تشویش سب سے بڑھ کر مسلمانوں کی ہجرت کے حوالے سے ہے۔ مسئلہ آبادیاتی-- مغربی یورپ میں ولادتوں کی ۱۰ فیصد تعداد تارکین کے ہاں ہوتی ہے، برسلز میں ان کی ۵۰ فیصد تعداد عربوں کے ہاں ہوتی ہے-- اور ثقافتی ہے۔ مسلمان برادریاں، خواہ جرمنی کے مقیم ترک ہوں یا فرانس میں مقیم الجزائری، نئی ثقافتوں میں گھلی ملی نہیں، اور کم ہی آثار نظر آتے ہیں کہ ایسا ہوگا جو اہلِ یورپ کے لیے باعثِ تشویش ہے۔ یاں میری ڈومیناش نے ۱۹۹۱ء میں کہا کہ "یورپ بھر میں یہ خوف سرایت کر رہا ہے کہ کہیں یورپی خطوط کو قطع کرتی ہوئی ایک مسلم برادری نہ پیدا ہو جائے، یورپی برادری میں ایک قسم کی تیرہویں قوم۔" تارکین کے بارے میں ایک امریکی صحافی نے تبصرہ کیا

> اہل یورپ کی دشمنی کا رخ عجیب انداز میں مخصوص طبقوں کی طرف ہے۔ فرانس میں بہت کم لوگوں کو مشرق کی جانب سے یلغار کے بارے میں تشویش ہے-- پولز بہرحال یورپی اور کیتھولک ہیں۔ اور زیادہ تر غیر عرب افریقی تارکین سے نہ خوف کھایا جاتا ہے نہ نفرت کی جاتی ہے۔ دشمنی کا ہدف بیشتر مسلمان ہیں۔ لفظ "تارک وطن" تقریباً اسلام کا مترادف ہے جو اب فرانس کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے اور اس ثقافتی اور نسلی تعصب کی عکاسی کرتا ہے جس کی جڑیں فرانسیسی تاریخ میں گہری ہیں۔[۲۴]

تاہم اہل فرانس نسل پرست سے زیادہ ثقافت پرست ہیں۔ انہوں نے روانی سے فرانسیسی زبان بولنے والے سیاہ فام افریقیوں کو اپنی مقننہ میں قبول کیا ہے لیکن ان مسلمان لڑکیوں کو قبول نہیں

کرتے جو اسکولوں میں اسکارف پہنتی ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں ۷۶ رفیصد فرانسیسی عوام کا خیال تھا کہ فرانس میں بہت زیادہ عرب ہیں، ۴۶ رفیصد کا خیال تھا کہ بہت زیادہ سیاہ فام ہیں، ۴۰ رفیصد کی رائے میں بہت زیادہ ایشیائی تھے اور ۲۴ رفیصد نے کہا کہ یہودی بہت زیادہ ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں ۴۷ رفیصد جرمنوں نے کہا کہ وہ چاہیں گے کہ ان کے اڑوس پڑوس میں عرب نہ رہتے ہوں، ۳۹ رفیصد نے پولز کے، ۳۶ رفیصد نے ترکوں کے اور ۲۲ رفیصد نے یہودیوں کے پڑوس میں رہنے کی مخالفت کی[۲۵] مغربی یورپ میں یہودیوں کے خلاف سام دشمنی (anti-Semitism) کی جگہ عربوں کے خلاف سام دشمنی نے لے لی ہے۔

نقلِ مکانی کے بارے میں عوامی مخالفت اور تارکین سے دشمنی اپنی انتہا پر تارکین برادریوں اور افراد کے خلاف تشدد کی کارروائیوں میں ظاہر ہوئی جو خاص طور پر ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل میں متنازع معاملہ بن گیا۔ زیادہ اہم بات دائیں بازو کی قوم پرست اور ترک وطن کی مخالف جماعتوں کے ووٹوں میں اضافہ تھا۔ تاہم ان ووٹوں کی تعداد شاذونادر ہی بہت زیادہ تھی۔ ۱۹۸۹ء میں یورپی انتخابات میں ری پبلیکن پارٹی نے ۷ فیصد سے زائد ووٹ لیے لیکن ۱۹۹۰ء کے قومی انتخابات میں صرف ۲ء۱ فیصد ووٹ حاصل کیے۔ فرانس میں نیشنل فرنٹ نے، جس کی کارکردگی ۱۹۸۱ء میں برائے نام رہی تھی، ۱۹۸۸ء میں ۹ء۶ فیصد ووٹ لیے اور علاقائی اور پارلیمانی انتخابات میں ۱۲ سے ۱۵ فیصد پر مستحکم ہوگئی۔ ۱۹۹۵ء میں صدر کے عہدے کے دو قوم پرست امیدواروں نے ۱۹ء۹ فیصد ووٹ حاصل کیے اور طولون اور نیس سمیت کئی شہروں میں نیشنل فرنٹ کے میئر منتخب ہوئے۔ اسی طرح اٹلی میں ایم ایس آئی/ نیشنل الائنس کے ووٹ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ۵ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۹۰ء کے عشرے کے آغاز میں ۱۰ سے ۱۵ فیصد کے درمیان ہوگئے۔ بیلجیئم میں فلیمش بلاک/ نیشنل فرنٹ کے ووٹ ۱۹۹۴ء کے مقامی انتخابات میں بڑھ کر ۹ فیصد ہوگئے اور بلاک کو اینٹ ورپ میں ۲۸ فیصد ووٹ ملے۔ آسٹریا میں عام انتخابات میں فریڈم پارٹی کے ووٹ، جو ۱۹۸۶ء میں ۱۰ فیصد سے کم تھے، ۱۹۹۰ء میں ۱۵ فیصد سے زائد اور ۱۹۹۴ء میں تقریباً ۲۳ فیصد ہوگئے[۲۶]

مسلمان تارکین کی مخالف یہ یورپی پارٹیاں بڑی حد تک مسلمان ملکوں میں اسلام پسند جماعتوں کا عکس تھیں۔ یہ دونوں ہی باہر کی جماعتیں تھیں جو بدعنوان ہیئت مقتدرہ اور اس کی پارٹیوں کی مذمت کررہی تھیں، اقتصادی محرومیوں خصوصاً بے روزگاری کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کررہی تھیں، نسلی و مذہبی حسیات کو ابھار رہی تھیں اور اپنے معاشرے میں غیرملکی اثرات پر تنقید کررہی تھیں۔ دونوں صورتوں میں ایک مختصر انتہا پسند طبقہ دہشت گردی اور تشدد کی کارروائیوں میں ملوث

رہا۔ زیادہ تر مثالوں میں اسلام پسند اور یورپی قوم پرست جماعتوں دونوں نے قومی کی بجائے مقامی انتخابات میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ مسلمان اور یورپی سیاسی ہیئت ہائے مقتدرہ نے ایک ہی انداز میں ان حالات پر ردعمل ظاہر کیا۔ جیسا کہ ذکر ہوا مسلمان ممالک میں سبھی حکومتیں اپنی سمت، علامات، پالیسیوں اور طور طریقوں میں زیادہ اسلامی ہوگئیں۔ یورپ میں مرکزی دھارے کی جماعتوں نے دائیں بازو کی ترک وطن کی مخالف پارٹیوں جیسی زبان استعمال کرنی شروع کردی اور ان کے اقدامات کو فروغ دیا۔ جن ملکوں میں جمہوری سیاست مؤثر طور پر چل رہی تھی اور اسلام پسند یا قوم پرست جماعت کے مقابلے میں دو یا دو سے زائد متبادل پارٹیاں موجود تھیں وہاں ان کے ووٹ تقریباً ۲۰ فیصد کی حد تک پہنچے۔ احتجاجی جماعتیں اِس حد کو صرف اُس صورت میں عبور کر پائیں جب مقتدر پارٹی یا مخلوط حکومت کا کوئی اور مؤثر متبادل موجود نہ تھا جیسے الجزائر، آسٹریا اور خاصی حد تک اٹلی میں ہوا۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں یورپی سیاسی رہنماؤں نے تارکین مخالف جذبات پر ردعمل ظاہر کرنے کے سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش شروع کردی۔ فرانس میں ژاق شیراک نے ۱۹۹۰ء میں اعلان کیا کہ ''نقلِ مکانی مکمل طور پر بند ہونی چاہیے۔'' وزیر داخلہ چارلس پاسکا نے ۱۹۹۳ء میں ''صفر ترک وطن'' کی بات کی اور فرانکوئی متراں، ایڈتھ کریسن، ویلری گیسکارڈ دیستاں اور مرکزی دھارے کے دوسرے سیاستدانوں نے نقلِ مکانی کے خلاف موقف اختیار کرلیا۔ ۱۹۹۳ء کے پارلیمانی انتخابات میں ترکِ وطن بڑا مسئلہ تھا اور بظاہر قدامت پسند جماعتوں کی فتح کا جزوی سبب بنا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں کے دوران فرانسیسی حکومت کی پالیسی میں تبدیلیاں ہوئیں اور غیرملکیوں کے بچوں کے لیے شہریت کا حصول، غیرملکیوں کے خاندانوں کے لیے ترک وطن، غیرملکیوں کے لیے پناہ کا حق مانگنا اور الجزائریوں کے فرانس آنے کے لیے ویزوں کا حصول مشکل بنادیا گیا۔ غیرقانونی تارکین کو بے دخل کیا گیا، پولیس اور نقل مکانی سے متعلق دوسرے سرکاری اداروں کے اختیارات بڑھا دیے گئے۔

جرمنی میں چانسلر ہیلمٹ کوہل اور دوسرے سیاسی رہنماؤں نے بھی نقل مکانی کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا اور سب سے اہم قدم یہ اٹھایا گیا کہ حکومت نے جرمن دستور کی شق ۱۶ میں ترمیم کردی جس میں ''سیاسی بنیادوں پر معتوب افراد'' کو پناہ کی ضمانت دی گئی تھی اور پناہ کے خواہشمند افراد کے لیے سرکاری سہولتیں گھٹا دیں۔ ۱۹۹۲ء میں ۴۳۸۰۰۰ افراد پناہ کے لیے جرمنی آئے؛ ۱۹۹۴ء میں صرف ۱۲۷۰۰۰ آئے۔ ۱۹۸۰ء میں برطانیہ نے تارکین کی تعداد میں بڑی کمی کرکے

اسے ۵۰۰۰۰ سالانہ تک محدود کر دیا اس لیے اس مسئلے پر وہاں جذبات کی شدت اور مخالفت اتنی نہیں تھی جتنی بقیہ یورپ میں۔ تاہم ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۴ء کے درمیان برطانیہ نے ۲۰۰۰۰ سے زائد کی بجائے ۱۰۰۰۰ سے بھی کم طلبگاران پناہ کو قیام کی اجازت دی۔ یورپی یونین کے اندر نقل و حرکت کے لیے رکاوٹیں کم ہوئیں تو برطانوی تشویش غیر یورپی افراد کی آمد پر مرکوز ہوگئی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں مجموعی طور پر مغربی یورپی ممالک غیر یورپی افراد کی نقل مکانی کا مکمل خاتمہ نہیں تو اسے کم سے کم تک لانے کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔

امریکا میں نقلِ مکانی کا مسئلہ یورپ کی نسبت بعد میں منظر عام پر آیا اور اس سے اس شدت کے جذبات بھی پیدا نہیں ہوئے۔ امریکا ہمیشہ تارکین کا ملک رہا ہے، اس نے خود کو اسی رنگ میں دیکھا بھی ہے اور تاریخی اعتبار سے نئے آنے والوں کے گھلنے ملنے کا عمل یہاں بہت کامیاب رہا ہے۔ مزید برآں، ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں کے دوران امریکا میں یورپ کی بہ نسبت بے روزگاری خاصی کم تھی اور نقلِ مکانی سے متعلق رویوں کو تشکیل دینے میں ملازمتوں سے محرومی فیصلہ کن عامل نہ تھا۔ امریکا نقلِ مکانی کرنے والے افراد بھی یورپ کے مقابلے میں زیادہ متنوع تھے اور کسی ایک غیر ملکی گروہ کی زد میں آنے کا خوف قومی سطح پر اتنا زیادہ نہ تھا، گو کہ کچھ علاقوں میں تھا۔ تارکین کے دو سب سے بڑے گروہوں اور مقامی معاشرے کے درمیان ثقافتی فاصلہ بھی یورپ کی بہ نسبت کم تھا: میکسیکن کیتھولک اور اسپینی بولنے والے ہیں؛ فلپائنی کیتھولک اور انگریزی بولنے والے ہیں۔

ان عوامل کے باوجود ۱۹۶۵ء کے اس قانون کی منظوری کے بعد جس کے تحت ایشیائی اور لاطینی امریکی نقلِ مکانی میں بہت اضافے کی اجازت دے دی گئی تھی، چوتھائی صدی میں امریکی رائے عامہ میں فیصلہ کن تبدیلی آئی۔ ۱۹۶۵ء میں صرف ۳۳ فیصد افراد نقلِ مکانی میں کمی کے حامی تھے جبکہ ۱۹۷۷ء میں ۴۲ فیصد، ۱۹۸۶ء میں ۴۹ فیصد اور ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء میں ۶۳ فیصد افراد نقلِ مکانی میں کمی کی حمایت کر رہے تھے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں ہونے والے پولز میں مسلسل ۶۰ فیصد یا زائد افراد نے نقلِ مکانی میں کمی کی حمایت کی ہے[2] اگرچہ معاشی مسائل اور معاشی حالات تارکین سے متعلق رویوں کو متاثر کرتے ہیں تاہم تمام اچھے اور برے حالات میں بڑھتی ہوئی مخالفت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ثقافت، جرائم اور طرزِ حیات رائے کی اس تبدیلی میں زیادہ اہم عوامل تھے۔ ایک مبصر نے ۱۹۹۴ء میں کہا کہ ''بہت سے بلکہ شاید زیادہ تر امریکی اپنی قوم کو ابھی تک یورپی آباد کاروں کے ملک کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس کے قوانین انگلینڈ کا ورثہ ہیں، جس کی زبان انگریزی ہے (اور رہنی چاہیے)، جس کے ادارے اور سرکاری ادارے مغربی کلاسیکی روایات سے متاثر ہوتے

ہیں، جس کے مذہب کی یہودی عیسائی جڑیں ہیں اور جس کی ابتدا میں عظمت پروٹسٹنٹ اخلاقیاتِ کار سے ابھری۔'' ان خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے، رائے عامہ کے ایک سروے میں ۵۵ فیصد افراد نے کہا کہ ان کے خیال میں نقلِ مکانی امریکی ثقافت کے لیے خطرہ ہے۔ یورپی تو اسے مسلم یا عرب خطرے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں مگر امریکی اسے لاطینی امریکی اور ایشیائی بلکہ بنیادی طور پر میکسیکن خطرے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی ایک رائے شماری میں اس سوال کے جواب میں کہ امریکا میں کن ملکوں کے افراد سب سے زیادہ داخل ہو رہے ہیں، میکسیکو کا نام لینے والوں کی تعداد دوسرے ملکوں کے مقابلے میں دگنی تھی اور اس کے بعد بالترتیب کیوبا، مشرق (ملک کے تعین کے بغیر)، جنوبی امریکا اور لاطینی امریکا (ملک کے تعین کے بغیر)، جاپان، ویت نام، چین اور کوریا کا نام لیا گیا۔[۲۸]

۱۹۹۰ء کے عشرے کے آغاز میں نقلِ مکانی کی بڑھتی ہوئی مخالفت یورپ جیسے ایک سیاسی ردعمل کا محرک بنی۔ امریکا کے سیاسی نظام کی نوعیت کے باعث دائیں بازو کی اور نقلِ مکانی کی مخالف جماعتوں کو ووٹ نہیں ملے مگر نقلِ مکانی کے خلاف مہم چلانے والے گروپوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور یہ گروہ زیادہ فعال ہو گئے۔ تلخی اور مخالفتوں کا ہدف زیادہ تر ۳۵ سے ۴۰ لاکھ غیر قانونی تارکین تھے اور سیاستدانوں نے ردعمل کا اظہار کیا۔ یورپ کی طرح طاقتور ترین ردعمل ریاستی اور مقامی سطحوں پر تھا جو تارکین کے زیادہ تر اخراجات کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ نتیجتاً ۱۹۹۴ء میں فلوریڈا نے غیر قانونی تارکین کی تعلیم، بہبود، نفاذ قانون کی خدمات اور دوسرے اخراجات پورے کرنے کے لیے وفاقی حکومت پر ۸۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر سالانہ کا دعویٰ دائر کر دیا اور چھ دیگر ریاستوں نے اس کی تقلید کی۔ کیلیفورنیا میں، جہاں مطلق اور متناسب اعداد کے لحاظ سے تارکین کی سب سے زیادہ تعداد ہے، گورنر پیٹ ولسن نے غیر قانونی تارکین کے بچوں کو سرکاری تعلیم کی سہولت نہ دینے، امریکا میں پیدا ہونے والے غیر قانونی تارکین کی اولاد کو شہریت دینے سے انکار اور ریاست کی جانب سے غیر قانونی تارکین کے لیے ہنگامی طبی نگہداشت کا خرچ بند کرنے پر زور دے کر عوامی حمایت حاصل کی۔ نومبر ۱۹۹۴ء میں کیلیفورنیا کے لوگوں نے تجویز نمبر ۱۸۷ کثرت رائے سے منظور کر لی جو غیر قانونی تارکین اور ان کے بچوں کو صحت، تعلیم اور بہبودی سہولتوں نہ دینے کے بارے میں تھی۔

۱۹۹۴ء میں ہی کلنٹن انتظامیہ نے اپنے پچھلے موقف کے برعکس نقلِ مکانی کے بارے میں سختی کرنے، سیاسی پناہ کے قواعد کو سخت بنانے، امیگریشن اینڈ نیچرلائزیشن سروس میں توسیع کرنے، سرحدی گشت بڑھانے اور میکسیکن سرحد پر رکاوٹیں تعمیر کرنے کے سلسلے میں اقدامات کیے۔ ۱۹۹۵ء

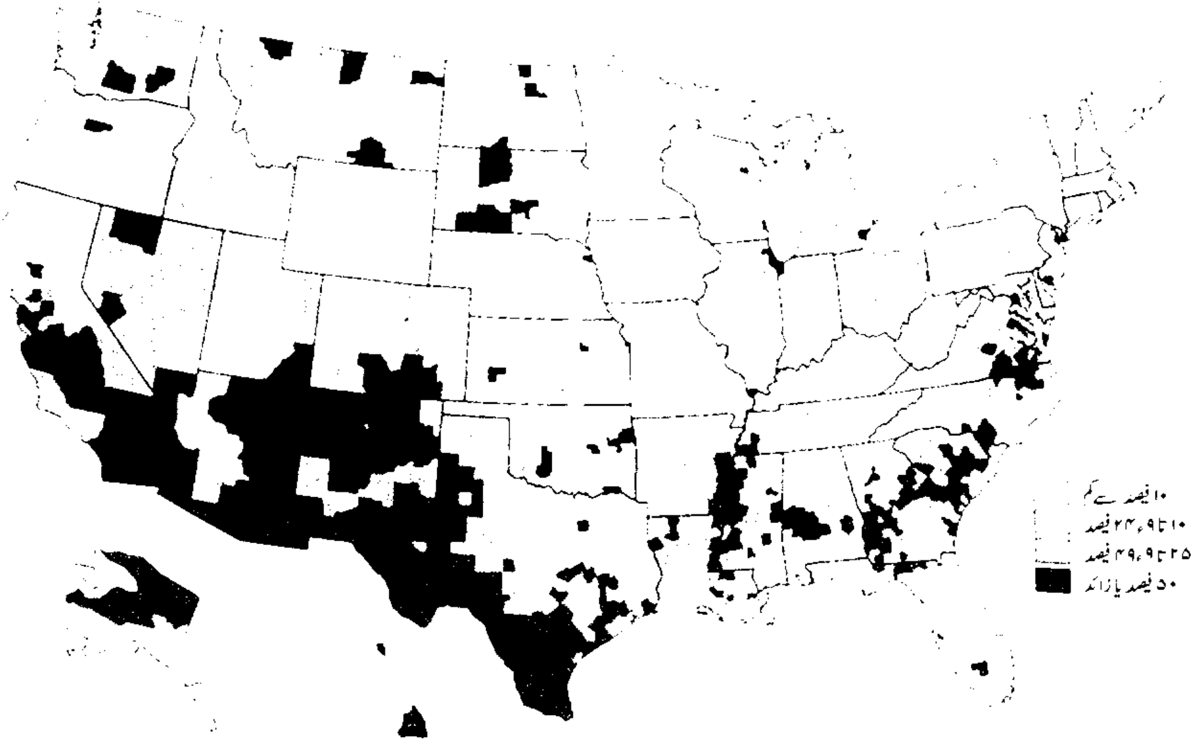
میں کمیشن آن امیگریشن ریفارم نے، جس کی ۱۹۹۰ء میں کانگریس نے توثیق کی تھی، قانونی نقلِ مکانی ۸۰۰۰۰۰ سالانہ سے کم کر کے ۵۵۰۰۰۰ تک لانے کی سفارش کی اور موجودہ شہریوں اور مقیم افراد کے کمسن بچوں اور شریک حیات کے سوا کسی اور رشتہ دار کو ترجیح نہ دینے کی بات کی۔ اس شرط سے ''ایشیائی نژاد امریکیوں اور ہسپانوی نسل کے خاندانوں میں اشتعال پھیل گیا''۔[۲۹] ۹۶-۱۹۹۵ء میں کمیشن کی بہت سی سفارشات اور نقلِ مکانی کو محدود کرنے والے دوسرے اقدامات کے سلسلے میں کانگریس میں قانون سازی ہو رہی تھی۔ اس طرح ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط تک نقلِ مکانی امریکا میں اہم سیاسی مسئلہ بن چکا تھا اور ۱۹۹۶ء میں پیٹرک بکانن نے اپنی صدارتی مہم میں نقلِ مکانی کی مخالفت کو ایک مرکزی نکتہ بنایا۔ معاشرے سے غیر مغربی افراد کا داخلہ بہت کم کرنے میں امریکا یورپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔

کیا یورپ یا امریکا تارکین کی تیز لہر کو روک سکیں گے؟ فرانس کو آبادیاتی قنوطیت کا اہم تجربہ ہوا ہے جو ۱۹۷۰ء کے عشرے کے ژاں راسپیل کے ناول سے لے کر ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ژاں کلاد شیسنائی کے علمی تجزیے تک پھیلا ہوا ہے اور ۱۹۹۱ء میں پیری لیلوشے کے تبصرے میں اس کا نچوڑ موجود ہے: ''تاریخ، قربت اور غربت سے یہ ضمانت ملتی ہے کہ جنوب کے ناکام معاشروں کے افراد کی یلغار فرانس اور یورپ کا مقدر ہے۔ یورپ کا ماضی یہودی عیسائی تھا، مستقبل نہیں''۔☆[۳۰] تاہم مستقبل حتمی طور پر طے نہیں ہوتا، نہ ہی کوئی ایک مستقبل مستقل ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ آیا یورپ اسلامی ہو جائے گا یا امریکا پر ہسپانوی نسل کے لوگ غالب آ جائیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آیا یورپ اور امریکا شکستہ ممالک بن جائیں گے جن میں دو مختلف تہذیبوں کی نمایاں طور پر ممتاز اور الگ تھلگ آبادیاں ہوں گی، اور اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تارکین کی کتنی تعداد آتی ہے اور وہ کس حد تک یورپ اور امریکا کی موجودہ ثقافتوں میں رچ بس جاتی ہے۔

یورپی معاشرے یا تو تارکین کو گھلنے ملنے نہیں دینا چاہتے یا اس میں انہیں سخت دشواری پیش

☆ راسپیل کا *Le Camp des Saints* پہلی بار ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا (پیرس، ایڈیشنز رابرٹ لیفرنٹ) اور ۱۹۸۵ء میں جب فرانس میں نقلِ مکانی سے متعلق تشویش میں اضافہ ہوا تو اس کا نیا ایڈیشن جاری ہوا۔ ۱۹۹۴ء میں جب یہ تشویش امریکا میں بڑھی تو ڈرامائی انداز میں میتھیو کونیلی اور پال کینیڈی نے امریکیوں کی توجہ اس ناول کی طرف دلائی۔ ملاحظہ ہو مضمون بعنوان ''کیا دیگر سب کا مغرب کے خلاف ہونا ضروری ہے؟'' *Atlantic Monthly* جلد ۲۷۴ (دسمبر ۱۹۹۴ء)، صفحات ۶۱ اور اس سے آگے، اور *The Social Contract* جلد ۴ (سرما ۱۹۹۳-۹۴ء) میں صفحات ۱۱۵ تا ۱۱۷ پر راسپیل کے ۱۹۸۵ء کے فرانسیسی ایڈیشن کا دیباچہ انگریزی میں شائع ہوا۔

سیاہ فام، ایشیائی، اصل امریکی یا ہسپانوی النسل افراد کی متوقع آبادی ۲۰۲۰ء میں، بلحاظ کاؤنٹی



آ رہی ہے اور یہ واضح نہیں کہ مسلمان تارکین اور ان کی اولاد کس درجے تک رچنا بسنا چاہتی ہے۔ لہٰذا مسلسل اچھی خاصی تعداد میں نقل مکانی کے نتیجے میں عیسائی اور مسلمان آبادیوں میں منقسم ممالک کے جنم لینے کا امکان ہے۔ اس نتیجے سے وہیں تک بچنا ممکن ہے جس حد تک یورپی حکومتیں اور عوام ان تارکین کو محدود کرنے کی صورت میں پڑنے والا بوجھ برداشت کرنے پر آمادہ ہوں جن میں نقلِ مکانی کے اقدامات پر براہ راست لاگت، موجودہ تارکین کی برادریوں کو مزید الگ تھلگ کرنے کے سماجی نقصانات اور لیبر کی قلت اور کم شرح ہائے نمو کے ممکنہ طویل المیعاد معاشی نقصانات شامل ہیں۔

بہرکیف مسلمانوں کی آبادیاتی یلغار کا مسئلہ اس وقت کم ہونے کا امکان ہے جب شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے معاشروں میں آبادی میں اضافے کی شرحیں نقطہ عروج پر پہنچیں گی جیسا کہ بعض ملکوں میں پہنچ بھی گئی ہیں، اور زوال پذیر ہونا شروع ہوں گی۔[۳۱] جہاں تک آبادیاتی دباؤ ترکِ وطن کا محرک بنتا ہے، اس حد تک مسلمانوں کی نقلِ مکانی ۲۰۲۵ء تک خاصی کم ہو جانے کا امکان ہے۔ یہ بات افریقہ میں صحرائے اعظم کے جنوب کے علاقوں کے لیے درست نہیں۔ اگر اقتصادی ترقی ہوئی اور اس نے مغربی اور وسطی افریقہ میں سماجی تحرک کو فروغ دیا تو نقلِ مکانی کی ترغیبات اور مواقع بڑھ جائیں گے اور یورپ میں ''اسلامائزیشن'' کے خطرے کے بعد ''افریقنائزیشن'' کا خطرہ آ جائے گا۔ اس خطرے کے حقیقت بننے کا انحصار اس پر ہے کہ افریقی آبادی کس درجہ ایڈز اور دیگر وبائی بیماریوں کی وجہ سے کم ہوتی ہے اور ملک جنوبی افریقہ میں براعظم افریقہ کے دوسرے علاقوں کے کتنے تارکین آتے ہیں۔

مسلمان یورپ کے لیے فوری مسئلہ ہیں تو میکسیکن امریکا کے لیے۔ اگر فرض کیا جائے کہ موجودہ رجحانات اور پالیسیاں جاری رہیں گی تو امریکی آبادی جیسا کہ جدول ۸ء۲ کے اعداد و شمار میں دکھایا گیا ہے، اکیسویں صدی کے پہلے پچاس برسوں میں ڈرامائی تغیرات آئیں گے اور وہ تقریباً ۵۰ فیصد سفید فام اور ۲۵ فیصد ہسپانوی النسل ہو جائے گی۔ یورپ کی طرح نقل مکانی کی پالیسی میں تبدیلیوں اور ترک وطن کے خلاف اقدامات کے مؤثر نفاذ سے یہ تخمینے بدل سکتے ہیں۔ تب بھی مرکزی مسئلہ یہ رہے گا کہ ہسپانوی النسل افراد کس حد تک امریکی معاشرے کا حصہ بنتے ہیں جیسے تارکین کے پچھلے گروہ بنتے رہے ہیں۔ ہسپانوی النسل افراد کی دوسری اور تیسری پیڑھی کے ایسا کرنے کے لیے متعدد ترغیبات اور دباؤ موجود ہیں۔ دوسری طرف میکسیکن نقلِ مکانی اور دوسری نقل مکانیوں میں اہم فرق ہیں۔ اول، یورپ یا ایشیا کے تارکین سمندر پار کرتے ہیں؛ میکسیکن باشندے پیدل سرحد پار کرتے ہیں یا دریا پار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں نقل وحمل اور مواصلات کے

جدول ۲ء۸
امریکی آبادی بلحاظ نسل اور نسلیت (فیصد میں)

	۱۹۹۵	۲۰۲۰ تخمیناً	۲۰۵۰ تخمیناً
غیر ہسپانوی النسل سفید فام	۷۴ فیصد	۶۴ فیصد	۵۳ فیصد
ہسپانوی النسل	۱۰	۱۶	۲۵
سیاہ فام	۱۲	۱۳	۱۴
ایشیائی اور بحرالکاہل کے جزائر کے باشندے	۳	۶	۸
امریکی ہندی اور الاسکا کے مقامی باشندے	۱>	۱>	۱
مجموعی (ملین میں)	۲۶۳	۳۲۳	۳۹۴

ماخذ: یو ایس بیورو آف دی سنسس Population Projections of the United States by Age, Sex, Race, and Hispanic Origin: 1995 to 2050 (واشنگٹن: امریکی گورنمنٹ پرنٹنگ آفس، ۱۹۹۶ء) صفحات ۱۲، ۱۳۔

ذرائع کی بڑھتی ہوئی سہولتوں نے انہیں اپنی آبائی برادریوں سے قریبی روابط اور شناخت قائم رکھنے کے قابل بنا دیا ہے۔ دوم، میکسیکن تارکین ریاست ہائے متحدہ امریکا کے جنوب مغربی علاقے میں مرتکز ہیں اور ایک مسلسل میکسیکن معاشرے کا حصہ ہیں جو یوکاٹن سے کولوریڈو تک پھیلی ہوئی ہے (دیکھئے نقشہ ۱ء۸)۔ سوم، بعض شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقامی رنگ میں رچنے بسنے کے خلاف مزاحمت میکسیکن تارکین میں دوسرے تارکین سے زیادہ ہے اور یہ کہ میکسیکن اپنی میکسیکن شناخت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ ۱۹۹۴ء میں کیلیفورنیا میں تجویز نمبر ۱۸۷ پر ہونے والی کشمکش سے ظاہر ہوا۔ چہارم، انیسویں صدی کے وسط میں میکسیکو کو شکست دینے کے بعد امریکا نے میکسیکن تارکین کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ میکسیکن اقتصادی ترقی تقریباً لازمی طور پر میکسیکو کے لوگوں میں اپنے علاقے کی واپسی کے لیے جذبات پیدا کرے گی۔ وقت آنے پر انیسویں صدی میں امریکی عسکری توسیع کے نتائج اکیسویں صدی میں میکسیکن آبادیاتی توسیع کے باعث مخدوش ہوجائیں گے اور ممکنہ طور پر الٹ نتائج بھی برآمد ہوسکتے ہیں۔

تہذیبوں کے مابین طاقت کا بدلتا ہوا توازن ہتھیاروں کے پھیلاؤ، انسانی حقوق، نقلِ مکانی اور دیگر امور کے حوالے سے مغرب کے لیے اپنے اہداف حاصل کرنا مشکل سے مشکل تر بنتا جارہا ہے۔ اس صورتحال میں اپنے نقصانات کم سے کم کرنے کے لیے مغرب کو دوسرے معاشروں سے

تعلقات میں اپنے معاشی وسائل کا ترغیبات اور دھمکیوں کی حیثیت سے استعمال مہارت سے کرنا ہوگا، اپنے اندر ایکا پیدا کرنا ہوگا اور پالیسیوں کو اس طرح ہم آہنگ کرنا ہوگا کہ دوسرے معاشرے ایک مغربی ملک کو دوسرے سے نہ لڑا سکیں اور غیر مغربی اقوام کے درمیان اختلافات کو بڑھانا اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا ہوگا۔ اس حکمت عملی پر چلنے کی مغرب کی صلاحیت کا انحصار ایک طرف چیلنج کرنے والی تہذیبوں کے ساتھ اس کے تنازعات کی نوعیت اور شدت پر ہے اور دوسری طرف اس بات پر ہے کہ مغرب کس حد تک درمیانی (swing) تہذیبوں کے ساتھ خود کو شناخت کرسکتا ہے اور ان کے ساتھ مشترک مفادات پروان چڑھا سکتا ہے۔

نواں باب

تہذیبوں کی عالمی سیاست

مرکزی ریاستیں اور رخنہ تنازعات

تہذیبیں حتمی و آخری انسانی قبیلے ہیں اور تہذیبوں کا تصادم عالمی پیمانے پر قبائلی تنازع ہے۔ ابھرتی ہوئی دنیا میں دو مختلف تہذیبوں کی ریاستیں اور گروہ کسی تیسری تہذیب کے خلاف اپنے مفادات کی ترویج یا کسی اور مشترکہ مقصد کے لیے محدود، عارضی، روابط اور اتحاد قائم کرسکتے ہیں۔ تاہم مختلف تہذیبوں کے گروہوں کے مابین تعلقات تقریباً کبھی قریبی نہیں ہوں گے، عموماً سرد مہری پر مبنی اور اکثر مخالفانہ ہوں گے۔ مختلف تہذیبوں کے وہ روابط جو ماضی کا ورثہ ہیں جیسے سرد جنگ کے دور کے فوجی اتحاد، کم یا ختم ہوجانے کا امکان ہے۔ قریبی بین التہذیبی ''شراکت داریوں'' کی امیدیں جیسے روس اور امریکا کے رہنماؤں نے ظاہر کی تھیں، حقیقت کا روپ نہیں دھار سکیں گی۔ اب جو بین التہذیبی روابط ابھر رہے ہیں وہ عام طور پر کشیدہ سے لے کر تشدد تک مختلف درجوں کے ہوں گے اور بیشتر ان دونوں مدارج کے درمیان ہوں گے۔ بسا اوقات یہ تعلقات اس ''سرد امن'' کے قریب قریب ہوں گے جس کے بارے میں بورس یلسن نے کہا تھا کہ یہ روس اور مغرب کے روابط کا مستقبل ہوسکتا ہے۔ دیگر بین التہذیبی تعلقات ''سرد جنگ'' کی کیفیت کے قریب قریب ہوسکتے ہیں۔ *la guerra fria* کی اصطلاح تیرہویں صدی کے اسپینیوں نے بحیرۂ روم میں مسلمانوں کے ساتھ اپنی ''تکلیف دہ بقائے باہمی'' کو بیان کرنے کے لیے وضع کی تھی اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں

بہت سے حلقوں نے اسلام اور مغرب کے درمیان پھر ایک ''تہذیبی سرد جنگ'' کو سر اٹھاتے دیکھا۔ تہذیبوں کی دنیا میں مذکورہ اصطلاح صرف اسی تعلق کی نمائندگی نہیں کرے گی۔ سرد امن، سرد جنگ، تجارتی جنگ، نیم جنگ، تکلیف دہ امن، کشیدہ تعلقات، شدید مخاصمت، مسابقانہ بقائے باہمی، اسلحے کی دوڑ: یہ تراکیب مختلف تہذیبوں کی اکائیوں کے درمیان روابط کی وضاحت کریں گے۔ بھروسا اور دوستی شاذونادر ہی دیکھنے میں آئے گی۔

بین التہذیبی تنازعے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ مقامی سطح پر رخنہ تنازعات ہوتے ہیں جو مختلف تہذیبوں کی پڑوسی ریاستوں، ایک ہی ریاست کے اندر مختلف تہذیبوں کے گروہوں کے درمیان اور ایسے گروہوں کے درمیان، جیسے سابق سوویت یونین اور یوگوسلاویہ میں، ہوتے ہیں جو پرانی ریاستوں کی ٹوٹ پھوٹ سے نئی ریاستیں وجود میں لانے کے لیے کوشاں ہوں۔ خاص طور پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین رخنہ تنازعات موجود ہیں۔ ان تنازعات کے اسباب اور حرکیات کا دسویں اور گیارہویں ابواب میں جائزہ لیا گیا ہے۔ عالمی سطح پر مختلف تہذیبوں کی اہم ریاستوں کے مابین مرکزی ریاستی تنازعات ہوتے ہیں۔ ان تنازعات میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں وہ بین الاقوامی سیاست میں کلاسیکی نوعیت کے ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

۱) عالمی حالات کو تشکیل دینے میں تقابلی اثر ورسوخ اور اقوام متحدہ، آئی ایم ایف اور عالمی بینک جیسے بین الاقوامی اداروں کے اقدامات؛
۲) تقابلی فوجی قوت جو عدم پھیلاؤ اور تخفیف اسلحہ اور ہتھیاروں کی دوڑ پر تنازعات میں ظاہر ہوتی ہے؛
۳) معاشی قوت اور بہبود جو تجارت، سرمایہ کاری اور دیگر مسائل میں ظاہر ہوتی ہے؛
۴) افراد، کسی تہذیب کی ریاست کی دوسری تہذیب کے قرابت داروں کو تحفظ دینے کی کوششیں، دوسری تہذیب کے افراد کے خلاف امتیاز یا دوسری تہذیب کے افراد کو اپنے علاقے سے خارج کرنے کی کوششیں؛
۵) اقدار اور ثقافت، جس پر تنازعات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کوئی ریاست دوسری تہذیب کے افراد پر اپنی اقدار ٹھونسنے یا فروغ دینے کی کوشش کرتی ہیں؛
۶) کبھی کبھار علاقہ، جس میں مرکزی ریاستیں رخنہ تنازعات میں آگے آگے ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مسائل پوری تاریخ میں انسانوں کے درمیان تنازعات کے اسباب رہے ہیں۔ لیکن جب مختلف تہذیبوں کی ریاستوں کا معاملہ ہو تو ثقافتی اختلافات تنازع کی آگ بھڑکا

دیتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مسابقت میں مرکزی ریاستیں اپنے تہذیبی قرابت داروں کو اکٹھا کرنے، تیسری تہذیب سے مدد لینے، مخالف تہذیبوں میں تفرقہ اور انتشار پیدا کرنے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے سفارتی، سیاسی، اقتصادی اور خفیہ اقدامات، تشہیری ترغیبات اور جبری کارروائیاں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تاہم اس بات کا امکان کم ہوتا ہے کہ مرکزی ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف براہ راست فوجی قوت استعمال کریں سوائے ان صورتوں کے جیسے مشرق وسطٰی یا برصغیر میں رہے ہیں جہاں فریقین تہذیبی رخنوں پر ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ مرکزی ریاستوں کے درمیان جنگیں صرف دو قسم کے حالات میں ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اول، یہ جنگیں مقامی گروپوں کے درمیان رخنہ تنازعات کے بڑھنے سے ابھر سکتی ہیں جب قرابت دار گروہ بشمول مرکزی ریاستیں مقامی جنگجوؤں کی حمایت کے لیے آجاتی ہیں۔ اس امکان سے مخالف تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کے لیے زبردست ترغیب پیدا ہوتی ہے کہ وہ رخنہ تنازعے کو روکنے یا تصفیہ کرنے کی کوشش کریں۔

دوم، مرکزی ریاستوں کے مابین جنگ تہذیبوں کے درمیان طاقت کا عالمی توازن بگڑنے سے بھی بھڑک سکتی ہے۔ یونانی تہذیب کے اندر، جیسا کہ تھوسی ڈائیڈیز نے کہا، ایتھنز کی بڑھتی ہوئی طاقت پیلو پونیشین جنگ پر منتج ہوئی۔ اسی طرح مغربی تہذیب کی تاریخ روبہ عروج و زوال طاقتوں کے درمیان ''بالادستی کی جنگوں'' کی تاریخ ہے۔ مختلف تہذیبوں کی روبہ عروج و زوال طاقتوں کے درمیان تنازعے میں جس حد تک مشابہ عوامل کارفرما ہیں ان کا انحصار جزواً اس بات پر ہے کہ ان تہذیبوں میں نئی ابھرتی ہوئی طاقت سے خود کو ہم آہنگ کرنے کے لیے توازن کا طریقہ اپنایا جاتا ہے یا تقلید کا۔ ہوسکتا ہے کہ ایشیائی تہذیبوں میں تقلید کی خاصیت زیادہ نمایاں ہو، تاہم چینی طاقت کا عروج دوسری تہذیبوں کی ریاستوں جیسے امریکا، بھارت اور روس میں توازن قائم کرنے کی کوششوں کا باعث بن سکتا ہے۔ مغربی تہذیب میں بالادستی کی جو جنگ نہیں ہوئی وہ برطانیہ عظمٰی اور امریکا کے مابین تھی اور Pax Britannica سے Pax Americana☆ کو پر امن منتقلی بڑی حد تک دونوں معاشروں کی ثقافتی قرابت داری کی وجہ سے تھی۔ مغرب اور چین میں اس طرح کی قرابت داری نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں میں جنگ یقینی ہے لیکن جنگ کا امکان زیادہ ضرور ہے۔ اسلام کا تحرک بہت سی نسبتاً مختصر رخنہ جنگوں کا سبب ہے اور چین کا عروج مرکزی ریاستوں کی بڑی

☆ نوٹ از مترجم: رومی شہنشاہ آگسٹس (۲۷ ق م تا ۱۴ء) کے دور سے مارکس آریلیس (۱۶۱ء تا ۱۸۱ء) تک نسبتاً امن وسکون کا زمانہ رہا جسے Pax Romana یا رومی امن کہا جاتا ہے۔ یہاں اسی طرز پر Pax Britannica (برطانوی امن) اور Pax Americana (امریکی امن) کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔

بین التہذیبی جنگ کا ممکنہ سبب ہے۔

اسلام اور مغرب

صدر بل کلنٹن سمیت بعض مغربی باشندوں نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ مغرب کو اسلام سے کوئی پرخاش نہیں بلکہ صرف متشدد اسلامی انتہا پسندوں سے مسائل کا سامنا ہے۔ لیکن چودہ سو سالہ تاریخ کچھ اور کہتی ہے۔ اسلام اور مسیحیت، آرتھوڈوکس اور مغربی مسیحیت دونوں، کے درمیان تعلقات اکثر طوفان خیز رہے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے غیر رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں لبرل جمہوریت اور مارکسسٹ لینن ازم کا تنازع محض عارضی اور سطحی تاریخی واقعہ ہے بمقابلہ اسلام اور عیسائیت کے تعلقات کے، جو مسلسل سخت تنازع پر مبنی رہے ہیں۔ بعض اوقات پرامن بقائے باہمی کی صورتحال رہی لیکن زیادہ تر سخت دشمنی اور مختلف شدت کی جنگ رہی۔ جان ایسپوسٹو نے کہا کہ اپنی ''تاریخی حرکیات کے باعث... دونوں برادریوں نے خود کو طاقت، زمین اور افراد کے مسئلے پر ایک دوسرے کے مقابل، اور بعض اوقات خونریز تصادم میں نبرد آزما پایا''۔[۲] قرنوں سے دونوں مذاہب زبردست شورشوں، وقفوں اور جوابی شورشوں کے سلسلے میں روبہ عروج و زوال رہے ہیں۔

ابتدا میں ساتویں صدی کے آغاز سے آٹھویں صدی کے وسط تک جو عرب اسلامی لہر اٹھی اس نے شمالی افریقہ، آئبیریا، مشرق وسطیٰ، ایران اور شمالی ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت قائم کر دی۔ لگ بھگ دو صدیوں کے لیے اسلام اور عیسائیت کے درمیان خطوط تقسیم مستحکم ہو گئے۔ پھر گیارہویں صدی کے اواخر میں عیسائیوں نے مغربی بحیرۂ روم کے خطوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا، صقلیہ کو فتح کیا اور طولیدو ہتھیا لیا۔ ۱۰۹۵ء میں عالمِ مسیحیت نے صلیبی جنگیں شروع کیں اور ڈیڑھ صدی تک عیسائی حکمراں مشرق قریب میں بیت المقدس اور ملحقہ علاقوں پر مسیحی اقتدار قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے جس میں کامیابی بتدریج کم ہوتی گئی اور ۱۲۹۱ء میں عکرہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، جو وہاں ان کا آخری گڑھ تھا۔ اس دوران عثمانی ترک نمودار ہوئے۔ انہوں نے پہلے بازنطیم کو کمزور کیا اور پھر بلقان نیز شمالی افریقہ کا بہت سا علاقہ تسخیر کر لیا، ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور ۱۵۲۹ء میں ویانا کا محاصرہ کیا۔ برنارڈ لیوس نے تبصرہ کیا ہے کہ ''اسپین میں مورز کی آمد سے لے کر ترکوں کی جانب سے ویانا کے دوسرے محاصرے تک تقریباً ایک ہزار سال یورپ اسلام سے مسلسل خطرے میں تھا''۔[۳] اسلام واحد تہذیب ہے جس نے مغرب کی بقا کو مشکوک بنایا ہے اور یہ عمل کم از کم دو بار کیا ہے۔

بہر حال پندرہویں صدی تک موجوں کا رخ بدلنا شروع ہوگیا تھا۔ عیسائیوں نے رفتہ رفتہ آئبیریا پر اقتدار بحال کرلیا۔ یہ کام ۱۴۹۲ء میں غرناطہ میں تکمیل کو پہنچا۔ اس دوران اہلِ یورپ نے بحر پیمائی کے نئے آلات ایجاد کیے جن کی وجہ سے پہلے پرتگالی اور پھر دوسرے ملکوں کے باشندے مسلمانوں کے مرکزی علاقوں کا گھیراؤ کرنے اور بحرِ ہند اور اس سے آگے قدم جمانے میں کامیاب ہوگئے۔ ساتھ ہی روسیوں نے تاتاریوں کی دوصدیوں پر محیط حکمرانی ختم کردی۔ بعد میں عثمانیوں نے ایک اور یورش کی اور ۱۶۸۳ء میں ویانا کا پھر محاصرہ کرلیا۔ وہاں ان کی ناکامی ایک طویل پسپائی کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی جس کے دوران بلقان کی آرتھوڈوکس اقوام کی عثمانی اقتدار سے خود کو آزاد کرنے کی جدوجہد، ہیپس برگ سلطنت کی توسیع اور بحیرۂ اسود اور قفقاز میں روسیوں کی ڈرامائی پیشقدمی سامنے آئی۔ ''عالمِ مسیحیت کا چابک'' لگ بھگ ایک صدی میں ''یورپ کا مردِ بیمار'' بن چکا تھا۔[۴] جنگ عظیم اول کے خاتمے پر برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے آخری وار لگاتے ہوئے جمہوریہ ترکی کے سوا بقیہ عثمانی علاقوں پر اپنا بلاواسطہ یا بالواسطہ اقتدار قائم کرلیا۔ ۱۹۲۰ء تک صرف چار مسلمان ممالک، ترکی، سعودی عرب، ایران اور افغانستان، غیر مسلموں کے اقتدار سے بچے رہے۔

مغربی استعماریت کی پسپائی ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں آہستہ آہستہ شروع ہوئی اور جنگ عظیم دوم کے بعد بہت تیز ہوگئی۔ سوویت یونین کے خاتمے کے نتیجے میں مزید مسلمان معاشرے آزاد ہوئے۔ ایک شمار کے مطابق ۱۷۵۷ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان مسلمانوں کے ۹۲ علاقے غیر مسلم حکومتوں کے زیرِ نگیں آئے۔ ۱۹۹۵ء تک ان میں سے ۶۵ علاقے دوبارہ مسلمانوں کے پاس جاچکے تھے اور ۴۵ آزاد ریاستوں میں مسلمانوں کی غالب آبادی تھی۔ ان بدلتے ہوئے تعلقات کی پرتشدد نوعیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۸۲۰ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیان مختلف مذاہب کی دو ریاستوں میں ہونے والی جنگوں میں سے نصف مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین تھیں۔[۵]

تنازع و تصادم کا یہ سلسلہ جاری رہنے کے اسباب اس طرح کے عارضی مظاہر نہیں جیسے بارہویں صدی کے عیسائی جذبات یا بیسویں صدی کی مسلم بنیاد پرستی۔ اس کا سرچشمہ دونوں مذاہب اور ان کی بنیاد پر قائم تہذیبوں کی نوعیت ہے۔ تنازع کا ایک سبب تو اختلافی تصورات تھے۔ مسلمان یہ تصور رکھتے تھے کہ اسلام ایک طرزِ زندگی ہے جو مذہب اور سیاست کو متحد کرتا ہے جبکہ مغربی عیسائی تصور یہ تھا کہ خدا اور سیزر کے دائرہ ہائے کار الگ الگ ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں کی مشابہتیں بھی تنازع کا باعث تھیں۔ دونوں وحدانیت پرست مذاہب ہیں جو زیادہ خداؤں کو ماننے والوں کے برخلاف، اضافی معبودوں کو آسانی سے قبول نہیں کرسکتے اور دنیا کو ثنویت پر مبنی ''ہم اور وہ'' کی شکل

میں دیکھتے ہیں۔ دونوں آفاقیت کی جانب مائل ہیں اور واحد سچا عقیدہ ہونے کے مدعی ہیں جس سے سارے انسان وابستہ ہوسکتے ہیں۔ دونوں تبلیغی مذاہب ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے پیروکاروں پر نہ ماننے والوں کو راہِ حق پر لانے کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ اسلام ابتدا سے فتوحات کے ذریعے پھیلا اور عیسائیت کو جب جب موقع ملا، وہ بھی اسی طرح پھیلی۔ ''جہاد'' اور ''صلیبی جنگ'' کے متوازی تصورات نا صرف باہم مشابہ ہیں بلکہ ان دونوں مذاہب کو دنیا کے دوسرے ادیان سے متمیز بھی کرتے ہیں۔ اسلام اور عیسائیت نیز یہودیت میں تاریخ کے غایتی نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں جبکہ دوسری تہذیبوں میں گردشی یا سکونی نظریات ہیں۔☆

اسلام اور عیسائیت کے درمیان پُر تشدد تصادم کی کمی بیشی پر آبادی گھٹنے بڑھنے، اقتصادی ترقی، تیکنیکی تبدیلیوں اور مذہبی وابستگی کی شدت کے اثرات پڑتے رہے ہیں۔ ساتویں صدی میں اسلام کے پھیلنے کے ساتھ بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر عربوں کی نقلِ مکانی ہوئی جس کی ''سطح اور رفتار'' کی نظیر نہیں تھی۔ چند صدیوں بعد صلیبی جنگیں گیارہویں صدی کے یورپ میں اقتصادی ترقی، آبادی میں اضافے اور ''کلونیائی☆☆ احیا'' کی پیداوار تھیں جن کے نتیجے میں بڑی تعداد میں امرا اور کسانوں کو بیت المقدس کی طرف پیشقدمی کے لیے متحرک کرنا ممکن ہوگیا۔ ایک بازنطینی مبصر نے لکھا کہ جب پہلی صلیبی جنگ قسطنطنیہ پہنچی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ''پورے مغرب نے، بحیرۂ ایڈریاٹک کے پار آباد غیر مہذب قبائل سمیت پلرز آف ہرکولیس تک اجتماعی نقلِ مکانی شروع کردی ہے اور اپنے تمام ساز وسامان کے ہمراہ ایشیا کے اندر طوفانی یلغار کررہا ہے''۔[6] انیسویں صدی میں آبادی کے زبردست اضافے کے باعث یورپی باشندے اپنے خطے کے باہر ہر طرف ابل پڑے اور تاریخ کی سب سے بڑی نقلِ مکانی ظہور میں آئی جو مسلمانوں کے علاقوں نیز دوسری سرزمینوں میں ہوئی۔

بیسویں صدی کے اواخر میں اسی طرح کے عوامل نے اسلام اور مغرب کے درمیان تنازع کو ہوا دی ہے۔ اول، مسلمانوں کی آبادی بڑھنے سے بے روزگار اور ناراض نوجوانوں کی بڑی تعداد پیدا ہوئی ہے جو اسلام پسندانہ تحریکوں میں کام آتے ہیں، ہمسایہ معاشروں پر دباؤ ڈالتے ہیں اور

☆ نوٹ از مترجم: تاریخ کا غایتی (teleological) نظریہ یہ تصور ہے کہ تاریخی واقعات کے پیچھے مقاصد کارفرما ہیں۔ گردشی (cyclical) نظریہ یہ ہے کہ تاریخ ایک دائرے میں گھوم رہی ہے، ماضی جیسے واقعات پھر ظہور پذیر ہوں گے جبکہ سکونی (static) نظریے کے مطابق دنیا یکساں حالت پر قائم ہے، کوئی تبدیلی رونما نہیں ہورہی۔

☆☆ کلونیائی (Cluniac)، فرانس میں کلونی کے مقام پر وجود میں آنے والے راہبوں کے فرقے سے متعلق۔

مغرب ہجرت کر جاتے ہیں۔ دوم، اسلامی احیا نے مسلمانوں کو مغرب کے مقابلے میں اپنی تہذیب اور اقدار کے ممتاز کردار اور وقعت کے بارے میں نیا اعتماد دیا ہے۔ سوم، ساتھ ہی ساتھ مغرب کی اپنی اقدار اور اداروں کو عام کرنے، فوجی اور اقتصادی بالادستی برقرار رکھنے اور عالم اسلام میں مداخلت کرنے کی کوششوں نے مسلمانوں کے اندر شدید تلخی کو جنم دیا ہے۔ چہارم، کمیونزم کے خاتمے نے مغرب اور اسلام کے ایک مشترکہ دشمن کو منظر سے ہٹا دیا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو خطرہ سمجھنے لگے ہیں۔ پنجم، مسلمانوں اور مغربی باشندوں میں بڑھتے ہوئے روابط اور باہم اختلاط نے دونوں کے اندر اپنی شناخت اور دوسرے سے مختلف ہونے کا نیا احساس پیدا کیا ہے۔ ارتباط اور اختلاط سے یہ اختلافات بھی مزید شدت پکڑ گئے ہیں کہ کسی ملک میں جس پر ایک تہذیب کے افراد کا غلبہ ہو، دوسری تہذیب کے لوگوں کے کیا حقوق ہیں۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں مسلمان اور مسیحی معاشروں دونوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے برداشت میں تیزی سے کمی ہوئی۔

پس اسلام اور مغرب کے پھر شروع ہونے والے تنازعے کے اسباب طاقت اور ثقافت کے بنیادی سوالوں میں مضمر ہیں۔ حاکم کون ہوگا؟ محکوم کون ہوگا؟ لینن کا بیان کردہ سیاست کا مرکزی مسئلہ اسلام اور مغرب کے مابین مقابلے کی جڑ ہے۔ لیکن ایک اور تنازع بھی ہے جسے لینن نے بے معنی خیال کیا ہوتا، یعنی دو مختلف نظریات کے مابین یہ تنازع کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، نتیجتاً کون حق پر ہے اور کون باطل کی راہ پر چل رہا ہے۔ جب تک اسلام اسلام ہے (جو رہے گا) اور مغرب مغرب ہے (جو مشکوک ہے) دو عظیم تہذیبوں اور طرز ہائے حیات کے درمیان یہ اساسی تنازع مستقبل میں ان کے تعلقات کا تعین کرتا رہے گا جیسے گزشتہ چودہ صدیوں سے کرتا رہا ہے۔

ان روابط میں متعدد ایسے ٹھوس مسائل کے باعث مزید طغیانی کیفیت آ رہی ہے جن پر دونوں کے موقف مختلف یا متصادم ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ایک بڑا مسئلہ زمین پر قبضے کا تھا لیکن اب وہ ذرا غیر اہم ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین ہونے والے ۲۸ رخنہ تنازعات میں سے ۱۹ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تھے۔ گیارہ تنازعات میں آرتھوڈوکس عیسائی اور سات میں افریقہ و جنوب مشرقی ایشیا میں مغربی مسیحیت کے پیروکار شامل تھے۔ ان پُر تشدد یا ممکنہ طور پر پُر تشدد تنازعات میں سے صرف ایک براہ راست مغرب اور اسلام کے رخنے پر پیش آیا جو کروٹس اور بوسنیائیوں کے مابین تھا۔ مغربی علاقائی استعمار کے عملاً خاتمے اور اب تک مسلمانوں کے علاقوں کی دوبارہ توسیع کی عدم موجودگی کی وجہ سے جغرافیائی طور پر دونوں ایک دوسرے سے اتنے الگ ہو گئے ہیں کہ بلقان میں صرف چند مقامات پر مغربی اور مسلمان آبادیاں براہ راست ایک

دوسرے کی سرحد پر واقع ہیں۔ پس مغرب اور اسلام کے تنازعات میں علاقے سے زیادہ وسیع تر بین التہذیبی مسائل شامل ہیں جیسے ہتھیاروں کا پھیلاؤ، انسانی حقوق اور جمہوریت، تیل پر قبضہ، نقلِ مکانی، مسلمانوں کی جانب سے دہشت گردی اور مغربی مداخلت۔

سرد جنگ کے بعد اس تاریخی مخاصمت کی بڑھتی ہوئی شدت کو دونوں برادریوں کے ارکان نے بڑے پیمانے پر تسلیم کیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۱ء میں بیری بوزن کے خیال میں اس موقف کے حق میں متعدد وجوہات تھیں کہ ''مغرب اور اسلام کے مابین'' معاشرتی سرد جنگ کی صورتحال ابھر رہی ہے'' جس میں یورپ پیش پیش ہوگا۔''

> اس نئی صورتحال کا تعلق کچھ سیکولر بمقابلہ مذہبی اقدار سے، کچھ عالمِ مسیحیت اور اسلام کے درمیان تاریخی دشمنی سے، کچھ مغربی قوت سے حسد سے، کچھ مشرق وسطیٰ کی نو استعماری تشکیل نو میں مغربی بالادستی پر ناراضی سے اور کچھ پچھلی دو صدیوں میں اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے کار ہائے نمایاں کے درمیان اشتعال انگیز موازنے پر تلخی اور توہین کے احساسات سے ہے۔

مزید برآں، بوزن نے یہ بات کہی کہ'' اسلام کے ساتھ معاشرتی سرد جنگ سے ایک ایسے نازک دور میں جب یورپی یونین کے اتحاد کا عمل جاری ہے، یورپی شناخت کو تقویت ملے گی۔'' لہٰذا '' مغرب میں ایسا خاصا بڑا حلقہ پیدا ہوسکتا ہے جو نا صرف اسلام کے خلاف معاشرتی جنگ کی حمایت کرنے پر بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کے لیے بھی آمادہ ہو۔'' ۱۹۹۰ء میں اسلام کا مطالعہ کرنے والے ایک ممتاز مغربی دانشور برنارڈ لوئیس نے'' مسلمانوں کے اشتعال کی جڑوں'' کا تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا:

> اب یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ ہمیں جس فضا اور تحریک کا سامنا ہے وہ مسائل اور پالیسیوں اور ان پر عمل پیرا حکومتوں کی سطح سے بہت بالاتر ہیں۔ یہ کچھ اور نہیں تہذیبوں کا تصادم ہے-- ہمارے یہودی مسیحی ورثے، ہمارے سیکولر حال اور ان دونوں کی عالمگیر سطح پر توسیع کے خلاف ایک قدیم حریف کا شاید غیر معقول مگر تاریخی ردعمل۔ یہ بڑا ضروری ہے کہ ہم اپنے طور پر مشتعل ہوکر اُس حریف کے خلاف اتنے ہی تاریخی مگر اتنے ہی غیر معقول ردعمل پر نہ اتر آئیں۔[۷]

اسلامی برادری کی جانب سے بھی اسی طرح کی باتیں کہی گئیں۔ صف اول کے مصری صحافی محمد سد احمد نے ۱۹۹۴ء میں کہا کہ'' یہودی مسیحی مغربی اخلاقیات اور احیائے اسلام کی تحریک کے درمیان ایک بڑھتے ہوئے تصادم کی علامات صاف نظر آرہی ہیں، جو اب مغرب میں بحراوقیانوس سے مشرق میں چین تک پھیلا ہوا ہے۔'' ایک ممتاز بھارتی مسلمان نے ۱۹۹۲ء میں کہا کہ مغرب کی'' آئندہ محاذ آرائی لازماً عالم اسلام سے ہوگی۔ مغرب [شمالی افریقہ] سے پاکستان تک اسلامی قوموں میں نئے

عالمی نظام کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوگا۔'' ایک معروف تیونسی وکیل کی نظر میں یہ جدوجہد شروع ہو بھی چکی: ''استعماریت نے اسلام کی تمام ثقافتی روایات کی شکل بگاڑنے کی کوشش کی۔ میں اسلام پسند نہیں۔ میرا یہ خیال نہیں کہ مذاہب کے درمیان تنازع ہے۔ تنازع تہذیبوں کے درمیان ہے''[8]

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں اسلام میں عمومی رجحان مغرب مخالف سمت میں رہا ہے۔ جزوی طور پر یہ اسلامی احیا کا فطری نتیجہ اور مسلمان معاشروں کی ''غرب زدگی'' کے خلاف ردعمل ہے۔ ''اسلام کے اثباتِ نو کا مطلب، خواہ اس کی مخصوص فرقہ وارانہ شکل کچھ بھی ہو، مقامی سماج، سیاست اور اخلاق پر یورپی اور امریکی اثرات کی مذمت ہے''۔[9] ماضی میں بعض موقعوں پر مسلمان رہنماؤں نے اپنے لوگوں سے یہ ضرور کہا کہ: ''ہمیں مغربیت اختیار کرنی ہوگی۔'' لیکن اگر بیسویں صدی کی آخری چوتھائی کے دوران کسی مسلمان رہنما نے یہ بات کہی ہے تو وہ تنہا شخصیت ہے۔ بلکہ کسی بھی مسلمان کی طرف سے چاہے وہ سیاستداں ہو، کوئی عہدیدار ہو، عالم ہو، تاجر ہو یا صحافی ایسے بیانات نہیں ملیں گے جن میں مغربی اقدار اور اداروں کی تعریف کی گئی ہو۔ اس کی بجائے وہ اپنی تہذیب اور مغربی تہذیب کے مابین اختلافات، اپنی ثقافت کی برتری اور مغربی یلغار کے مقابلے میں اپنی ثقافت کی سالمیت برقرار رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ مسلمان مغرب کی طاقت اور اس طاقت سے اپنے معاشرے اور عقائد کو درپیش خطرے سے ڈرتے ہیں۔ وہ مغربی ثقافت کو مادہ پرست، بدعنوان، انحطاط پذیر اور اخلاق باختہ سمجھتے ہیں۔ وہ اسے ورغلانے والی ثقافت بھی خیال کرتے ہیں اور اسی لیے اپنے طور زندگی پر اس کے اثرات کی مزاحمت کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اہلِ مغرب پر مسلمانوں کی زیادہ تر نکتہ چینی اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ ایک نامکمل اور غلط مذہب کے پابند ہیں جو بہرحال ''اہلِ کتاب'' کا مذہب ہے بلکہ اس لیے کہ وہ کسی بھی مذہب کی پیروی نہیں کرتے۔ مسلمانوں کی نظروں میں مغربی سیکولرزم، لادینی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے راہ روی مغربی عیسائیت سے بدتر ہیں جس نے انہیں جنم دیا۔ سرد جنگ میں مغرب نے اپنے مخالف کو ''بے خدا کمیونزم'' قرار دیا؛ مابعد سرد جنگ کے تہذیبوں کے تنازع میں مسلمان اپنے مخالف کو ''بے خدا مغرب'' کے روپ میں دیکھتے ہیں۔

مغرب کے بارے میں یہ تصور کہ وہ مغرور، مادہ پرست، جابر، سفاک اور انحطاط پذیر ہے، نا صرف بنیاد پرست ائمہ کا ہے بلکہ ان حلقوں کا بھی ہے جنہیں مغرب کے بہت سے لوگ اپنے فطری اتحادی اور حمایتی خیال کریں گے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں شائع ہونے والی مسلمان مصنفین کی بہت کم کتابوں کی مغرب میں اتنی تعریف و توصیف کی گئی ہوگی جتنی فاطمہ مرنیسی کی کتاب

Islam and Democracy کی۔ اس کتاب کو اہلِ مغرب نے عموماً ایک جدید، آزاد خیال مسلمان خاتون کا جرأت مندانہ بیان قرار دیا۔ تاہم اس کتاب میں مغرب کی جو عکاسی کی گئی ہے اسے کسی طرح ستائش نہیں کہا جا سکتا۔ مغرب ''عسکریت پسند'' اور ''سامراجیت پسند'' ہے اور اس نے ''نوآبادیاتی دہشت گردی'' سے دوسری اقوام کو ''دھچکے پہنچائے ہیں'' (صفحات ۳، ۹)۔ فرد پرستی جو مغربی ثقافت کا طرۂ امتیاز ہے ''ساری خرابیوں کی جڑ'' ہے (صفحہ ۸)۔ مغربی طاقت خوفناک ہے۔ مغرب ''تنہا یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مصنوعی سیارے عربوں کو تعلیم دینے کے لیے استعمال کیے جائیں گے یا ان پر بمباری کے لیے... اس نے ہماری صلاحیتوں کو کچل دیا ہے اور اپنی درآمد شدہ مصنوعات اور ٹیلی وژن پر دکھائی جانے والی فلموں کے ذریعے، جو فضائی لہروں پر چھائی ہوئی ہیں، وہ ہماری زندگیوں پر یورش کر رہا ہے... [یہ] وہ طاقت ہے جو ہمیں کچل رہی ہے، وہ ہماری منڈیوں کا گھیراؤ کیے ہوئے ہے اور ہمارے معمولی وسائل، صلاحیتوں اور امکانات پر قابض ہے۔ ہم نے اپنی صورتحال کو اسی انداز میں خیال کیا اور جنگ خلیج نے ہمارے خیال کو یقین میں بدل دیا۔'' (صفحات ۱۴۶ تا ۱۴۷)۔ مغرب ''فوجی تحقیق کے ذریعے اپنی طاقت پیدا کرتا ہے'' اور پھر اس تحقیق کی مصنوعات پسماندہ ممالک کو بیچ دیتا ہے جو اس کے ''انفعالی صارفین'' ہیں۔ اس محکومیت سے آزاد ہونے کے لیے اسلام کو اپنے انجینئر اور سائنسداں پیدا کرنے چاہئیں، اپنے ہتھیار بنانے چاہئیں (جوہری یا روایتی، وہ یہ وضاحت نہیں کرتیں) اور ''مغرب پر فوجی انحصار سے خود کو چھڑانا چاہیے'' (صفحات ۴۳ تا ۴۴)۔ پھر کہوں گا کہ یہ خیالات کسی باریش، عباپوش آیت اللہ کے نہیں ہیں۔

مسلمانوں کی سیاسی یا مذہبی آرا کچھ بھی ہوں اس بات پر وہ متفق ہیں کہ ان کی ثقافت اور مغربی ثقافت کے مابین بنیادی اختلافات ہیں۔ جیسا کہ شیخ غانوشی نے کہا ''سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ہمارے معاشروں کی بنیادیں مغرب سے مختلف ہیں۔'' ایک مصری سرکاری عہدیدار نے کہا کہ امریکی ''یہاں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم ان جیسے بن جائیں۔ وہ ہماری اقدار یا ہماری ثقافت کے بارے میں کچھ نہیں سمجھتے۔'' ایک مصری صحافی نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ''ہم مختلف ہیں۔ ہمارا مختلف پس منظر، مختلف تاریخ ہے۔ پس ہم مختلف مستقبل رکھنے کے حقدار ہیں۔'' مسلمانوں کی عام پسند اور علمی اعتبار سے سنجیدہ مطبوعات دونوں میں بار بار ان مبینہ مغربی منصوبوں اور سازشوں کا تذکرہ ہوتا ہے جو اسلامی اداروں اور ثقافت کو محکوم بنانے، ان کی توہین کرنے اور جڑیں اکھاڑنے کے لیے ترتیب دی جا رہی ہیں۔!!

مغرب کے خلاف ردعمل صرف اسلامی احیا کے علمی حلقوں میں نظر نہیں آتا بلکہ مسلمان ملکوں

کی حکومتوں کے مغرب کے بارے میں رویوں کی تبدیلی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ استعماریت کے دور کے فوراً بعد کی حکومتیں بالعموم سیاسی و معاشی نظریات اور پالیسیوں میں مغربی اور خارجہ پالیسیوں میں مغرب نواز تھیں، الجزائر اور انڈونیشیا جیسے ممالک کے جزوی استثنا کے ساتھ جہاں آزادی قوم پرست انقلاب کے نتیجے میں آئی۔ تاہم ایک ایک کر کے مغرب نواز حکومتوں کی جگہ مغرب سے کم وابستگی رکھنے والی یا کھلی مخالف حکومتیں عراق، لیبیا، یمن، شام، ایران، سوڈان، لبنان اور افغانستان میں آ ئیں۔ اس سے کم ڈرامائی تبدیلیاں دوسرے ممالک کی وابستگی اور وفاداری میں بھی آ ئیں جن میں تیونس، انڈونیشیا اور ملائشیا شامل ہیں۔ سرد جنگ کے زمانے کے امریکا کے دو قریب ترین فوجی اتحادی ترکی اور پاکستان داخلی طور پر اسلام پسندوں کے سیاسی دباؤ کا شکار ہیں اور مغرب سے ان کے روابط میں کھچاؤ آتا جا رہا ہے۔

۱۹۹۵ء میں کویت واحد مسلمان ملک تھا جو دس سال پہلے کے مقابلے میں زیادہ مغرب نواز تھا۔ مسلمان دنیا میں مغرب کے قریبی دوست اب یا تو کویت، سعودی عرب اور خلیجی ریاستیں ہیں جو عسکری لحاظ سے مغرب کی محتاج ہیں یا مصر اور الجزائر ہیں جو معاشی لحاظ سے اس پر انحصار کرتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں جب یہ ظاہر ہو گیا کہ سوویت یونین اب مشرقی یورپ کی کمیونسٹ حکومتوں کو اقتصادی وفوجی امداد فراہم نہیں کر سکتا یا نہیں کرے گا تو یہ حکومتیں ختم ہو گئیں۔ اگر یہ ظاہر ہوا کہ اب مغرب اپنی پٹھو حکومتوں کی مزید مدد نہیں کر سکتا تو ان کا بھی یہی انجام ہونے کا امکان ہے۔

مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی مغرب دشمنی کے متوازی مغرب میں ''اسلامی خطرے'' کے بارے میں تشویش بڑھ رہی ہے جو مسلمان انتہا پسندوں کی طرف سے ہے۔ اسلامی دنیا کو جوہری پھیلاؤ، دہشت گردی اور، یورپ میں، بن بلائے تارکین کا گڑھ اور ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ یہ تشویش عوام اور رہنماؤں دونوں میں پائی جاتی ہے۔ نومبر ۱۹۹۴ء میں ۳۵۰۰ امریکیوں سے یہ سوال کیا گیا کہ آیا ''اسلامی احیا'' مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کے لیے خطرہ ہے تو ۶۱ فیصد نے ہاں اور ۲۸ فیصد نے نہیں میں جواب دیا۔ ایک سال قبل جب سوال کیا گیا تھا کہ کون سا ملک امریکا کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے تو ایران، چین اور عراق کے نام سرِ فہرست تھے۔ اسی طرح ۱۹۹۴ء میں امریکا کے لیے ''بڑے خطرات'' کے بارے میں پوچھا گیا تو ۷۲ فیصد عوام اور خارجہ پالیسی کے ۶۱ فیصد رہنماؤں نے 'جوہری پھیلاؤ' جبکہ ۶۹ فیصد عوام اور ۳۳ فیصد رہنماؤں نے بین الاقوامی دہشت گردی کا نام لیا جو اسلام سے منسلک کیے جانے والے دو مسائل ہیں۔ علاوہ ازیں ۳۳ فیصد عوام اور ۳۹ فیصد رہنماؤں نے اسلامی بنیاد پرستی میں ممکنہ اضافے کو خطرہ قرار دیا۔ اہلِ یورپ کے بھی اسی

سے ملتے جلتے رویے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۱ء میں ۵۱ فیصد فرانسیسی عوام نے کہا کہ فرانس کو سب سے بڑا خطرہ جنوب کی طرف سے ہے جبکہ صرف ۸ فیصد نے کہا کہ خطرہ مشرق سے ہے۔ جن چار ملکوں سے فرانسیسی عوام سب سے زیادہ خائف ہیں وہ سب کے سب مسلمان ہیں: عراق، ۵۲ فیصد؛ ایران، ۳۵ فیصد؛ لیبیا، ۲۶ فیصد؛ اور الجزائر، ۲۲ فیصد۔[۱۲] جرمن چانسلر اور فرانسیسی وزیر اعظم سمیت مغربی سیاسی رہنماؤں نے اسی طرح کے تشویش آمیز خیالات ظاہر کیے اور نیٹو کے سیکریٹری جنرل نے ۱۹۹۵ء میں صاف کہہ دیا کہ اسلامی بنیاد پرستی مغرب کے لیے ''کم از کم کمیونزم جتنی خطرناک ہے'' اور کلنٹن انتظامیہ کے ایک ''بہت سینئر رکن'' نے اسلام کو مغرب کا عالمی حریف ٹھہرایا۔[۱۳]

مشرق کی سمت سے فوجی خطرہ تقریباً ختم ہونے کے بعد نیٹو کی منصوبہ بندی کا رخ زیادہ تر جنوب کے ممکنہ خطرات کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ ایک امریکی فوجی تجزیہ نگار نے ۱۹۹۲ء میں تبصرہ کیا کہ ''جنوبی خطہ'' وسطی محاذ کی جگہ لے رہا ہے اور ''تیزی سے نیٹو کا نیا اگلا مورچہ بنتا جا رہا ہے۔'' ان جنوبی خطرات سے نمٹنے کے لیے نیٹو کے جنوبی ارکان اٹلی، فرانس، اسپین اور پرتگال نے مشترکہ فوجی منصوبہ بندی اور کارروائیاں شروع کیں اور ساتھ ہی شمالی افریقہ کی حکومتوں سے اسلامی انتہا پسندوں کا قلع قمع کرنے کے طریقوں پر مشاورت کرنے لگے۔ یہ محسوس خطرات یورپ میں امریکا کی فوجی موجودگی کے تسلسل کا بھی جواز بنے۔ ایک سابق سینئر امریکی عہدیدار نے کہا کہ ''اگرچہ یورپ میں امریکی افواج بنیاد پرست اسلام کے پیدا کردہ ہر مرض کی دوا نہیں تاہم یہ افواج پورے خطے میں فوجی منصوبہ بندی پر گہرا اثر مرتب کرتی ہیں۔ ۹۱-۱۹۹۰ء کی جنگ خلیج میں یورپ سے امریکی، فرانسیسی اور برطانوی افواج کی کامیاب تعیناتی یاد ہے؟ اس خطے کے لوگوں کو یاد ہے''۔[۱۴] اور یہ عہدیدار یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ انہیں یہ بات خوف، تلخی اور نفرت کے جذبات کے ساتھ یاد ہے۔

مسلمانوں اور مغربی باشندوں کے ایک دوسرے کے بارے میں تاثرات نیز اسلامی انتہاپسندی کے ابھار کے پیش نظر یہ امر باعث حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ ۱۹۷۹ء کے انقلاب ایران کے بعد اسلام اور مغرب کے درمیان ایک بین التہذیبی نیم جنگ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ تین وجوہ کی بنا پر یہ نیم جنگ ہے۔ اول، تمام عالم اسلام سارے مغرب سے برسر پیکار نہیں۔ دو بنیاد پرست ممالک (ایران، سوڈان)، تین غیر بنیاد پرست ریاستیں (عراق، لیبیا، شام) اور ان کے ساتھ متعدد اسلام پسند تنظیمیں سعودی عرب جیسے کچھ دوسرے مسلمان ممالک کی مالی امداد سے امریکا اور بعض اوقات برطانیہ، فرانس اور دیگر مغربی ریاستوں اور گروپوں نیز اسرائیل اور بالعموم یہودیوں سے لڑ رہے ہیں۔ دوم، یہ اس لیے نیم جنگ ہے کہ ۹۱-۱۹۹۰ء کی جنگ خلیج کے سوا، یہ لڑائی محدود وسائل

سے لڑی جاتی رہی ہے: ایک جانب دہشت آمیز کارروائیاں اور دوسری جانب فضائی طاقت، خفیہ کارروائیاں اور اقتصادی پابندیاں۔ سوم، یہ اس لیے نیم جنگ ہے کہ تشدد جاری رہا ہے لیکن مسلسل نہیں۔ اس میں ایک طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف اقدامات اور دوسری جانب سے اس پر جوابی کارروائیاں سامنے آتی رہی ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود نیم جنگ بہرحال جنگ ہے۔ جنوری فروری ۱۹۹۱ء میں مغربی بمباری سے ہلاک ہونے والے ہزاروں عراقی فوجیوں اور عام شہریوں کو چھوڑ کر بھی ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور ۱۹۷۹ء کے بعد تقریباً ہر سال یہ واقعات ہوتے رہے ہیں۔ اس نیم جنگ میں جتنے مغربی باشندے ہلاک ہوئے ہیں اتنے خلیج میں ''حقیقی'' جنگ میں بھی نہیں ہوئے تھے۔

علاوہ ازیں فریقین نے اس تنازعے کو جنگ تسلیم کیا ہے۔ خمینی نے پہلے ہی بجا طور پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ ''ایران عملاً امریکا سے حالتِ جنگ میں ہے''[۱۵] اور قذافی باقاعدگی سے مغرب کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے انتہا پسند گروہوں اور ریاستوں کے مسلمان رہنما بھی اسی طرح کے بیانات دیتے رہے ہیں۔ ادھر مغرب میں، امریکا نے سات ملکوں کو ''دہشت گرد ریاستیں'' قرار دیا ہے جن میں سے پانچ مسلمان (ایران، عراق، شام، لیبیا، سوڈان) اور کیوبا اور شمالی کوریا بقیہ دو ہیں۔ یوں انہیں دشمن کی حیثیت دے دی گئی ہے کیونکہ وہ امریکا اور اس کے دوستوں پر اپنے مؤثر ترین ہتھیاروں سے حملے کر رہے ہیں اور اس طرح ان کے ساتھ حالتِ جنگ کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ امریکی عہدیدار بار بار ان ممالک کو ''ناجائز''، ''بدمعاش'' اور ''غنڈہ'' ریاستیں کہتے ہیں اور یوں انہیں مہذب بین الاقوامی نظام سے باہر قرار دیتے ہیں اور اجتماعی یا تنہا جوابی اقدامات کا جائز ہدف ٹھہراتے ہیں۔ امریکی حکومت نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بم سے حملہ کرنے والوں پر جو فرد جرم عائد کی اس کے مطابق وہ ''امریکا کے خلاف شہری دہشت گردی کی جنگ شروع کرنے'' کا ارادہ رکھتے تھے اور یہ استدلال کیا کہ جن سازشیوں کو مین ہٹن میں بموں کے مزید حملے کرنے کا کام سونپا گیا تھا وہ امریکا کے خلاف ''جنگ'' کے ''سپاہی'' تھے۔ اگر مسلمان الزام لگاتے ہیں کہ مغرب اسلام کے خلاف جنگ کر رہا ہے اور اگر مغربی باشندے الزام لگاتے ہیں کہ اسلامی گروہ مغرب کے خلاف جنگ کر رہے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرنا معقول معلوم ہوتا ہے کہ جنگ جیسی کوئی صورتحال چل رہی ہے۔

اس نیم جنگ میں دونوں فریقوں نے اپنی قوتوں اور دوسرے کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ فوجی اعتبار سے یہ زیادہ تر دہشت گردی بمقابلہ فضائی طاقت کی جنگ رہی ہے۔ اسلامی

عسکریت پسند مغرب کے کھلے معاشروں کا فائدہ اٹھا کر منتخب اہداف میں کار بم نصب کر دیتے ہیں۔ مغربی فوجی ماہر اسلامی ملکوں کی کھلی فضاؤں کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور منتخب اہداف پر اسمارٹ بم پھینکتے ہیں۔ اسلامی جہادی اہم مغربی باشندوں کے قتل کے منصوبے ترتیب دیتے ہیں تو امریکا انتہا پسند اسلامی حکومتوں کو گرانے کے منصوبے بناتا ہے۔ امریکی محکمہ دفاع کے مطابق ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۵ء کے درمیان پندرہ برسوں میں امریکا نے مشرقِ وسطیٰ میں سترہ فوجی کارروائیاں کیں جو سب کی سب مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ کسی اور تہذیب کے لوگوں کے خلاف امریکی فوجی کارروائیوں کا اس طرح کا سلسلہ نہیں ہوا۔

آج تک جنگ خلیج کے سوا فریقین نے تشدد کی شدت کو بہت کم سطح پر رکھا ہے اور متشدد کارروائیوں کو جنگ کی کارروائیاں کہنے سے گریز کیا ہے جن کے لیے بھرپور جوابی اقدام درکار ہوتا ہے۔ اکنامسٹ جریدے نے کہا ''اگر لیبیا نے اپنی کسی آبدوز کو امریکی جہاز ڈبونے کا حکم دیا تو امریکا اسے ایک حکومت کی جنگی کارروائی قرار دے گا، آبدوز کے کمانڈر کی حوالگی کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ اصولاً لیبیا کی سیکرٹ سروس کی جانب سے ایک طیارے پر بم سے حملہ اس سے مختلف نہیں''۔[۱۶] اس جنگ کے شرکا ایک دوسرے کے خلاف اس سے زیادہ تشدد آمیز طریقے استعمال کر رہے ہیں جتنے سرد جنگ میں امریکا اور سوویت یونین نے ایک دوسرے کے خلاف براہ راست استعمال کیے تھے۔ اکا دکا واقعات کے سوا دونوں سپر طاقتوں نے ایک دوسرے کے شہریوں بلکہ فوجیوں تک کو قصداً ہلاک نہیں کیا لیکن نیم جنگ میں مسلسل ایسا ہو رہا ہے۔

امریکی رہنماؤں کا کہنا ہے کہ اس نیم جنگ میں برسرِ پیکار مسلمان چھوٹی سی اقلیت ہیں جسے اعتدال پسند مسلمانوں کی بڑی اکثریت مسترد کرتی ہے۔ یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن اس کے حق میں شواہد نہیں۔ مغرب دشمن تشدد کے خلاف مسلمان ممالک میں احتجاجی مظاہرے بالکل دیکھنے میں نہیں آئے۔ جب مغرب کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیوں کی مذمت کرنے کا موقع آتا ہے تو مسلمان حکومتیں، بلکہ وہ حکومتیں تک جو مغرب کی دوست اور اس کی محتاج ہیں، بہت پس و پیش کرتی ہیں۔ دوسری طرف یورپی حکومتوں اور عوام نے مسلمان حریفوں کے خلاف امریکی اقدامات پر شاذ ہی تنقید کی ہے جبکہ سرد جنگ کے دوران وہ سوویت یونین اور کمیونزم کے خلاف امریکی کارروائیوں کی اکثر مخالفت کرتے رہے۔

مغرب کے لیے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں۔ یہ مسئلہ اسلام ہے، ایک مختلف تہذیب جس کے افراد کو اپنی ثقافت کی برتری کا یقین اور اپنی طاقت کی کمتری کا شدید احساس ہے۔ اسلام کا

مسئلہ سی آئی اے یا امریکی محکمہ دفاع نہیں۔ یہ مسئلہ مغرب ہے، ایک مختلف تہذیب جس کے افراد کو اپنی ثقافت کی آفاقیت پر یقین ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی برتر طاقت، جو خواہ زوال پذیر ہو، ان پر اس ثقافت کو پوری دنیا میں پھیلانے کا فریضہ عائد کرتی ہے۔ یہ وہ اساسی اجزا ہیں جو اسلام اور مغرب کے درمیان تنازعے کو ہوا دیتے ہیں۔

ایشیا، چین اور امریکا

تہذیبوں کا کڑھاؤ۔ ایشیا، علی الخصوص مشرقی ایشیا میں ہونے والے اقتصادی تغیرات بیسویں صدی کے نصف آخر میں دنیا کی اہم ترین تبدیلیوں میں شامل ہیں۔ ان تغیرات نے ۱۹۹۰ء کی دہائی تک بہت سے مبصرین میں معاشی خوش امیدی کا ایک رجحان پیدا کر دیا تھا جنھوں نے مشرقی ایشیا اور بحر الکاہل کی پوری پٹی کو مسلسل وسعت پذیر تجارتی خطے کی حیثیت سے دیکھا جو اقوام کے مابین امن و ہم آہنگی کا ضامن ہوگا۔ یہ خوش امیدی اس بے حد مبہم مفروضے پر قائم تھی کہ تجارتی لین دین ہمیشہ امن کو جنم دیتا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ اقتصادی ترقی ملکوں کے اندر اور ملکوں کے درمیان سیاسی عدم استحکام پیدا کرتی ہے اور ملکوں اور خطوں کے مابین طاقت کا توازن تبدیل کر دیتی ہے۔ معاشی لین دین سے لوگ رابطے میں آتے ہیں، متفق نہیں ہوتے۔ تاریخ میں اس سے اکثر اقوام کے درمیان اختلافات کا احساس بڑھا ہے اور باہمی خوف نے جنم لیا ہے۔ ملکوں کے مابین تجارت تنازع نیز منافع پیدا کرتی ہے۔ اگر ماضی کے تجربات کی اہمیت ہے تو معاشی طور پر چمکنے والا ایشیا، سیاسی سایوں والے ایشیا کو جنم دے گا، عدم استحکام اور تنازعے والے ایشیا کو۔

ایشیا کی اقتصادی ترقی اور ایشیائی معاشروں کی بڑھتی ہوئی خود اعتمادی کم از کم تین طریقوں سے بین الاقوامی سیاست کو منتشر کر رہی ہے۔ اول، اقتصادی ترقی ایشیائی ممالک کو اپنی فوجی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے قابل بنا رہی ہے، ان ملکوں کے مابین آئندہ کے تعلقات کے حوالے سے بے یقینی کو فروغ دے رہی ہے اور سرد جنگ کے دوران دبا دیے جانے والے مسائل اور مخاصمتوں کو سطح پر لا رہی ہے اور اس طرح تنازع اور خطے میں عدم استحکام کے امکانات بڑھا رہی ہے۔ دوم، معاشی ترقی ایشیائی معاشروں اور مغرب، خصوصاً امریکا کے درمیان تنازعات کی شدت میں اضافہ کر رہی ہے اور اس کشمکش میں ایشیائی معاشروں کے غالب آنے کی اہلیت بڑھا رہی ہے۔ سوم، ایشیا کی سب سے بڑی طاقت کی اقتصادی نمو سے خطے میں چین کا اثر و رسوخ پھیل رہا ہے اور امکان پیدا

ہو رہا ہے کہ چین مشرقی ایشیا میں اپنی روایتی بالادستی کا دوبارہ اثبات کرے گا اور دوسری اقوام چین کی اندھی تقلید یا اس کے اثرات کو روکنے کے لیے توازن قائم کرنے کی کوششوں پر مجبور ہوں گی۔

مغربی حاکمیت کی کئی صدیوں کے دوران بین الاقوامی امور مغربی کھیل کے سوا کچھ نہ تھے جو بڑی مغربی طاقتوں کے درمیان کھیلا جا رہا تھا جس میں کسی حد تک اٹھارہویں صدی میں روس اور بیسویں صدی میں جاپان شامل ہوگیا۔ طاقتوں کے تنازع اور تعاون کا اصل میدان یورپ تھا۔ حتیٰ کہ سرد جنگ کے دوران بھی سپر طاقتوں کی محاذ آرائی کا گڑھ عین یورپ تھا۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں بین الاقوامی امور کا کوئی میدان ہے تو وہ ایشیا خاص طور پر مشرقی ایشیا ہے۔ ایشیا تہذیبوں کا گڑھ ہے۔ صرف مشرقی ایشیا میں چھ تہذیبوں-- جاپانی، صینی، آرتھوڈوکس، بدھ، مسلم اور مغربی سے تعلق رکھنے والے معاشرے ہیں اور جنوبی ایشیا میں ہندومت بھی ہے۔ چار تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں، جاپان، چین، روس اور امریکا مشرقی ایشیا میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جنوبی ایشیا بھارت کا اضافہ کرتا ہے جبکہ انڈونیشیا ابھرتی ہوئی مسلمان طاقت ہے۔ مزید برآں، مشرقی ایشیا میں بڑھتی ہوئی معاشی قوت کی حامل اوسط درجے کی کئی طاقتیں ہیں جیسے جنوبی کوریا، تائیوان اور ملائشیا نیز امکانی طور پر مضبوط ویت نام۔ اس کا نتیجہ انتہائی پیچیدہ بین الاقوامی تعلقات کی صورت میں نکلتا ہے جس کا موازنہ اس ساری بے یقینی اور سیال پن کے ساتھ جو کثیر قطبی صورت ہائے حال میں ہوتا ہے متعدد پہلوؤں سے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے یورپ سے کیا جاسکتا ہے۔

مشرقی ایشیا کی کثیر طاقتی، کثیر تہذیبی نوعیت اسے مغربی یورپ سے متمیز کرتی ہے اور اقتصادی و سیاسی اختلافات اس تضاد کو مزید نمایاں کرتے ہیں۔ مغربی یورپ کے تمام ممالک مستحکم جمہوریتیں ہیں، منڈی کی معیشتیں رکھتے ہیں اور اقتصادی ترقی کی اعلیٰ سطحوں پر ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں مشرقی ایشیا میں ایک مستحکم جمہوریت، کئی نئی اور غیر مستحکم جمہوریتیں، دنیا میں باقی رہ جانے والی پانچ کمیونسٹ آمریتوں میں سے چار، نیز فوجی حکومتیں، شخصی آمریتیں اور یک جماعتی جابرانہ نظام موجود ہیں۔ اقتصادی ترقی کی سطحیں جاپان اور سنگاپور سے لے کر ویت نام اور کوریا تک بہت مختلف ہیں۔ منڈی کی معیشت اور اقتصادی کھلا پن اپنانے کی طرف عمومی رجحان موجود ہے مگر شمالی کوریا کی سرکاری کے ماتحت چلائی جانے والی معیشت سے لے کر ہانگ کانگ کی بالکل آزاد معیشت تک ہر طرح کے معاشی نظام ہیں جن میں ریاست کا دخل اور نجی کاروباری اداروں کا کردار مختلف تناسبوں میں ہے۔

مغربی یورپ کی طرح ایک بین الاقوامی نظام (برطانوی مفہوم میں) مشرقی ایشیا میں کبھی

موجود نہیں رہا سوائے اس کے کہ بعض اوقات چینی بالادستی نے کبھی کبھار خطے میں وقتی استحکام پیدا کر دیا۔[۱۷] بیسویں صدی کے اواخر میں یورپ بین الاقوامی اداروں کے ایک غیر معمولی طور پر پیچیدہ سلسلے میں بندھا ہوا ہے جن میں یورپی یونین، نیٹو، مغربی یورپی یونین، کونسل آف یورپ، تنظیم برائے سلامتی و تعاون در یورپ اور دیگر ادارے شامل ہیں۔ مشرقی ایشیا میں آسیان کے سوا ایسا کوئی ادارہ نہیں اور اس میں بھی کوئی بڑی طاقت شامل نہیں۔ مشرقی ایشیا عموماً سلامتی کے امور سے گریزاں رہا ہے اور اقتصادی اتحاد کی انتہائی خام صورتوں کی طرف پیشرفت ابھی شروع ہی کی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں خاصی وسیع تر تنظیم ایپک (APEC) وجود میں آئی جس میں بحرالکاہل کی پٹی کے بیشتر ممالک شامل تھے لیکن یہ آسیان سے بھی کمزور موقف کی حامل ثابت ہوئی۔ کوئی اور بڑا کثیر جہتی ادارہ نہیں جس میں اہم ایشیائی طاقتیں اکٹھی ہوگئی ہوں۔

مغربی یورپ کے برخلاف مشرقی ایشیا میں ریاستوں کے مابین نفاق کے بیج بہت ہیں۔ دو مقامات جنہیں بڑے پیمانے پر خطرناک قرار دیا گیا ہے دو کوریا اور دو چین ہیں۔ مگر یہ سرد جنگ کی باقیات ہیں۔ نظریاتی اختلافات کی اہمیت گھٹ رہی ہے اور ۱۹۹۵ء تک دونوں چین کے درمیان تعلقات خاصے وسیع ہو چکے تھے اور دونوں کوریاؤں کے مابین پروان چڑھنے لگے تھے۔ کوریائیوں کے کوریائیوں سے لڑنے کے امکانات ہیں مگر کم؛ چینیوں کے چینیوں سے لڑنے کے امکانات کچھ زیادہ ہیں مگر پھر بھی محدود ہیں تاوقتیکہ تائیوانی اپنے چینی تشخص کو مسترد کر کے باقاعدہ طور پر ایک آزاد جمہوریہ تائیوان بنانے کا اعلان نہ کر دیں۔ جیسا کہ ایک چینی فوجی دستاویز میں تعریفی انداز میں ایک جنرل کے فقرے کا حوالہ دیا گیا ''کنبے کے افراد کے درمیان جھگڑے کی حدود ہونی چاہئیں''۔[۱۸] اگرچہ دونوں کوریاؤں اور دونوں چینیوں کے درمیان تشدد ممکن ہے تاہم ثقافتی اشتراک اس امکان کو رفتہ رفتہ ختم کر دے گا۔

مشرقی ایشیا میں سرد جنگ سے ورثے میں ملنے والے تنازعات کی جگہ دیگر ممکنہ تنازعات لے رہے ہیں جو پرانی دشمنیوں اور نئے معاشی تعلقات کے آئینہ دار ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں مشرقی ایشیا کے سلامتی کے تجزیوں میں باقاعدگی سے اس خطے کو ''خطرناک علاقہ''، ''دشمنی کے لیے تیار''، ''کئی سرد جنگوں'' کا خطہ، ''اُس مستقبل کی طرف گامزن'' علاقہ جس میں جنگ اور عدم استحکام کا دور دورہ ہوگا، قرار دیا گیا۔[۱۹] مغربی یورپ کے برخلاف مشرقی ایشیا میں ۱۹۹۰ء کے عشرے میں غیر تصفیہ شدہ سرحدی تنازعات ہیں جن میں سب سے اہم شمالی جزائر پر روس اور جاپان کے درمیان اور چین، ویت نام اور فلپائن کے مابین اور ممکنہ طور پر بحیرۂ جنوبی چین پر جنوب مشرقی ایشیائی

ریاستوں کے درمیان ہیں۔ چین کے روس اور بھارت سے سرحدی تنازعات ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں کم ہوگئے لیکن دوبارہ سامنے آسکتے ہیں جیسے منگولیا پر چین کے دعوے سے آئے ہیں۔ منڈاناؤ، مشرقی تیمور، تبت، جنوبی تھائی لینڈ اور مشرقی میانمار میں شورشیں یا علیحدگی پسند تحریکیں ہیں جنہیں زیادہ تر بیرونِ ملک سے امداد مل رہی ہے۔ مزید برآں، ہرچند مشرقی ایشیا میں ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں ریاستوں کے مابین امن قائم ہے تاہم گزشتہ پچاس برس میں کوریا اور ویت نام میں بڑی جنگیں ہوچکی ہیں اور ایشیا کی مرکزی قوت چین امریکیوں سے نیز اپنے تقریباً تمام ہمسایوں بشمول کوریائیوں، ویت نامیوں، قوم پرست چینیوں، بھارتیوں، تبتیوں اور روسیوں سے لڑچکی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں چینی فوج کے ایک تجزیے میں آٹھ علاقائی مخدوش مقامات کی نشاندہی کی گئی جو چین کی فوجی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں اور چینی مرکزی فوجی کمیشن نے نتیجہ اخذ کیا کہ مشرقی ایشیا میں سلامتی کی عمومی صورتحال ''بہت سنگین'' ہے۔ صدیوں کی جنگ و جدل کے بعد مغربی یورپ پرامن ہے اور جنگ کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ مشرقی ایشیا میں ایسا نہیں ہے اور، جیسا کہ ایرون فریڈبرگ نے کہا، یورپ کا ماضی ایشیا کا مستقبل ہوسکتا ہے۔[20]

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں اقتصادی تحرک، سرحدی تنازعات، دوبارہ زندہ ہونے والی دشمنیوں اور سیاسی بے یقینیوں کے باعث مشرقی ایشیائی فوجی بجٹوں اور عسکری صلاحیتوں میں خاصے اضافے ہوئے۔ اپنی نئی دولت اور بہت سی صورتوں میں تعلیم یافتہ آبادی کو استعمال کر کے مشرقی ایشیائی حکومتوں نے بڑی، ناقص سازوسامان سے لیس ''کسان'' افواج کو نسبتاً چھوٹی، پیشہ ور، اعلیٰ تیکنیکی اہلیت کی حامل فوجوں میں بدل دیا ہے۔ مشرقی ایشیا میں امریکی وابستگی کے بارے میں شکوک وشبہات بڑھنے کے ساتھ خطے کے ممالک فوجی خود انحصاری کی طرف چل پڑے ہیں۔ مشرقی ایشیائی ریاستیں یورپ، امریکا اور سابق سوویت یونین سے اسلحہ درآمد تو کرتی رہی ہیں لیکن اس ٹیکنالوجی کو ترجیح دے رہی ہیں جو انہیں ملک کے اندر اعلیٰ درجے کے طیارے، میزائل اور الیکٹرانک آلات بنانے میں مدد دے۔ جاپان، اور صینی ریاستیں یعنی چین، تائیوان، سنگاپور اور جنوبی کوریا کی اسلحہ صنعتیں زیادہ سے زیادہ جدید ترین ہتھیاروں سے مزین ہوتی جارہی ہیں۔ مشرقی ایشیا کے ساحلی جغرافیہ کے پیش نظر ان کا زورِ قوت کی رسائی اور فضائی و بحری صلاحیتوں پر رہا ہے۔ نتیجتاً وہ اقوام بھی ایک دوسرے سے لڑنے کے قابل ہوتی جارہی ہیں جو پہلے نہیں تھیں۔ فوجی قوت میں یہ اضافے شفاف طریقے سے نہیں ہوئے اور اس سے شکوک اور بے یقینی نے جنم لیا ہے۔[21] طاقت کے بدلتے رشتوں کی صورتحال میں لازماً اور جائز طور پر ہر حکومت یہ سوچتی ہے: ''آج سے دس سال بعد کون

میرا دشمن ہوگا اور کون دوست؟''

ایشیائی امریکی سرد جنگیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے شروع میں امریکا اور ایشیائی ممالک کے درمیان، ویت نام کو چھوڑ کر تعلقات زیادہ سے زیادہ مخاصمانہ ہوتے چلے گئے اور ان تنازعات میں امریکا کے غالب رہنے کی اہلیت کم ہوتی گئی خاص کر مشرقی ایشیا میں بڑی طاقتوں کے حوالے سے یہ رجحانات نمایاں تھے اور چین اور جاپان سے امریکی روابط متوازی خطوط پر آگے بڑھے۔ ایک جانب امریکی اور دوسری جانب چینی اور جاپانی ایشیائی امریکی سرد جنگوں کی بات کرتے رہے۔[۲۲] بش انتظامیہ میں یہ رجحانات ابھرے اور کلنٹن انتظامیہ میں شدت پکڑ گئے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط تک دونوں بڑی ایشیائی طاقتوں سے امریکا کے تعلقات کو نرم ترین الفاظ میں بھی ''کشیدہ'' کہا جا سکتا تھا اور تناؤ کم ہونے کے امکانات نہ تھے۔☆

۱۹۹۰ء کے عشرے کے آغاز میں متعدد مسائل پر جاپان اور امریکا میں گرما گرمی ہوئی جن میں جنگ خلیج میں جاپان کا کردار، جاپان میں امریکا کی فوجی موجودگی، چین اور دوسرے ملکوں کے بارے میں امریکی انسانی حقوق کی پالیسیوں سے متعلق جاپانی رویہ، امن مشنوں میں جاپان کی شرکت اور سب سے اہم اقتصادی تعلقات خصوصاً تجارت کے حوالے سے شامل تھے۔ تجارتی جنگوں کے حوالے عام ہو گئے۔[۲۳] امریکی اہلکار خاص طور پر کلنٹن انتظامیہ کے عہدیدار جاپان سے زیادہ سے زیادہ رعایات کا مطالبہ کرنے لگے، جاپانی اہلکار ان مطالبات کی زیادہ سے زیادہ قوت سے مزاحمت کرنے لگے۔ جاپان اور امریکا کا ہر تجارتی تنازع پچھلے جھگڑے سے زیادہ تلخ ہو گیا اور تصفیہ دشوار

☆ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کم از کم امریکا میں ملکوں کے روابط کے بارے میں اصطلاحات میں الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ ''اچھے'' تعلقات کو دوستانہ، تعاون پر مبنی تعلقات اور ''خراب'' تعلقات کو مخالفانہ و مخاصمانہ تعلقات سمجھا جاتا ہے۔ اس استعمال میں دو مختلف جہات باہم خلط ملط ہوگئی ہیں: دوستی بمقابلہ دشمنی اور پسندیدگی بمقابلہ ناپسندیدگی۔ اس سے اس خاص امریکی مفروضے کی عکاسی ہوتی ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ہم آہنگی ہمیشہ اچھی اور تصادم ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔ مگر اچھے تعلقات کو دوستانہ تعلقات کہنا صرف اسی صورت میں صحیح ہے جب تصادم کبھی پسندیدہ نہ ہو۔ بیشتر امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ''اچھی'' بات تھی کہ بش انتظامیہ نے کویت کے معاملے پر جنگ کرکے عراق سے امریکی تعلقات ''خراب'' کر لیے۔ اس بارے میں الجھاؤ سے بچنے کے لیے کہ آیا ''اچھے'' کا مطلب پسندیدہ یا ہم آہنگ اور ''خراب'' کا مطلب ناپسندیدہ یا مخاصمانہ ہے، میں ''اچھے'' اور ''خراب'' کے الفاظ صرف پسندیدہ اور ناپسندیدہ کے معانی میں استعمال کروں گا۔ دلچسپ مگر الجھن کی بات یہ ہے کہ اہل امریکا امریکی معاشرے میں آرا، گروہوں، جماعتوں، حکومت کی شاخوں اور کاروباری اداروں کے مابین مسابقت کو درست گردانتے ہیں۔ یہ مسحور کن مسئلہ ہے، جس کا میرے علم کے مطابق کسی نے سنجیدگی سے جائزہ نہیں لیا کہ امریکی اپنے سماج کے اندر تصادم کو اچھا لیکن معاشروں کے درمیان خراب کیوں سمجھتے ہیں۔

سے دشوار تر ہوگیا۔ مثال کے طور پر مارچ ۱۹۹۴ء میں صدر کلنٹن نے ایک حکم پر دستخط کیے جس کے تحت انہیں جاپان کے خلاف سخت تر پابندیاں عائد کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا جس پر نا صرف جاپانیوں نے بلکہ دنیا کی اہم ترین تجارتی تنظیم گیٹ (GATT) کے سربراہ نے بھی احتجاج کیا۔ کچھ عرصہ بعد جاپان نے امریکی پالیسیوں پر زوردار حملہ کیا اور تھوڑے دن بعد امریکا نے ''باضابطہ طور پر جاپان پر الزام لگایا'' کہ وہ سرکاری ٹھیکے دینے میں امریکی کمپنیوں کے خلاف امتیاز برت رہا ہے۔ ۱۹۹۵ء کے موسمِ بہار میں کلنٹن انتظامیہ نے جاپان کی پُرتعیش کاروں پر سو فیصد ٹیرف عائد کرنے کی دھمکی دی جس پر عمل ہونے سے عین قبل ایک معاہدہ طے پا گیا اور ایسا نہ ہو سکا۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی جنگ سے قریبی مشابہت رکھنے والے معاملات چل رہے تھے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط تک تلخی اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ جاپان کی صف اول کی سیاسی شخصیات نے جاپان میں امریکی فوج کی موجودگی پر اعتراض کرنا شروع کر دیا۔

ان برسوں میں دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے مخالف ہوتے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں ۸۷ فیصد امریکی عوام جاپان کے بارے میں عموماً دوستانہ رویہ رکھتے تھے۔ ۱۹۹۰ء تک یہ شرح گر کر ۶۷ فیصد ہوچکی تھی، ۱۹۹۳ء میں صرف ۵۰ فیصد امریکی جاپان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور تقریباً دو تہائی نے کہا وہ جاپانی مصنوعات خریدنے سے گریز کرتے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ۷۳ فیصد جاپانیوں نے امریکا جاپان تعلقات کو دوستانہ قرار دیا جبکہ ۱۹۹۳ء میں ۶۴ فیصد نے ان تعلقات کو غیر دوستانہ ٹھہرایا۔ سرد جنگ کے خول سے نکلنے کے حوالے سے ۱۹۹۱ء کا سال رائے عامہ میں تبدیلی کا اہم موڑ تھا۔ اس سال دونوں ملکوں نے سوویت یونین کی جگہ ایک دوسرے کو مقابل تصور کیا۔ امریکیوں نے پہلی بار جاپان کو سوویت یونین سے بڑھ کر امریکی سلامتی کے لیے خطرہ کہا اور جاپانیوں نے پہلی بار امریکا کو سوویت یونین سے بڑھ کر جاپان کی سلامتی کے لیے خطرہ کہا۔[۲۴]

عوامی رویوں کے ساتھ اعلیٰ طبقات کے تصورات میں تبدیلیاں آئیں۔ امریکا میں اہلِ علم، اہلِ دانش اور اہلِ سیاست کا ایک اہم اصلاح پسند گروہ سامنے آیا جس نے دونوں ملکوں کے ثقافتی اور تشکیلی اختلافات کو اجاگر کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اقتصادی مسائل پر جاپان سے معاملہ کرنے میں زیادہ سخت موقف اختیار کیا جائے۔ ذرائع ابلاغ، نان فکشن مطبوعات اور عام پسند ناولوں میں جاپان کی توہین آمیز انداز میں عکاسی کی جانے لگی۔ دوسری طرف جاپان میں سیاسی رہنماؤں کی ایک نئی نسل ابھری جسے امریکی طاقت اور جنگ عظیم دوم کے بعد مہربانی کا تجربہ نہیں ہوا تھا، جو جاپانی معاشی ترقی پر نازاں تھے اور اپنے بزرگوں کے برخلاف امریکی مطالبات کی مزاحمت کرنے کو تیار تھے۔

امریکا میں ''اصلاح پسندوں'' کے مقابلے پر جاپان میں ''مزاحمت کنندگان'' تھے اور دونوں ملکوں میں انتخابی امیدواروں نے محسوس کیا کہ جاپانی امریکی تعلقات کے حوالے سے سخت موقف اختیار کرنا ووٹروں میں مقبولیت کا باعث بنے گا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آغاز میں چین سے امریکا کے تعلقات مخاصمانہ ہوتے چلے گئے۔ جیسا کہ ڈینگ ژیاؤپنگ نے ستمبر ۱۹۹۱ء میں کہا، دونوں ملکوں کے درمیان تنازعات ''نئی سرد جنگ'' ہیں۔ اس اصطلاح کو چینی اخبارات نے بہت استعمال کیا۔ اگست ۱۹۷۹ء میں حکومت کی پریس ایجنسی نے اعلان کیا کہ ''دونوں ملکوں میں سفارتی روابط قائم ہونے کے بعد سے اب تک چین امریکا تعلقات سب سے نچلی سطح پر ہیں۔'' چینی حکام باقاعدگی سے چینی امور میں مبینہ مداخلت کی مذمت کرتے رہے۔ ۱۹۹۲ء کی ایک چینی سرکاری اندرونی دستاویز میں کہا گیا کہ ''ہمیں نشاندہی کرنی چاہیے کہ امریکا واحد سپر طاقت بننے کے بعد نئی بالادستی اور طاقت کی سیاست کے لیے بے چینی سے ہاتھ پیر مار رہا ہے اور یہ بھی کہ اس کی قوت زوال پذیر ہے اور اس کی کچھ کر سکنے کی صلاحیت محدود ہوتی جا رہی ہے۔'' صدر جیانگ زیمن نے اگست ۱۹۹۵ء میں کہا کہ ''دشمن مغربی قوتوں نے ہمارے ملک کو مغرب زدہ بنانے اور 'تقسیم' کرنے کے لیے ایک لمحے کے لیے بھی ریشہ دوانیاں ترک نہیں کی ہیں۔'' ۱۹۹۵ء تک چینی رہنماؤں اور دانشوروں میں اس مسئلے پر وسیع تر اتفاق رائے تھا کہ امریکا ''چین کو علاقائی اعتبار سے بانٹنے، سیاسی طور پر تباہ کرنے، عسکری لحاظ سے محدود کرنے اور اقتصادی حوالے سے ناکام بنانے'' کی کوشش کر رہا ہے۔[۲۵]

ان تمام الزامات کے شواہد موجود تھے۔ امریکا نے تائیوان کے صدر لی کو امریکا آنے کی اجازت دی، تائیوان کو ۱۵۰ ایف سولہ طیارے فروخت کیے، تبت کو ''مقبوضہ خودمختار علاقہ'' قرار دیا، انسانی حقوق کی پامالی پر چین کی مذمت کی، بیجنگ کو ۲۰۰۰ء کے اولمپک کھیلوں کی میزبانی نہ کرنے دی، ویت نام سے تعلقات معمول پر لایا، چین پر ایران کو کیمیائی ہتھیاروں کے پرزے دینے کا الزام عائد کیا، پاکستان کو میزائل کا ساز و سامان فروخت کرنے پر چین پر تجارتی پابندیاں لگائیں اور مزید اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن میں چین کو داخل ہونے سے روکا۔ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر بدنیتی کا الزام لگایا: امریکیوں کے مطابق چین نے میزائل کی برآمدات، املاک دانش (intellectual property) کے حقوق اور جیلوں میں لیبر سے متعلق معاہدوں کی خلاف ورزی کی۔ چینیوں کے مطابق امریکا نے صدر لی کو امریکا آنے کی اجازت دے کر اور تائیوان کو اعلیٰ درجے کے لڑاکا طیارے بیچ کر معاہدوں کی خلاف ورزی کی۔

چین میں سب سے اہم گروہ جس کا امریکا کے بارے میں مخاصمانہ نقطہ نظر تھا، فوج تھی جس نے امریکا سے سخت برتاؤ کرنے کے لیے حکومت پر بظاہر باقاعدگی سے دباؤ ڈالا۔ جون ۱۹۹۳ء میں سو چینی جنرلوں نے ڈینگ کو ایک خط بھیجا جس میں امریکا کے حوالے سے حکومت کی ''انفعالی'' پالیسی اور چین کو ''بلیک میل'' کرنے کی امریکی کوششوں کی مزاحمت نہ کرنے کی شکایت کی۔ اُس سال کے موسمِ خزاں میں ایک خفیہ چینی سرکاری دستاویز میں فوج کی طرف سے امریکا سے تنازعے کی وجوہ بیان کی گئی تھیں: ''چونکہ چین اور امریکا کے مختلف نظریات، سماجی نظاموں اور خارجہ پالیسیوں پر پرانے تنازعات ہیں اس لیے چین امریکا تعلقات کو بنیادی طور پر بہتر بنانا ناممکن ثابت ہوگا۔'' چونکہ امریکی سمجھتے ہیں کہ مشرقی ایشیا ''عالمی معیشت کا گڑھ بن جائے گا... اس لیے امریکا مشرقی ایشیا میں کسی طاقتور حریف کو برداشت نہیں کرسکتا''[۲۶] ۱۹۹۰ء کے عشرے کے وسط تک چینی حکام اور اداروں کی جانب سے امریکا کو مخالف طاقت قرار دینا معمول ہو چکا تھا۔

چین اور امریکا کے درمیان بڑھتی ہوئی مخاصمت کا محرک جزوی طور پر دونوں ملکوں کی داخلی پالیسی تھی۔ جیسا کہ جاپان کے معاملے میں ہوا، امریکی آرا بٹی ہوئی تھیں۔ ہیئت مقتدرہ کی بہت سی شخصیات نے چین سے تعمیری تعلقات پیدا کرنے، اقتصادی روابط بڑھانے اور چین کو اقوام کی نام نہاد برادری میں لانے کی بات کی۔ کچھ اور حلقوں نے امریکی مفادات کو درپیش ممکنہ چینی خطرات پر زور دیا اور کہا کہ چین سے مفاہمانہ رویہ رکھنے سے منفی نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ انہوں نے مضبوطی سے چین کے اثرات کو محدود کرنے کی پالیسی کی حمایت کی۔ ۱۹۹۳ء میں امریکی عوام نے ایران کے بعد چین کو امریکا کے لیے دوسرا خطرناک ترین ملک قرار دیا۔ امریکی سیاست اکثر اس طرح کام کرتی رہی کہ علامتی اقدامات کیے گئے جیسے لی کا کورنیل کا دورہ اور دلائی لامہ سے کلنٹن کی ملاقات، جن سے چین سخت مشتعل ہوا، اور ساتھ ہی امریکی انتظامیہ معاشی مفادات کی خاطر انسانی حقوق کو قربان کرتی رہی جیسے پسندیدہ ترین قوم (MFN) قرار دینے کے معاملے میں ہوا۔ دوسری طرف چین میں حکومت کو چینی قوم پرستی کے نعرے کو پرکشش بنانے اور اپنے اقتدار کا جواز فراہم کرنے کے لیے نئے دشمن کی ضرورت تھی۔ جانشینی کی کشمکش نے طول پکڑا تو فوج کے سیاسی اثر و رسوخ میں اضافہ ہوگیا اور صدر جیانگ اور ڈینگ کے بعد حصول اقتدار کے متمنی دوسرے رہنما چینی مفادات کے فروغ میں نرمی نہیں برت سکتے تھے۔

یوں ایک عشرے کے دوران جاپان اور چین دونوں سے امریکا کے تعلقات ''زوال پذیر'' ہو گئے۔ ایشیائی امریکی تعلقات میں یہ تغیر اس قدر وسیع اور اتنے مختلف مسائل پر محیط تھا کہ اس کے

اسباب ایک جانب گاڑیوں کے پرزوں، کیمروں کی فروخت اور فوجی ٹھکانوں یا دوسری جانب منحرفین کی اسیری، ہتھیاروں کی منتقلی اور املاک دانش کی چوری جیسے انفرادی تنازعات پر مفادات کے ٹکراؤ میں تلاش نہیں کیے جاسکتے۔ مزید برآں بیک وقت دونوں بڑی ایشیائی طاقتوں سے تعلقات بگاڑ لینا امریکی قومی مفادات کے خلاف تھا۔ سفارتکاری اور طاقت کی سیاست کے اساسی اصولوں کا تقاضا تھا کہ امریکا کو ایک ملک کو دوسرے کے خلاف استعمال کرنا چاہیے اور کم ازکم اگر کسی ایک سے تعلقات خراب ہورہے ہوں تو دوسرے سے بہتر بنانے چاہئیں۔ لیکن یہ نہ ہوا۔ ایشیائی امریکی روابط میں وسیع تر عوامل کام کررہے تھے اور ان روابط میں سامنے آنے والے انفرادی تنازعات کا تصفیہ کرنا دشوارتر تھا۔ اس عمومی مظہر کے کئی عمومی اسباب تھے۔

پہلے یہ کہ ایشیائی معاشروں اور امریکا کے درمیان مواصلات، تجارت، سرمایہ کاری اور ایک دوسرے کے بارے میں معلومات بڑھنے سے ان مسائل اور موضوعات میں اضافہ ہوگیا جہاں مفادات ٹکرا سکتے تھے اور ٹکرائے۔ باہم ربط ضبط بڑھنے سے ہر معاشرہ کو دوسرے کے رواج اور عقائد خطرناک معلوم ہونے لگے جو فاصلے سے منفرد اور بے ضرر محسوس ہوتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں سوویت خطرہ امریکا اور جاپان کے باہمی سلامتی کے معاہدے پر منتج ہوا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں سوویت طاقت میں اضافے کی وجہ سے ۱۹۷۹ء میں امریکا اور چین کے سفارتی تعلقات استوار ہوئے اور اس خطرے سے نمٹنے کے لیے دونوں عارضی بنیادوں پر ایک دوسرے سے تعاون کرنے لگے۔ سرد جنگ کے خاتمے سے امریکا اور ایشیائی طاقتوں کا یہ مشترکہ مفاد ختم ہوگیا اور یہ خلا پُر نہیں ہوا۔ نتیجتاً دوسرے تنازعات جہاں مفادات متصادم ہوسکتے تھے سامنے آگئے۔ تیسرے یہ کہ مشرقی ایشیائی ملکوں کی اقتصادی ترقی نے ان کے اور امریکا کے درمیان طاقت کا مجموعی توازن بدل دیا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے ایشیائیوں نے اپنی اقدار اور اداروں کا اثبات کیا اور مغربی ثقافت کے مقابلے میں اپنی ثقافت کی برتری جتلائی۔ دوسری طرف امریکیوں نے یہ فرض کرلیا کہ خاص طور پر سرد جنگ میں ان کی فتح کے بعد ان کی اقدار اور اداروں کی آفاقی اہمیت ہے اور وہ ایشیائی معاشروں کی خارجہ اور داخلہ پالیسیوں کو تشکیل دینے کی قوت اب بھی رکھتے ہیں۔

یہ بدلتا ہوا بین الاقوامی ماحول ایشیا اور امریکی تہذیبوں کے درمیان بنیادی ثقافتی اختلافات کو سامنے لے آیا۔ وسیع ترین سطح پر ایشیائی معاشروں میں رائج کنفیوشین اخلاقیات میں حاکمیت، درجہ بندی، انفرادی حقوق اور مفادات کی ضمنی حیثیت، اتفاق رائے کی اہمیت، محاذ آرائی سے گریز، ''لاج رکھنا'' اور عمومی طور پر معاشرے اور فرد پر ریاست کی بالادستی پر زور دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں

ایشیائی اپنے معاشروں کے ارتقا کے بارے میں صدیوں اور ہزاریوں کے حوالوں سے سوچتے تھے اور زیادہ سے زیادہ طویل المیعاد فوائد کو ترجیح دیتے تھے۔ ان رویوں کا موازنہ امریکی عقائد میں آزادی، مساوات، جمہوریت اور فرد پسندی کی بنیادی اہمیت سے اور حکومت پر عدم اعتماد، حاکمیت کی مخالفت، توازن قائم رکھنے کی کوششوں، مسابقت کی حوصلہ افزائی، انسانی حقوق کی تقدیس، ماضی کو فراموش کرنے، مستقبل کو نظرانداز کرنے اور زیادہ سے زیادہ فوری فوائد کے حصول کے رجحانات سے کیا جاسکتا ہے۔ تنازع کے ماخذ معاشرے اور ثقافت میں بنیادی اختلافات ہیں۔

ان اختلافات کے امریکا اور اہم ایشیائی معاشروں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے خاص نتائج برآمد ہوئے۔ سفارتکاروں نے معاشی مسائل پر جاپان سے امریکی تنازعات کا تصفیہ کرانے کی بہت کوششیں کیں خصوصاً جاپان کی فاضل تجارت اور امریکی مصنوعات اور سرمایہ کاری کی مزاحمت کے حوالے سے۔ جاپان اور امریکا کے تجارتی مذاکرات میں سرد جنگ کے دور کے سوویت امریکی تخفیف اسلحہ مذاکرات کی بہت سی خصوصیات آگئیں۔ ۱۹۹۵ء تک اول الذکر، مؤخرالذکر سے بھی کم نتیجہ خیز ثابت ہوئے تھے کیونکہ ان تنازعات کا منبع دونوں معیشتوں کے اساسی اختلافات ہیں بالخصوص بڑے صنعتی ممالک میں جاپانی معیشت کی منفرد نوعیت کے باعث۔ جاپانی مصنوعات کی درآمد اس کی مجموعی قومی پیداوار کا تقریباً ۳۱ء فیصد ہیں جبکہ دوسرے صنعتی ملکوں میں یہ شرح اوسطاً ۴ء۷ فیصد ہے۔ جاپان میں براہِ راست غیرملکی سرمایہ کاری مجموعی داخلی پیداوار کا محض ۷ء۰ فیصد رہی ہے جبکہ امریکا میں ۶ء۲۸ اور یورپ میں ۵ء۳۸ فیصد ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں بڑے صنعتی ممالک میں جاپان تنہا تھا جس کا بجٹ فاضل ہوتا تھا۔[۲]

بحیثیت مجموعی جاپانی معیشت مغربی معیشتوں کے مفروضہ آفاقی قوانین کی طرز پر نہیں چلتی۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں مغربی معاشیات دانوں کا یہ آسان مفروضہ غلط ثابت ہوا کہ ڈالر کی قدر گھٹانے سے جاپانی تجارت کا اضافہ کم ہوجائے گا۔ ۱۹۸۵ء کے پلازا معاہدے سے یورپ کے ساتھ امریکا کے تجارتی خسارے کی تلافی تو ہوگئی لیکن جاپان کے ساتھ خسارے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ جب ین ڈالر کے سو سے کچھ کم کے مساوی ہوا تو جاپانی تجارتی اضافہ بلند سطح پر رہا بلکہ بڑھ گیا۔ اس طرح جاپانی مضبوط کرنسی اور فاضل تجارت دونوں برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ مغربی اقتصادی سوچ میں بے روزگاری اور افراطِ زر میں منفی ربط قائم کرنے کا رجحان ہے اور خیال ہے کہ ۵ فیصد سے کم بے روزگاری افراطِ زر کا دباؤ پیدا کرتی ہے۔ اس کے باوجود جاپان میں بے روزگاری اوسطاً ۳فیصد سے کم اور افراطِ زر اوسطاً ۵ء۱ رہا۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے تک امریکی اور جاپانی ماہرین

معاشیات دونوں ان دو اقتصادی نظاموں کے بنیادی اختلافات کو سمجھنے لگے۔ ایک محتاط تحقیق میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ جاپان کی مصنوعات کی بہت کم درآمدات کی "معیاری اقتصادی عوامل سے" توضیح نہیں کی جا سکتی۔ ایک اور تجزیہ نگار نے کہا کہ "مغرب کے پیشگوئی کرنے والے کچھ بھی کہیں، جاپانی معیشت مغربی منطق پر نہیں چلتی جس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ یہ آزاد منڈی والی مغربی معیشت نہیں۔ جاپانیوں نے... ایک ایسی معاشیات ایجاد کی ہے جس کا طرزِ عمل مغربی مبصرین کی پیشگوئی کی قوتوں کو حیران پریشان رکھتا ہے۔"[28]

جاپانی معیشت کی ممتاز خاصیت کی تشریح کیسے ہو؟ بڑے صنعتی ممالک میں جاپانی معیشت منفرد ہے کیونکہ جاپانی معاشرہ منفرد انداز میں غیر مغربی ہے۔ جاپانی معاشرہ اور ثقافت مغربی خصوصاً امریکی معاشرے اور ثقافت سے مختلف ہے۔ جاپان اور امریکا کے درمیان ہر سنجیدہ تقابلی تجزیے میں ان اختلافات کو اجاگر کیا گیا ہے۔[29] جاپان اور امریکا کے درمیان معاشی تنازعات کا تصفیہ کسی ایک یا دونوں معیشتوں کی نوعیت میں بنیادی تبدیلیوں پر منحصر ہے جو خود ایک یا دونوں ملکوں کے معاشرے اور ثقافت میں بنیادی تبدیلیوں پر منحصر ہیں۔ یہ تغیرات ناممکن نہیں۔ سماج اور ثقافتیں بدلتے ہیں۔ کسی بڑے دھچکا پہنچانے والے واقعے سے یہ تبدیلی ہوسکتی ہے: دوسری جنگ عظیم میں شکست نے دنیا کے دو سب سے زیادہ عسکریت پسند ملکوں کو دو امن پسند ترین ملک بنا دیا۔ تاہم اس کا امکان کم معلوم ہوتا ہے امریکا یا جاپان ایک دوسرے پر اقتصادی ہیروشیما نافذ کردیں۔ معاشی ترقی سے بھی کسی ملک کے سماجی ڈھانچے اور ثقافت میں گہری تبدیلیاں آسکتی ہیں جیسے ۱۹۵۰ء کے عشرے کے اوائل اور ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اواخر میں اسپین میں ہوا اور شاید اقتصادی دولت جاپان کو امریکا کی طرح کے صارف پسند معاشرے میں ڈھال دے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں جاپان اور امریکا دونوں کے لوگوں نے ایک دوسرے کے بارے میں کہا کہ ان کے ملک کو دوسرے جیسا بننا چاہیے۔ محدود سطح پر تشکیلی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے کیا جانے والا جاپان و امریکا کا معاہدہ (Structural Impediment Initiatives) اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ اس معاہدے اور ایسی دوسری کوششوں کی ناکامی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثقافتی اختلافات کی دونوں ممالک کی ثقافتوں میں کتنی گہری جڑیں ہیں۔

امریکا اور ایشیا کے تنازعات کا ماخذ تو ان کے ثقافتی اختلافات تھے مگر ان تنازعات کے نتائج کی امریکا اور ایشیا کے مابین طاقت کے بدلتے ہوئے رشتوں میں عکاسی ہوئی۔ امریکا نے ان قضیوں میں کچھ فتوحات حاصل کیں لیکن رجحان ایشیائی سمت میں تھا اور طاقت کے توازن میں تبدیلی نے ان تنازعات کو شدید تر کردیا۔ امریکا کو توقع تھی کہ ایشیائی حکومتیں اسے "بین الاقوامی برادری" کا رہنما

تسلیم کریں گی اور اپنے معاشروں پر مغربی اصول و اقدار کے نفاذ کو قبول کریں گی۔ دوسری طرف، جیسا کہ نائب وزیر خارجہ ونسٹن لارڈ نے کہا، ایشیائی "اپنے کارناموں کا زیادہ سے زیادہ احساس ہونے لگا تھا اور وہ ان پر فخر کرنے لگے تھے"، مساوی سطح پر برتاؤ کی توقع رکھتے تھے اور امریکا کو "بین الاقوامی دادا گیر نہیں تو واعظ" سمجھتے تھے۔ تاہم امریکی ثقافت کے عمیق داخلی تقاضے امریکا کو بین الاقوامی امور میں دادا گیر نہیں تو کم از کم واعظ بننے پر مجبور کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ امریکی توقعات ایشیائیوں سے متصادم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ متعدد مسائل پر جاپانی اور دیگر ایشیائی رہنماؤں نے امریکی ہم منصبوں سے "نہیں" کہنا سیکھ لیا ہے جس کا اظہار بعض اوقات نرم انداز میں "بھاڑ میں جاؤ" کہہ کر کیا جاتا ہے۔ ایشیا اور امریکا کے روابط میں شاید یہ علامتی موڑ ہی تھا جسے ایک سینئر جاپانی عہدیدار نے امریکا جاپان تعلقات میں "پہلی بڑی تباہی" قرار دیا جو فروری ۱۹۹۴ء میں اس وقت ہوئی جب وزیر اعظم موری ہیرو ہوسوکاوا نے امریکی مصنوعات کے جاپان میں درآمد کے اعدادی اہداف کا صدر کلنٹن کا مطالبہ سختی سے مسترد کر دیا۔ ایک اور جاپانی اہلکار نے کہا کہ "ہم ایک سال پہلے بھی ایسا ہونے کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔" ایک برس بعد جاپان کے وزیر خارجہ نے اس تبدیلی کو یہ کہہ کر مزید اجاگر کر دیا کہ اقوام اور خطوں کے درمیان اقتصادی مسابقت کے اس دور میں جاپان کا قومی مفاد "محض" مغرب کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کی شناخت سے زیادہ اہم ہے۔[30]

طاقت کے بدلے ہوئے توازن سے امریکا نے خود کو بتدریج ہم آہنگ کیا جس کا اظہار ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ایشیا کے بارے میں امریکی پالیسی سے ہوتا ہے۔ اول، امریکا نے ان معاملات کو جن میں وہ کچھ وزن ڈال سکتا تھا متنازع مسائل سے علیحدہ کر دیا اور اس طرح عملاً تسلیم کر لیا کہ وہ ایشیائی معاشروں پر دباؤ ڈالنے کا ارادہ اور/یا عزم نہیں رکھتا۔ اگرچہ کلنٹن نے اعلان کیا تھا کہ چین کے بارے میں امریکی خارجہ پالیسی میں انسانی حقوق کو اولین ترجیح حاصل ہوگی تاہم ۱۹۹۴ء میں انہوں نے امریکی کاروباری اداروں، تائیوان اور دوسرے ذرائع کے دباؤ پر انسانی حقوق کے مسئلے کو اقتصادی معاملات سے الگ کر دیا اور سیاسی منحرفین سے چین کے برتاؤ پر اثر انداز ہونے کے لیے پسندیدہ ترین قوم کی حیثیت کے معاملے کو استعمال کرنے کی کوشش ترک کر دی۔ جاپان کے ساتھ بھی کلنٹن انتظامیہ نے سلامتی پالیسی کو، جس کے حوالے سے وہ کچھ وزن ڈال سکتا تھا، تجارت اور اقتصادیات سے، جن میں تعلقات متنازع تھے، الگ کر دیا۔ اس طرح امریکا نے وہ ہتھیار ڈال دیے جو وہ چین میں انسانی حقوق کی ترویج اور جاپان سے تجارتی رعایات کے حصول کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔

دوم، امریکا نے ایشیائی اقوام کے ساتھ اقدامات و جوابی اقدامات کا سلسلہ رکھا اور اس توقع کے ساتھ رعایات کیں کہ ان کے جواب میں ایشیائیوں سے اسی طرح کی رعایات ملیں گی۔ اس طریقے کا اکثر یہ جواز فراہم کیا گیا کہ ایشیائی ملک سے ''تعمیری تعلقات'' یا ''مذاکرات'' کی ضرورت ہے۔ لیکن زیادہ تر ایشیائی ملکوں نے رعایت کو امریکی کمزوری کی علامت تصور کیا اور یہ سمجھا کہ وہ امریکی مطالبات کو مسترد کرنے میں مزید آگے جا سکتا ہے۔ چین کے معاملے میں بطور خاص یہ بات دیکھنے میں آئی۔ چین نے امریکا کی طرف سے پسندیدہ ترین قوم کی حیثیت کے مسئلے کو انسانی حقوق سے علیحدہ کرنے کا جواب اس طرح دیا کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا ایک نیا اور شدید نوعیت کا مرحلہ شروع کر دیا۔ ''اچھے'' تعلقات کو ''دوستانہ'' سمجھنے کے رجحان کی وجہ سے امریکا ان ایشیائی معاشروں سے مقابلے میں پیچھے ہے جو ''اچھے'' تعلقات کو ایسے تعلقات سمجھتے ہیں جو ان کے لیے فتح کا باعث بنیں۔ ایشیائیوں کی نظر میں امریکی رعایات پر جوابی رعایات کی ضرورت نہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

سوم، جاپان اور امریکا کے درمیان بار بار تجارتی تنازعات میں ایک جیسے سلسلہ ہائے واقعات دیکھنے میں آئے۔ امریکا جاپان سے مطالبات کرتا اور عدم تکمیل کی صورت میں پابندیوں کی دھمکی دیتا۔ طویل مذاکرات ہوتے اور آخری لمحے پر جب پابندیاں لگنے والی ہوتیں، سمجھوتے کا اعلان ہو جاتا۔ سمجھوتوں کے الفاظ اتنے مبہم تھے کہ امریکا اپنی اصولی فتح کا دعویٰ کرتا اور جاپان سمجھوتے پر عمل کرتا یا نہ کرتا، اس کی مرضی تھی۔ حالات حسب دستور چلتے رہتے۔ اسی طرح چین طوعاً وکرہاً انسانی حقوق، املاک دانش یا جوہری پھیلاؤ کے بارے میں موٹے موٹے اصولی نکات پر اتفاق کر لیتا لیکن ان کی تشریح امریکا سے بہت مختلف کرتا اور اپنی سابقہ پالیسیاں جاری رکھتا۔

ایشیا اور امریکا کے درمیان ثقافت اور طاقت کے بدلتے توازن کے ان اختلافات نے ایشیائی معاشروں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ امریکا کے ساتھ تنازعات میں ایک دوسرے کی حمایت کریں۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۴ء میں ''آسٹریلیا سے ملائشیا اور جنوبی کوریا تک'' تقریباً تمام ایشیائی ممالک درآمدات کے اعدادی اہداف کے امریکی مطالبات کے خلاف جاپان کی حمایت میں یکجا ہو گئے۔ اسی طرح چین کے لیے پسندیدہ ترین قوم کی حیثیت کے معاملے پر ہوا اور جاپان کے وزیر اعظم ہوسوکاوا نے کہا کہ مغربی انسانی حقوق کے تصورات ایشیا پر ''اندھا دھند لاگو'' نہیں کیے جا سکتے جبکہ سنگاپور کے لی کوآن یو نے انتباہ کیا کہ اگر چین پر دباؤ ڈالا گیا تو ''امریکا بحرالکاہل میں خود کو تنہا پائے گا''۔[۳۱] یکجہتی کا ایک اور مظاہرہ اس وقت ہوا جب ایشیائی، افریقی اور دیگر اقوام نے عالمی ادارۂ صحت

کے جاپانی سربراہ کے دوبارہ انتخاب کے مسئلے پر مغرب کے خلاف جاپانیوں کی حمایت میں ایکا کرلیا اور جاپان نے عالمی ادارۂ تجارت (World Trade Organization, WTO) کی سربراہی کے لیے امریکی امیدوار، میکسیکو کے سابق صدر کارلوس سیلیناس، کے مقابلے میں ایک جنوبی کوریائی کی حمایت کی۔ ریکارڈ سے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی تک بحرالکاہل سے ماورا مسائل پر مشرقی ایشیا کا ہر ملک یہ محسوس کررہا تھا کہ وہ امریکا سے زیادہ دوسرے مشرقی ایشیائی ملکوں کا ہم نشین ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے پر ایشیا اور امریکا کے بڑھتے ہوئے روابط اور امریکی طاقت میں کمی کے باعث امریکا کے جاپان اور دوسرے ایشیائی معاشروں سے ثقافتی تصادم نمایاں ہوگیا اور مؤخرالذکر امریکی دباؤ کی مزاحمت کرنے کے قابل ہوگئے۔ چین کا عروج امریکا کے لیے زیادہ بنیادی چیلنج تھا۔ چین سے امریکا کے تنازعات جاپان کی بہ نسبت زیادہ مسائل پر تھے جن میں اقتصادی سوالات، انسانی حقوق، تبت، تائیوان، بحیرۂ جنوبی چین اور اسلحے کے پھیلاؤ کے معاملات شامل تھے۔ تقریباً کسی بھی اہم پالیسی کے مسئلے پر امریکا اور چین کے مشترکہ مقاصد نہ تھے۔ اختلافات ہر معاملے میں ہیں۔ جاپان کی طرح چین سے بھی اختلافات کی جڑیں زیادہ تر دونوں سماجوں کی مختلف ثقافتوں میں ہیں۔ تاہم امریکا اور چین کے تنازعات میں طاقت کے بنیادی مسائل بھی شامل ہیں۔ چین دنیا میں امریکی قیادت یا بالادستی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ امریکا ایشیا میں چینی قیادت کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ دو سو سال سے زائد عرصے تک امریکا نے یورپ میں کسی غالب طاقت کو ابھرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ تقریباً سو سال اس نے مشرقی ایشیا میں بھی ایسا کرنے کی کوشش کی اور یہ سلسلہ چین کے بارے میں "کھلے دروازے" (Open Door) کی پالیسی سے شروع ہوا تھا۔ ان اہداف کے حصول کے لیے امریکا شہنشاہی جرمنی، نازی جرمنی، شہنشاہی جاپان، سوویت یونین اور کمیونسٹ چین سے دو عالمی جنگیں اور ایک سرد جنگ لڑچکا ہے۔ صدر ریگن اور صدر بش نے امریکی دلچسپی کو برقرار رکھا اور جتلایا۔ مشرقی ایشیا میں غالب علاقائی طاقت کے طور پر چین کا عروج برقرار رہا تو اس مرکزی اہمیت کی حامل امریکی دلچسپی کو چیلنج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکا اور چین کے درمیان تنازعے کا اصل سبب اس مسئلے پر بنیادی اختلاف ہے کہ مشرقی ایشیا میں آئندہ طاقت کا توازن کیا ہونا چاہیے۔

چینی بالادستی: توازن اور تقلید۔ مشرقی ایشیا میں جہاں چھ تہذیبیں، اٹھارہ ممالک، تیزی سے ترقی کرتی ہوئی معیشتیں اور معاشروں کے مابین اہم سیاسی، معاشی اور سماجی

اختلافات ہیں، اکیسویں صدی کے اوائل میں بین الاقوامی تعلقات کی متعدد صورتیں بن سکتی ہیں۔ تعاون و تنازع کے انتہائی پیچیدہ تانے بانے ابھر سکتے ہیں جن میں خطے کی بیشتر بڑی اور متوسط سطح کی طاقتیں شامل ہوں۔ یا پھر کوئی کثیر قطبی بین الاقوامی نظام تشکیل پا سکتا ہے جس میں چین، امریکا، روس اور ممکنہ طور پر بھارت ایک دوسرے سے مسابقت اور توازن کے کھیل میں شریک ہوں۔ یہ امکان بھی ہے کہ مشرقی ایشیائی سیاست پر مسلسل دو حریف طاقتوں کے مقابلے کا غلبہ ہو جو چین اور جاپان یا چین اور امریکا ہوسکتی ہیں جبکہ دوسرے ممالک ان میں سے کسی ایک فریق کے ساتھ ہوں یا غیر وابستہ رہنے کو ترجیح دیں۔ یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ مشرقی ایشیائی سیاست اپنے روایتی یک قطبی راستے پر چل پڑے جس میں بیجنگ طاقت کا مرکز ہو۔ اگر اکیسویں صدی میں چین نے معاشی ترقی کی اعلیٰ سطح برقرار رکھی، ڈینگ کے بعد کے دور میں اپنی سالمیت قائم رکھی اور جانشینی کی لڑائیوں کی وجہ سے کھچاؤ کا شکار نہ ہوا تو وہ اس آخرالذکر امکان کو حقیقت بنانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار مشرقی ایشیا کے سیاسی کھیل میں دوسرے کھلاڑیوں کے ردعمل پر ہے۔

چین کی تاریخ، ثقافت، روایات، جسامت و رقبہ، معاشی تحرک اور اپنے بارے میں تصور اسے مشرقی ایشیا میں بالادست بننے پر اکساتے ہیں۔ یہ ہدف اس کی تیز رفتار اقتصادی ترقی کا فطری نتیجہ ہے۔ ہر بڑی طاقت برطانیہ اور فرانس، جرمنی اور جاپان، امریکا اور سوویت یونین نے تیز رفتار صنعتی ترقی اور اقتصادی ترقی کے ساتھ یا فوراً بعد کے برسوں میں توسیع، اثبات اور سامراجیت کا عمل اختیار کیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اقتصادی و فوجی طاقت کے حصول کے چین پر بھی ایسے ہی اثرات نہ مرتب ہوں۔ دو ہزار سال چین مشرقی ایشیا میں بالادست طاقت رہا۔ اب چینی اپنا یہ تاریخی کردار دوبارہ اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہے ہیں اور مغرب اور جاپان کی محکومی و ذلت سے معمور طویل صدی کا خاتمہ چاہتے ہیں جو ۱۸۴۲ء میں برطانیہ کی طرف سے معاہدہ نانکنگ کے نفاذ سے شروع ہوئی تھی۔

۱۹۸۰ء کے عشرے کے آخر میں چین نے اپنے بڑھتے ہوئے معاشی وسائل کو فوجی طاقت اور سیاسی اثر و رسوخ میں تبدیل کرنے کا آغاز کیا۔ اگر اس کی معاشی ترقی جاری رہی تو تبدیلی کا یہ عمل بہت بڑھ جائے گا۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۰ء کے عشرے کے بیشتر حصے میں چین کے عسکری اخراجات کم ہوئے۔ تاہم ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۳ء کے درمیان فوجی مصارف موجودہ مقداروں سے دوگنے ہو گئے اور قوت خرید کے حوالے سے ۵۰ فیصد بڑھ گئے۔ ۱۹۹۵ء کے لیے ۲۱ فیصد اضافہ تجویز کیا گیا۔ ۱۹۹۳ء کے لیے چینی فوجی اخراجات کے تخمینے سرکاری شرح ہائے تبادلہ پر ۲۲ سے

۷۳۰/ارب ڈالر اور مساوی قوت خرید کے حوالے سے ۹۰/ارب ڈالر تک لگائے گئے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں چین نے اپنی فوجی حکمت عملی کی تشکیل نو کی اور سوویت یونین سے بڑی جنگ میں حملے کے خلاف دفاع کی جگہ علاقائی حکمت عملی کو اختیار کرلیا جس میں طاقت کے بڑھاوے پر زور دیا گیا۔ اس تبدیلی کے مطابق اس نے اپنی بحری قوت میں اضافے، جدید، دور مار والے لڑاکا طیاروں کے حصول، دوران پرواز ایندھن بھرنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور طیارہ بردار بحری جہاز کے حصول کے لیے اقدامات شروع کردیے۔ چین نے روس کے ساتھ ہتھیاروں کی فروخت کے باہمی طور پر منافع بخش سلسلے کا بھی آغاز کردیا۔

چین مشرقی ایشیا کی غالب قوت بننے کے راستے پر گامزن ہے۔ مشرقی ایشیا کی معاشی ترقی زیادہ سے زیادہ چینی جہت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اسے مین لینڈ اور تین دوسرے چینی ممالک کی تیز نمو نیز تھائی لینڈ، ملائشیا، انڈونیشیا اور فلپائن کی معیشتوں کی ترقی میں نسلی چینیوں کے مرکزی کردار سے تحریک مل رہی ہے۔ زیادہ خطرے کی بات یہ ہے کہ چین بحیرہ جنوبی چین پر اپنے دعوے کا زیادہ زوردار اثبات کرنے لگا ہے: اس نے جزائر پیراسل میں اپنے ٹھکانے کو مضبوط بنایا، ۱۹۸۸ء میں چند جزائر پر ویت نامیوں سے جنگ کی، فلپائن کے قریب مسچیف ریف پر اپنی فوج تعینات کی اور انڈونیشیا کے نیٹونا جزیرے سے ملحق گیس کے ذخائر پر دعویٰ کیا۔ چین نے مشرقی ایشیا میں امریکی فوجی موجودگی کی دھیمے انداز میں حمایت بھی ترک کردی اور سرگرمی سے اس کی مخالفت شروع کردی۔ اسی طرح اگرچہ سرد جنگ میں چین جاپان پر خاموشی سے اپنی فوجی طاقت بڑھانے پر زور دیتا تھا لیکن مابعد سرد جنگ کے برسوں میں اس نے جاپانی فوجی قوت میں اضافے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ علاقائی بالادست قوت کے روایتی طرزعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے چین خطے میں فوجی برتری کے حصول کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو کم سے کم کررہا ہے۔

اکا دکا مستثنیات کے سوا، جیسے ممکنہ طور پر بحیرہ جنوبی چین، مشرقی ایشیا میں چین کی علاقائی بالادستی میں بلاواسطہ فوجی قوت کے استعمال کے ذریعے زمین پر قبضے کی کارروائیوں کا امکان نہیں۔ تاہم یہ امکان ضرور ہے کہ چین مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں سے مختلف درجوں میں مندرجہ ذیل اقدامات جزوی یا کلی طور پر کرنے کی توقع کرے:

- چینی سرحدی سالمیت، تبت اور زن جیانگ پر چینی قبضے اور ہانگ کانگ اور تائیوان کی چین میں شمولیت کی حمایت کرنا؛
- بحیرہ جنوبی چین اور ممکنہ طور پر منگولیا پر چینی حاکمیت کو تسلیم کرنا؛

- اقتصادیات، انسانی حقوق، ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور دیگر مسائل پر مغرب سے تنازعات میں چین کی عمومی حمایت کرنا؛
- خطے میں چین کی فوجی بالادستی کو قبول کرنا اور جوہری ہتھیار یا ایسی روایتی قوت حاصل کرنے سے گریز کرنا جو اس بالادستی کے لیے خطرہ بنیں؛
- چینی مفادات سے ہم آہنگ اور چینی معاشی ترقی کے لیے سازگار تجارتی اور سرمایہ کارانہ پالیسیاں اختیار کرنا؛
- علاقائی مسائل سے نمٹنے میں چین کی قیادت کا احترام کرنا؛
- چین سے ترک وطن کرنے والوں کے لیے بالعموم دروازے کھلے رکھنا؛
- اپنے معاشروں میں چین مخالف اور چینی مخالف تحریکوں کو روکنا اور دبانا؛
- اپنے سماجوں میں چینیوں کے حقوق کا احترام کرنا بشمول چین میں اپنے قرابت داروں اور آبائی صوبوں سے قریبی روابط قائم رکھنے کے حق کے؛
- دوسری طاقتوں کے ساتھ فوجی اتحادوں یا چین مخالف اتحادوں سے احتراز کرنا؛
- مشرقی ایشیا میں وسیع تر ابلاغ کی زبان کے طور پر انگریزی کے ساتھ اور بالآخر اس کی جگہ مینڈارین رائج کرنا۔

تجزیہ نگار چین کے عروج کا موازنہ انیسویں صدی کے اواخر میں یورپ میں غالب طاقت کی حیثیت سے ابھرنے والے ولہلمین کے زمانے کے جرمنی سے کرتے ہیں۔ نئی بڑی طاقتوں کا ابھرنا ہمیشہ عدم استحکام پیدا کرتا ہے اور اگر چین نے عروج پالیا تو دوسرے ہزاریے کے آخری نصف کے دوسرے واقعات اس کے سامنے ماند پڑ جائیں گے۔ لی کوآن یو نے ۱۹۹۴ء میں کہا کہ" دنیا میں چین کا اپنا مقام حاصل کرنے کا عمل، جس پیمانے پر ہو رہا ہے اس کے تحت ۳۰ یا ۴۰ سال میں دنیا کو ایک نیا توازن مل جائے گا۔ یہ فرض کرنا ممکن نہیں کہ یہ ایک اور بڑا کھلاڑی ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا کھلاڑی ہے"[۳۲] اگر چین کی اقتصادی ترقی ایک اور عشرے جاری رہی، جو لگتا ہے کہ رہے گی، اور اگر چین نے جانشینی کی لڑائیوں میں اپنی سالمیت برقرار رکھی، جس کا غالب امکان ہے، تو مشرقی ایشیائی ممالک اور دنیا کو انسانی تاریخ کے اس سب سے بڑے کھلاڑی کے بڑھتے ہوئے اثباتی کردار پر ردعمل کا اظہار کرنا ہوگا۔

عمومی اعتبار سے ریاستیں کسی نئی طاقت کے عروج پر دو میں سے کسی ایک طریقے یا دونوں کے ملاپ کے ذریعے ردعمل ظاہر کرتی ہیں۔ تنہا یا دوسری ریاستوں کے ساتھ اتحاد بنا کر وہ ابھرتی

ہوئی طاقت کے خلاف توازن پیدا کر کے، اسے محدود کر کے اور ضرورت ہو تو اسے شکست دینے کے لیے جنگ لڑ کر اپنی سلامتی کو یقینی بنانے کی کوشش کر سکتی ہیں۔ یا پھر ریاستیں ابھرتی ہوئی طاقت کی تقلید کر کے، اس کے ساتھ ہم آہنگی کا رشتہ قائم کر کے اور ثانوی یا ماتحت مقام اختیار کر سکتی ہیں، اس توقع کے ساتھ کہ اس طرح ان کے اہم مفادات کی نگہبانی ہو سکے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ریاستیں توازن اور تقلید کو ملا جلا کر چلنے کی کوشش کریں گو کہ اس میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ ابھرتی ہوئی طاقت مخالف ہو جائے اور اس سے کوئی تحفظ نہ رہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے مغربی نظریے کے مطابق توازن عموماً زیادہ پسندیدہ راستہ ہے اور تقلید کے مقابلے میں اسے زیادہ اختیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اسٹیون والٹ نے کہا،

> بالعموم نیت کے اندازے ریاستوں کو توازن پیدا کرنے کی طرف لے جاتے ہیں۔ تقلید کا راستہ مخدوش ہے کیونکہ اس میں اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے؛ کسی غالب طاقت سے اس امید پر تعاون کیا جاتا ہے کہ وہ مہربان رہے گی۔ توازن قائم کرنا محفوظ تر راستہ ہے کہ کہیں غالب طاقت جارحیت پر نہ اتر آئے۔ مزید برآں کمزور فریق سے اتحاد سے اپنا اثر و رسوخ بڑھتا ہے کیونکہ کمزور فریق کو مدد کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔[۳۳]

والٹ نے جنوب مغربی ایشیا میں اتحادوں کی تشکیل کا جو تجزیہ کیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ریاستیں تقریباً بیرونی خطرات کے خلاف توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ بھی عام طور پر فرض کیا گیا ہے کہ جدید یورپی تاریخ کے زیادہ تر دور میں توازن قائم رکھنے کا رویہ معمول رہا ہے جن میں کئی طاقتوں نے فلپ دوم، لوئی چہاردہم، فریڈرک اعظم، نپولین، قیصر اور ہٹلر کے پیش کردہ خطرات کو متوازن اور روکنے کے لیے اپنے اتحاد تبدیل کیے۔ تاہم والٹ تسلیم کرتا ہے کہ ریاستیں ''بعض حالات میں'' تقلید کی راہ چن سکتی ہیں اور، جیسا کہ رینڈل شوئیلر نے کہا، اصلاح پسند ریاستوں کے ابھرتی ہوئی طاقت کی تقلید کرنے کا امکان ہوتا ہے کیونکہ وہ غیر مطمئن ہوتی ہیں اور انہیں امید ہوتی ہے کہ حالات کی یکسانی بدلے گی تو فائدہ اٹھانے کے امکانات پیدا ہوں گے۔[۳۴] مزید برآں، جیسا کہ والٹ نے خیال ظاہر کیا، تقلید کے لیے کسی حد تک اعتبار ضروری ہے کہ طاقتور ریاست جارحانہ عزائم نہیں رکھتی۔

طاقت کو متوازن کرنے میں ریاستیں بنیادی یا ثانوی کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اول، ریاست الف ریاست ب کے خلاف، جسے وہ ممکنہ حریف سمجھتی ہے، ریاست ج اور د کے ساتھ اتحاد بنا کر، اپنی فوجی یا دیگر قوت بڑھا کر (جس سے اسلحے کی دوڑ شروع ہونے کا امکان ہوتا ہے) یا ان ذرائع کو باہم ملا کر طاقت کو متوازن کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ اس صورت حال میں ریاست الف اور ب ایک

دوسرے کے بنیادی توازن کنندہ کہلائیں گے۔ دوم، ممکن ہے ریاست الف کسی اور ریاست کو فوری حریف نہ سمجھے لیکن ریاست ب اور ج کے درمیان طاقت کا توازن پیدا کرنے سے دلچسپی رکھتی ہو کیونکہ اندیشہ ہو کہ اگر ان میں سے کوئی طاقتور ہوگئی تو ریاست الف لیے خطرہ بنے گی۔ اس صورتحال میں ریاست الف ریاست ب اور ج کے لحاظ سے ثانوی توازن کنندہ کہلائے گی جبکہ ب اور ج ایک دوسرے کی بنیادی توازن کنندہ ہوں گی۔

اگر چین مشرقی ایشیا میں بالادست قوت کے طور پر ابھرنا شروع ہوگیا تو ریاستوں کا کیا ردعمل ہوگا؟ اس کے ردعمل بلاشبہ متنوع ہوں گے۔ چونکہ چین نے امریکا کو اہم ترین دشمن کے طور پر متعین کیا ہے، امریکا کا غالب رجحان یہ ہوگا کہ بنیادی توازن کنندہ کا کردار ادا کرے اور چینی بالادستی کو روکے۔ یہ مفروضہ امریکا کے اس روایتی کردار سے ہم آہنگ ہوگا جو اس نے یورپ یا ایشیا میں کسی ایک طاقت کی بالادستی کو روکنے کے لیے ادا کیا ہے۔ یورپ میں یہ ہدف اب غیر متعلق ہے لیکن ایشیا میں اس کی اہمیت ہوسکتی ہے۔ مغربی یورپ میں ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق جو ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی طور پر امریکا سے وابستہ ہو، امریکی سلامتی کے لیے خطرہ نہیں ہوگا۔ ایک متحد، طاقتور اور اثبات پر مائل چین خطرہ ہوسکتا ہے۔ کیا یہ امریکی مفاد میں ہے کہ ضروری ہو تو مشرقی ایشیا میں چینی بالادستی کو روکنے کے لیے جنگ لڑنے کے لیے تیار رہے؟ اگر چین کی معاشی ترقی جاری رہی تو اکیسویں صدی کے اوائل میں یہ امریکی پالیسی سازوں کو درپیش سلامتی کا سنگین ترین مسئلہ ہوگا۔ اگر امریکا مشرقی ایشیا پر چینی غلبہ روکنا چاہتا ہے تو اسے اس مقصد کے لیے جاپانی اتحاد کا رخ بدلنا ہوگا، دوسری ایشیائی اقوام سے قریبی فوجی تعلقات پروان چڑھانے ہوں گے اور ایشیا میں اپنی فوجی موجودگی نیز ایشیا میں قابل استعمال فوجی طاقت کو بڑھانا ہوگا۔ اگر امریکا چینی بالادستی کے خلاف لڑنے کے لیے تیار نہیں تو اسے اپنی آفاقیت سے دستبردار ہونا پڑے گا، اس بالادستی کے ساتھ رہنا سیکھنا ہوگا اور بحرالکاہل کے دوسرے کنارے پر واقعات کا رخ متعین کرنے کی اپنی قوت میں نمایاں کمی سے سمجھوتا کرنا ہوگا۔ ان دونوں راستوں پر چلنے میں بڑے نقصانات اور خطرات ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ امریکا کوئی واضح راستہ نہیں چنے گا اور اس بات کا محتاط جائزہ لیے بغیر کہ یہ قومی مفاد میں ہے یا نہیں اور جنگ کی مؤثر تیاری کیے بغیر چین سے جنگ میں کود پڑے گا۔

نظری اعتبار سے اگر کوئی اور بڑی طاقت بنیادی توازن کنندہ ہو تو امریکا ثانوی توازن کنندہ کا کردار ادا کرکے چین کو محدود کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ صرف جاپان کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے کہ وہ بنیادی توازن کنندہ بن سکے لیکن اس کے لیے جاپانی پالیسی میں بڑی بڑی تبدیلیاں درکار

ہوں گی: جاپان کی طرف سے اسلحہ دوبارہ اکٹھا کرنے کی بھرپور کوششیں، جوہری ہتھیاروں کا حصول اور دوسری ایشیائی طاقتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے چین سے زبردست مسابقت۔ اگر یہ مان بھی لیں کہ جاپان چین کے خلاف امریکی قیادت میں بننے والے اتحاد میں شریک ہوجائے گا، گوکہ وہ بھی غیریقینی ہے، تب بھی اس کا امکان نہیں کہ وہ چین کا بنیادی توازن کنندہ بنے گا۔ مزید یہ کہ امریکا نے ثانوی توازن کنندہ کا کردار ادا کرنے کی اہلیت یا دلچسپی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ جب امریکا نیا چھوٹا سا ملک تھا تو اس نے نپولین کے زمانے میں ایسا کرنے کی کوشش کی تھی اور نتیجتاً برطانیہ اور فرانس دونوں سے جنگیں لڑی تھیں۔ بیسویں صدی کے پہلے حصے کے دوران امریکا نے یورپی اور ایشیائی ملکوں کے درمیان توازن کو فروغ دینے کی برائے نام کوششیں ہی کیں جس کی بنا پر ترازو کے پلڑوں کو، جن کا توازن بگڑ گیا تھا، متوازن کرنے کے لیے عالمی جنگوں میں شامل ہوگیا۔ سرد جنگ میں امریکا کے پاس سوویت یونین کا بنیادی توازن کنندہ بننے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پس امریکا عظیم طاقت کی حیثیت سے کبھی ثانوی توازن کنندہ نہیں رہا۔ بڑی طاقت بننے کا مطلب ہے چالاک، لچکدار، مبہم حتیٰ کہ غیر دیانتدارانہ کردار ادا کرنا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ایک فریق کو چھوڑ کر دوسرے کی حمایت شروع کردی جائے، کسی ایسی ریاست کی حمایت یا مخالفت کرنے سے انکار کرنا جو امریکی اقدار کے لحاظ سے اخلاقی اعتبار سے حق بجانب ہو اور کسی ایسی ریاست کی حمایت کرنا جو اخلاقی اعتبار سے غلطی پر ہو۔ اگر جاپان ایشیا میں چین کے بنیادی توازن کنندہ کے طور پر ابھرا تب بھی امریکا کی اس توازن کو سہارا دینے کی صلاحیت محل نظر ہے۔ امریکا دوممکنہ خطرات کو متوازن کرنے کی بہ نسبت کسی ایک موجودہ خطرے کے خلاف متحرک ہونے کا زیادہ اہل ہے۔ آخری بات یہ کہ ایشیائی طاقتوں کے اندر تقلید کا میلان موجود ہونے کا امکان ہے جس سے ثانوی توازن کے لیے امریکی کوشش کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

تقلید کے اعتماد پر منحصر ہونے کے حوالے سے تین قضیات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اول، تقلید ایک ہی تہذیب سے متعلق یا ثقافتی اشتراک رکھنے والی ریاستوں کے مابین ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے بمقابلہ ان ریاستوں کے جن میں کوئی ثقافتی اشتراک نہ ہو۔ دوم، تناظر کے لحاظ سے اعتماد کی سطحیں متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ ایک چھوٹا لڑکا اس وقت اپنے بڑے بھائی کی تقلید کرے گا جب وہ دوسرے لڑکوں کے مقابل ہوں لیکن جب وہ تنہا گھر پر ہوں تو وہ اپنے بڑے بھائی پر ذرا کم اعتماد کرے گا۔ لہٰذا مختلف تہذیبوں کی ریاستوں کے درمیان زیادہ روابط تہذیبوں کے اندر تقلید کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ سوم، تہذیبوں کے اندر تقلید اور توازن کے رجحانات اس لیے بھی مختلف ہوسکتے

ہیں کہ ان کے ارکان کے مابین اعتماد کی سطحیں مختلف ہوں۔ مثال کے طور پر مشرقِ وسطیٰ میں توازن کا عام ہونا عرب اور مشرقِ وسطیٰ کی دیگر ثقافتوں کے درمیان بے اعتمادی کا آئینہ دار ہے۔

ان اثرات کے علاوہ تقلید یا توازن کا میلان طاقت کی تقسیم کی توقعات اور ترجیحات کے لحاظ سے تشکیل پائے گا۔ یورپی معاشرے مطلق العنانی کے ایک دور سے گزرے لیکن افسر شاہی پر مشتمل ان شہنشاہیوں یا ''شرقی آمریتوں'' سے بچے رہے جو تاریخ کے زیادہ تر حصے کے دوران ایشیا کا خاصہ رہی ہیں۔ جاگیرداری نے تکثیریت کی بنیاد اور یہ مفروضہ فراہم کیا کہ طاقت کی کچھ تقسیم فطری اور پسندیدہ ہے۔ پس بین الاقوامی سطح پر بھی طاقت کے توازن کو فطری اور پسندیدہ سمجھا گیا اور ریاست کار کی ذمے داری اس کی حفاظت کرنا اور اسے برقرار رکھنا تھا۔ پس جب توازن کو خطرہ ہوا تو اسے بحال کرنے کے لیے توازن کے رویے کا مطالبہ کیا گیا۔ مختصراً بین الاقوامی معاشرے کا یورپی نمونہ ملکی معاشرے کے یورپی نمونے کا عکاس تھا۔

اس کے مقابلے میں ایشیا کی افسر شاہی پر مشتمل شہنشاہیوں میں معاشرتی یا سیاسی تکثیریت اور طاقت کی تقسیم کی گنجائش نہ تھی۔ چین کے اندر یورپ کی بہ نسبت تقلید کو توازن سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ لوسین پائی نے کہا کہ ۱۹۲۰ء کے عشرے کے دوران ''جنگی کماندار پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ طاقت سے انہیں کیا حاصل ہوسکتا ہے، اس کے بعد ہی وہ کمزوروں سے اتحاد کرنے کے فوائد پر غور کرتے... چینی جنگجو کمانداروں کی نظر میں خود مختاری اس طرح فی نفسہٖ قابل قدر چیز نہ تھی جیسی یہ یورپی توازن طاقت کے اندازوں میں سمجھی جاتی تھی۔ وہ اپنے فیصلوں کی بنیاد طاقت سے وابستگی کو بنایا کرتے تھے۔'' اسی طرز پر ایوری گولڈ اسٹائن نے کہا ہے کہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۶ء تک جب حاکمیت کا ڈھانچا نسبتاً واضح تھا، کمیونسٹ چین کی سیاست میں تقلید کا عنصر پایا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب ثقافتی انقلاب نے تقریباً طوائف الملوکی کے حالات اور حاکمیت کے بارے میں بے یقینی پیدا کردی اور سیاسی کرداروں کی بقا کے لیے خطرہ بن گیا تو توازن کا رویہ حاوی ہونے لگا۔[۳۵] غالباً ۱۹۷۸ء کے بعد حاکمیت کے واضح طور پر متعین کردہ ڈھانچے سے تقلید کا رجحان پھر عود کر آیا۔

تاریخی اعتبار سے چین میں ملکی و غیر ملکی امور کے مابین واضح امتیاز نہیں رہا ہے۔ وہ ''دنیا کے نظام کو چینی داخلی نظام کی ضمنیات میں شامل اور اس وجہ سے چینی تہذیبی تشخص کا تسلسل سمجھتے تھے'' جس کے بارے میں ''یہ مفروضہ تھا کہ وہ صحیح کائناتی نظام ہے اور ہم مرکز دائروں کی شکل میں وسیع ہوتے چلے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' یا جیسا کہ روڈرک میک فرکوہر نے کہا ''دنیا کے بارے میں روایتی چینی نقطہ نگاہ یہ تھا کہ یہ بہت سوچے سمجھے انداز میں تشکیل دیا گیا طبقاتی معاشرہ ہے۔

غیر ملکی فرماں روا اور ریاستیں وسطی بادشاہت کے خراج دہندہ فرض کیے جاتے تھے: ''آسمان پر دو سورج نہیں، زمین پر دو شہنشاہ نہیں ہو سکتے۔'' نتیجتاً اہلِ چین سلامتی کے ''کثیر قطبی بلکہ کثیر پہلو تصورات'' کی طرف مائل نہیں رہے۔ ایشیا کے لوگ عموماً بین الاقوامی تعلقات میں ''طبقات کو قبول کرنے'' پر آمادہ ہوتے ہیں اور یورپی طرز کی بالادستی کی جنگیں مشرقی ایشیا کی تاریخ میں نہیں ہوئیں۔ طاقت کے توازن کا فعال نظام جو تاریخی طور پر یورپ میں عام تھا، ایشیا کے لیے اجنبی تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں مغربی طاقتوں کی آمد تک مشرقی ایشیا کے بین الاقوامی نظام میں چین کو مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور دوسرے معاشرے بیجنگ کی محکومی، اس سے تعاون یا خود مختاری کے مختلف درجوں میں بٹے ہوئے تھے۔[۳] بے شک عالمی نظام کا کنفیوشین مثالی نمونہ کبھی مکمل حقیقت کا روپ نہیں دھار سکا مگر بین الاقوامی سیاست کے بارے میں طبقاتی طاقت کے ایشیائی نمونے اور توازنِ طاقت کے یورپی نمونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

عالمی نظام کے بارے میں اس تصور کے نتیجے میں ملکی سیاست کے اندر تقلید کا چینی میلان بین الاقوامی سیاست میں بھی موجود ہے۔ انفرادی ریاستوں کی خارجہ پالیسیوں پر اس میلان کے اثرات کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ کنفیوشین ثقافت سے کس حد تک وابستہ ہیں اور چین سے ان کا تاریخی تعلق کیا ہے۔ کوریا کا چین سے بہت زیادہ ثقافتی اشتراک ہے اور تاریخی اعتبار سے اس کا چین کی طرف جھکاؤ رہا ہے۔ سنگاپور کے لیے سرد جنگ کے دوران کمیونسٹ چین دشمن تھا۔ تاہم ۱۹۸۰ء کے عشرے میں سنگاپور نے اپنا موقف بدلنا شروع کیا اور اس کے رہنماؤں نے امریکا اور دوسرے ملکوں پر سرگرمی سے زور دینا شروع کر دیا کہ چینی طاقت کے حقائق سے مفاہمت کریں۔ ملائشیا بھی جہاں بڑی چینی آبادی اور رہنماؤں میں مغرب مخالف رجحانات ہیں، چین کی طرف بہت زیادہ جھک گیا۔ تھائی لینڈ نے انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپی اور جاپانی سامراجیت سے مفاہمت کر کے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ چین کے ساتھ بھی اس کے یہی ارادے نظر آتے ہیں اور تھائی لینڈ کی سلامتی کو ویت نام سے لاحق ممکنہ خطرے سے اس رجحان کو مزید تقویت ملتی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا میں انڈونیشیا اور ویت نام وہ دو ممالک ہیں جو چین کے خلاف توازن اور اسے محدود کرنے کی طرف سب سے زیادہ مائل ہیں۔ انڈونیشیا بڑا ہے، مسلمان ملک ہے اور چین سے دور ہے لیکن دوسروں کی مدد کے بغیر وہ بحیرۂ جنوبی چین میں چینی قبضے کے اثبات کے خلاف بند نہیں باندھ سکتا۔ ۱۹۹۵ء کے موسم خزاں میں انڈونیشیا اور آسٹریلیا سلامتی کے ایک معاہدے میں شامل ہوئے جس میں یہ طے پایا کہ وہ اپنی سلامتی کو لاحق ''مخالف چیلنجوں'' کی صورت میں ایک

دوسرے سے مشورہ کریں گے۔ اگرچہ دونوں فریقوں نے اس بات کی تردید کی کہ یہ اقدام چین کے خلاف ہے تاہم انہوں نے یہ ضرور اقرار کیا کہ سب سے زیادہ چین کی طرف سے مخالف چیلنج آنے کا امکان ہے۔[۳۷] ویت نام کی ثقافت بڑی حد تک کنفیوشین ہے لیکن تاریخی طور پر اس کے چین سے بہت مخاصمانہ تعلقات رہے ہیں اور ۱۹۷۹ء میں اس نے چین سے ایک مختصر جنگ لڑی۔ ویت نام اور چین دونوں اسپریٹلی جزائر پر دعویٰ رکھتے ہیں اور ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں ان کی بحری افواج وقتاً فوقتاً باہم نبرد آزما رہ چکی ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کی ابتدا میں ویت نام کی فوجی صلاحیتیں چین کے مقابلے میں زوال پذیر ہوگئیں۔ نتیجے کے طور پر دوسری مشرقی ایشیائی ریاستوں کے مقابلے میں ویت نام چین خلاف توازن قائم کرنے کے لیے شراکت دار تلاش کرنے کے محرکات رکھتا ہے۔ آسیان میں اس کی شمولیت اور ۱۹۹۵ء میں امریکا سے اس کے تعلقات کا معمول پر آنا اس سمت میں کیے گئے دو اقدامات تھے۔ تاہم آسیان کا اندرونی خلفشار اور اس تنظیم کی چین کو للکارنے میں پس وپیش کے باعث یہ امکان انتہائی کم ہے کہ آسیان چین مخالف تنظیم بن جائے گی یا چین سے محاذ آرائی میں ویت نام کی کوئی مدد کرے گی۔ امریکا چین کو محدود کرنے کے لے زیادہ آمادہ ہوگا مگر ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط تک یہ واضح نہ تھا کہ وہ بحیرہ جنوبی چین پر چینی قبضے کی اثبات کی مخالفت میں کس حد تک جائے گا۔ آخر کار ویت نام کے لیے "سب سے کم برا راستہ" یہ ہوسکتا ہے کہ وہ چین سے مفاہمت کرے اور فن لینڈ ائزیشن کو قبول کرے جس سے "ویت نامی حمیت کو ٹھیس تو پہنچے گی مگر... بقا کی ضمانت مل سکتی ہے"۔[۳۸]

۱۹۹۰ء کی دہائی میں چین اور شمالی کوریا کے سوا تقریباً تمام مشرقی ایشیائی اقوام خطے میں مسلسل امریکی فوج کی موجودگی کی حمایت کرچکی ہیں۔ تاہم عملاً ویت نام کے سوا وہ چین سے مفاہمت کی جانب مائل ہیں۔ فلپائن نے بڑے امریکی فضائی اور بحری اڈے ختم کردیے اور اوکی ناوا میں بڑی تعداد میں امریکی افواج کی موجودگی کے خلاف مخالفت بڑھی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں تھائی لینڈ، ملائشیا اور انڈونیشیا نے اپنی بحری حدود میں چھ مال بردار جہاز پہنچانے کی امریکی درخواستیں مسترد کردیں جو جنوب مشرقی یا جنوب مغربی ایشیا میں امریکی فوجی مداخلت کو سہل بنانے کے لیے تیرتے ہوئے اڈے کا کام دیتے۔ احترام کا ایک اور مظاہرہ یوں کیا گیا کہ آسیان علاقائی فورم نے اپنے پہلے اجلاس میں چین کے اس مطالبے کے آگے سرِ تسلیم خم کرلیا کہ اسپریٹلی جزائر کے قضیے کو ایجنڈے میں شامل نہ کیا جائے اور ۱۹۹۵ء میں فلپائن کے قریب مسچیف ریف پر چینی قبضے پر آسیان کے کسی اور ملک نے احتجاج نہیں کیا۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں جب چین نے زبانی اور فوجی طور پر تائیوان کو دھمکایا تو

ایشیائی حکومتیں پھر چپ سادھے رہیں۔ مائیکل اوکسنبرگ نے اس تقلیدی میلان کا بہت خوبصورتی سے خلاصہ بیان کیا ہے: ''ایشیائی رہنماؤں کو یہ خوف تو ہے کہ طاقت کا توازن چین کے حق میں بدل جائے گا مگر مستقبل کے ڈر سے وہ ابھی چین کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے'' اور ''چین مخالف مہم میں امریکا کا ساتھ نہیں دیں گے''۔[۳۹]

چین کا عروج جاپان کے لیے بڑا چیلنج ہوگا اور اہل جاپان اس بارے میں تقسیم ہو جائیں گے کہ جاپان اس بارے میں کیا حکمت عملی اختیار کرے۔ کیا وہ چین سے مفاہمت کی کوشش کرے، شاید اس طرح کہ چین کے سیاسی و فوجی غلبے کو تسلیم کرنے کے عوض معاشی معاملات میں جاپان کی اولیت کو مانا جائے؟ کیا وہ چین کو متوازن اور محدود کرنے کی خاطر امریکی جاپانی اتحاد کو نئے معانی اور قوت دینے کی کوشش کرے؟ کیا وہ چینی مداخلت کے خلاف اپنے مفادات کے دفاع کے لیے اپنی فوجی قوت بڑھانے کی کوشش کرے؟ غالب امکان یہ ہے کہ جاپان جب تک ان سوالات کے دوٹوک جوابات سے گریز کر سکے گا، کرے گا۔

چین کو متوازن اور محدود کرنے کی کسی بامعنی کوشش کا مرکز امریکی جاپانی فوجی اتحاد ہی ہوگا۔ اس مقصد کے لیے جاپان اس اتحاد کا رخ بدلنے کو آہستہ آہستہ تسلیم کر سکتا ہے۔ جاپان کے ایسا کرنے کا انحصار اس پر ہوگا کہ اسے مندرجہ ذیل باتوں پر اعتماد ہو: (۱) دنیا کی واحد سپر طاقت کی حیثیت اور عالمی امور میں اپنی فعال قیادت قائم رکھنے کی امریکی اہلیت؛ (۲) ایشیا میں اپنی موجودگی برقرار رکھنے اور چین کے اثرات پھیلنے سے روکنے کے مقاصد سے امریکی وابستگی؛ اور (۳) امریکا اور جاپان کی بھاری لاگت یا جنگ میں بہت زیادہ خطرات کے بغیر چین کو محدود کرنے کی اہلیت۔

امریکا کی طرف سے اس بارے میں محکم ارادے اور عزائم کا اظہار نہ کیا گیا، جس کے غالب امکانات ہیں، تو جاپان سے یہی توقع ہے کہ وہ چین کے ساتھ افہام و تفہیم کا راستہ اپنائے گا۔ سوائے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں کے جب جاپان نے مشرقی ایشیا میں یکطرفہ فتوحات کی پالیسی پر عمل کیا تھا اور تباہ کن نتائج بھگتے تھے، وہ تاریخ میں اُس قوت سے اتحاد کر کے سلامتی قائم رکھنے کی کوشش کرتا آیا ہے جسے وہ بالادست سمجھتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں بھی محوری طاقتوں میں شامل ہوکر جاپان ان طاقتوں سے اتحاد کر رہا تھا جو اُس دور میں عالمی سیاست کی متحرک ترین فوجی و نظریاتی قوت معلوم ہوتی تھی۔ اس صدی میں اس سے پہلے وہ اینگلو جاپانی اتحاد میں سوچ سمجھ کر شامل ہوا کیونکہ برطانیہ عظمیٰ عالمی امور میں صفِ اول کی طاقت تھا۔ اسی طرح ۱۹۵۰ء کے عشرے میں جاپان نے خود کو امریکا سے وابستہ کیا جو دنیا کا طاقتور ترین ملک تھا اور جو جاپان کی

سلامتی کی ضمانت دے سکتا تھا۔ چینیوں کی مانند جاپانی بھی بین الاقوامی سیاست کو طبقاتی تصور کرتے ہیں کیونکہ ان کی ملکی سیاست طبقاتی ہے۔ جیسا کہ ایک ممتاز جاپانی دانشور نے کہا:

> جب جاپانی بین الاقوامی سماج میں اپنی قوم کے بارے میں سوچتے ہیں تو جاپانی ملکی مثالیں موازنے کے لیے سامنے آتی ہیں۔ جاپانیوں کا یہ رجحان ہے کہ وہ بین الاقوامی نظام کو اُس ثقافتی تانے بانے کا اظہار خیال کرتے ہیں جو جاپانی معاشرے کے اندر عیاں ہیں جس میں عمودی طور پر تشکیل شدہ ڈھانچوں کی اہمیت ہے۔ بین الاقوامی نظام کے بارے میں یہ تصور ماقبل جدید دور کے چینی جاپانی تعلقات (جو خراج کا نظام تھا) کے طویل تجربے سے متاثر ہے۔

لہٰذا جاپان کا اتحادی رویہ "بنیادی طور پر توازن کا نہیں، تقلید کا" اور "غالب طاقت سے ربط ضبط" کا رہا ہے۔[۶۱] جاپان میں طویل عرصے رہنے والے ایک مغربی باشندے نے کہا کہ جاپانی "بڑی قوت کے سامنے جھکنے اور اخلاقی اعتبار سے برتر سمجھے جانے والوں سے تعاون کے معاملے میں بہت تیزی دکھاتے ہیں... اور اخلاقی طور پر گرے ہوئے اور پسپا ہوتے ہوئے بالا دست کی زیادتی پر برہمی کا مظاہرہ کرنے میں سب سے تیز ہیں۔" ایشیا میں امریکی کردار میں کمی اور چین کے حاوی آنے کے ساتھ جاپانی پالیسی بھی اسی تناسب سے تبدیل ہوگی۔ بلکہ ہونا شروع ہو گئی ہے۔ کشور محبوبانی کا تبصرہ ہے کہ چین جاپان کے روابط میں کلیدی سوال یہ ہے کہ "نمبر ایک کون ہے؟" اور جواب صاف ہوتا جا رہا ہے۔ "کوئی واضح بیانات یا افہام و تفہیم نہیں ہوگی لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ جاپانی شہنشاہ نے ۱۹۹۲ء میں اس وقت چین کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا جب بیجنگ بین الاقوامی طور پر خاصا الگ تھلگ تھا۔"[۶۲]

مثالی بات تو یہی ہوگی کہ جاپان رہنما اور عوام پچھلے چند عشروں کی صورتحال کو ترجیح دیں اور امریکا کے سائے میں رہیں۔ تاہم ایشیا میں امریکا کی شمولیت گھٹنے کے ساتھ جاپان میں وہ قوتیں زور پکڑتی جارہی ہیں جو جاپان کے "دوبارہ ایشیائی رنگ میں رنگنے" پر اصرار کررہی ہیں اور جاپانی مشرقی ایشیا کے خطے میں ایک بار پھر چینی بالادستی کو ناگزیر کے طور پر قبول کرلیں گے۔ مثال کے طور پر جب ۱۹۹۴ء میں جاپانی عوام سے دریافت کیا گیا کہ اکیسویں صدی میں کون سی قوم ایشیا میں سب سے زیادہ اثر ورسوخ کی حامل ہوگی تو ۴۴ فیصد نے چین، ۳۰ فیصد نے امریکا اور صرف ۱۶ فیصد نے جاپان کا نام لیا۔[۶۳] جیسا کہ ایک اعلیٰ جاپانی عہدیدار نے ۱۹۹۵ء میں پیشگوئی کی، جاپان میں اتنا "نظم وضبط" ہوگا کہ وہ چین کے عروج سے مطابقت پیدا کرے۔ پھر اس نے یہ پوچھا کہ آیا امریکا میں یہ نظم وضبط ہوگا۔ اس عہدیدار کا پہلا فقرہ قابل یقین ہے مگر بعد میں پوچھے گئے سوال کا جواب غیر یقینی ہے۔

چینی بالادستی مشرقی ایشیا میں عدم استحکام اور تنازعے کو کم کرے گی۔ یہ وہاں امریکی و مغربی اثرات کو بھی گھٹائے گی اور امریکا کو مجبور کرے گی کہ وہ اس چیز کو قبول کرے جس کو تاریخ میں روکنے کی کوشش کرتا رہا ہے: دنیا کے ایک کلیدی خطے میں کسی اور طاقت کا غلبہ۔ تاہم یہ غلبہ دوسری ایشیائی اقوام یا امریکا کے مفادات کو کس حد تک مخدوش بنائے گا، اس بات کا انحصار جزواً اس پر ہے کہ چین میں کیا ہوتا ہے۔ اقتصادی ترقی بالعموم فوجی طاقت اور سیاسی اثر ورسوخ پیدا کرتی ہے لیکن یہ سیاسی تبدیلی اور کھلے پن، تکثیریت اور شاید جمہوری سیاست کی طرف تحریک کو بھی جنم دے سکتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنوبی کوریا اور تائیوان پر پہلے ہی یہ اثرات مرتب ہو چکے ہیں۔ تاہم ان دونوں ملکوں میں جمہوریت کے حق میں فعال ترین سیاسی رہنما عیسائی رہے ہیں۔

چین کا کنفیوشین ورثہ جس میں حاکمیت، انضباط، حفظِ مراتب اور فرد پر اجتماع کی برتری پر زور دیا گیا ہے جمہوری بننے کی راہ میں دشواریاں پیدا کرتا ہے۔ تاہم معاشی نمو جنوبی چین میں دولت کی فراوانی، ایک متحرک بورژوا طبقہ، سرکاری کنٹرول سے باہر اقتصادی طاقت اور تیزی سے پھیلتا ہوا متوسط طبقہ پیدا کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں تجارت، سرمایہ کاری اور تعلیم کے حوالے سے چین کے لوگ بیرونی دنیا کے معاملات میں گہری شمولیت رکھتے ہیں۔ یہ سب عوامل سیاسی تکثیریت کی جانب تحریک کی سماجی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

سیاسی کشادگی کی پہلی شرط عام طور پر حاکمیت کے نظام میں اصلاحی عناصر کا برسرِ اقتدار آنا ہوتی ہے۔ کیا چین میں ایسا ہوگا؟ غالباً ڈینگ کے بعد پہلی جانشینی میں نہیں مگر ممکنہ طور پر دوسری میں ہوسکتا ہے۔ نئی صدی میں جنوبی چین کے اندر سیاسی ایجنڈے رکھنے والے گروہ جنم لے سکتے ہیں جو درحقیقت باقاعدہ طور پر نہیں تو خام سطح کی سیاسی جماعتیں ہوں گی اور امکان ہے کہ ان کے تائیوان، ہانگ کانگ اور سنگاپور میں چینیوں سے قریبی تعلقات ہوں گے اور ان کی حمایت حاصل ہوگی۔ اگر جنوبی چین میں ایسی تحریکیں ابھریں اور اگر بیجنگ میں کوئی اصلاح پسند دھڑا اقتدار میں آگیا تو کسی قسم کی سیاسی تبدیلی واقع ہوسکتی ہے۔ جمہوری عمل سیاست دانوں کے قوم پرستانہ جذبات ابھارنے اور جنگ کا امکان بڑھانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اگرچہ امکان یہ ہے کہ طویل المیعاد بنیادوں پر چین میں مستحکم تکثیری نظام دوسری طاقتوں سے اس کے تعلقات کی کشیدگی کم کردے گا۔

شاید، جیسا کہ فرائیڈبرگ نے کہا، یورپ کا ماضی ایشیا کا مستقبل ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ یورپ کا ماضی ایشیا کا مستقبل ہوگا۔ ایشیا کے سامنے جو راستے کھلے ہیں وہ یہ ہیں کہ تنازعے کی قیمت پر طاقت کو متوازن کرے یا بالادستی کی قیمت پر امن حاصل کرے۔ تاریخ، ثقافت اور طاقت کے

حقائق اس سمت اشارہ کرتے ہیں کہ ایشیا امن اور بالادستی کا راستہ چنے گا۔ ۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۰ء کی دہائیوں میں مغربی مداخلت کے ساتھ شروع ہونے والا دور ختم ہورہا ہے، چین علاقائی بالادست قوت کے مقام پر دوبارہ براجمان ہورہا ہے اور مشرق پھر اپنے اصل روپ میں آرہا ہے۔

تہذیبیں اور مرکزی ریاستیں: ابھرتے روابط

مابعد سرد جنگ کی کثیر قطبی، کثیر تہذیبی دنیا میں اس طرح کی کوئی نمایاں خلیج یا خطِ تقسیم موجود نہیں جیسا سرد جنگ کے دور میں تھا۔ تاہم جب تک مسلمانوں کی آبادیاتی اور ایشیائیوں کی اقتصادی پیشقدمی جاری ہے مغرب اور چیلنج کرنے والی تہذیبوں کے درمیان تنازعات عالمی سیاست میں دوسرے خطوطِ تقسیم سے زیادہ مرکزی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ امکان ہے کہ مسلمان ملکوں کی حکومتیں مغرب سے کم دوستانہ رویہ اختیار کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں گی اور اسلامی تنظیموں اور مغربی معاشروں کے مابین وقتاً فوقتاً کم شدت کے اور بعض اوقات شاید زیادہ شدت کے خونریزی کے واقعات ہوتے رہیں گے۔ امریکا کے چین، جاپان اور دوسرے ایشیائی ملکوں سے تعلقات انتہائی متنازع ہوں گے اور اگر امریکا نے ایشیا میں چین کے بالادست طاقت کے طور پر عروج کو چیلنج کیا تو بڑی جنگ چھڑ سکتی ہے۔

ان حالات میں کنفیوشین اسلامی تعلقات جاری رہیں گے بلکہ شاید بڑھیں اور گہرے ہو جائیں۔ ان تعلقات میں اہم ترین عنصر ہتھیاروں کے پھیلاؤ، انسانی حقوق اور دیگر مسائل پر مسلم اور صینی معاشروں کا تعاون ہے۔ پاکستان، ایران اور چین کے درمیان قریبی روابط اس حوالے سے مرکزی حیثیت کے حامل ہیں جو ۱۹۹۰ء کے اوائل میں صدر یانگ شانگ کن کے ایران اور پاکستان کے اور صدر رفسنجانی کے پاکستان اور چین کے دوروں میں تشکیل پائے۔ ان سے "پاکستان، ایران اور چین کے مابین ایک ابھرتے ہوئے اتحاد کا اشارہ ملا" چین جاتے ہوئے رفسنجانی نے اسلام آباد میں اعلان کیا کہ ایران اور پاکستان کے درمیان "عسکری اتحاد" موجود ہے اور پاکستان پر حملہ ایران پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس روش کو مزید تقویت بے نظیر بھٹو کے ایران اور چین کے دورے سے ملی جو انہوں نے اکتوبر ۱۹۹۳ء میں وزیر اعظم بننے کے فوراً بعد کیا۔ ان تینوں ممالک کے مابین تعاون میں باقاعدگی سے سیاسی، فوجی اور اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کے دوروں کے تبادلے اور دفاعی پیداوار سمیت متعدد سول اور فوجی شعبوں میں مشترکہ کاوشیں، اور ان کے علاوہ چین سے دوسری ریاستوں کو

اسلحے کی منتقلی شامل ہیں۔ اس تعلق کے پروان چڑھنے کی پاکستان میں ان حلقوں نے زبردست حمایت کی جو خارجہ پالیسی پر "آزاد" اور "مسلم" مکتب ہائے فکر سے منسلک ہیں جو ایک "تہران۔اسلام آباد۔بیجنگ" محور کے قیام کی امید رکھتے تھے جبکہ تہران میں یہ کہا گیا کہ "دورِ حاضر کی مخصوص نوعیت" ایران، چین، پاکستان اور قازقستان میں "قریبی اور مسلسل تعاون" کی متقاضی ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط تک تینوں ملکوں کے درمیان عملاً ایک اتحاد وجود میں آ چکا تھا جس کی جڑیں مغرب کی مخالفت، بھارت سے سلامتی کے خدشات اور وسط ایشیا میں ترکی اور روسی اثرات کو روکنے کی خواہش میں تھیں۔[۴۳]

کیا یہ امکان ہے کہ یہ ریاستیں کسی وسیع تر گروہ کے مرکز کی حیثیت اختیار کریں جس میں دوسرے مسلمان اور ایشیائی شامل ہوں؟ گراہم فلر کے مطابق ایک غیر رسمی قسم کا "کنفیوشین اسلامی اتحاد حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے، اس لیے نہیں کہ محمد [ﷺ] اور کنفیوشس مغرب دشمن ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ ثقافتیں ان شکایات کے اظہار کے لیے ذریعہ مہیا کرتی ہیں جن کا مغرب کو جزوی طور پر موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، وہ مغرب جس کی سیاسی، فوجی، اقتصادی اور ثقافتی بالادستی ایک ایسی دنیا میں مستقل باعث تکلیف ہے جہاں ریاستیں محسوس کر رہی ہیں کہ 'اب انہیں مزید برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔'" اس قسم کے تعاون کے لیے سب سے زیادہ پرجوش آواز معمر قذافی نے بلند کی جنہوں نے مارچ ۱۹۹۴ء میں اعلان کیا:

> نئے عالمی نظام کا مطلب یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی مسلمانوں کو دبا کر رکھیں اور اگر وہ ایسا کر سکے تو اس کے بعد کنفیوشنزم اور بھارت، چین اور جاپان میں دوسرے مذاہب کو دبائیں گے...
>
> اب عیسائی اور یہودی یہ کہہ رہے ہیں: ہم نے کمیونزم کو کچلنے کا تہیہ کیا ہوا تھا اور اب مغرب کو اسلام اور کنفیوشنزم کو کچلنا چاہیے۔
>
> ہمیں چین اور امریکا کے درمیان محاذ آرائی کی توقع ہے جس میں چین کنفیوشنزم کیمپ اور امریکا عیسائی صلیبی کیمپ کی قیادت کرے گا۔ ہمارے پاس صلیبیوں کے خلاف ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم کنفیوشنزم کے ساتھ ہیں اور اس سے اتحاد کر کے اور ایک بین الاقوامی محاذ پر اس کے ہمراہ لڑ کر اپنے مشترکہ حریف کو ختم کریں گے۔
>
> پس مسلمان کی حیثیت سے ہم اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف جدوجہد میں چین کی مدد کریں گے...
> ہم چین کی فتح کے لیے دعا گو ہیں...[۴۴]

تاہم کنفیوشین اور اسلامی ریاستوں میں قریبی مغرب دشمن اتحاد کے لیے چین میں زیادہ جوش و خروش نہیں پایا جاتا اور ۱۹۹۵ء میں صدر جیانگ زیمن نے اعلان کیا کہ چین کسی ملک کے

ساتھ اتحاد نہیں کرے گا۔ یہ موقف غالباً اس چینی کلاسیکی نقطہ نظر کا عکاس تھا کہ وسطی بادشاہت اور مرکزی طاقت کی حیثیت سے چین کو باضابطہ اتحادوں کی ضرورت نہیں اور دوسرے ملک چین سے تعاون کو اپنے مفاد میں پائیں گے۔ دوسری جانب مغرب سے چین کے تنازعات کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسری مغرب مخالف ریاستوں کی قدر کرے گا جن کی سب سے زیادہ اور سب سے بااثر تعداد اسلام فراہم کرتا ہے۔ علاوہ ازیں چین کی تیل کی روز افزوں ضروریات اسے ایران، عراق اور سعودی عرب نیز قازقستان اور آذربائیجان سے اپنے روابط میں اضافے پر مجبور کریں گی۔ ایک ماہر توانائی نے ۱۹۹۴ء میں کہا کہ اس طرح کے اسلحہ برائے تیل کے محور کو ''پھر لندن، پیرس اور واشنگٹن کے احکامات نہیں سننے پڑیں گے''۔[۴۵]

مغرب اور اس کو چیلنج کرنے والوں سے دوسری تہذیبوں اور ان کی مرکزی ریاستوں کے تعلقات گوناگوں اقسام کے ہوں گے۔ جنوبی تہذیبیں لاطینی امریکا اور افریقہ کسی مرکزی ریاست سے محروم ہیں، مغرب کی محتاج رہی ہیں اور فوجی و اقتصادی اعتبار سے نسبتاً کمزور ہیں (گو کہ لاطینی امریکا میں یہ صورتحال اب تیزی سے بدل رہی ہے)۔ مغرب سے اپنے تعلقات میں وہ غالباً متضاد سمتوں میں جائیں گی۔ لاطینی امریکا ثقافتی طور پر مغرب سے قریب ہے۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں اس کے سیاسی اور معاشی نظام مغرب سے زیادہ سے زیادہ مشابہہ ہوتے چلے گئے۔ دو لاطینی امریکی ریاستیں جنہوں نے ایک زمانے میں جوہری اسلحہ حاصل کرنا چاہا تھا، اپنی کوششیں ترک کر دیں۔ لاطینی امریکا میں دوسری تمام تہذیبوں کے مقابلے میں مجموعی طور پر فوجی قوت کے حصول کی جدوجہد سب سے کم ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ لاطینی امریکا کے باشندے امریکا کی فوجی بالادستی کو ناپسند کرتے ہوں لیکن اسے چیلنج کرنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کر رہے۔ بہت سے لاطینی امریکی معاشرے پروٹسٹنٹ مسلک کے تیزی سے بڑھنے کے باعث مغرب کے ملے جلے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ معاشروں جیسے ہوتے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی لاطینی امریکا اور مغرب کے درمیان ان مذہبی رشتوں میں اضافہ ہو رہا ہے جو روم سے ہو کر گزرتے ہیں۔ دوسری طرف امریکا میں میکسیکن، وسطی امریکی اور جزائر غرب الہند کے باشندوں کی آمد اور اس کے نتیجے میں امریکی سماج پر پڑنے والے ہسپانوی اثرات سے بھی ثقافتی اشتراک جنم لے رہا ہے۔ لاطینی امریکا اور مغرب، یعنی عملاً ریاست ہائے متحدہ امریکا، کے مابین سب سے متنازع معاملات نقل مکانی، منشیات اور منشیات سے منسلک دہشت گردی اور اقتصادی اتحاد (یعنی لاطینی امریکا کی ریاستوں کی نیفٹا میں شمولیت بمقابلہ مرکوسر اور اینڈین معاہدے جیسی لاطینی امریکی گروہ بندیوں کی توسیع) ہیں۔ جیسا کہ میکسیکو کی نیفٹا

میں شمولیت کے حوالے سے پیدا ہونے والے مسائل سے پتا چلتا ہے، لاطینی امریکی اور مغربی تہذیبوں کی یکجائی آسان نہ ہوگی، غالباً اکیسویں صدی کے بیشتر عرصے کے دوران آہستہ آہستہ جاری رہے گی اور ہوسکتا ہے کبھی مکمل طور پر نہ ہوسکے۔ اس کے باوجود مغرب اور لاطینی امریکا میں دوسری تہذیبوں اور مغرب کی بہ نسبت معمولی اختلافات ہیں۔

مغرب سے افریقہ کے تعلقات اس سے کچھ ہی زیادہ متنازع ہوں گے، بنیادی طور پر اس لیے کہ افریقہ بہت کمزور ہے۔ تاہم بعض اہم مسائل موجود ہیں۔ جنوبی افریقہ نے، برازیل اور ارجنٹینا کی طرح جوہری ہتھیار بنانے کا پروگرام ترک نہیں کیا؛ اس نے وہ ہتھیار تباہ کر دیے جو وہ بنا چکا تھا۔ یہ ہتھیار ایک سفید فام حکومت نے نسل پرستی کی پالیسی پر غیر ملکی حملے روکنے کے لیے تیار کیے تھے اور وہ اسے ایک سیاہ فام حکومت کے لیے ترکے میں نہیں چھوڑنا چاہتی تھی جو اسے دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرسکتی۔ تاہم جوہری ہتھیار بنانے کی صلاحیت تباہ نہیں کی جاسکتی اور ممکن ہے کہ نسل پرست حکمرانوں کے بعد آنے والی کوئی حکومت نیا جوہری اسلحہ خانہ تیار کرلے تاکہ اس کی افریقہ کی مرکزی ریاست کی حیثیت یقینی ہوجائے اور مغرب افریقہ میں مداخلت سے باز رہے۔ انسانی حقوق، نقل مکانی، اقتصادی معاملات اور دہشت گردی بھی افریقہ اور مغرب کے درمیان بحث طلب مسائل ہیں۔ فرانس کی اپنی سابق نوآبادیوں سے قریبی تعلقات برقرار رکھنے کی کوششوں کے باوجود مغربیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک طویل المیعاد عمل افریقہ میں جاری معلوم ہوتا ہے، مغربی طاقتوں کی دلچسپی اور اثرات کم ہورہے ہیں، دیسی ثقافتیں اپنا اثبات کررہی ہیں اور جنوبی افریقہ اپنی ثقافت کے افریقی پہلوؤں کو افریکان اور انگریزی عناصر پر فوقیت دے رہا ہے۔ لاطینی امریکا زیادہ مغربی بن رہا ہے تو افریقہ کم مغربی ہوتا جارہا ہے۔ تاہم دونوں مختلف طریقوں سے مغرب کے محتاج ہیں اور، اقوام متحدہ کے ووٹوں کے سوا، مغرب اور اس کو چیلنج کرنے والی تہذیبوں کے درمیان توازن پر فیصلہ کن اثر نہیں ڈال سکتے۔

تین "وزن دار" تہذیبوں کے ساتھ یہ معاملہ بالکل نہیں۔ ان کی مرکزی ریاستیں عالمی امور میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور امکان ہے کہ ان کے مغرب اور اس کی چیلنج کرنے والی تہذیبوں سے مخلوط، ملے جلے اور متغیر روابط ہوں گے۔ ان کے باہمی تعلقات بھی تغیر پذیر ہوں گے۔ جاپان، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، وقت گزرنے پر سخت اذیت کے ساتھ اور اپنا جائزہ لینے کے بعد امکان ہے کہ امریکا سے رخ موڑ کر چین کی طرف ہوجائے گا۔ سرد جنگ کے دیگر ماورائے تہذیب اتحادوں کی مانند امریکا سے جاپان کے سلامتی کے روابط کمزور ہوں گے گو کہ باضابطہ طور پر غالباً کبھی منقطع نہ

ہوں۔ روس سے اس کے تعلقات ناخوشگوار رہیں گے تاوقتیکہ روس کیورائل جزائر پر سمجھوتا کرنے پر آمادہ نہ ہوجائے جن پر اس نے ۱۹۴۵ء میں قبضہ کیا تھا۔ وہ لمحہ جب سرد جنگ کے خاتمے پر اس تنازعے کا تصفیہ ہوسکتا تھا، روسی قوم پرستی کے ابھرنے کے ساتھ تیزی سے گزر گیا اور کوئی وجہ نہیں امریکا مستقبل میں بھی اسی طرح جاپانی دعوے کی حمایت کرے جیسی وہ ماضی میں کرتا رہا۔

سرد جنگ کے آخری عشروں میں جاپان نے سوویت یونین اور امریکا کے خلاف مؤثر طور پر ''چین کا کارڈ'' کھیلا۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں روس کے پاس کھیلنے کے لیے ''روس کا کارڈ'' ہے۔ روس اور چین کا ایکا یوریشین توازن مغرب کے خلاف بدل دے گا اور ان سب پریشانیوں کو ابھار دے گا جو ۱۹۵۰ء کے عشرے میں چینی سوویت تعلق کے بارے میں پیدا ہوئی تھیں۔ روس نے مغرب سے قریبی تعاون کیا تو وہ کنفیوشین اسلامی روابط کے خلاف عالمی امور پر وزن ڈال سکے گا اور چین پر شمال کی سمت سے حملے سے متعلق سرد جنگ کے زمانے کے اندیشے پھر بیدار کردے گا۔ تاہم ان دونوں ہمسایہ تہذیبوں سے روس کے بھی تنازعات ہیں۔ جہاں تک مغرب کا تعلق ہے، یہ تنازعات مختصر مدتی ہیں اور سرد جنگ کے خاتمے کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح روس اور مغرب کے درمیان توازن کو نئے سرے سے متعین کرنے اور ایک دوسرے کی برابری اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کے بارے میں فریقین میں اتفاق کی ضرورت ہے۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ:

۱۔ روس یورپی یونین اور نیٹو کی توسیع اور اس میں وسطی و مشرقی یورپ کی مغربی مسیحی ریاستوں کی شمولیت کو قبول کرے اور مغرب نیٹو میں مزید توسیع نہ کرنے کا عہد کرے، سوائے اس صورت کے کہ یوکرین دو ملکوں میں بٹ جائے؛

۲۔ روس اور نیٹو کے مابین عدم جارحیت کا معاہدہ طے پائے، سلامتی کے مسائل پر باقاعدگی سے مشاورت ہو، اسلحے کی مسابقت سے گریز کے لیے مشترکہ کوششیں کی جائیں اور مابعد سرد جنگ کی سلامتی کی ضروریات کی مناسبت سے ہتھیاروں سے متعلق معاہدوں پر گفت وشنید کی جائے؛

۳۔ مغرب تسلیم کرے کہ روس آرتھوڈوکس ممالک اور ان خطوں میں جہاں آرتھوڈوکسی غالب ہے، سلامتی قائم رکھنے کا ذمے دار ہے؛

۴۔ مغرب ان موجودہ اور ممکنہ سلامتی کے مسائل کو تسلیم کرے جو روس کو جنوب کی سمت سے مسلمان اقوام سے درپیش ہیں، سی ایف ای معاہدے پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ ہو اور ایسے دیگر اقدامات کی حمایت کرے جو روس ان خطرات سے نمٹنے کے لیے کرے؛

۵۔ روس اور مغرب کے درمیان بوسنیا جیسے مسائل پر، جن میں مغربی اور آرتھوڈوکس مفادات دونوں شامل ہیں، مساوی فریقوں کی حیثیت سے تعاون کرنے پر اتفاق ہو۔

اگر ان خطوط پر یا ملتے جلتے خطوط پر کوئی تعلق بن گیا تو روس اور مغرب ایک دوسرے کے لیے کسی طویل المیعاد سلامتی کے خطرے کا باعث نہیں ہوں گے۔ یورپ اور روس آبادیاتی اعتبار سے پختہ معاشرے ہیں جن میں پیدائش کی شرحیں کم اور معمر آبادی زیادہ ہے؛ ایسے معاشروں میں جوانوں کا توسیع پسندانہ جذبہ اور جارحانہ فضا نہیں ہوتی۔

سرد جنگ کے فوراً بعد کے دور میں روس اور چین کے روابط میں معنی خیز تعاون کا آغاز ہوگیا۔ سرحدی تنازعات کا تصفیہ ہوا، سرحدوں پر دونوں جانب افواج کم ہوئیں، تجارت میں اضافہ ہوا، دونوں نے ایک دوسرے کے جوہری میزائلوں کو ہدف پر رکھنا ترک کر دیا اور بنیاد پرست اسلام سے لڑائی میں دونوں کے وزراء خارجہ نے مشترکہ مفادات کا جائزہ لیا۔ اہم ترین امر یہ ہے کہ روس کو چین کی شکل میں فوجی سازوسامان اور ٹیکنالوجی، بشمول ٹینکوں، لڑاکا طیاروں، دور مار بمباروں اور سطح سے فضا میں مار کرنے والے میزائلوں کا ایک خریدار مل گیا جو شوق سے بہت کچھ خریدنے کو تیار تھا۔[۲] روس کی نگاہ میں تعلقات کی یہ گرما گرمی چین کے ساتھ اپنے ایشیائی "رفیق" کے طور پر کام کرنے کا سوچا سمجھا فیصلہ بھی تھا کیونکہ جاپان سے اس کے روابط سرد مہری کا شکار تھے، اور نیٹو کی توسیع، اقتصادی اصلاحات، تخفیف اسلحہ، معاشی امداد اور مغربی بین الاقوامی اداروں میں اپنی رکنیت کے مسائل پر مغرب سے تنازعات پر اس کے ردعمل کا اظہار بھی تھا۔ ادھر چین مغرب پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ دنیا میں اکیلا نہیں اور خطے میں طاقت کے پھیلاؤ کے منصوبوں پر عملدرآمد کے لیے ضروری فوجی صلاحیتیں حاصل کرسکتا ہے۔ دونوں ملکوں کے لیے روس چین تعلق، کنفیوشین اسلامی تعلق کی طرح مغربی طاقت و آفاقیت کا مقابلہ کرنے کا ذریعہ ہے۔

اس تعلق کے طویل عرصے تک باقی رہنے کا دارومدار ایک تو اس بات پر ہے کہ مغرب سے روس کے روابط دونوں کے لیے اطمینان بخش بنیاد پر کس حد تک مستحکم ہوتے ہیں دوسرے اس بات پر ہے کہ مشرقی ایشیا میں چین کے بالادست ہونے سے روس کے اقتصادی، آبادیاتی اور عسکری مفادات کس حد مخدوش ہوجاتے ہیں۔ چین کی معاشی فعالیت سائبیریا تک پہنچ گئی ہے اور کوریائیوں اور جاپانیوں کے ہمراہ چینی تاجر بھی وہاں مواقع تلاش کررہے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ سائبیریا کے روسی اپنے معاشی مستقبل کو یورپی روس سے زیادہ مشرقی ایشیا سے وابستہ دیکھ رہے ہیں۔ روس کے لیے اس سے زیادہ خطرناک سائبیریا میں چینیوں کی نقل مکانی ہے۔ وہاں ۱۹۹۳ء میں چینی

تارکین کی تعداد ۳۰ سے ۵۰ لاکھ تک بتائی گئی ہے جبکہ مشرقی سائبیریا میں روسی آبادی ۷۰ لاکھ ہے۔ روسی وزیر دفاع پاؤل گراچیف نے خبردار کیا کہ ''اہلِ چین روسی مشرق بعید کو پُر امن طریقے سے تسخیر کر رہے ہیں۔'' روس کے ترک وطن کے محکمے کے اعلیٰ عہدیدار نے بھی اسی طرح کی بات کہی ''ہمیں چینی توسیع پسندی کی مزاحمت کرنی چاہیے''۔[۴۷] مزید برآں وسط ایشیا کی سابق سوویت جمہوریاؤں سے چین کے پروان چڑھتے ہوئے روابط کی وجہ سے بھی روس سے تعلقات خراب ہوسکتے ہیں۔ اگر چین نے منگولیا کو، جسے پہلی جنگ عظیم کے بعد روسیوں نے چین سے علیحدہ کر دیا تھا اور جو عشروں تک سوویت یونین کا پٹھو رہا، دوبارہ حاصل کرنا چاہا تو چینی توسیع پسندی فوجی روپ دھار سکتی ہے۔ کسی مرحلے پر ''زرد غول'' جو منگولوں کی یورش کے زمانے سے روس کے حواسوں پر سوار ہیں، دوبارہ حقیقت بن سکتے ہیں۔

اسلام سے روس کے تعلقات ترکوں، شمالی قفقاز کی قوموں اور وسط ایشیا کی امارات کے خلاف جنگ کے ذریعے صدیوں کی توسیع کے تاریخی ورثے نے تشکیل دیے ہیں۔ اب روس بلقان میں ترکی اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آرتھوڈوکس حلیفوں سربیا اور یونان کی شراکت میں اور ماورائے قفقاز میں ان اثرات کو محدود کرنے کے لیے اپنے آرتھوڈوکس حلیف آرمینیا کی شراکت میں سرگرم ہے۔ اس نے وسط ایشیائی جمہوریاؤں میں اپنا سیاسی، معاشی اور فوجی اثر ورسوخ برقرار رکھنے کے لیے فعال کوششیں کی ہیں، انہیں آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ میں شامل کیا ہے اور ان سب میں اپنی فوج تعینات کر رکھی ہے۔ روس کی تشویش کا محور بحیرۂ خزر کے تیل اور گیس کے ذخائر اور وہ راستے ہیں جن کے ذریعے یہ وسائل مغرب اور مشرقی ایشیا پہنچیں گے۔ روس ایک جنگ شمالی قفقاز میں چچنیا کی مسلم قوم کے خلاف لڑ رہا ہے اور دوسری تاجکستان میں اسلامی بنیاد پرستوں کی شورش کے خلاف حکومت کی حمایت میں لڑ رہا ہے۔ سلامتی کے یہ مسائل وسط ایشیا میں ''اسلامی خطرے'' کو محدود کرنے کے لیے چین سے تعاون کرنے کی ترغیب پیدا کرتے ہیں اور ایران سے روسی مفاہمت کے لیے بھی یہ بڑا محرک ہیں۔ روس نے ایران کو آبدوزیں، جدید ترین قسم کے جنگی طیارے، لڑاکا بمبار، سطح سے فضا میں مار کرنے والے میزائل اور جاسوسی کے آلات اور الیکٹرانک جنگی سازوسامان فروخت کیا ہے۔ اس کے علاوہ روس نے ایران میں ہلکے پانی کے جوہری ری ایکٹر تعمیر کرنے اور ایران کو یورینیم کو افزودہ کرنے کے آلات فراہم کرنے کا بھی معاہدہ کیا ہے۔ جواب میں روس ایران سے یہ کھلی توقع رکھتا ہے کہ وہ وسط ایشیا میں بنیاد پرستی کو پھیلنے سے باز رکھے گا اور یہ چھپی توقع رکھتا ہے کہ وہ وہاں اور قفقاز میں ترکی اثرات کا مقابلہ کرنے میں تعاون کرے۔ آنے

والی دہائیوں میں اسلام سے روس کے روابط اس کے جنوبی سرحدی خطوں میں بڑھتی ہوئی مسلمان آبادی سے درپیش محسوس خطرات سے تشکیل پائیں گے۔

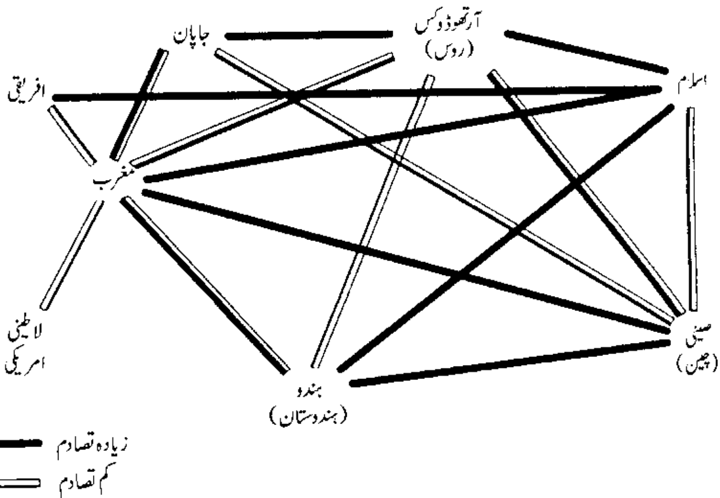
تیسری ''وزن دار'' مرکزی ریاست بھارت سرد جنگ کے دوران سوویت یونین کی حلیف تھی، اس نے چین سے ایک اور پاکستان سے کئی جنگیں لڑیں۔ مغرب خصوصاً امریکا سے اس کے تعلقات میں جب تلخی نہیں ہوتی تھی تو دوری ہوتی تھی۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں پاکستان سے بھارت کے تعلقات کشمیر، جوہری ہتھیاروں اور برصغیر میں مجموعی فوجی توازن کے مسائل پر تنازعات سے آلودہ ہوں گے۔ پاکستان جس حد تک دوسرے مسلمان ملکوں سے حمایت حاصل کر سکا، بھارت کے اسلام سے تعلقات بالعموم دشواریوں کا شکار ہوں گے۔ اس کی تلافی کرنے کے لیے بھارت انفرادی طور پر بعض مسلم ممالک کو پاکستان سے دور کرنے کے لیے خصوصی کوششیں کر سکتا ہے جیسے ماضی میں کر چکا ہے۔ سرد جنگ کے ختم ہونے کے ساتھ چین کی اپنے پڑوسی ملکوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوششوں کے دائرے میں بھارت بھی آ گیا اور دونوں کے درمیان کشیدگی کم ہوگئی۔ تاہم یہ رجحان غیر معینہ مدت تک جاری رہنے کا امکان نہیں۔ چین نے خود کو سرگرمی سے جنوبی ایشیا کی سیاست میں شامل کیا ہے اور شاید ان اقدامات کا سلسلہ جاری رکھے گا: پاکستان سے قریبی تعلق برقرار رکھنا، پاکستان کی جوہری اور روایتی ہتھیاروں کی صلاحیت کو مضبوط بنانا اور میانمار کو اقتصادی امداد، سرمایہ کاری اور فوجی امداد کے ذریعے اپنی طرف راغب کرنے کے ساتھ ممکنہ طور پر وہاں بحری تنصیبات قائم کرنا۔ اس وقت چینی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے؛ بھارت کی طاقت اکیسویں صدی کے اوائل میں خاصی بڑھ سکتی ہے۔ تنازعے کا غالب امکان ہے۔ ایک تجزیہ نگار کا تبصرہ ہے کہ ''ایشیا کے ان دونوں دیو قامت ملکوں کے درمیان طاقت کا پوشیدہ مقابلہ اور ان کے اپنے اپنے بارے میں یہ تصورات کہ وہ فطری عظیم طاقت اور تہذیب و ثقافت کا گڑھ ہیں، انہیں مختلف ممالک اور مقاصد کی حمایت کی طرف مائل کرتے رہیں گے۔ بھارت کثیر قطبی دنیا میں نا صرف طاقت کے آزاد مرکز کے طور پر بلکہ چینی قوت اور اثرات کے مقابل کی حیثیت سے ابھرنے کی جدوجہد کرے گا۔''[۴۸]

بھارت کو وسیع تر کنفیوشین اسلامی ربط ضبط سے نہیں تو کم از کم چین پاکستان اتحاد کا سامنا ہے اس لیے یہ اس کے مفاد میں ہوگا کہ روس سے قریبی روابط برقرار رکھے اور روسی فوجی ساز و سامان کا بڑا خریدار بنا رہے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے وسط میں بھارت روس سے تقریباً ہر قسم کے ہتھیار حاصل کر رہا تھا جن میں طیارہ بردار جہاز اور کرایوجینک (کم درجہ حرارت سے متعلق) راکٹ

ٹیکنالوجی شامل ہے جس کی بنا پر امریکا نے پابندیاں عائد کیں۔ ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے علاوہ بھارت اور امریکا کے درمیان دوسرے تنازعات انسانی حقوق، کشمیر اور اقتصادی آزادی شامل ہیں۔ بہرحال وقت گزرنے کے ساتھ توقع یہ ہے کہ پاک امریکا تعلقات میں سرد مہری اور چین کے اثرات کو محدود کرنے سے متعلق مشترکہ مفادات بھارت اور امریکا کو قریب لائیں گے۔ جنوبی ایشیا میں بھارت کی طاقت بڑھنے سے امریکی مفادات کو نقصان نہیں ہوسکتا اور فائدے کا امکان ہے۔

تہذیبوں اور ان کی مرکزی ریاستوں کے درمیان روابط پیچیدہ اور اکثر ملے جلے ہوتے ہیں اور تغیر پذیر ہیں۔ کسی ایک تہذیب کے بیشتر ممالک بالعموم دوسری تہذیب کے ملکوں سے تعلقات استوار کرنے میں اپنی مرکزی ریاست کی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا اور بلاشبہ کسی ایک تہذیب کے تمام ممالک کے دوسری تہذیب کے تمام ملکوں سے بالکل ایک جیسے روابط نہیں ہوتے۔ مشترکہ مفادات، جو عام طور پر کسی تیسری تہذیب سے تعلق رکھنے والے مشترکہ دشمن کے حوالے سے ہوتے ہیں، مختلف تہذیبوں کے ملکوں میں تعاون کا سبب بن سکتے ہیں۔ بے شک تہذیبوں کے اندر بھی، خصوصاً اسلام میں، باہمی تنازعات ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں، رخنوں پر مختلف گروہوں کے درمیان تعلقات ایک ہی تہذیب کی مرکزی ریاستوں کے باہمی روابط سے بہت مختلف ہوسکتے ہیں۔

شکل ۱ء۹
تہذیبوں کی عالمی سیاست: اُبھرتے ہوئے روابط



تاہم خاص خاص رجحانات بالکل واضح ہیں اور تہذیبوں اور مرکزی ریاستوں کے درمیان ابھرتی ہوئی دوستیوں اور دشمنیوں کے بارے میں کچھ عمومی پہلوؤں کی عکاسی کی جاسکتی ہے۔ ان کا خلاصہ شکل ۱ء۹ میں دکھایا گیا ہے۔ سرد جنگ کی سادہ دوقطبیت ایک کثیرقطبی، کثیرتہذیبی دنیا کے کہیں زیادہ پیچیدہ روابط کے لیے راہ ہموار کر رہی ہے۔

دسواں باب

عبوری جنگوں سے رخنہ جنگوں تک

عبوری جنگیں: افغانستان اور خلیج

''تہذیبوں کی پہلی جنگ'' یہ نام ایک ممتاز مراکشی دانشور مہدی المنظرہ نے خلیج کی جنگ کو اس وقت دیا جب وہ لڑی جا رہی تھی[1] درحقیقت یہ دوسری تھی۔ پہلی ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء کی سوویت افغان جنگ تھی۔ دونوں جنگیں ایک ملک پر دوسرے ملک کے براہِ راست حملے سے شروع ہوئیں لیکن تہذیبی جنگوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اصل میں یہ ایک ایسے دور کی نقیب عبوری جنگیں تھیں جس میں مختلف تہذیبوں کے گروہوں کے مابین نسلی تنازعات اور رخنہ جنگوں کا غلبہ ہونے والا تھا۔

افغان جنگ سوویت یونین کی ایک پٹھو حکومت کو برقرار رکھنے کی کوشش سے شروع ہوئی۔ جب امریکا نے شدید ردعمل ظاہر کیا اور سوویت افواج کی مزاحمت کرنے والے افغانوں کو منظم کیا، مالی امداد دی اور سازوسامان فراہم کیا تو یہ جنگِ سرد جنگ بن گئی۔ امریکیوں کی نظر میں سوویت شکست ریگن انتظامیہ کے اس نظریے کی صداقت کی دلیل تھی کہ کمیونسٹ حکومتوں کی مسلح مزاحمت کی حمایت کی جائے اور سوویت یونین کو بھی اسی طرح رسوا کیا جائے جیسے امریکا ویت نام میں ہوا تھا۔ اس شکست کے اثرات پورے سوویت معاشرے اور سیاسی ہیئت مقتدرہ میں پھیل گئے اور سوویت سلطنت کے انہدام کا ایک اہم سبب بنے۔ امریکیوں اور بالعموم اہلِ مغرب کی نگاہ میں افغانستان سرد جنگ کی آخری، فیصلہ کن فتح تھی۔

لیکن سوویت یونین سے لڑنے والوں کے لیے افغان جنگ کچھ اور تھی۔ ایک مغربی اہلِ علم کے مطابق[۲] یہ ''کسی غیرملکی طاقت کے خلاف پہلی کامیاب مزاحمت تھی جس کی بنیاد قوم پرستانہ یا سوشلسٹ اصولوں پر نہیں''، اسلامی اصولوں پر تھی، یہ جنگ جہاد کی حیثیت سے لڑی گئی اور اس نے اسلامی خود اعتمادی اور طاقت کو بے پناہ بڑھاوا دیا۔ اسلامی دنیا پر اس کے اثرات ویسے ہی گہرے تھے جیسے ۱۹۰۵ء میں جاپانیوں کے ہاتھوں روسیوں کی شکست کے مشرقی دنیا پر پڑے تھے۔ مغرب جسے آزاد دنیا کی فتح سمجھتا ہے، مسلمان اس کو اسلام کی فتح سمجھتے ہیں۔

سوویت یونین کو ہرانے کے لیے امریکی ڈالر اور میزائل ناگزیر تھے۔ عالمِ اسلام کی اجتماعی کوششیں بھی ناگزیر تھیں جس میں متنوع حکومتوں اور گروہوں نے بڑھ چڑھ کر سوویت یونین کو شکست دینے اور اس فتح کے لیے جدوجہد کی جو ان کے مفادات کی تکمیل کر سکے۔ اس جنگ کے لیے مسلم مالی امداد زیادہ تر سعودی عرب کی طرف سے آئی۔ ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۶ء کے درمیان سعودی عرب نے اس مقصد کے لیے ۵۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر فراہم کیے، ۱۹۸۹ء میں مجموعی ۷۱ کروڑ ۵۰ لاکھ میں سے ۶۱ فیصد یا ۴۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر دینے پر اتفاق کیا جبکہ بقیہ رقم امریکا کو فراہم کرنی تھی۔ ۱۹۹۳ء میں سعودی عرب نے افغان حکومت کو ۱۹ کروڑ ۳۰ لاکھ ڈالر دیے۔ جنگ کے دوران انہوں نے مجموعی طور پر جو رقم دی وہ امریکا کی فراہم کردہ رقم کے کم از کم مساوی اور غالباً اس سے ۳ یا ۳ء۳/ارب ڈالر زیادہ تھی۔ دوسرے مسلمان، خصوصاً عرب ملکوں سے لگ بھگ ۲۵ ہزار رضا کاروں نے جنگ میں شرکت کی۔ ان رضا کاروں کو، جو زیادہ تر اردن میں بھرتی کیے گئے تھے، پاکستان کی انٹرسروسز انٹیلی جنس نے تربیت دی۔ پاکستان نے مزاحمت کے لیے ضروری بیرونی بیس نیز ذرائع نقل وحمل اور دیگر امداد فراہم کی۔ مزید برآں، پاکستان امریکی رقوم کی تقسیم کا وسیلہ اور راستہ تھا اور اس نے جان بوجھ کر اس میں سے ۷۵ فیصد رقم زیادہ بنیاد پرست اسلامی تنظیموں کو دی۔ مجموعی رقم کا ۵۰ فیصد گلبدین حکمت یار کے سنی بنیاد پرست گروپ کو ملا جو زیادہ انتہا پسند تھا۔ سوویت یونین سے لڑنے کے باوجود جنگ کے عرب شرکا کی بڑی اکثریت مغرب دشمن تھی اور وہ مغربی انسانی امداد کے اداروں کو غیر اخلاقی اور اسلام کے لیے تباہ کن قرار دیتے تھے۔ آخر میں سوویت یونین کو تین عوامل نے جن کا وہ مؤثر مقابلہ یا برابری نہیں کرسکتا تھا، شکست سے دوچار کیا: امریکی ٹیکنالوجی، سعودی دولت اور مسلم آبادیات اور جوش وجذبہ۔[۳]

اس جنگ نے اپنے پیچھے اسلام پسند تنظیموں کا ایک ڈھیلا ڈھالا جال چھوڑا جو تمام غیر مسلم قوتوں کے خلاف اسلام کو فروغ دینے کے عزائم رکھتی تھیں۔ اس جنگ کے ترکے میں ماہر اور

آموزدہ کار جنگجو، کیمپ، تربیتی میدان، نقل وحمل کی سہولتیں، ذاتی اور تنظیمی رابطوں کے لمبے چوڑے جال جو اسلامی دنیا سے باہر تک پھیلے ہوئے تھے، ۳۰۰ سے ۵۰۰ اسٹنگر میزائلوں سمیت خاصا فوجی سازوسامان اور سب سے بڑھ کر اپنے کارنامے پر طاقت اور خود اعتمادی کے احساسات اور مزید فتوحات کرنے کی خواہش شامل تھی۔ ایک امریکی عہدیدار نے ۱۹۹۴ء میں کہا کہ افغان رضا کاروں کی ''جہادی اسناد، مذہبی و سیاسی حوالوں سے بے داغ ہیں۔ انہوں نے دنیا کی دو سپر طاقتوں میں سے ایک کو شکست دی اور اب وہ دوسری کے لیے کام کر رہے ہیں''۔[۴]

افغان جنگ تہذیبی جنگ بن گئی کیونکہ مسلمانوں نے ہر جگہ اسے اسی رنگ میں دیکھا اور سوویت یونین کے خلاف متحد ہو گئے۔ جنگ خلیج تہذیبی جنگ بن گئی کیونکہ مغربی ممالک نے ایک مسلم تنازعے میں فوجی مداخلت کی، اہلِ مغرب نے اس مداخلت کی بھرپور حمایت کی اور پوری دنیا میں مسلمانوں نے اسے اپنے خلاف جنگ سمجھا اور اسے مغربی سامراجیت کی ایک اور مثال سمجھتے ہوئے اس کے خلاف متحد ہو گئے۔

ابتدا میں عرب اور مسلمان حکومتیں اس جنگ پر باہم اختلاف رکھتی تھیں۔ صدام حسین نے سرحدوں کے تقدس کو پامال کیا اور اگست ۱۹۹۰ء میں عرب لیگ نے خاصی اکثریت سے (چودہ حمایت میں، دو مخالفت میں، پانچ غیر حاضر رہے یا ووٹ نہیں دیا) ان کی کارروائی کی مذمت کی۔ امریکا نے عراق کے خلاف جو اتحاد منظم کیا اس میں مصر اور شام خاصی تعداد اور پاکستان، مراکش اور بنگلہ دیش کچھ کم تعداد میں فوجی مہیا کرنے پر تیار ہو گئے۔ ترکی نے وہ پائپ لائن بند کر دی جو عراق سے بحیرۂ روم جاتے ہوئے اس کے علاقے سے گزرتی تھی اور اتحادی فوجوں کو اپنے فضائی ٹھکانے استعمال کرنے کی اجازت دی۔ ان اقدامات کے جواب میں ترکی نے یورپ میں داخلے کے لیے اپنے دعوے کو تقویت دی؛ پاکستان اور مراکش نے سعودی عرب سے اپنے قریبی تعلقات کا از سر نو اثبات کیا؛ مصر نے اپنا قرضہ معاف کرایا؛ اور شام کو لبنان مل گیا۔ دوسری جانب ایران، اردن، لیبیا، ماریطانیہ، یمن، سوڈان اور تیونس نیز پی ایل او، حماس اور ایف آئی ایس جیسی تنظیموں نے، باوجود اس کے کہ کئی کو سعودی عرب سے مالی مدد ملی تھی، عراق کی حمایت اور مغربی مداخلت کی مذمت کی۔ دوسری مسلمان حکومتیں مثلاً انڈونیشیا بین بین رہیں اور کوئی حتمی موقف اختیار کرنے سے گریز کیا۔

مسلم حکومتیں تو ابتدا میں بٹی ہوئی تھیں لیکن عرب اور مسلمان عوام کی آرا شروع ہی سے مغرب کے سخت خلاف تھی۔ ایک امریکی مبصر نے کویت پر حملے کے تین ہفتے بعد یمن، شام، مصر، اردن اور سعودی عرب کا دورہ کرنے کے بعد کہا کہ ''عرب دنیا میں... امریکا کے خلاف نفرت اہل

رہی ہے۔ ان سے یہ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی کہ ایک عرب رہنما اتنا باہمت ہے کہ اس نے کرۂ ارض کی سب سے بڑی طاقت کو للکارا ہے''۔[۵] مراکش سے چین تک کروڑوں مسلمان صدام حسین کی حمایت میں اکٹھا ہوگئے اور ''انہیں مسلم ہیرو قرار دیا''۔[۶] جمہوریت کا مخمصہ ''اس تنازع کا بڑا مخمصہ'' تھا: صدام حسین کی حمایت ان عرب ملکوں میں سب سے زیادہ ''شدید اور عام'' تھی جہاں سیاست میں زیادہ کھلا پن تھا اور اظہار رائے کی آزادی پر کم قدغنیں تھیں[۷] مراکش، پاکستان، اردن، انڈونیشیا اور دوسرے ملکوں میں بڑے بڑے مظاہرے ہوئے جن میں مغرب اور شاہ حسن، بے نظیر بھٹو اور سوہارتو جیسے ان سیاسی رہنماؤں کی مذمت کی گئی جنہیں مغرب کا پٹھو سمجھا جاتا تھا۔ اتحادی افواج کی مخالفت شام تک میں ابھر آئی جہاں ''شہریوں کے متعدد طبقات نے خلیج میں غیر ملکی فوجوں کی موجودگی کی مخالفت کی۔'' بھارت کے دس کروڑ مسلمانوں میں سے پچھتر فیصد نے امریکا کو جنگ کا ذمے دار قرار دیا اور انڈونیشیا کے ''تقریباً سارے'' ۱۷ کروڑ ۱۰ لاکھ مسلمان خلیج میں امریکی فوجی کارروائی کے خلاف تھے۔ اسی طرح عرب دانشوروں نے بھی صف بندی کرلی اور صدام کی سفاکی کو نظرانداز اور مغربی مداخلت کی مذمت کرنے کے حق میں بہت باریک بینی سے تاویلیں کیں۔[۸]

عرب اور دوسرے مسلمانوں نے بالعموم یہ بات تسلیم کی کہ صدام حسین خونی جابر ہے لیکن فرینکلن ڈیلانو روزویلٹ کی طرزفکر کے مطابق ''وہ ہمارا خونی جابر ہے۔'' ان کے خیال میں کویت پر حملہ گھر کا معاملہ تھا جو گھر کے اندر طے کیا جانا چاہیے تھا اور یہ کہ بین الاقوامی انصاف کے کسی عظیم الشان نظریے کے نام پر جنہوں نے مداخلت کی وہ اپنے خودغرضانہ مفادات کے تحفظ اور عربوں کو مغرب کا محکوم رکھنے کے لیے ایسا کررہے تھے۔ ایک تحقیق میں کہا گیا کہ عرب دانشور ''عراقی حکومت کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور اس کی سفاکی اور جبر و استبداد کو سخت ناپسند کرتے ہیں لیکن اسے عرب دنیا کے دشمن عظیم، مغرب کے خلاف مزاحمت کا مرکز تصور کرتے ہیں۔'' وہ ''عرب دنیا کا تعین مغرب کی مخالفت کے حوالے سے کرتے ہیں۔'' ایک فلسطینی پروفیسر نے کہا کہ صدام نے جو کچھ کیا وہ غلط ہے لیکن ہم مغربی فوجی مداخلت کی حمایت کی خاطر عراق کی مذمت نہیں کرسکتے۔'' مغرب میں اور دوسری جگہوں پر مسلمانوں نے سعودی عرب میں غیرمسلم فوجیوں کی موجودگی اور اس کے نتیجے میں مسلم مقامات مقدسہ کی ''بے حرمتی'' کی مذمت کی۔[۹] مختصراً عام خیال یہ تھا: صدام کا حملہ کرنا غلط تھا، مغرب کا مداخلت کرنا غلط تھا، پس صدام کا مغرب سے لڑنا درست ہے اور ہمارا اُس کی حمایت کرنا درست ہے۔

صدام حسین نے، دیگر رخنہ جنگوں کے بنیادی شرکا کی مانند اپنی حکومت کو جو پہلے سیکولر تھی،

اس مقصد سے منسلک کیا جس کی کشش سب سے زیادہ ہوتی یعنی اسلام سے۔ مسلم دنیا میں شناختوں کی تقسیم U شکل میں ہونے کے باعث صدام کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ایک عرب مبصر نے کہا کہ عرب قوم پرستی یا تیسری دنیا کی مبہم مغربیت دشمنی کی بجائے اسلام کا چناؤ ''حمایت کے حصول کے لیے سیاسی نظریے کے طور پر اسلام کی قدر و قیمت ظاہر ثابت کرتا ہے''۔[۱۰] اگرچہ سعودی عرب اپنے رواجوں اور اداروں کے حوالے سے، ممکنہ طور پر ایران اور سوڈان کے سوا، دیگر مسلمان ریاستوں سے زیادہ سخت مسلمان ہے اور ہرچند کہ اس نے پوری دنیا میں اسلام پسند تنظیموں کی مالی امداد کی تھی تاہم کسی ملک میں بھی کسی اسلام پسند تحریک نے عراق کے خلاف مغربی اتحاد کی حمایت نہیں کی اور تقریباً تمام نے مغربی مداخلت کی مخالفت کی۔

اس طرح مسلمانوں کے لیے یہ جنگ تیزی سے تہذیبوں کے درمیان جنگ بن گئی جس میں اسلام کا تقدس داؤ پر لگا ہوا تھا۔ مصر، شام، اردن، پاکستان، ملائشیا، افغانستان، سوڈان اور دوسرے ملکوں کی اسلام پسند بنیاد پرست تنظیموں نے اسے ''صلیبیوں اور صیہونیوں کے اتحاد'' کی ''اسلام اور اس کی تہذیب'' کے خلاف جنگ کہتے ہوئے مذمت کی اور عراق ''عوام کے خلاف فوجی اور معاشی جارحیت پر'' عراق کی حمایت کا اعلان کیا۔ ۱۹۹۰ء کے موسم خزاں میں مکہ کے اسلامک کالج کے ڈین سفار الحوالی نے ایک ٹیپ میں جو سعودی عرب میں بہت عام کیا گیا، اعلان کیا کہ یہ جنگ ''عراق کے خلاف دنیا کی نہیں، اسلام کے خلاف مغرب کی جنگ ہے۔'' اسی سے ملتے جلتے الفاظ میں اردن کے شاہ حسین نے کہا کہ یہ ''تنہا عراق کے خلاف نہیں تمام عربوں اور مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے۔'' مزید برآں، جیسا کہ فاطمہ مرنیسی نشاندہی کرتی ہیں، صدر بش نے بار بار اپنے بیانات میں خدا کے امریکا کی طرف ہونے کی باتیں کیں جس سے عربوں میں اس خیال کو تقویت ملی کہ یہ ''مذہبی جنگ'' ہے۔ بقول ان کے، بش کے الفاظ سے ''ساتویں صدی کے قبل از اسلام غولوں کی لوٹ مار اور بعد میں صلیبی جنگوں'' کی بو آتی تھی۔ اس استدلال سے کہ یہ مغربی اور صیہونی سازشوں سے ہونے والی صلیبی جنگ ہے، جواب میں جہاد کے لیے لوگوں کو متحرک کرنے کا مزید جواز فراہم ہوا بلکہ مطالبہ ہونے لگا۔[۱۱]

مسلمانوں کی جانب سے جنگ کو مغرب بمقابلہ اسلام کی حیثیت سے دیکھنے کے نتیجے میں عالم اسلام میں باہمی مخالفتیں کم یا معطل ہوگئیں۔ مسلمانوں کے مابین پرانے اختلافات اسلام و مغرب کے وسیع تر اختلاف کے مقابلے میں کم اہم ہوگئے۔ جنگ کے دوران مسلم حکومتیں اور گروپ مسلسل مغرب سے فاصلے بڑھاتے رہے۔ افغان جنگ کی مانند خلیج کی جنگ نے بھی ان مسلمانوں کو ساتھ

لا کھڑا کیا جو پہلے باہم دست و گریباں رہتے تھے: عرب سیکولر حلقے، قوم پرست اور بنیاد پرست؛ اردنی حکومت اور فلسطینی؛ پی ایل او اور حماس؛ ایران اور عراق؛ بالعموم حزب اختلاف کی جماعتیں اور حکومتیں۔ جیسا کہ سفار الحوالی نے کہا ''عراق میں بعث پارٹی والے چند گھنٹوں کے لیے ہمارے دشمن ہیں لیکن روم تا حشر ہمارا دشمن، ہے گا''۔[۱۲] اس جنگ نے عراق اور ایران کے درمیان مفاہمت کا عمل بھی شروع کیا۔ ایران کے شیعہ مذہبی رہنماؤں نے مغربی مداخلت کی مذمت کی اور مغرب کے خلاف جہاد کا مطالبہ کیا۔ ایرانی حکومت نے اپنے سابق دشمن کے خلاف کیے جانے والے اقدامات سے لاتعلقی اختیار کر لی اور جنگ کے بعد دونوں حکومتوں کے مابین تعلقات کی بتدریج بہتری کا آغاز ہوا۔

بیرونی دشمن کسی ملک کے اندر بھی تنازعات کم کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جنوری ۱۹۹۱ء میں بتایا گیا کہ پاکستان میں ''مغرب مخالف بیانات اور بحثوں کا ایک ریلا'' آیا ہوا تھا جس نے کم سے کم تھوڑے عرصے کے لیے اس ملک کو متحد کر دیا۔ ''پاکستان اتنا متحد کبھی نہیں رہا۔ جنوبی صوبے سندھ میں جہاں سندھی اور ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین پانچ سال سے ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے ہیں، دونوں طرف کے لوگ امریکیوں کے خلاف ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر مظاہرے کرتے ہیں۔ شمال مغربی سرحد کے انتہائی قدامت پسند قبائلی علاقے میں خواتین تک سڑکوں پر نکل کر احتجاج کر رہی ہیں، اکثر ایسے مقامات پر جہاں لوگ جمعے کی نمازوں کے سوا کبھی اکٹھے نہیں ہوئے''۔[۱۳]

جب رائے عامہ جنگ کے خلاف اور اٹل ہوگئی تو وہ حکومتیں جنہوں نے پہلے اتحاد کا ساتھ دیا تھا پسپا ہوگئیں یا بٹ گئیں یا اپنے اقدامات کی لمبی چوڑی تاویلیں کرنے لگیں۔ حافظ الاسد جیسے رہنما جنہوں نے سپاہی مہیا کیے تھے اب یہ دلیل دینے لگے کہ سعودی عرب میں مغربی افواج کے خلاف توازن پیدا کرنے کے لیے اور بالآخر ان کی جگہ لینے کے لیے یہ اقدام ضروری تھا اور یہ کہ یہ سپاہی بہر صورت خالصتاً دفاعی مقاصد اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے استعمال کیے جائیں گے۔ ترکی اور پاکستان میں اعلیٰ فوجی رہنماؤں نے اتحاد کی حمایت کرنے پر اپنی حکومتوں کی مذمت کی۔ مصر اور شام کی حکومتیں، جنہوں نے سپاہی مہیا کیے تھے، اپنے معاشروں میں مغرب مخالف حلقوں کو دبانے اور نظر انداز کرنے کی قوت رکھتی تھیں۔ شمالی افریقہ میں ''عراق کے حق میں ایک دم حمایت پھٹ پڑنا جنگ کے حیران کن ترین واقعات میں سے'' تھا۔ تیونس میں عوامی رائے شدید مغرب دشمن تھی اور صدر بن علی نے مغربی مداخلت کی مذمت کرنے میں دیر نہ کی۔ مراکش کی حکومت نے شروع میں اتحاد کے لیے ۱۵۰۰ فوجی مہیا کیے تھے لیکن پھر جب مغرب مخالف گروہوں نے زور پکڑا تو

عراق کے حق میں عام ہڑتال کی توثیق بھی کی۔ الجزائر میں عراق کی حمایت میں ۴لاکھ افراد کے مظاہرے نے صدر بن جدید کو، جو پہلے مغرب کی جانب جھکاؤ رکھتے تھے، اپنا موقف بدلنے، مغرب کی مذمت کرنے اور یہ اعلان کرنے پر مجبور کر دیا کہ ''الجزائر اپنے برادر ملک عراق کے شانہ بشانہ کھڑا رہے گا''۔[۱۴] اگست ۱۹۹۰ء میں شمالی افریقہ کی ان تینوں حکومتوں نے عرب لیگ میں عراق کی مذمت میں ووٹ دیا تھا۔ موسم خزاں میں اپنے عوام کے شدید جذبات پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے امریکی مداخلت کے خلاف مذمتی قرارداد کے حق میں ووٹ دیا۔

غیر مغربی، غیر مسلم تہذیبوں کے عوام نے بھی مغربی فوجی کارروائی کی کوئی خاص حمایت نہ کی۔ جنوری ۱۹۹۱ء میں ایک سروے میں ۵۳ فیصد جاپانیوں نے جنگ کی مخالفت اور ۲۵ فیصد نے حمایت کی۔ ہندوؤں میں صدام حسین اور جارج بش کو مورد الزام ٹھہرانے والوں کی تعداد آدھوں آدھ تھی۔ ٹائمز آف انڈیا نے خبردار کیا کہ یہ جنگ ''مضبوط اور مغرور یہودی مسیحی دنیا اور مذہبی جوش وخروش سے بھری کمزور مسلم دنیا کے درمیان کہیں بڑے پیمانے پر محاذ آرائی'' کی سمت لے جاسکتی ہے۔ پس خلیج کی جنگ عراق اور کویت کے مابین جنگ کے طور پر شروع ہوئی تھی، پھر عراق اور مغرب کی جنگ بن گئی، اس کے بعد اسلام اور مغرب کی جنگ میں بدل گئی اور بالآخر بہت سے غیر مغربی اسے مشرق بمقابلہ مغرب کی جنگ اور ''سفید فام کی جنگ، دقیانوسی سامراجیت کا نیا ابال'' کہنے لگے۔[۱۵]

کویتیوں کے سوا کسی مسلمان ملک کے عوام جنگ کے بارے میں پُرجوش نہیں تھے اور بیشتر نے مغربی مداخلت کی بھرپور مخالفت کی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو لندن اور نیویارک جیسی فتح کی پریڈیں کہیں اور نہیں ہوئیں۔ سہیل ایچ ہاشمی نے کہا ہے کہ عربوں میں ''جنگ کے خاتمے نے خوشیاں منانے کی کوئی بنیاد فراہم نہیں کی۔'' اس کی بجائے شدید مایوسی، بے چارگی، احساس ذلت اور تلخی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ مغرب ایک بار پھر جیت گیا تھا۔ ایک بار پھر تازہ ترین صلاح الدین ایوبی کو جس نے عربوں کی امیدیں جگا دی تھیں، اسلام کی برادری میں جبراً گھس آنے والی زبردست مغربی طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پڑے تھے۔ فاطمہ مرنیسی سوال کرتی ہیں ''عربوں کے ساتھ اس سے برا کیا ہوسکتا تھا جو اس جنگ نے کیا کہ پورا مغرب اپنی تمام ٹیکنالوجی کے ساتھ ہم پر بمباری کر رہا ہو؟ اس سے دہشت ناک صورتحال ہو نہیں سکتی تھی''۔[۱۶]

جنگ کے بعد کویت کے سوا عربوں کی رائے خلیج میں امریکی فوجی موجودگی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ ناقدانہ ہوتی گئی۔ لہٰذا مصر جیسے ملکوں میں بھی عراق کے لیے ہمدردی میں اضافہ ہوتا

گیا۔ اتحاد میں شامل ہونے والی عرب حکومتوں نے موقف بدل لیا۔[۱۷] مصر اور شام نیز دوسرے ملکوں کو اگست ۱۹۹۲ء میں نوفلائی زون (وہ علاقہ جہاں طیاروں کے پرواز کرنے پر پابندی ہو) کے نفاذ کی مخالفت کی۔ عرب حکومتوں اور ترکی نے جنوری ۱۹۹۳ء میں عراق پر فضائی حملوں پر بھی اعتراض کیا۔ اگر مغربی فضائی قوت شیعہ مسلمانوں اور کردوں پر سنّی مسلمانوں کے حملوں کے جواب میں استعمال کی جا سکتی تھی تو بوسنیائی مسلمانوں پر آرتھوڈوکس سربوں کے حملوں کے جواب میں کیوں استعمال نہیں کی گئی؟ جون ۱۹۹۳ء میں صدر کلنٹن نے سابق صدر بش کو قتل کرنے کی عراقی کوشش پر بغداد پر بمباری کا حکم دیا تو بین الاقوامی ردعمل عین تہذیبی خطوط پر دیکھنے میں آیا۔ اسرائیل اور مغربی یورپ کی حکومتوں نے حملے کی شدت سے حمایت کی؛ روس نے اسے ''جائز'' ذاتی دفاع قرار دیا؛ چین نے ''گہری تشویش'' ظاہر کی؛ سعودی عرب اور خلیجی امارت نے کچھ نہیں کہا؛ دوسری مسلمان حکومتوں بشمول مصر نے اسے مغرب کے دہرے معیار کی ایک اور مثال کہتے ہوئے مذمت کی اور ایران نے اسے امریکی ''نوتوسیع پسندی اور غرور'' کے جذبے کے تحت ''کھلم کھلا جارحیت'' قرار دیا۔[۱۸] بار بار یہ سوال اٹھایا گیا: امریکا اور ''بین الاقوامی برادری'' (یعنی مغرب) اسرائیل کے شرمناک رویے اور اس کی جانب سے اقوام متحدہ کی خلاف ورزیوں پر اسی طرح کا ردعمل کیوں ظاہر نہیں کرتی؟

جنگِ خلیج تہذیبوں کے درمیان مابعد سرد جنگ کے دور کی پہلی جنگ تھی۔ فیصلہ اس بات کا ہونا تھا کہ دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر سعودی اور امارات کی حکومتوں کے قبضے میں ہوں گے جو اپنی سلامتی کے لیے مغربی فوجی طاقت کی محتاج ہیں یا مغرب دشمن حکومتوں کے ہاتھ میں ہوں گے جو تیل کا ہتھیار مغرب کے خلاف استعمال کر سکتی ہیں۔ مغرب صدام حسین کو اقتدار سے برطرف کرنے میں ناکام رہا لیکن اس نے جو فتح حاصل کی اس میں خلیجی ریاستوں کی سلامتی کے مغرب پر انحصار کو نمایاں کرنے میں اور خلیج میں زمانہ امن میں بھی فوج تعینات رکھنے میں کامیابی ہوئی۔ جنگ سے پہلے ایران، عراق، خلیج تعاون کونسل اور امریکا خلیج میں اپنا اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کے لیے کوشاں تھے۔ جنگ کے بعد خلیج فارس امریکی جھیل بن چکا تھا۔

رخنہ جنگوں کی خصوصیات

چھوٹے بڑے قبیلوں، نسلی گروہوں، مذہبی برادریوں اور اقوام کے درمیان جنگیں ہر دور میں اور

ہر تہذیب میں ہوئی ہیں کیونکہ ان کی جڑیں لوگوں کے تشخص میں ہیں۔ یہ تنازعات مخصوص نوعیتوں کے ہوتے ہیں، اس لحاظ سے کہ ان میں غیر شرکا کے لیے براہِ راست دلچسپی کے وسیع تر نظریاتی یا سیاسی مسائل شامل نہیں ہوتے تاہم بیرونی گروہوں کے اندر ان تنازعات پر انسانی ہمدردی کے حوالے سے تشویش ضرور پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ تنازعات تشدد اور خونریزی پر مبنی بھی ہوتے ہیں کیونکہ شناخت کے بنیادی مسائل داؤ پر لگے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ طویل ہوتے ہیں، جنگ بندی یا معاہدوں کی وجہ سے ان میں تعطل آسکتا ہے مگر یہ معاہدے ٹوٹ جاتے ہیں اور تنازع پھر شروع ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف تشخص کے مسئلے پر ہونے والی خانہ جنگی میں ایک فریق کی فیصلہ کن فتح نسل کشی کے امکانات میں اضافہ کردیتی ہے۔[19]

رخنہ جنگوں کے تنازعات مختلف تہذیبوں کی ریاستوں یا گروہوں کے مابین فرقہ وارانہ تنازعات ہوتے ہیں۔ رخنہ جنگیں وہ تنازعات ہوتے ہیں جو متشدد ہوگئے ہوں۔ یہ جنگیں ریاستوں کے درمیان، غیر سرکاری گروہوں کے درمیان اور ریاستوں اور غیر سرکاری گروہوں کے مابین ہوسکتی ہیں۔ ریاستوں کے اندر رخنہ تنازعات میں ایسے گروہ شامل ہوسکتے ہیں جن کی بھاری اکثریت جغرافیائی طور پر مختلف علاقوں میں رہتی ہو۔ اس صورت میں جو گروہ برسرِ اقتدار نہ ہو عام طور پر آزادی کے لیے لڑتا ہے اور ضروری نہیں کہ اس سے کم پر راضی ہوجائے۔ ریاستوں کے اندر رخنہ تنازعات میں ایسے گروہ بھی ہوسکتے ہیں جو جغرافیائی اعتبار سے مخلوط ہوں۔ اس صورت میں کشیدہ تعلقات وقتاً فوقتاً بڑھ کر تشدد کی شکل اختیار کرلیتے ہیں جیسے بھارت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اور ملائشیا میں مسلمانوں اور چینیوں کے مابین — یا پھر بھرپور لڑائی ہوسکتی ہے، خصوصاً اس وقت جب نئی ریاستیں اور ان کی سرحدیں قائم کی جارہی ہوں، اور اقوام کو بزورِ قوت علیحدہ کرنے کی سفاکانہ کوششیں سامنے آتی ہیں۔

رخنہ تنازعات بعض اوقات لوگوں پر اقتدار قائم رکھنے کی لڑائیاں ہوتی ہیں مگر زیادہ تر مسئلہ زمین پر قبضے کا ہوتا ہے۔ لڑائی کے کم از کم ایک شریک کا ہدف زمین کو تسخیر کرنا اور دوسرے لوگوں کو نکال کر، ہلاک کرکے یا دونوں کارروائیاں کرکے، یعنی ''نسلی تطہیر'' کے ذریعے اسے خالی کرانا ہوتا ہے۔ یہ تنازعات تشدد آمیز اور گھناؤنے ہوتے ہیں جن میں دونوں فریق قتل عام، دہشت گردی، عصمت دری اور اذیت رسانی میں ملوث ہوجاتے ہیں۔ جو زمین داؤ پر لگی ہوتی ہے وہ اکثر کسی ایک یا دونوں فریقوں کے لیے اپنی تاریخ اور تشخص کی انتہائی متحرک علامت ہوتی ہے، وہ مقدس زمین جس پر ان کے حق کو کوئی پامال نہیں کرسکتا: مغربی کنارہ، کشمیر، نگورنو کاراباخ، وادی ڈرینا، کوسووا۔

رخنہ جنگوں میں عمومی فرقہ وارانہ جنگوں کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں مگر تمام نہیں۔ یہ طویل تنازعات ہوتے ہیں۔ جب یہ تنازعات ریاستوں کے اندر ہوتے ہیں تو بین الریاستی جنگوں کے مقابلے میں اوسطاً چھ گنا طویل ہوتے ہیں۔ چونکہ ان میں گروہی شناخت اور طاقت کے بنیادی مسائل شامل ہوتے ہیں اس لیے گفت وشنید اور سمجھوتے کے ذریعے ان کا تصفیہ دشوار ہوتا ہے۔ معاہدے ہوتے بھی ہیں تو اکثر دونوں جانب تمام فریق شامل نہیں ہوتے اور معاہدے عموماً زیادہ عرصہ نہیں رہتے۔ رخنہ جنگیں وقتاً فوقتاً ہونے والی جنگیں ہیں جو کبھی بھڑک کر بڑے پیمانے پر تشدد کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور کبھی کم شدت کی جنگوں یا دبی نفرتوں میں بدل جاتی ہیں جو پھر کسی موقعے پر بھڑک سکتی ہیں۔ فرقہ وارانہ تشخص اور منافرت کی آگ نسل کشی کے بغیر بجھائے نہیں بجھتی۔ رخنہ جنگیں اپنی طوالت کی وجہ سے دوسری فرقہ وارانہ جنگوں کی مانند بڑی تعداد میں اموات اور پناہ گزینوں پر منتج ہوتی ہیں۔ ان دونوں کے تخمینے احتیاط کے متقاضی ہیں مگر ۱۹۹۰ء کے دہائی کے اوائل میں جاری رخنہ جنگوں میں عام طور پر تسلیم شدہ اموات کے اعداد وشمار یہ تھے: فلپائن میں ۵۰ ہزار، سری لنکا میں ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ، کشمیر میں ۲۰ ہزار، سوڈان میں ۵ سے ۱۵ /لاکھ، تاجکستان میں ایک لاکھ، کروشیا میں ۵۰ ہزار، بوسنیا میں ۵۰ ہزار سے دو لاکھ، چچنیا میں ۳۰ سے ۵۰ ہزار، تبت میں ایک لاکھ، مشرقی تیمور میں دو لاکھ۔[۲] تقریباً ان تمام تنازعات نے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں تارکین پیدا کیے۔

عصرِ حاضر کی ان جنگوں میں سے بہت سی خونریز تنازعات کی لمبی تاریخ کا تازہ ترین مرحلہ ہیں اور بیسویں صدی کے اواخر کا تشدد اپنے مستقل خاتمے کی راہ میں مزاحم ہے۔ مثال کے طور پر سوڈان میں ۱۹۵۶ء میں لڑائی شروع ہوئی، ۱۹۷۲ء تک جاری رہی جب جنوبی سوڈان کے لیے کچھ خود مختاری کا معاہدہ طے پایا، لیکن ۱۹۸۳ء میں پھر بھڑک اٹھی۔ سری لنکا میں تاملوں کی بغاوت ۱۹۸۳ء میں شروع ہوئی، ۱۹۹۱ء میں اسے ختم کرنے کے لیے منعقدہ امن مذاکرات ناکام ہو گئے اور ۱۹۹۴ء میں دوبارہ کیے گئے تو جنوری ۱۹۹۵ء میں جنگ بندی پر معاہدہ ہو گیا۔ تاہم چار ماہ بعد تامل ٹائیگرز نے عارضی جنگ بندی اور امن مذاکرات ختم کر دیے اور جنگ مزید شدت کے ساتھ پھر چھڑ گئی۔ فلپائن میں مورو بغاوت کا آغاز ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائل میں ہوا، ۱۹۷۶ء میں جب منڈاناؤ کے بعض علاقوں کو خود مختاری دینے کا معاہدہ طے پایا تو لڑائی کی شدت میں کمی آئی لیکن ۱۹۹۳ء تک منحرف شورش پسند دھڑوں کے قیام امن کی کوششوں کو مسترد کرنے کے باعث تشدد کے واقعات پھر زیادہ سے زیادہ تعداد اور بڑے پیمانے پر ہو رہے تھے۔ روسی اور چچنیائی رہنماؤں کے

درمیان جولائی ۱۹۹۵ء میں فوجیں ہٹانے پر سمجھوتا ہوا تاکہ گزشتہ دسمبر میں شروع ہونے والا تشدد کا سلسلہ ختم ہو سکے۔ تھوڑے عرصے کے لیے جنگ کی تیزی کم ہوگئی لیکن روسی یا روس نواز رہنماؤں پر چچنیائیوں کے حملوں، روسی جوابی کارروائیوں، جنوری ۱۹۹۶ء میں چچنیائیوں کے داغستان میں گھس جانے اور ۱۹۹۶ء کے اوائل میں بڑے پیمانے پر روسی کارروائی کے ساتھ لڑائی میں پھر شدت آ گئی۔

رخنہ جنگوں اور فرقہ وارانہ جنگوں میں جہاں طوالت، بہت زیادہ تشدد اور نظریاتی دورنگی کے خواص مشترک ہیں وہاں ان کے درمیان دو اختلافات بھی ہیں۔ اول فرقہ وارانہ جنگیں نسلی، مذہبی یا لسانی گروہوں کے مابین ہوسکتی ہیں۔ لیکن چونکہ مذہب تہذیبوں کی بنیادی ممتاز خاصیت ہے اس لیے رخنہ جنگیں تقریباً ہمیشہ مختلف مذاہب کی قوموں کے درمیان ہوتی ہیں۔ بعض تجزیہ نگار اس عامل کی اہمیت گھٹاتے ہیں۔ مثلاً وہ بوسنیا میں سربوں اور مسلمانوں کے درمیان مشترکہ نسل و زبان، گزشتہ پُرامن بقائے باہمی اور بڑی تعداد میں آپس کی شادیوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور فرائڈ کی ''چھوٹے موٹے اختلافات کی نرگسیت'' کا حوالہ دیتے ہوئے مذہبی عنصر کو مسترد کردیتے ہیں۔[۲] مگر یہ خیال سیکولر کم نظری کا نتیجہ ہے۔ ہزاروں سال کی انسانی تاریخ شاہد ہے کہ مذہب ''چھوٹا موٹا اختلاف'' نہیں بلکہ لوگوں کے درمیان شاید اس سے گہرا اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ مختلف خداؤں پر یقین سے رخنہ جنگوں کی تعداد، شدت اور تشدد بہت بڑھ جاتا ہے۔

دوم، دوسری فرقہ وارانہ جنگیں مخصوص نوعیت کی ہوتی ہیں اس لیے اس میں اضافی فریقوں کی شمولیت کا امکان کم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں رخنہ جنگوں کی تعریف یہ ہے کہ وہ ان گروہوں کے درمیان ہوتی ہیں جو وسیع تر ثقافتی اکائیوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ گروہ الف، گروہ ب سے لڑ رہا ہے اور گروہ ج، د اور ہ کو لڑائی میں شامل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تاوقتیکہ الف یا ب براہِ راست ج، د یا ہ کے مفادات پر حملہ نہ کردیں۔ اس کے برعکس رخنہ جنگ گروہ الف ۱، گروہ ب ۱ سے لڑ رہا ہے اور دونوں جنگ کو پھیلانے اور تہذیبی قرابت دار گروہوں الف ۲، الف ۳، الف ۴ اور ب ۲، ب ۳ اور ب ۴ کو متحرک کرنے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ گروہ بھی اپنے برسرِ پیکار قرابت دار کے ساتھ خود کو شناخت کریں گے۔ جدید دنیا میں ذرائع نقل وحمل اور مواصلات کی ترقی نے ان روابط کو قائم کرنا آسان بنادیا ہے اس لیے رخنہ تنازعات ''بین الاقوامیت'' اختیار کر گئے ہیں۔ نقل مکانی نے تیسری [جو لڑائی میں شامل نہیں] تہذیبوں میں مختلف اقوام کی برادریاں پیدا کی ہیں۔ مواصلات کے طفیل فریقین مدد کے لیے درخواست کر سکتے ہیں اور قرابت دار گروہوں کو فریقین کے حالات فوراً معلوم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح دنیا کے عمومی طور پر سکڑ جانے کی

وجہ سے قرابت دار گروہ فریقین کو اخلاقی، سفارتی، مالی اور مادی امداد فراہم کر سکتے ہیں اور ایسا نہ کرنا مشکل تر ہو گیا ہے۔ یہ امداد پہنچانے کے لیے بین الاقوامی تنظیمیں قائم ہوتی ہیں، امداد کے بل بوتے پر شرکا جمے رہتے ہیں اور تنازع طول کھینچ جاتا ہے۔ ایچ ڈی ایس گرین وے کے الفاظ میں ''قرابت دار ملک کا قارورہ''☆ بیسویں صدی کے اواخر کی رخنہ جنگوں کی مرکزی خاصیت ہے۔[۲۲] زیادہ عموی لحاظ سے دیکھا جائے تو مختلف تہذیبوں کے افراد کے درمیان کم تشدد کے بھی جو مضمرات اور نتائج ہوتے ہیں وہ دروں تہذیبی تشدد میں نہیں پائے جاتے۔ فروری ۱۹۹۵ء میں سنی مسلح افراد نے کراچی کی ایک مسجد میں اٹھارہ شیعہ نمازیوں کو ہلاک کر کے شہر کا امن خراب اور پاکستان کے لیے مسئلہ پیدا کیا۔ ٹھیک ایک سال پہلے ایک یہودی آباد کار نے الخلیل کے غار بطاریک میں عبادت میں مصروف ۲۹ مسلمانوں کو ختم کر کے مشرق وسطی کے امن کے عمل کو خراب اور دنیا کے لیے مسئلہ پیدا کیا۔

تعدد: اسلام کی خونیں سرحدیں

فرقہ وارانہ تنازعات اور رخنہ جنگیں تاریخ میں عام رہی ہیں اور ایک شمار کے مطابق سرد جنگ کے دوران عربوں اور اسرائیلیوں، بھارتیوں اور پاکستانیوں، سوڈانی مسلمانوں اور عیسائیوں، سری لنکن بودھوں اور تاملوں، لبنانی شیعوں اور مارونی عیسائیوں کے درمیان لڑائیوں سمیت بتیس رخنہ جنگیں ہوئیں۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کی دہائیوں کے دوران ہونے والی خانہ جنگیوں میں سے آدھی تشخص کی جنگیں تھیں لیکن آنے والی دہائیوں میں لگ بھگ تین چوتھائی خانہ جنگیاں شناخت کے تنازعات سے متعلق تھیں اور ۱۹۵۰ء کے عشرے کے اوائل اور ۱۹۸۰ء کے عشرے کے اواخر کے درمیان نسلی گروہوں کی بغاوتوں کی شدت تگنی ہو گئی۔ تاہم سپر طاقتوں کی باہمی دشمنی میں یہ تنازعات چند نمایاں مستثنیات کے سوا زیادہ توجہ حاصل نہ کر سکے اور اکثر سرد جنگ کی عینک سے دیکھے گئے۔ جب سرد جنگ کی بساط لپیٹ دی گئی تو فرقہ وارانہ تنازعات نمایاں تر ہو گئے اور کہا جا سکتا ہے کہ پہلے سے زیادہ عام ہو گئے۔ نسلی تنازع میں ''یکدم تیزی'' جیسی کوئی چیز تو بلاشبہ ہوئی۔[۲۳]

یہ نسلی تنازعات اور رخنہ جنگیں دنیا کی تہذیبوں میں برابر برابر بٹی ہوئی نہیں ہیں۔ سابق

☆ نوٹ از مترجم: قرابت دار ملک کا قارورہ، مصنف نے kin-country syndrom کے الفاظ لکھے ہیں۔ syndrom کے معانی ہیں کسی بیماری کی علامات کا مجموعہ یا آرا، جذبات اور رویوں کا مخصوص مجموعہ۔ مطلب یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر کی رخنہ جنگوں میں ثقافتی رشتے رکھنے والے ملک کی حمایت کا رجحان بہت دیکھنے میں آ رہا ہے۔

یوگوسلاویہ میں سربوں اور کروٹس اور سری لنکا میں بودھوں اور ہندوؤں کے درمیان بڑی رخنہ لڑائیاں ہوئی ہیں جبکہ چند دوسرے مقامات پر غیر مسلم گروہوں کے مابین کم تشدد والے تنازعات چھڑے ہیں۔ تاہم رخنہ تنازعات کی بھاری اکثریت یوریشیا اور افریقہ کے گرد سرحد پر، جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے الگ کرتی ہے، ہوئی ہے۔ عالمی سطح پر تہذیبوں کا بنیادی تصادم مغرب اور دیگر کے درمیان ہے لیکن علاقائی سطح پر یہ تصادم اسلام اور دیگر کے درمیان ہے۔

مقامی مسلم اور غیر مسلم اقوام کے مابین شدید دشمنیاں اور تشدد آمیز تنازعات عام ہیں۔ بوسنیا میں مسلمانوں نے آرتھوڈوکس سربوں سے ایک خونیں اور تباہ کن جنگ لڑی اور کیتھولک کروشیائیوں کے ساتھ بھی تشدد کے واقعات ہوئے۔ کوسووا میں البانوی مسلمان سربیائیوں کے اقتدار سے خوش نہیں، اپنی زیر زمین متوازی حکومت قائم کر رکھی ہے اور دونوں گروہوں کے درمیان تشدد کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔ البانوی اور یونانی حکومتیں ایک دوسرے کے ملکوں میں اپنی اقلیتوں کے حقوق کے مسئلے پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ ترک اور یونانی تاریخ میں باہم دست و گریباں رہے ہیں۔ قبرص میں مسلمان ترکوں اور آرتھوڈوکس یونانیوں نے دشمن ملحقہ ریاستیں قائم کر رکھی ہیں۔ قفقاز میں ترکی اور آرمینیا تاریخی دشمن ہیں اور نگورنو کاراباخ کے مسئلے پر آذریوں اور آرمینیائیوں میں جنگ ہوتی رہی ہے۔ شمالی قفقاز میں دو سو سال تک چیچن، انگش اور دوسری مسلمان اقوام وقتاً فوقتاً روس سے آزادی کے لیے برسرِ پیکار رہی ہیں اور ۱۹۹۴ء میں روس اور چچنیا کے درمیان خونیں تصادم کی صورت میں یہ جدوجہد پھر ابھر آئی۔ انگش اور آرتھوڈوکس اوسیشین قوم کے درمیان بھی لڑائی ہوئی ہے۔ دریائے وولگا کے طاس میں مسلمان تا تار ماضی میں روس سے لڑ چکے ہیں اور ۱۹۹۰ء کے عشرے کے آغاز میں محدود خود مختاری کے لیے روس سے بمشکل سمجھوتا ہوا۔

پوری انیسویں صدی کے دوران روس بزورِ قوت وسط ایشیا کی مسلمان اقوام پر اپنا اقتدار وسیع کرتا رہا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں افغانوں اور روسیوں نے ایک بڑی جنگ لڑی اور روسی پسپائی کے ساتھ ہی اس کی دوسری قسط تاجکستان میں شروع ہوگئی جہاں روسی افواج موجودہ حکومت کی مدد کر رہی تھیں جو اسلام پسند باغیوں کے خلاف کارروائی کر رہی تھی۔ زن جیانگ میں یوغور اور دوسرے مسلم گروہ صینی ثقافت میں ڈھالنے کی کوششوں سے نبرد آزما ہیں اور سابق سوویت جمہوریاؤں میں اپنے نسلی و مذہبی قرابت داروں سے تعلقات استوار کر رہے ہیں۔ برصغیر میں پاکستان اور بھارت تین جنگیں لڑ چکے ہیں، کشمیر میں مسلمان علیحدگی پسند بھارتی حکومت سے پنجہ آزمائی کر رہے ہیں، آسام میں مسلمان مہاجرین قبائلی لوگوں سے لڑ رہے ہیں اور پورے بھارت

میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد فسادات اور تشدد کے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کو دونوں مذہبی برادریوں میں بنیاد پرست تحریکوں کے ابھرنے سے مزید ہوا ملی ہے۔ بنگلہ دیش میں بدھ اپنے خلاف امتیازی سلوک پر اکثریتی مسلمانوں سے نالاں ہیں جبکہ میانمار میں مسلمان بدھ اکثریت کے امتیازی رویے پر احتجاج کرتے ہیں۔ ملائشیا اور انڈونیشیا میں معیشت پر چینیوں کے غلبے پر مسلمان ان کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور فسادات رونما ہوتے ہیں۔ جنوبی تھائی لینڈ میں بدھ حکومت کے خلاف وقتاً فوقتاً مسلمان تنظیموں کی شورشیں سامنے آتی رہی ہیں جبکہ جنوبی فلپائن میں مسلمان کیتھولک ملک اور حکومت سے آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف انڈونیشیا میں کیتھولک مشرقی تیموری، مسلمان حکومت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے خطے میں فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کا تنازع یہودی وطن کے قیام سے شروع ہوا۔ اسرائیل اور عرب ریاستوں میں چار جنگیں ہو چکی ہیں اور فلسطینی اسرائیلی اقتدار کے خلاف انتفاضہ میں شامل رہے ہیں۔ لبنان میں مارونی عیسائی، شیعہ اور دیگر مسلمانوں سے ہاری ہوئی جنگ لڑتے رہے ہیں۔ ایتھوپیا میں آرتھوڈوکس امہارا تاریخ میں مسلمان نسلی گروہوں کو دباتے رہے ہیں اور مسلم اورومو سے ان کا ٹکراؤ رہا ہے۔ پورے افریقہ میں شمال کی عرب اور مسلمان قوموں اور جنوب کے مظاہر پرست وعیسائی سیاہ فاموں کے درمیان متعدد تنازعات ہوئے ہیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کی سب سے خونریز جنگ سوڈان میں ہوئی جو عشروں تک چلتی رہی اور ہزارہا ہلاکتیں ہوئیں۔ نائیجیریا کی سیاست میں شمال کے مسلمان فولانی ہوسا اور جنوب کے مسیحی قبائل کے تنازعات چھائے رہے ہیں جن میں بار بار فسادات اور تختے الٹے جانے کے علاوہ ایک جنگ ہو چکی ہے۔ چاڈ، کینیا اور تنزانیہ میں بھی مسلمان اور عیسائی گروہوں کے درمیان اس طرح کی لڑائیاں ہوئی ہیں۔

ان سب مقامات پر مسلمانوں کے دیگر تہذیبوں کے افراد یعنی کیتھولک، پروٹسٹنٹ، آرتھوڈوکس، ہندوؤں، چینیوں، بودھوں، یہودیوں سے عموماً معاندانہ تعلقات رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر تعلقات ماضی کے کسی دور میں تشدد آمیز رہے ہیں۔ بہت سے ۱۹۹۰ء کی دہائی میں تشدد آمیز رہے۔ اسلامی خطوں کی سرحدوں پر جہاں بھی دیکھا جائے، مسلمانوں کو اپنے ہمسایوں کے ساتھ پُرامن طریقے سے رہنے میں دقت پیش آئی ہے۔ فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا بیسویں صدی کے اواخر میں مسلمان اور غیر مسلم گروہوں کے درمیان تعلقات کا یہ انداز دوسری تہذیبوں کے تعلقات میں بھی پایا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ نہیں پایا جاتا۔ مسلمان دنیا کی آبادی کا تقریباً بیس فیصد ہیں لیکن ۱۹۹۰ء کی دہائی میں وہ گروہی تشدد کے واقعات میں دوسری کسی بھی

جدول ۱۰ء۱
نسلی سیاسی تنازعات، ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۴ء

	دروں تہذیبی	بین التہذیبی	کل تعداد
اسلام	۱۱	۱۵	۲۶
دیگر	۱۹*	۵	۲۴
کل تعداد	۳۰	۲۰	۵۰

*ان میں سے ۱۰/افریقہ میں قبائلی تنازعات تھے۔

ماخذ: ٹیڈرابرٹ گر "Peoples Against States: Ethnopolitical Conflict and the Changing World System," *International Studies Quarterly* جلد ۳۸ (ستمبر ۱۹۹۴ء)، صفحات ۷-۳۴۷ تا ۷۸-۳۔ میں نے تنازعات کی وہی تقسیم بندی استعمال کی ہے جو گر کی ہے سوائے اس کے کہ چینی تبتی تنازع کو، جسے وہ غیرتہذیبی شمار کرتا ہے، بین التہذیبی تنازع شمار کیا ہے کیوں کہ یہ واضح طور پر کنفیوشن ہان چینیوں اور لامائی بدھ تبتیوں کے مابین تصادم ہے۔

تہذیب کے افراد سے کہیں زیادہ شامل رہے ہیں۔اس کے حق میں بے تحاشا شواہد ہیں۔

۱۔ ٹیڈ رابرٹ گر نے نسلی سیاسی تنازعات کا جو گہرا تجزیہ کیا اس کے مطابق ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۴ء میں ایسے پچاس تنازعات میں سے چھبیس میں مسلمان شریک تھے (جدول ۱۰ء۱)۔ان تنازعات میں سے بیس مختلف تہذیبوں کے گروہوں کے درمیان تھے جن میں سے پندرہ مسلمانوں اور غیرمسلمانوں کے درمیان ہوئے۔مختصراً تمام غیرمسلم تہذیبوں کے مابین تنازعات کی بہ نسبت مسلمانوں کے بین التہذیبی تنازعات تین گنا تھے۔مسلمان دنیا کے اندر بھی دوسری تہذیبوں سے زیادہ جھگڑے ہیں، بشمول افریقہ کے قبائلی تنازعات کے۔ اسلام کے مقابلے میں مغرب صرف دو دروں تہذیبی اور دو بین التہذیبی تنازعات میں شامل رہا۔مسلمانوں کے تنازعات میں زیادہ ہلاکتوں کا رجحان بھی پایا گیا۔گر کے تخمینے کے مطابق جن چھ جنگوں میں دو لاکھ یا زائد افراد ہلاک ہوئے، ان میں سے تین (سوڈان، بوسنیا، مشرقی تیمور) مسلمانوں اور غیرمسلموں کے درمیان تھیں، دو (صومالیہ، عراق کرد) مسلمانوں میں آپس کی جنگیں تھیں اور ایک (انگولا) میں صرف غیرمسلم تھے۔

۲۔ نیویارک ٹائمز نے ایسے اڑتالیس مقامات کی نشاندہی کی جہاں ۱۹۹۳ء میں

انسٹھ تنازعات وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ ان میں سے نصف مقامات پر مسلمان دوسرے مسلمانوں یا غیر مسلموں سے نبرد آزما تھے۔ انسٹھ میں سے اکتیس تنازعات مختلف تہذیبوں کے گروہوں کے مابین تھے اور گر کے اعداد وشمار کی مطابقت سے ان بین التہذیبی تنازعات میں سے دو تہائی (اکیس) مسلمانوں اور دیگر اقوام کے درمیان تھے (جدول ۲ء۱۰)۔

۳۔ پھر ایک اور تجزیے میں رتھ لیگر سیورڈ نے انتیس جنگوں (وہ تنازعات جن میں ایک سال کے اندر ایک ہزار یا اس سے زیادہ اموات ہوئیں) کی نشاندہی کی جو ۱۹۹۲ء میں جاری تھیں۔ بارہ بین التہذیبی تنازعات میں سے نو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین تھے اور مسلمان ایک بار پھر کسی اور تہذیب کے افراد سے زیادہ جنگیں لڑ رہے تھے۔[۲۴]

جدول ۲ء۱۰
نسلی تنازعات، ۱۹۹۳ء

	دروں تہذیبی	بین التہذیبی	کل تعداد
اسلام	۷	۲۱	۲۸
دیگر	۲۱*	۱۰	۳۱
کل تعداد	۲۸	۳۱	۵۹

*ان میں سے ۱۰/افریقہ میں قبائلی تنازعات تھے۔

ماخذ: نیویارک ٹائمز، ۷ فروری ۱۹۹۳ء، صفحات ۱، ۱۴۔

اس طرح تین جدا جدا مرتب کردہ اعداد وشمار سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے: ۱۹۹۰ء کے اوائل میں مسلمان گروہی تشدد میں غیر مسلموں سے زیادہ شریک تھے اور دو تہائی سے تین چوتھائی بین التہذیبی جنگیں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہوئیں۔ اسلام کی سرحدیں خونیں ہیں اور اس کا اندرونی علاقہ بھی۔☆

☆ میرے Foreign Affairs والے مضمون میں کسی اور بیان پر اتنی تنقید نہیں ہوئی جتنی اس پر کہ ''اسلام کی سرحدیں خونیں ہیں۔'' میں نے یہ بات بین التہذیبی تنازعات کے طائرانہ جائزے کی بنیاد پر کہی تھی۔ ہر غیر جانبدار حلقے کی جانب سے مقداری شواہد سے حتمی طور پر اس کی صحت ثابت ہو جاتی ہے۔

جدول ۳ء۱۰
مسلم و مسیحی ممالک کی عسکریت پسندی

	اوسط شرح فوج	اوسط فوجی کاوش
مسلم ممالک	۸ء۱۱	۷ء۱۷
دیگر ممالک	۱ء۷	۳ء۱۲
مسیحی ممالک	۸ء۵	۲ء۸
دیگر ممالک	۵ء۹	۹ء۱۶

ماخذ: جیمز ایل پین Why Nations Arm (اوکسفرڈ: بیل بلیک ول، ۱۹۸۹ء)، صفحات ۱۲۵، ۱۳۸، تا ۱۳۹۔ مسلم اور مسیحی ممالک وہ ہیں جن میں ۸۰ فیصد سے زائد آبادی مذکورہ مذاہب سے تعلق رکھتی ہے۔

پرتشدد تنازع کی طرف مسلمانوں کے رجحان کی نشاندہی مسلم معاشروں میں عسکریت پسندی کی سطح سے بھی ہوتی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں مسلم ممالک کی شرح ہائے فوج (یعنی فوجی عملے کے ارکان کی تعداد فی ایک ہزار آبادی) اور فوجی کاوش اشاریے (شرح فوج ملک کی دولت کے لحاظ سے) دوسرے ملکوں سے خاصے زیادہ تھے۔ اس کے مقابلے میں مسیحی ممالک کی شرح فوج اور فوجی کاوش کے اشاریے دیگر ممالک سے خاصے کم تھے۔ مسلمان ملکوں کی اوسط شرح فوج اور فوجی کاوش کے اشاریے مسیحی ممالک سے لگ بھگ دگنے تھے (جدول ۳ء۱۰)۔ جیمز پین نے نتیجہ نکالا ہے کہ ''صاف ظاہر ہے کہ اسلام اور عسکریت پسندی کے درمیان کوئی تعلق ہے''۔[۲۵]

مسلمان ریاستوں میں بین الاقوامی بحرانوں میں تشدد پر اتر آنے کا میلان بھی بہت زیادہ ہے۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۷۹ء کے درمیان ان ریاستوں کو ۱۴۲ بحرانوں کا سامنا رہا جن میں سے ۷۶ کے تصفیے کے لیے انہوں نے تشدد کی راہ اختیار کی۔ ۲۵ میں تشدد بحران سے نمٹنے کا بنیادی ذریعہ تھا، ۵۱ بحرانوں میں مسلم ریاستوں نے دیگر ذرائع کے ساتھ تشدد استعمال کیا۔ مسلمان ریاستوں نے جب تشدد استعمال کیا تو شدت سے کیا اور جن بحرانوں میں تشدد کا استعمال ہوا ان میں سے ۴۱ فیصد میں بھرپور جنگ کی گئی جبکہ ۳۸ فیصد میں بڑے تصادم ہوئے۔ مسلم ریاستوں نے ۵ء۵۳ فیصد بحرانوں میں تشدد استعمال کیا۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ نے صرف ۵ء۱۱ فیصد، امریکا نے ۹ء۱۷ فیصد اور سوویت یونین نے ۵ء۲۸ فیصد بحرانوں میں تشدد کا استعمال کیا۔ بڑی طاقتوں میں صرف چین کا تشدد کا رجحان مسلمان ریاستوں سے زیادہ تھا جس نے اپنے ۹ء۷۶ فیصد بحرانوں میں

تشدد استعمال کیا۔[۲۶] مسلمانوں کا جھگڑالو پن اور تشدد بیسویں صدی کے حقائق ہیں جن سے نہ مسلمان انکار کرسکتے ہیں نہ غیر مسلم۔

اسباب: تاریخ، آبادیات، سیاست

رخنہ جنگوں میں بیسویں صدی کے اواخر میں اچانک اضافے اور ان تنازعات میں مسلمانوں کے مرکزی کردار کے کیا اسباب ہیں؟ مختلف تہذیبی گروہوں کے درمیان ماضی میں وقتاً فوقتاً تشدد ہوتا رہا اور لوگوں کی یادوں میں باقی ہے جس نے فریقین میں اندیشوں اور عدم تحفظ کے احساسات کو جنم دیا ہے۔ برصغیر میں مسلمان اور ہندو، شمالی قفقاز میں روسی اور قفقازی، ماورائے قفقاز میں آرمینیائی اور ترک، فلسطین اور عرب اور یہودی، بلقان میں کیتھولک، مسلمان اور آرتھوڈوکس، بلقان سے وسط ایشیا تک روسی اور ترک، سری لنکا میں سنہالی اور تامل، افریقہ بھر میں عرب اور سیاہ فام: یہ وہ روابط ہیں جو صدیوں تک کبھی بداعتمادی کی فضا میں بقائے باہمی اور کبھی سخت تشدد سے دوچار رہے ہیں۔ تنازع کا تاریخی ورثہ موجود ہے اور جو فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اٹھاتے ہیں۔ ان روابط میں تاریخ زندہ، بخیریت اور دہشت انگیز ہے۔

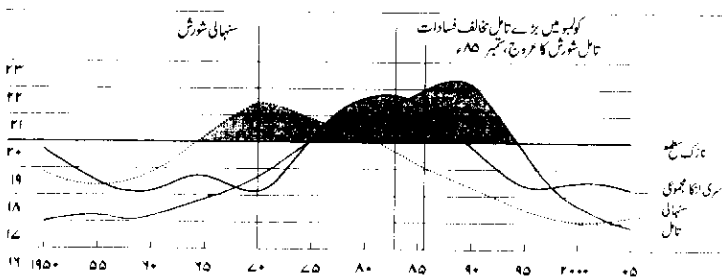
بہرکیف وقتاً فوقتاً تشدد کی تاریخ فی نفسہٖ یہ وضاحت نہیں کرتی کہ بیسویں صدی کے اواخر میں تشدد کیوں شروع ہوا۔ جیسا کہ بہت سوں نے نشاندہی کی، آخر سرب، کروٹس اور مسلمان یوگوسلاویہ میں کئی دہائیوں سے پُرامن طور پر رہ ہی رہے تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں مسلمان اور ہندو رہتے تھے۔ سوویت یونین میں بہت سے نسلی و مذہبی گروہ ساتھ ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، سوائے چند نمایاں مستثنیات کے جو سوویت حکومت کی پیدا کردہ تھیں۔ تامل اور سنہالی بھی سکون سے اپنے جزیرے پر رہتے تھے جسے اکثر منطقہ حارّہ کی جنت کہا جاتا تھا۔ تاریخ نے ان پُرامن تعلقات کو خاصے عرصے تک قائم رہنے سے نہیں روکا۔ پس تاریخ خود امن کے خاتمے کی وضاحت نہیں کرسکتی۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں کچھ دوسری قوتوں کا بھی دخل ہوگا۔

آبادیاتی توازن کے تغیرات ایک عامل تھے۔ کسی ایک گروہ کی تعداد میں اضافہ دوسرے گروہ پر سیاسی، معاشی اور معاشرتی دباؤ ڈالتا ہے اور جوابی اقدامات کا محرک بنتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ آبادیاتی طور پر کم متحرک گروہوں پر فوجی دباؤ کا باعث بنتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے آغاز میں لبنان میں تیس سال پرانے آئینی نظام کے دم توڑ جانے کا سبب بڑی حد

شکل ۱۰ء۱

سری لنکا: سنہالی اور تامل نوجوان آبادی کی کثرت

کل آبادی کا فیصدی تناسب، عمر ۱۵ تا ۲۴



* نازک سطح وہ نقطہ ہے جہاں نوجوان آبادی کا ۲۰ ؍فیصد یا زائد ہیں۔

تک مارونی عیسائیوں کے مقابلے میں شیعہ آبادی میں ڈرامائی اضافہ تھا۔ گیری فلر نے بتایا ہے کہ سری لنکا میں ۱۹۷۰ء میں سنہالی قوم پرست شورش کا عروج اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں تامل شورش کا عروج ٹھیک ان برسوں میں ہوا جب پندرہ تا چوبیس سالہ نوجوانوں کی آبادی ان گروہوں کی مجموعی آبادی کے بیس فیصد سے بڑھ گئی۔[۲۷] (دیکھئے شکل ۱۰ء۱)۔ سری لنکا میں متعین ایک امریکی سفارتکار نے کہا کہ سنہالی شورش پسند تقریباً تمام چوبیس سال سے کم عمر کے تھے اور تامل ٹائیگروں میں ''بچوں کی فوج پر انحصار کرنے کی منفرد'' خاصیت بتائی گئی، وہ ''گیارہ گیارہ سال تک کے لڑکے اور لڑکیاں بھرتی کرتے تھے'' جن میں سے لڑائی میں مارے جانے والے ''موت کے وقت تیرہ سال کے بھی نہیں [ہوتے تھے]، صرف چند اٹھارہ سال سے زائد'' کے تھے۔ دی اکنامسٹ نے تبصرہ کیا کہ تامل ''کم عمروں کی جنگ'' لڑ رہے ہیں۔[۲۸] اسی طرح روسیوں اور ان کے جنوب میں مسلم قوموں کے درمیان رخنہ جنگوں کو آبادی میں اضافے سے تحریک ملی۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے کی ابتدا میں روسی فیڈریشن میں عورتوں کی زرخیزی کی شرح ۱ء۵ تھی جبکہ وسط ایشیا کی سابق سوویت جمہوریاؤں میں جو مسلمان ہیں، زرخیزی کی شرح ۴ء۴ اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں ان جمہوریاؤں کی آبادی میں خالص (net) اضافہ (لگ بھگ شرح ولادت نفی لگ بھگ شرح اموات) روس سے پانچ چھ گنا زیادہ تھا۔ چیچنیائی ۱۹۸۰ء کے عشرے میں ۲۶ فیصد بڑھ گئے اور چیچنیا روس کے گنجان ترین مقامات میں سے تھا جس کی بلند شرح ولادت تارکین اور جنگجو پیدا

کررہی تھی۔[۲۹] اسی طرز پر مسلمانوں کی بلند شرح ولادت اور پاکستان سے کشمیر☆ میں ہجرت نے بھارتی اقتدار کے خلاف ازسرِنو مزاحمت کو تحریک دی۔

سابق یوگوسلاویہ میں جو پیچیدہ عمل بین التہذیبی جنگوں پر منتج ہوئے ان کے کئی اسباب اور کئی نقطہ ہائے آغاز تھے۔ غالباً اہم ترین واحد عامل جو ان تنازعات پر منتج ہوا کوسووا میں آبادیاتی تغیر تھا۔ کوسووا سربیائی جمہوریہ کے اندر خود مختار صوبہ تھا جو علیحدگی کے حق کے علاوہ عملاً یوگوسلاویہ کی چھ جمہوریاؤں جیسے اختیارات رکھتا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں اس کی آبادی میں ۶۷ فیصد البانوی مسلمان اور ۲۴ فیصد آرتھوڈوکس سرب تھے۔ تاہم البانوی شرح ولادت یورپ میں سب سے زیادہ تھی اور کوسووا یوگوسلاویہ کا گنجان ترین علاقہ بن گیا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک ۵۰ فیصد کے قریب البانوی بیس سال سے کم عمر کے تھے۔ اس بھاری تعداد کی وجہ سے سرب اقتصادی مواقع کی تلاش میں بلغراد اور دوسرے مقامات کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ نتیجتاً ۱۹۹۱ء میں کوسووا میں ۹۰ فیصد مسلمان اور ۱۰ فیصد سرب تھے۔[۳۰] اس کے باوجود سرب کوسووا کو اپنی ''ارض مقدس'' یا ''یروشلم'' سمجھتے تھے کیونکہ یہ وہ مقام تھا جہاں، دیگر واقعات کے علاوہ ۲۸ جون ۱۳۸۹ء کی عظیم جنگ ہوئی تھی جب عثمانی ترکوں نے انہیں شکست دی اور جس کے باعث وہ تقریباً پانچ صدیوں تک عثمانی اقتدار کو جھیلتے رہے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر تک بدلتا ہوا آبادیاتی توازن البانویوں کے اس مطالبے کا باعث بنا کہ کوسووا کو یوگوسلاویہ کی جمہوریہ کی حیثیت دی جائے۔ سربوں اور یوگوسلاویہ کی حکومت نے مزاحمت کی کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اگر کوسووا کو علیحدگی کا حق مل گیا تو وہ الگ ہوجائے گا اور شاید البانیہ میں ضم ہوجائے گا۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں جمہوریہ کی حیثیت کے مطالبے کے حق میں البانوی احتجاجی مظاہرے اور فسادات پھوٹ پڑے۔ سربوں کے بقول، اس کے بعد سربوں کے خلاف امتیازی سلوک، مظالم اور تشدد زور پکڑ گیا۔ ایک کروشیائی پروٹسٹنٹ نے کہا کہ ''۱۹۷۰ء کے عشرے کے اواخر اور اس کے بعد کوسووا میں ... متعدد تشدد آمیز واقعات پیش آئے جن میں املاک کو نقصان، روزگار سے محرومی، ہراساں کیا جانا، آبروریزی، لڑائیاں اور ہلاکتیں شامل تھیں۔'' نتیجے کے طور پر ''سربوں نے دعویٰ کیا کہ ان کو نسل کشی کا خطرہ تھا اور اب وہ اسے برداشت نہیں کرسکتے تھے۔'' کوسووا کے سربوں کی حالت زار کے بارے میں بیانات کی بازگشت سربیا کے دوسرے علاقوں میں بھی سنائی دی اور ۱۹۸۶ء میں حزب اختلاف کے لبرل جریدے پراکسس کے مدیروں سمیت

☆ نوٹ از مترجم: یہاں مراد بھارت کے زیر انتظام کشمیر ہے۔

صف اول کے ۲۰۰ سربیائی دانشوروں، سیاسی شخصیات، مذہبی رہنماؤں اور فوجی افسران نے ایک اعلان جاری کیا کہ حکومت کوسووا میں سربوں کی نسل کشی ختم کرانے کے لیے بھرپور اقدامات کرے۔ نسل کشی کی کسی بھی معقول تعریف کی رو سے یہ الزام بے حد مبالغہ آمیز تھا گو کہ البانویوں سے ہمدردی رکھنے والے ایک غیرملکی مبصر کے مطابق ''۱۹۸۰ء کی دہائی کے دوران البانوی قوم پرست سربوں پر متعدد تشدد آمیز حملوں اور سربوں کی بعض املاک کی تباہی کے ذمے دار تھے''۔[۳۱]

ان سب عوامل نے سربیائی قوم پرستی کو ابھارا اور سلوبوڈن میلاسووچ کو موقع مل گیا۔ ۱۹۸۷ء میں اس نے کوسووا میں ایک اہم تقریر کی جس میں سربوں پر زور دیا کہ وہ اپنی زمین اور تاریخ پر دعویٰ کریں۔ ''فوراً سربوں کی بڑی تعداد، کمیونسٹ، غیرکمیونسٹ حتیٰ کہ کمیونسٹ مخالف بھی اس کے گرد اس عزم کے ساتھ جمع ہونے لگے کہ وہ نا صرف کوسووا میں سربیائی اقلیت کی حفاظت کریں گے بلکہ البانویوں کو دبائیں گے اور انہیں دوسرے درجے کا شہری بنادیں گے۔ میلاسووچ کو جلد ہی قومی رہنما تسلیم کرلیا گیا''۔[۳۲] دو سال بعد ۲۸ جون ۱۹۸۹ء کو میلاسووچ دس سے بیس لاکھ سربوں کے ہمراہ اس عظیم جنگ کی چھ سوویں سالگرہ منانے کوسووا لوٹا جو مسلمانوں سے ان کی مسلسل لڑائی کی علامت تھی۔

البانویوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور طاقت سے سربوں میں جو خدشات اور قوم پرستی پیدا ہوئی تھی اسے بوسنیا میں آبادیاتی تبدیلیوں سے مزید ہوا ملی۔ ۱۹۶۱ء میں بوسنیا ہرزیگووینا کی آبادی کا ۴۳ فیصد سرب اور ۲۶ فیصد مسلمان تھے۔ ۱۹۹۱ء میں تناسب تقریباً برعکس ہو چکا تھا: سرب کم ہو کر ۳۱ فیصد رہ گئے تھے اور مسلمان بڑھ کر ۴۴ فیصد ہو گئے تھے۔ ان تیس برسوں میں کروٹس ۲۲ سے ۱۷ فیصد رہ گئے۔ ایک گروہ کی نسلی توسیع دوسرے گروہ کی جانب سے نسلی تطہیر پر منتج ہوئی۔ ایک سرب جنگجو نے ۱۹۹۲ء میں سوال کیا کہ ''ہم بچوں کو کیوں ہلاک کرتے ہیں؟'' اور خود ہی جواب دیا ''کیونکہ کسی دن وہ بڑے ہوں گے اور ہمیں انہیں اُس وقت ہلاک کرنا پڑے گا۔'' اس سے کم سفاک سطح پر بوسنیائی کروشیائی حکام نے اپنے علاقوں کو آبادیاتی طور پر مسلمانوں کے قبضے میں جانے سے روکنے کے لیے اقدامات کیے۔[۳۳]

آبادیاتی توازن میں تغیرات اور نوجوان آبادی میں ۲۰ فیصد یا زائد کے اضافے اکیسویں صدی کے اواخر کے بہت سے بین التہذیبی تنازعات کی تشریح کرتے ہیں تاہم سب کی تشریح نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر سربوں اور کروٹس کے درمیان لڑائی کو آبادیات سے منسلک نہیں کیا جاسکتا اور صرف جزواً تاریخ سے جوڑا جاسکتا ہے چونکہ یہ دونوں اقوام اس وقت تک نسبتاً امن سے رہتی رہی تھیں جب تک کہ دوسری جنگ عظیم میں کروٹ استاشے نے سربوں کا قتل عام نہ کیا۔ اس جگہ اور

دوسرے مقامات پر سیاست بھی جھگڑے کی وجہ تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر آسٹرو ہنگرین، عثمانی اور روسی سلطنتوں کے انہدام سے ان کی جانشین اقوام اور ریاستوں کے درمیان نسلی و تہذیبی تنازعات بھڑک اٹھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی، فرانسیسی اور ولندیزی سلطنتوں کے خاتمے سے بھی اس سے مماثل نتائج پیدا ہوئے۔ سرد جنگ کے اختتام پر سوویت یونین اور یوگوسلاویہ میں کمیونسٹ حکومتوں کے گرنے سے یہی کچھ ہوا۔ لوگ اب خود کو کمیونسٹ، سوویت شہری یا یوگوسلاوی کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکتے تھے، انہیں نئی شناختوں کی شدید ضرورت تھی۔ یہ شناختیں انہیں نسلیت اور مذہب میں ملیں جو تشخص فراہم کرنے میں قدیم سے ساتھ دیتے آئے ہیں۔ کسی خدا پر یقین نہ رکھنے والی ریاستوں کے جابرانہ مگر پُرامن نظام کی جگہ مختلف خداؤں پر یقین رکھنے والی اقوام کے تشدد نے لے لی۔

اس وجہ سے اور بھی خرابی پیدا ہوئی کہ ابھرتی ہوئی سیاسی اکائیوں کو جمہوریت اپنانے کی ضرورت تھی۔ جب سوویت یونین اور یوگوسلاویہ کی شکست وریخت شروع ہوئی تو مقتدر طبقات نے قومی انتخابات نہیں کرائے۔ اگر ایسا ہوتا تو سیاسی رہنما مرکز میں اقتدار کے حصول کے لیے مقابلہ کرتے اور رائے دہندگان میں کثیر نسلی و کثیر تہذیبی جذبات بیدار کرنے اور پارلیمنٹ میں اسی طرح کے اتحاد بنانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اس کی بجائے سوویت یونین اور یوگوسلاویہ دونوں میں انتخابات پہلے جمہوریاؤں کی بنیاد پر منعقد ہوئے جس نے سیاسی رہنماؤں میں مرکز کے خلاف مہم چلانے، نسلی قوم پرستی کے جذبات ابھارنے اور اپنی جمہوریاؤں میں آزادی کی بات کرنے کی ترغیب پیدا کی۔ بوسنیا کے اندر تک ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں لوگوں نے قطعی نسلی خطوط پر ووٹ دیے۔ کثیر نسلی اصلاح پسند پارٹی اور سابق کمیونسٹ پارٹی دونوں کو دس فیصد سے کم ووٹ ملے۔ مسلم جماعت برائے جمہوری عمل (۳۴ فیصد)، سربیائی جمہوری پارٹی (۳۰ فیصد) اور کروشیائی جمہوری یونین (۱۸ فیصد) کے ووٹ آبادی میں لگ بھگ مسلمانوں، سربوں اور کروٹس کے تناسب کے برابر تھے۔ سابق سوویت یونین اور سابق یوگوسلاویہ کی تقریباً ہر جمہوریہ میں پہلے منصفانہ انتخابات میں وہ سیاسی رہنما کامیاب ہوئے جو قوم پرستانہ جذبات کو ابھار رہے تھے اور دوسرے نسلی گروہوں کے مقابلے میں اپنی قومیت کے دفاع کے لیے زوردار اقدامات کے وعدے کر رہے تھے۔ انتخابی مسابقت قوم پرستانہ جذبات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور اس طرح رخنہ تنازعات کو بڑھا کر رخنہ جنگوں میں بدل دیتی ہے۔ بوگڈن ڈینچ کے الفاظ میں جب "ethnos (قوم) demos (عوام) بن جاتی ہے"[۳۴] تو ابتدائی نتیجہ *polemos* یا جنگ ہوتا ہے۔

جدول ۴ء۱۰

مسلمانوں میں تنازعے کے میلانات کے ممکنہ اسباب

	ماورائے اسلام تنازعات	دروں اسلام اور ماورائے اسلام تنازعات
تاریخی اور عصر حاضر کے تنازعات	قربت عدم قبولیت	عسکریت پسندی
عصر حاضر کے تنازعات	مظلوم کی حیثیت	آبادی میں اضافہ مرکزی ریاست کی عدم موجودگی

یہ سوال اب بھی قائم ہے کہ بیسویں صدی کے رخصت ہوتے وقت مسلمان دوسری تہذیبوں کے افراد سے زیادہ گروہی تشدد میں کیوں شریک ہیں۔ کیا ہمیشہ یہی صورت رہی ہے؟ ماضی میں عیسائیوں نے بڑی تعداد میں اپنے عیسائی بھائیوں اور دوسرے لوگوں کو ہلاک کیا۔ پوری تاریخ میں تہذیبوں کے تشدد کے میلانات کو جانچنے کے لیے بہت تحقیق درکار ہوگی جو یہاں ناممکن ہے۔ تاہم یہ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ مسلم گروہی تشدد، دروں اسلام اور ماورائے اسلام دونوں، کے ممکنہ اسباب کی نشاندہی کی جائے۔ نیز تمام تاریخ میں گروہی تنازعات کے رجحان کی وضاحت کرنے والے، بشرطیکہ ایسا کوئی رجحان موجود ہو، اور صرف بیسویں صدی کے خاتمے پر اس رجحان کی وضاحت کرنے والے اسباب کے مابین امتیاز کیا جائے۔ چھ ممکنہ اسباب نظر آتے ہیں۔ تین اسباب صرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تشدد کی تشریح کرتے ہیں جبکہ تین اس کے علاوہ دروں اسلام تشدد کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ تین اسباب صرف دور حاضر میں مسلمانوں کے تشدد کے میلان کی توضیح کرتے ہیں جبکہ تین دیگر نا صرف اس میلان کی بلکہ تاریخی میلان کی بھی، بشرطیکہ اس کا وجود ہے، توضیح کرتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی تاریخی میلان موجود نہیں تو اس کے مفروضہ اسباب بھی جو ایک غیر موجود تاریخی میلان کی وضاحت نہیں کرسکتے، دور حاضر میں مسلمانوں کے ثابت شدہ گروہی تشدد کے میلان کی وضاحت بھی نہیں کرسکیں گے۔ اُس صورت میں دور حاضر کے تشدد کی وضاحت صرف بیسویں صدی کے ان اسباب سے ہوگی جو پچھلی صدیوں میں موجود نہیں تھے (جدول ۴ء۱۰)۔

اول، یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام ابتدا سے ہی تلوار کا مذہب رہا ہے اور یہ کہ اس

میں عسکری فضائل کی بہت مدح سرائی کی جاتی ہے۔ اسلام ''خانہ بدوش جنگجو بدو قبائل'' کے درمیان ابھرا اور یہ ''پُر تشدد ابتدا اسلام کی گھٹی میں پڑی ہے۔ محمد [ﷺ] خود ایک زبردست ماہر حرب اور بہترین سپہ سالار کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں''[۳۵] (عیسیٰ [علیہ السلام] اور گوتم بدھ کے بارے میں کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا۔) یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اسلام کے عقائد منکرین سے جنگ کی تلقین کرتے ہیں اور جب اسلام کی ابتدائی توسیع کا سلسلہ کم ہوا تو مسلمان گروہوں نے، عقیدے کے بالکل خلاف، آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ فتنوں یا داخلی تنازعات اور جہاد کا تناسب بہت زیادہ اول الذکر کے حق میں ہوگیا۔ قرآن اور مسلم عقائد کے دوسرے بیانات میں تشدد کے امتناع کے بارے میں شاذ ہی احکامات ہیں اور عدم تشدد کا تصور مسلم عقائد اور عمل میں نہیں پایا جاتا۔

دوم، عرب میں آغاز سے لے کر پورے شمالی افریقہ اور مشرق کے وسط اور بعد ازاں وسط ایشیا، برصغیر اور بلقان تک جوں جوں اسلام پھیلتا گیا مسلمان مختلف اقوام سے براہ راست رابطے میں آتے رہے، انہیں تسخیر اور مسلمان کرتے رہے اور اس عمل کا ورثہ باقی ہے۔ بلقان میں عثمانی فتوحات کے بعد شہری جنوبی سلاف اکثر مسلمان ہوگئے جبکہ دیہات کے لوگ نہیں ہوئے اور یوں مسلم بوسنیائیوں اور آرتھوڈوکس سربوں کے درمیان فرق پیدا ہوا۔ دوسری جانب روسی سلطنت کی بحیرۂ اسود، قفقاز وسط ایشیا تک توسیع کئی صدیوں تک مختلف مسلم قوموں سے مسلسل تنازعات کا سبب بنتی رہی۔ جب مغرب نے اپنی طاقت کے عروج پر اسلام کے مقابلے پر مشرق وسطیٰ میں یہودی وطن قائم کرایا تو عرب اسرائیلی دشمنی کی بنیاد پڑ گئی۔ اس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کی طرف سے علاقائی توسیع کے نتیجے میں پورے یوریشیا میں مسلمان اور غیر مسلم جغرافیائی اعتبار سے قربت میں رہنے لگے۔ اس کے مقابلے پر مغرب نے سمندر کے راستے توسیع کی جس کے نتیجے میں عموماً مغربی اقوام کی غیر مغربی اقوام سے علاقائی قربت نہیں ہوئی: غیر مغربی اقوام یورپ کی محکومی میں آگئیں یا، جنوبی افریقہ کے سوا، مغربی آبادکاروں نے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تنازعے کی تیسری ممکنہ وجہ وہ ہے جسے ایک سیاست کار نے اپنے ملک کے حوالے سے مسلمانوں کی ''عدم قبولیت'' قرار دیا ہے۔ لیکن عدم قبولیت دونوں سمتوں میں سرگرم عمل ہوتی ہے: مسلمان ممالک کو غیر مسلم اقلیتوں سے ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے جیسے غیر مسلم ممالک کو مسلم اقلیتوں سے ہے۔ اسلام عیسائیت سے بھی زیادہ مطلقیت کا حامل (absolutist) مذہب ہے۔ اس میں مذہب اور سیاست ضم ہوجاتے ہیں اوردارالاسلام اور دارالحرب میں رہنے والوں کے درمیان واضح تمیز کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کنفیوشینز، بدھوں،

ہندوؤں، مغربی عیسائیوں اور آرتھوڈوکس عیسائیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے اور رچنے بسنے میں اتنی مشکل نہیں ہوتی جتنی مسلمانوں کے ساتھ رہنے میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر نسلی چینی جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں اقتصادی طور پر غالب اقلیت ہیں۔ وہ بودھ تھائی لینڈ اور کیتھولک فلپائن کے معاشروں میں کامیابی سے گھل مل گئے ہیں۔ ان ممالک میں اکثریتی گروہوں کے ہاتھوں چینیوں پر تشدد کے کوئی اہم واقعات سامنے نہیں آئے۔ اس کے مقابلے میں مسلم انڈونیشیا اور مسلم ملائشیا میں چینیوں کے خلاف فسادات اور/یا تشدد کے واقعات ہوئے ہیں، ان معاشروں میں چینیوں کا کردار حساس ہے اور تھائی لینڈ اور فلپائن کے برخلاف یہ بھڑک اٹھنے کے امکانات کا حامل مسئلہ ہے۔

عسکریت، عدم قبولیت اور غیر مسلم گروہوں سے جغرافیائی قربت اسلام کے جاری خواص ہیں اور، اگر یہی بات ہے تو، پوری تاریخ میں مسلمانوں کے تنازعات کی تشریح کر سکتے ہیں۔ ایک تشریح جو مسلمان پیش کرتے ہیں یہ ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی سامراجیت اور مسلمان معاشروں کی محکومیت نے مسلمانوں کو فوجی و معاشی اعتبار سے کمزور بنا کر پیش کیا اس لیے غیر مسلم گروہ مسلمانوں کو آسان ہدف سمجھتے ہیں۔ اس استدلال کے مطابق مسلمان بہت عام مسلم دشمن تعصب کا شکار ہیں جس کا موازنہ مغربی سماجوں کی تاریخ میں پھیلی ہوئی یہود دشمنی سے کیا جا سکتا ہے۔ اکبر احمد الزام لگاتے ہیں کہ فلسطینیوں، بوسنیائیوں، کشمیریوں اور چیچنیائیوں جیسے مسلمان گروہ ''ریڈ انڈینز کی طرح [ہیں]، دبے ہوئے گروہ، عزت و وقار سے عاری، اپنے آبائی علاقوں کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے''[۳۶] تاہم یہ استدلال جس میں مسلمانوں کو مظلوم قرار دیا جاتا ہے سوڈان، مصر، ایران اور انڈونیشیا جیسے ممالک میں مسلمان اکثریت اور غیر مسلم اقلیت کے درمیان تنازع کی وضاحت نہیں کرتا۔

اس سے زیادہ قابل فہم عنصر جو شاید دروں اسلام اور ماورائے اسلام دونوں تنازعات کی توضیح کرتا ہے، اسلام میں ایک یا زیادہ مرکزی ریاستوں کی عدم موجودگی ہے۔ اسلام کا دفاع کرنے والے اکثر الزام لگاتے ہیں کہ مغربی ناقدین یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں کوئی مرکزی، سازشی قوت محرکہ ہے جو اسے قوت بخش رہی ہے اور مغرب اور دیگر کے خلاف اس کی کارروائیوں کو مربوط کر رہی ہے۔ اگر ناقدین یہ سمجھتے ہیں تو غلطی پر ہیں۔ اسلام دنیا میں عدم استحکام کا سبب اس لیے ہے کہ اس میں کسی غالب مرکز کا فقدان ہے۔ اسلام کی رہبر بننے کا عزم رکھنے والی ریاستیں جیسے سعودی عرب، ایران، پاکستان، ترکی اور ممکنہ طور پر انڈونیشیا مسلم دنیا میں اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں لیکن ان میں کوئی اتنی مضبوط نہیں کہ اسلام کے اندر تنازعات میں ثالثی کرا سکے اور کوئی اس قابل نہیں

کہ مسلم اور غیر مسلم گروہوں کے درمیان تنازعات سے نمٹنے میں اسلام کی محکم ترجمان بن سکے۔

آخر میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلم معاشروں کی آبادی میں زبردست اضافہ اور پندرہ سے تیس برس کے اکثر بے روزگار مردوں کی بڑی تعداد کی دستیابی عدم استحکام اور اسلام کے اندر اور غیر مسلموں کے خلاف تشدد کا فطری سبب ہے۔ دوسرے جو بھی اسباب ہوں، صرف یہی عامل ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں مسلم تشدد کی بڑی حد تک وضاحت کرسکتا ہے۔ اکیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک اس بیقرار نسل کے بوڑھا ہونے اور اگر مسلم معاشروں میں اقتصادی ترقی ہوئی تو اس کی وجہ سے مسلمانوں میں تشدد کے میلان میں نمایاں کمی آسکتی ہے جس کے ساتھ رخنہ جنگوں کی تعداد اور شدت میں عمومی طور پر کمی آجائے گی۔

گیارہواں باب

رخنہ جنگوں کی حرکیات

شناخت: تہذیبی احساس کی بیداری

رخنہ جنگیں شدت، توسیع، تحدید، مداخلت اور کبھی کبھار تصفیے کے راستوں سے گزرتی ہیں۔ یہ راستے عموماً یکے بعد دیگرے آتے ہیں لیکن اکثر ایک دوسرے پر منطبق بھی ہوجاتے ہیں اور دوبارہ بھی سامنے آسکتے ہیں۔ دوسرے فرقہ وارانہ تنازعات کی طرح رخنہ جنگیں ایک بار چھڑ جانے کے بعد اپنی ایک زندگی گزارتی ہیں اور ان میں عمل و ردعمل کا ایک سلسلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جو شناختیں پہلے متعدد تھیں اور لائق التفات نہ تھیں اب ان پر بھرپور توجہ اور اہمیت دی جاتی ہے۔ فرقہ وارانہ تنازعات کو ''تشخص کی جنگیں'' کہنا موزوں ہے۔[1] جوں جوں تشدد بڑھتا ہے ابتدائی مسائل ''ہم'' اور ''وہ'' کے حوالوں سے دیکھے جانے لگتے ہیں اور گروہی اتحاد اور وابستگی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ سیاسی رہنما نسلی و مذہبی وفاداریوں کی زیادہ بات کرنے لگتے ہیں اور دوسری شناختوں کی بہ نسبت تہذیبی احساس مضبوط تر ہوجاتا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے ''مسئلہ سلامتی'' کی طرز پر ایک ''نفرت کی حرکیات'' ابھر آتی ہے جس میں باہمی خوف، بداعتمادی اور منافرت ایک دوسرے کو پروان چڑھاتے ہیں۔[2] ہر فریق خیر کی قوتوں اور شر کی قوتوں کے درمیان فرق کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور آخرکار اس امتیاز کو 'برق رفتار' اور 'مردہ' کے فرق میں بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔

جب انقلابات کا ارتقا ہوتا ہے تو اعتدال پسند، جیرونڈنس اور مینشوکس شدت پسندوں، جیکوبنز

اور بالشویکس سے ہار جاتے ہیں۔ اس سے مماثل عمل رخنہ جنگوں میں بھی ہوتا ہے۔ محدود اہداف مثلاً خودمختاری بجائے آزادی، رکھنے والے اعتدال پسند گفت وشنید کے ذریعے یہ اہداف حاصل نہیں کرپاتے جو شروع میں تقریباً ہمیشہ ناکام ہوتی ہے اور ان کی جگہ شدت پسند آجاتے ہیں تو تشدد کے ذریعے زیادہ انتہاپسندانہ اہداف کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ مورو فلپائن تنازعے میں اہم ترین شورش پسند تنظیم مورو قومی آزادی محاذ کے ساتھ پہلے مورو اسلامی آزادی محاذ آیا جو زیادہ انتہاپسندانہ موقف کا حامل تھا اور پھر ابوسیاف آیا جو اس سے بھی زیادہ انتہا پسند تھا اور اس نے جنگ بندی کے وہ تمام سمجھوتے مسترد کردیے جو دوسری تنظیموں نے فلپائنی حکومت سے کیے تھے۔ سوڈان میں ۱۹۸۰ء کے عشرے کے دوران حکومت زیادہ سے زیادہ انتہا کی طرف مائل اسلام پسندانہ موقف اختیار کرتی رہی اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں مسیحی شورش پسند تقسیم ہوگئے اور ایک نئی تنظیم تحریک آزادی برائے جنوبی سوڈان سامنے آئی جو محض خود مختاری کی بجائے آزادی کا مطالبہ کررہی تھی۔ اسرائیلیوں اور عربوں کے مابین جاری تنازعے میں جب تنظیم آزادی فلسطین نے اسرائیلی حکومت سے مذاکرات شروع کیے تو اخوان المسلمون اور حماس نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ وہ فلسطینیوں سے وفادار نہیں۔ اس کے ساتھ ہی مذاکرات میں اسرائیلی حکومت کی شمولیت پر اسرائیل کے انتہاپسند مذہبی گروپوں نے احتجاج اور تشدد کیا۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں جب روس کے ساتھ چیچنیائیوں کے تنازعے میں شدت آئی تو دودایف حکومت پر ''چیچنیائی قوم پرستوں کے سب سے انتہاپسند دھڑوں'' کا غلبہ ہوگیا ''جو ماسکو سے کسی بھی قسم کی مفاہمت کے مخالف تھے اور اعتدال پسند حزب اختلاف میں دھکیل دیے گئے۔'' تاجکستان میں بھی اسی طرح کی تبدیلی آئی۔ ''۱۹۹۲ء میں جب تنازعے نے شدت پکڑی تو تاجک قوم پرست اور جمہوری گروپوں کا اثرورسوخ بتدریج اسلام پسند گروپوں کو منتقل ہوگیا جو دیہی غربا اور شہر کے ناراض نوجوانوں کو متحرک کرنے میں زیادہ کامیاب تھے۔ جب نسبتاً جواں سال رہنما روایتی اور عملیت پسند مذہبی مقتدر حلقوں کے حریف بن کر ابھرے تو اسلام پسندی کے پیغام میں مزید شدت آگئی۔'' ایک تاجک رہنما نے کہا ''میں سفارتکاری کی لغت بند کررہا ہوں۔ میں میدان جنگ کی زبان بولنے لگا ہوں جو میرے وطن میں روس کی پیدا کردہ صورتحال میں واحد موزوں زبان ہے۔''[۳۳] بوسنیا مسلم جماعت برائے جمہوری عمل (ایس ڈی اے) کے اندر علی جاہ عزت بیگووچ کے زیر قیادت زیادہ انتہا کی طرف جھکاؤ رکھنے والا قوم پرست دھڑا حارث سلاجک کے زیر قیادت رواداری، کثیر ثقافتی رجحانات کے حامل دھڑے سے زیادہ بااثر ہوگیا۔[۳۴]

یہ ضروری نہیں کہ انتہاپسندوں کی فتح مستقل ہو۔ یہ بھی نہیں کہ رخنہ جنگ ختم کرنے میں

انتہا پسندانہ تشدد کا کردار اعتدال پسندانہ سمجھوتے سے زیادہ ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ جب اموات اور تباہی و بربادی کا سلسلہ بڑھتا ہے اور اس کے کوئی نتائج نظر نہیں آتے تو دونوں جانب اعتدال پسند دوبارہ سامنے آ سکتے ہیں اور ان سب کارروائیوں کی ''بے معنویت'' کی پھر نشاندہی کرتے ہیں اور گفت وشنید کے ذریعے مسائل حل کرنے کی کوشش پر زور دیتے ہیں۔

جنگ کے دوران متعدد شناختیں مدھم ہو کر پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور وہی شناخت نمایاں ہو جاتی ہے جو جاری تنازعے میں سب سے بامعنی ہو۔ یہ شناخت تقریباً ہمیشہ مذہب سے متعین ہوتی ہے۔ نفسیاتی طور پر ''بے خدا'' قوتوں کے خلاف جنہیں خطرناک قرار دیا جاتا ہے، مذہب سب سے تسلی بخش اور مضبوط جواز فراہم کرتا ہے۔ عملاً مذہب کی دینی وتہذیبی برادری وسیع ترین برادری ہے جس سے تنازعے میں شامل مقامی گروپ حمایت کی درخواست کر سکتا ہے۔ اگر دو افریقی قبائل کے درمیان مقامی جنگ میں ایک قبیلہ اپنا تشخص مسلمان اور دوسرا عیسائی کی حیثیت سے متعین کرے تو اول الذکر کو سعودی پیسہ، افغان مجاہدین اور ایرانی اسلحے اور فوجی مشیروں سے امداد ملنے کی امید ہو سکتی ہے جبکہ دوسرا مغربی اقتصادی و انسانی امداد اور مغربی حکومتوں کی طرف سے سیاسی و سفارتی حمایت کی توقع رکھے گا۔ جب تک کوئی گروپ اس طرح نہ کر سکے جیسے بوسنیائی مسلمانوں نے کیا تھا یعنی خود کو نسل کشی کے شکار کے طور پر پیش کرنا اور اس طرح مغربی ہمدردی ابھارنا، وہ صرف اپنے تہذیبی قرابت دار سے ہی مدد وصول کر سکتا ہے اور، سوائے بوسنیائی مسلمانوں کے، یہی ہوتا رہا ہے۔ رخنہ جنگیں اپنی تعریف کی رو سے وسیع تر روابط کے حامل مقامی گروہوں کے درمیان مقامی جنگیں ہوتی ہیں شرکا میں تہذیبی شناختوں کو فروغ دیتی ہیں۔

تہذیبی تشخص کا مضبوط ہو جانا دوسری تہذیبوں سے متعلق رخنہ جنگوں کے شرکا میں بھی ہوا ہے لیکن مسلمانوں میں بطور خاص یہ پہلو نمایاں ہے۔ رخنہ جنگ کی جڑیں خاندانی یا قبائلی تنازعات میں ہو سکتی ہیں لیکن چونکہ مسلم دنیا میں شناختیں U شکل کی ہوتی ہیں اس لیے جوں جوں جدوجہد آگے بڑھتی ہے، مسلم شرکا اپنی شناخت کو وسیع کر کے پورے عالم اسلام کی بات کرنے لگتے ہیں جیسے صدام حسین جیسے بنیاد پرستوں کے دشمن سیکولرسٹ کے ساتھ ہوا۔ ایک مغربی مبصر کے مطابق آذربائیجانی حکومت نے بھی اسی طرح ''اسلامی کارڈ'' کھیلا۔ تاجکستان میں اس جنگ میں جو تاجکستان کے اندرونی علاقائی تنازعے کے طور پر شروع ہوئی تھی، شورش پسند اپنے مقاصد کو اسلام کا مقصد قرار دینے لگے۔ شمالی قفقاز کی قوموں اور روسیوں کے درمیان ہونے والی انیسویں صدی کی جنگوں میں مسلمان رہنما شامل نے خود کو اسلام پسند ٹھہرایا اور ''اسلام اور روسی فتح کی مزاحمت کی بنیاد''

پر درجنوں نسلی و لسانی گروہوں کو متحد کر دیا۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں دودائیف نے بھی اِسی حکمت عملی کے تحت اس اُسلامی احیا سے فائدہ اٹھایا جو ۱۹۸۰ء کی دہائی میں قفقاز میں ہوا تھا۔ مسلمان علما اور اسلام پسند جماعتوں نے اس کی حمایت کی، انہوں نے قرآن پر عہدے کا حلف اٹھایا (جیسے یلسن کو آرتھوڈوکس پیشوا نے آشیرباد دی تھی) اور ۱۹۹۴ء میں تجویز دی کہ چیچنیا اسلامی ریاست بن جائے جہاں شریعت کی حکمرانی ہو۔ چیچنیائی فوجیوں نے سبز اسکارف پہنے ''جن پر 'گوازات' کا لفظ چمک رہا ہوتا تھا جس کے معنی چیچن زبان میں جہاد کے ہیں۔'' لڑائی پر جاتے وقت وہ ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگاتے۔[۵] اسی طرح کشمیری مسلمانوں نے اپنی علاقائی شناخت، جس میں مسلمان، ہندو اور بدھ سب آجاتے تھے یا بھارتی سیکولرزم سے شناخت کو ایک تیسری شناخت میں بدل لیا جس کی عکاسی ''کشمیر میں مسلم قوم پرستی کے ابھرنے اور ماورائے قوم اسلامی بنیاد پرست اقدار کے پھیلنے سے ہوتی تھی جس نے کشمیری مسلمانوں کو احساس دلایا کہ وہ اسلامی پاکستان اور اسلامی دنیا کا جزو ہیں۔'' بھارت کے خلاف ۱۹۸۹ء کی شورش کی ابتدا میں ایک ''نسبتاً سیکولر'' تنظیم نے قیادت کی جسے حکومت پاکستان کی حمایت حاصل تھی۔ پھر پاکستانی حمایت اسلامی بنیاد پرست تنظیموں کی طرف منتقل ہوگئی جو حاوی ہوگئے۔ ان تنظیموں میں ''سخت موقف کے حامل شورش پسند'' شامل تھے جو لگتا تھا کہ ''جہاد برائے جہاد جاری رکھنے کا عزم رکھتے ہیں چاہے اس کی کامیابی کی امید یا نتیجہ کیسا ہی ہو۔'' ایک اور مبصر نے کہا کہ ''قوم پرستانہ احساسات مذہبی اختلافات کے باعث شدید ہوگئے ہیں، عالمی سطح پر اسلامی شدت پسندی نے کشمیری شورش پسندوں کو حوصلہ دیا ہے اور ہندو مسلم رواداری کی کشمیر کی روایت کو کھوکھلا کر دیا ہے۔''[۶]

بوسنیا میں تہذیبی شناختوں میں ڈرامائی اضافہ ہوا خصوصاً مسلمان آبادی میں۔ تاریخی اعتبار سے بوسنیا میں فرقہ وارانہ شناختیں زیادہ مضبوط نہیں رہی تھیں۔ سرب، کروٹس اور مسلمان پڑوسیوں کی حیثیت سے امن سے رہتے تھے۔ آپس کی شادیاں عام تھیں۔ مذہبی تشخص کمزور تھا۔ یہ کہا گیا کہ مسلمان وہ بوسنیائی تھے جو مسجد نہیں جاتے تھے، کروٹس وہ بوسنیائی تھے جو کیتھڈرل نہیں جاتے تھے اور سرب وہ بوسنیائی تھے جو آرتھوڈوکس گرجا گھر نہیں جاتے تھے۔ ایک بار جب وسیع تر یوگوسلاوی تشخص ختم ہوگیا تو یہ مذہبی شناختیں جنہیں پہلے اہمیت نہیں دی جاتی تھی نئے معانی اختیار کر گئیں اور جب لڑائی شروع ہوئی تو شدت پکڑ گئیں۔ کثیر گروہی جذبات دھواں بن کر اڑ گئے اور ہر گروہ نے خود کو اپنی وسیع تر ثقافتی برادری سے شناخت کرنا اور مذہبی حوالوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بوسنیائی سرب انتہا پسند سربیائی قوم پرست بن گئے اور خود کو عظیم تر سربیا، سربیائی آرتھوڈوکس کلیسا اور وسیع تر

آرتھوڈوکس برادری سے وابستہ کرنے لگے۔ بوسنیائی کروٹس نے انتہائی پرجوش کروشیائی قوم پرستوں کا روپ دھار لیا، خود کو کروشیا کا شہری سمجھنے لگے، اپنے کیتھولک مسلک اور کروشیا کے کروٹس کے ساتھ کیتھولک مغرب سے اپنی شناخت پر زور دینے لگے۔

مسلمانوں میں تہذیبی احساس کی بیداری اور بھی نمایاں تھی۔ جب تک جنگ شروع نہیں ہوئی تھی، بوسنیائی مسلمان اپنے انداز نظر میں بے حد سیکولر تھے، خود کو یورپی سمجھتے تھے اور کثیر ثقافتی بوسنیائی معاشرے اور ریاست کے سخت ترین حامی تھے۔ تاہم جب یوگوسلاویہ ٹوٹا تو اس میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ کروٹس اور سربوں کی طرح ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں مسلمانوں نے کثیر گروہی جماعتوں کو مسترد کر دیا اور عزت بیگووچ کی مسلم جماعت برائے جمہوری عمل کو بھاری اکثریت سے ووٹ دیے۔ عزت بیگووچ کٹر مسلمان تھے، کمیونسٹ دور میں اپنی اسلامی سرگرمیوں کی وجہ سے قید میں رہ چکے تھے اور The Islamic Declaration نامی کتاب میں جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی، انہوں نے یہ نقطہ نظر پیش کیا کہ ''اسلام کی غیر اسلامی نظاموں سے عدم مطابقت [ہے]۔ مذہب اسلام اور غیر اسلامی معاشرتی و سیاسی اداروں کے درمیان نہ امن ہوسکتا ہے نہ بقائے باہمی۔'' جب اسلامی تحریک مضبوط ہو تو اسے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہیے اور اسلامی جمہوریہ قائم کرنی چاہیے۔ اس نئی ریاست میں یہ بالخصوص ضروری ہے کہ تعلیم اور ذرائع ابلاغ ''ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جن کا اسلامی اخلاقی وعلمی مقام غیر متنازع ہو۔''

جب بوسنیا آزاد ہوا تو عزت بیگووچ نے کثیر نسلی ریاست کو فروغ دیا جس میں مسلمان غالب گروہ ہوں گو کہ ان کی اکثریت نہیں تھی۔ تاہم وہ ایسے شخص نہیں تھے جو جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اسلامائزیشن کے عمل کی مزاحمت کرتے۔ ان کی جانب سے The Islamic Declaration کو کھلے عام مسترد کرنے میں پس وپیش سے غیر مسلموں میں اندیشوں نے جنم لیا۔ جنگ جاری رہی اور بوسنیائی سرب اور کروٹس بوسنیائی حکومت کے زیر اقتدار علاقے چھوڑتے گئے اور جو رہ گئے انہوں نے خود کو اچھی ملازمتوں اور سماجی اداروں میں شرکت سے محروم پایا۔ ''اسلام کو مسلم قومی برادری کے اندر زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی اور ... مضبوط مسلم قومی شناخت سیاست اور مذہب کا حصہ بن گئی۔'' بوسنیائی ثقافتی قوم پرستی کے مقابلے میں مسلم قومیت کا اظہار ذرائع ابلاغ پر زیادہ سے زیادہ کیا گیا۔ اسکولوں میں مذہبی تعلیم بڑھ گئی اور نئی نصابی کتابوں میں عثمانی اقتدار کی برکات پر زور دیا جانے لگا۔ بوسنیائی زبان کو سربو کروشیائی سے علیحدہ فروغ دیا گیا اور اس میں زیادہ سے زیادہ ترکی اور عربی الفاظ شامل کیے گئے۔ سرکاری عہدیداروں نے مخلوط شادیوں اور

''جارحین'' کی یا سربیائی موسیقی نشر کیے جانے پر تنقید کی۔ حکومت نے دین اسلام کی حوصلہ افزائی کی اور مسلمانوں کو ملازمتیں اور ترقیاں دینے میں ترجیح دی۔ سب سے اہم یہ کہ بوسنیائی فوج کو اسلامی بنادیا گیا اور ۱۹۹۵ء تک اس کا ۹۰ فیصد سے زائد عملہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ زیادہ سے زیادہ آرمی یونٹ خود کو اسلامی تشخص سے منسلک کرنے لگے، اسلامی رواج اپنانے لگے اور مسلم علامات استعمال کرنے لگے۔ اعلیٰ درجے کے یونٹ سب سے زیادہ اسلامی رنگ میں رنگ گئے اور ان کی تعداد بڑھ گئی۔ اس صورتحال کے نتیجے میں بوسنیائی صدارت کے پانچ ارکان (بشمول دو کروٹس اور دو سرب) نے عزت بیگووچ سے احتجاج کیا جو انہوں نے مسترد کردیا اور ۱۹۹۵ء میں کثیر ثقافتی رجحانات کے حامل وزیر اعظم حارث سلا جک نے استعفا دے دیا۔[8]

سیاسی اعتبار سے عزت بیگووچ کی مسلم جماعت ایس ڈی اے نے بوسنیائی ریاست اور معاشرے پر اپنے اثر ورسوخ کو وسعت دی۔ ۱۹۹۵ء تک یہ ''بری فوج، سول سروس اور سرکاری تجارتی اداروں'' پر چھا چکی تھی۔ یہ بتایا گیا کہ ''غیر مسلم تو درکنار، پارٹی سے تعلق نہ رکھنے والے مسلمانوں تک کو باعزت روزگار مشکل سے ملتا ہے۔'' پارٹی کے ناقدین نے الزام عائد کیا کہ یہ ''اسلامی استبداد کا ذریعہ بن چکی ہے جس میں کمیونسٹ حکومت کی عادات نمایاں ہیں''۔[9] ایک اور مبصر نے بتایا کہ مجموعی طور پر

> مسلم قوم پرستی مزید انتہا کی طرف جارہی ہے۔ اب اس میں دیگر قومی احساسات کا کوئی خیال نہیں رکھا جارہا، صرف نئی بالادست مسلم قوم کی املاک، حقوق اور سیاسی وسائل ہی اہم ہیں...
> اس نئی مسلم قومیت کا سب سے اہم نتیجہ قومی یکجہتی کی سمت تحریک ہے...
> اسلامی مذہبی بنیاد پرستی بھی مسلم قومی مفادات کا تعین کرنے میں زیادہ سے زیادہ غالب آتی جارہی ہے۔[10]

مذہبی شناخت میں جنگ اور نسلی تطہیر کی پیدا کردہ شدت، رہنماؤں کی ترجیحات اور دوسرے مسلم ممالک کی حمایت اور دباؤ کی بنا پر بوسنیا آہستہ آہستہ مگر واضح طور پر بلقان کے سوئٹزرلینڈ سے بلقان کے ایران میں تبدیل ہوتا جارہا تھا۔

رخنہ جنگوں میں ہر فریق نا صرف اپنے بلکہ دوسرے فریق کے تہذیبی تشخص پر زور دینے کی ترغیبات رکھتا ہے۔ اپنی مقامی جنگ میں وہ خود کو محض دوسرے مقامی گروہ سے برسر پیکار نہیں سمجھتا بلکہ دوسری تہذیب کے خلاف ڈٹا ہوا سمجھتا ہے۔ اس طرح خطرہ بڑھا ہوا محسوس ہوتا ہے اور کسی اہم تہذیب کے وسائل سے اس میں اضافہ ہوجاتا ہے اور شکست کے نتائج صرف اس گروہ کے لیے اہم

نہیں ہوتے بلکہ اس کی پوری تہذیب کے لیے ہوتے ہیں۔ پس اس کی تہذیب کی جانب سے تنازعے میں اس کی حمایت کی ہنگامی ضرورت ہوتی ہے۔ مقامی جنگ کی نئی تعریف کی جاتی ہے کہ یہ مذاہب کی جنگ اور تہذیبوں کا تصادم ہے جو نوع انسانی کی بڑی آبادیوں کے لیے نتائج رکھتا ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں جب آرتھوڈوکس مذہب اور آرتھوڈوکس کلیسا پھر روسی قومی تشخص کے مرکزی عناصر بن گئے، جنہوں نے ''دوسری شناختوں سے تعلق کے روسی اعترافات کو خارج کر دیا، جن میں اہم ترین اسلام ہے''[۱۱] تو روسیوں نے یہ بات اپنے مفاد میں خیال کی کہ تاجکستان میں ہونے والی جنگ کو قبائل اور علاقوں کی جنگ اور چیچنیا سے جنگ کو آرتھوڈوکسی اور اسلام کے درمیان صدیوں سے جاری وسیع تر تصادم کا حصہ قرار دیا جائے کیونکہ روس کے مقامی حریف اب اسلامی بنیاد پرستی اور جہاد اور اسلام آباد، تہران، ریاض اور انقرہ کی غائبانہ حمایت سے وابستہ تھے۔

سابق یوگوسلاویہ میں کروٹس نے خود کو جری سرحدی محافظوں کے روپ میں دیکھا جو آرتھوڈوکسی اور اسلام سے حملے سے مغرب کا دفاع کر رہے تھے۔ سربوں نے اپنے دشمنوں کو اب صرف بوسنیائی کروٹس اور مسلمان نہیں بلکہ ''وٹیکن'' اور ''اسلامی بنیاد پرست'' اور ''بدنام ترک'' ٹھہرایا جو صدیوں سے عیسائیت کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ ایک مغربی سفارتکار نے بوسنیائی سربوں کے رہنما کے بارے میں کہا کہ ''کاراجک اسے یورپ میں سامراجیت کے خلاف جنگ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ یورپ میں عثمانی ترکوں کی سلطنت کے آخری نشانات مٹا دینے کے مشن کی بات کرتے ہیں''۔[۱۲] جواباً بوسنیائی مسلمانوں نے خود کو نسل کشی کے متاثرین کے طور پر شناخت کیا، جنہیں مغرب نے ان کے مذہب کی وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا لہٰذا وہ مسلم دنیا سے مدد کے مستحق تھے۔ اس طرح یوگوسلاویہ کی جنگوں کے تمام فریقوں اور بیشتر بیرونی مبصرین نے انہیں مذہبی یا نسلی مذہبی جنگوں کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا۔ مشا گلینی نے اس نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس تنازعے میں ''مذہبی جدوجہد کی خصوصیات پیدا ہوتی گئیں جس میں تین عظیم یورپی ادیان، رومن کیتھولک مسلک، مشرقی آرتھوڈوکسی اور اسلام شامل تھے، ان سلطنتوں کی باقیات جن کی سرحدیں بوسنیا میں باہم متصادم ہوئیں''۔[۱۳]

رخنہ جنگوں کو تہذیبی تصادموں کے طور پر دیکھنے کے عمل نے ڈومنو کے نظریے☆ کو نئی زندگی دی جو سرد جنگ کے دوران رائج تھا۔ تاہم اب تہذیبوں کی بڑی ریاستوں نے ایک مقامی تنازعے

☆ نوٹ از مترجم: وہ نظریہ جس کے تحت کوئی واقعہ لگاتار ملتے جلتے واقعات کا سبب بنتا ہے۔

میں شکست سے بچنے کی ضرورت محسوس کی جس کے نتیجے میں یکے بعد دیگرے بڑھتے ہوئے نقصانات پیش آسکتے تھے جو تباہی پر منتج ہوتے۔ کشمیر پر بھارتی حکومت کے سخت موقف کا محرک بڑی حد تک یہ خدشہ تھا کہ یہ علاقہ ہاتھ سے نکل گیا تو دوسری نسلی و مذہبی اقلیتیں بھی آزادی کے لیے سرگرم ہوجائیں گی اور اس طرح بھارت ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ وزیر خارجہ کوزیریف نے انتباہ کیا کہ اگر روس نے تاجکستان میں سیاسی تشدد ختم نہ کیا تو وہ کرغزستان اور ازبکستان تک پھیل جائے گا۔ یہ کہا گیا کہ اس سے روسی فیڈریشن کی مسلم جمہوریاؤں میں علیحدگی پسندی کی تحریکوں کو ہوا مل سکتی ہے جس کا نتیجہ بالآخر بعض لوگوں کے خیال میں ریڈ اسکوائر میں اسلامی بنیاد پرستی کی شکل میں نکلے گا۔ پس یلسن نے کہا کہ افغان تاجک سرحد ''عملاً روس کی'' سرحد ہے۔ اسی طرح اہلِ یورپ نے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ سابق یوگوسلاویہ میں مسلمان ریاست قائم ہونے سے مسلمان تارکین اور اسلامی بنیاد پرستی کو ایک ٹھکانہ میسر آجائے گا جس سے اس چیز کو تقویت ملے گی جسے ژاق شیراک نے یورپ میں ''اسلام کی بو'' قرار دیا۔[۱۴] کروشیا کی سرحد عملاً یورپ کی سرحد ہے۔

جب رخنہ جنگ میں شدت آتی ہے تو ہر فریق اپنے مخالفین کو عفریت اور اکثر انسانیت سے گرا ہوا بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس طرح انہیں ہلاک کرنے کا جواز فراہم پیدا ہوجاتا ہے۔ یلسن نے چچنیائی چھاپہ ماروں کے بارے میں کہا کہ ''پاگل کتوں کو گولی ماردینی چاہیے۔'' ۱۹۹۱ء میں مشرقی تیموریوں کے قتل عام کے حوالے سے انڈونیشیائی جنرل ٹرائی سترسنو نے کہا کہ ''ان بدمعاش لوگوں کو گولیاں مارنا ضروری ہے... اور ہم انہیں گولیاں ماریں گے۔'' ماضی کے شیطان حال میں پھر زندہ ہوکر آجاتے ہیں: کروٹس ''استاشے''، مسلمان ''ترک'' اور سرب ''چیٹنکس'' بن جاتے ہیں۔ گروہی نفرت مزید گروہی نفرت پیدا کرتی چلی جاتی ہے اور قتل عام، اذیت رسانی، عصمت دری اور شہریوں کا سفاکانہ انخلا سب جائز ہوجاتا ہے۔ مخالف ثقافت کی مرکزی علامتیں اور فن پارے ہدف بن جاتے ہیں۔ سربوں نے منظم طور پر مساجد اور فرانسسکن رہبہ خانوں کو تباہ کیا جبکہ کروٹس نے آرتھوڈوکس رہبہ خانے دھماکے سے اڑائے۔ ثقافت کے خزانے عجائب گھر اور کتب خانے نشانہ بننے لگتے ہیں۔ سنہالی افواج جافنا کی پبلک لائبریری کو آگ لگا کر تامل ثقافت کی ''بے مثل ادبی و تاریخی دستاویزات'' کو برباد کردیتی ہیں اور سربیائی توپچی سرائیوو میں قومی عجائب گھر پر گولہ باری کرکے اسے تباہ کردیتے ہیں۔ سرب، بوسنیائی شہر زوورنک سے ۴۰ ہزار مسلمانوں کی نسلی تطہیر کردیتے ہیں اور عثمانی دور کے منار کو منہدم کرکے، جو ۱۴۶۳ء میں ترکوں نے آرتھوڈوکس گرجا گھر ڈھا کر تعمیر کیا تھا، ایک صلیب نصب کردیتے ہیں۔[۱۵] ثقافتوں کی جنگ میں ثقافت نقصان اٹھاتی ہے۔

تہذیبی گروہ بندی: قرابت دار ممالک اور منتشر آبادیاں☆

سرد جنگ کے چالیس برسوں کے دوران دونوں سپر طاقتیں اتحادیوں اور حلیفوں میں اضافہ کرنے ایک دوسرے کے اتحادیوں اور حلیفوں کو نقصان پہنچانے، اپنے ساتھ ملانے اور غیر جانبدار بنانے کے لیے کوشاں رہیں اور تنازع نیچے کی جانب نفوذ کرتا رہا۔ بلاشبہ سب سے شدید مقابلہ تیسری دنیا میں تھا جہاں نئی اور کمزور ریاستوں پر سپر طاقتوں کا دباؤ تھا کہ عالمی مقابلے میں شریک ہوں۔ مابعد سرد جنگ کی دنیا میں متعدد گروہی تنازعات کو واحد سپر طاقت کے تنازعے پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔ جب ان گروہی تنازعات میں مختلف تہذیبوں کے گروپ شامل ہوں تو لڑائی پھیلتی ہے اور شدت اختیار کرتی ہے۔ جب تنازع زیادہ شدید ہو جاتا ہے تو ہر فریق اپنی تہذیب کے ممالک اور گروہوں سے حمایت کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ ایک یا زیادہ قرابت دار ملکوں اور گروہوں کی طرف سے کسی نہ کسی شکل میں، سرکاری یا غیر سرکاری، چھپی یا کھلی، مادی، انسانی، سفارتی، مالی، علامتی یا فوجی امداد ہمیشہ آتی ہے۔ رخنہ تنازع جتنا طول کھینچتا ہے قرابت دار ملکوں کے حمایت، روک تھام اور ثالثی کے لیے سامنے آنے کا امکان اتنا ہی بڑھ جاتا ہے۔ اس ''قرابت دار ملک کے قارورے'' کے نتیجے میں رخنہ تنازعات کے بڑھنے کا امکان دروں تہذیبی تنازعات سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اور ان کو روکنے اور ختم کرنے کے لیے عموماً بین التہذیبی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرد جنگ کے برخلاف، تنازع اوپر سے نیچے نہیں آتا بلکہ نیچے سے ابلتا ہے۔

رخنہ جنگوں میں ریاستوں اور گروہوں کی شرکت کی مختلف سطحیں ہیں۔ پہلی سطح پر وہ فریق ہوتے ہیں جو اصل میں لڑ رہے ہوں اور ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے ہوں۔ یہ ریاستیں ہو سکتی ہیں جیسے بھارت اور پاکستان یا اسرائیل اور اس کے ہمسایہ ملکوں کی جنگیں، تاہم یہ مقامی گروہ بھی ہو سکتے ہیں جو ریاست نہ ہوں یا زیادہ سے زیادہ ریاست کی خام صورتیں ہوں جیسے بوسنیا اور نگورنو کاراباخ کے آرمینیائیوں کا معاملہ تھا۔ ان تنازعات میں دوسری سطح کے شرکا بھی شامل ہو سکتے ہیں یعنی عموماً وہ ریاستیں جو بنیادی فریقوں سے براہِ راست وابستہ ہوں جیسے سابق یوگوسلاویہ میں سربیا اور کروشیا اور قفقاز میں آرمینیا اور آذربائیجان کی حکومتیں۔ پھر تیسری سطح پر جو ریاستیں ہوتی ہیں ان کا تنازعے سے مزید دور کا تعلق ہوتا ہے، جو اصل لڑائی سے اور فاصلے پر ہوتی ہیں لیکن ان کے شرکا کے ساتھ تہذیبی رشتے ناتے ہوتے ہیں جیسے سابق یوگوسلاویہ کے حوالے سے جرمنی، روس اور اسلامی ریاستیں؛ اور

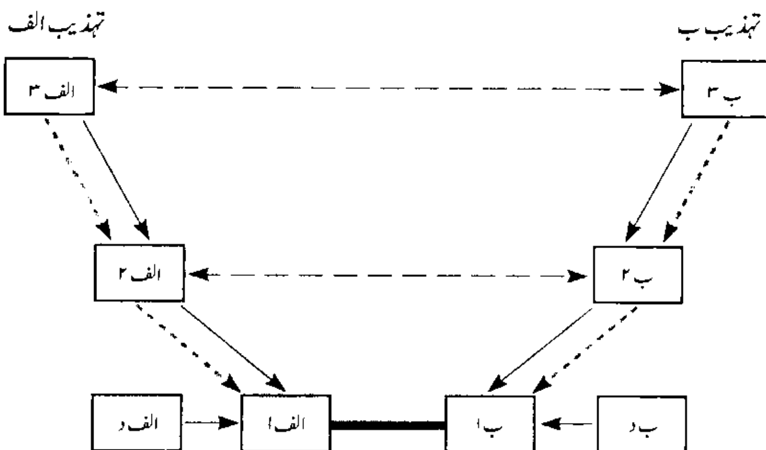
☆ نوٹ از مترجم: منتشر آبادی (diaspora)، کسی قوم کا وہ گروہ جو دوسری اقوام کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہو۔

آرمینیائی آذری نزاع میں روس، ترکی اور ایران۔ تیسری سطح کے یہ شرکا اکثر اپنی تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں ہوتی ہیں۔ جب ان ریاستوں کا وجود ہو تو پہلی سطح کے شرکا کے منتشر یا مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے افراد بھی رخنہ جنگوں میں کردار ادا کرتے ہیں۔ چونکہ پہلی سطح پر بالعموم افراد اور اسلحے کی کم تعداد شامل ہوتی ہے اس لیے رقم، ہتھیاروں یا رضا کاروں کی صورت میں نسبتاً معمولی امداد بھی جنگ کے نتیجے پر اکثر اہم اثر ڈال سکتی ہے۔

تنازعے کے دوسرے شرکا کے مفادات بعینہٖ پہلی سطح کے شرکا جیسے نہیں ہوتے۔ پہلی سطح کے فریقوں کی سب سے زیادہ جوش وخروش سے اور دل کھول کر مدد کرنے والے عام طور پر منتشر برادریوں کے افراد ہوتے ہیں جو اپنے قرابت داروں کے نصب العین کے ساتھ شدت سے وابستہ ہوجاتے ہیں اور ''پوپ سے زیادہ کیتھولک'' بن جاتے ہیں۔ دوسری اور تیسری سطح کی حکومتوں کے مفادات زیادہ پیچیدگی کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ بھی عموماً پہلی سطح کے شرکا کو مدد فراہم کرتے ہیں اور اگر نہ بھی کر رہے ہوں تو مخالف گروہ شبہ کرتے ہیں کہ کر رہے ہیں جس سے مؤخرالذکر کو اپنے قرابت دار کی مدد کرنے کا جواز مل جاتا ہے۔ تاہم دوسری اور تیسری سطح کی حکومتوں کا مفاد لڑائی کو محدود رکھنے اور براہِ راست خود ملوث ہونے سے باز رہنے میں بھی ہوتا ہے۔ پس پہلی سطح کے شرکا کی مدد کے باوجود وہ ان کی تحدید اور مقاصد میں اعتدال لانے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ وہ عموماً رخنے کے دوسری جانب کے دوسری اور تیسری سطح کے شرکا سے گفت وشنید کی کوشش بھی کرتے ہیں اور اس طرح مقامی جنگ کو بڑھ کر مرکزی ریاستوں کے مابین جنگ میں بدلنے سے روکتے ہیں۔ شکل ۱۱۔۱ میں رخنہ جنگوں کے ان ممکنہ شرکا کے تعلقات کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ ہر جنگ میں سارے کے سارے کرداروں کا ہونا ضروری نہیں لیکن کئی جنگوں میں تمام کردار رہے بھی ہیں جن میں سابق یوگوسلاویہ اور ماورائے قفقاز کی جنگیں شامل ہیں اور تقریباً ہر رخنہ جنگ میں یہ امکانات ہوتے ہیں کہ وہ پھیل جائے اور ہر سطح کے شرکا اس میں شامل ہو جائیں۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں منتشر آبادیاں اور قرابت دار ممالک ہر رخنہ جنگ میں کسی نہ کسی طرح شریک رہے ہیں۔ ان جنگوں میں وسیع پیمانے پر مسلمانوں کے پہلی سطح کے شرکا کے کردار کے باعث دوسری اور تیسری سطح کے شرکا میں مسلمان حکومتیں اور تنظیمیں سب سے زیادہ ہیں۔ سب سے فعال سعودی عرب، پاکستان، ایران، ترکی اور لیبیا کی حکومتیں رہی ہیں جنھوں نے، بعض اوقات دیگر مسلم ریاستوں کے ہمراہ فلسطین، لبنان، بوسنیا، چچنیا، ماورائے قفقاز، تاجکستان، کشمیر، سوڈان اور فلپائن میں غیر مسلموں سے برسرِپیکار مسلمانوں کو مختلف درجوں کی امداد پہنچائی ہے۔ سرکاری معاونت کے

شکل ۱۱۔۱
ایک پیچیدہ رخنہ جنگ کا ڈھانچا



علاوہ بہت سے پہلی سطح کے مسلمان گروہوں کو افغانستان کی جنگ کے جنگجوؤں کی اسلامسٹ انٹرنیشنل سے بھی مدد ملتی رہی ہے جو الجزائر کی خانہ جنگی سے لے کر چیچنیا اور فلپائن تک لڑائیوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ اسلامسٹ انٹرنیشنل، ایک تجزیہ نگار کے مطابق، ''افغانستان، کشمیر اور بوسنیا میں اسلام پسند حکومت کے قیام کے لیے رضا کار بھیجنے، مختلف ملکوں میں اسلام پسندوں کی مخالف حکومتوں کے خلاف مشترکہ تشہیری جنگیں شروع کرنے اور منتشر آبادیوں میں اسلامی مراکز قائم کرنے میں، جو ان تمام فریقوں کے لیے سیاسی صدر دفتر کا کام دیں'' سرگرم رہی۔[16] عرب لیگ اور اسلامی کانفرنس تنظیم نے بھی بین التہذیبی تنازعات میں مسلمان گروہوں کو تقویت دینے میں اپنے ارکان کی جدوجہد کو ہم آہنگ کرنے اور مدد فراہم کے لیے اقدامات کیے ہیں۔

افغانستان کی جنگ میں سوویت یونین پہلی سطح کا شریک تھا اور مابعد سرد جنگ کے دور میں روس چیچنیا کی جنگ میں پہلی سطح کا، تاجکستان کی لڑائی میں دوسری سطح کا اور سابق یوگوسلاویہ کی جنگ میں تیسری سطح کا شریک رہا ہے۔ بھارت کشمیر میں پہلی اور سری لنکا میں دوسری سطح کا شریک رہا ہے۔

بڑی مغربی ریاستیں یوگوسلاویہ کے تنازعات میں تیسری سطح کی شریک رہی ہیں۔ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان طویل لڑائیوں میں نیز آرمینیائیوں، کروشیائیوں اور چچنیائیوں کے تنازعات میں دونوں جانب منتشر آبادیوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ٹیلی وژن، فیکس اور ای میل کے ذریعے ''سابق وطن سے مسلسل رابطے کے باعث منتشر آبادیوں کی وابستگی مزید گہری ہو جاتی ہے اور بعض اوقات شدید فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے؛ 'سابق' کے وہ معنی نہیں رہتے جو پہلے تھے''۔[۱۷]

کشمیر کی جنگ میں پاکستان نے شورش پسندوں کی کھلی سفارتی و سیاسی حمایت کی اور، پاکستانی فوجی ذرائع کے مطابق، پیسہ اور اسلحہ بھی خوب پہنچایا نیز تربیت، نقل وحمل کی سہولتیں اور پناہ گاہ فراہم کی۔☆ شورش پسندوں کے لیے پاکستان نے مسلمان حکومتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۱۹۹۵ء تک شورش پسندوں کو اطلاعات کے مطابق افغانستان، تاجکستان اور سوڈان کے کم از کم ۱۲۰۰ مجاہدین کی مدد حاصل ہو چکی تھی جو اسٹنگر میزائل اور دیگر ایسے ہتھیاروں سے لیس تھے جو امریکیوں نے سوویت یونین کے خلاف جنگ میں انہیں فراہم کیے تھے۔[۱۸] فلپائن میں مورو شورش کو کچھ عرصے ملائشیا سے رقوم اور ساز وسامان ملتا رہا؛ عرب حکومتوں نے اضافی مالی امداد فراہم کی؛ کئی ہزار شورش پسندوں کو لیبیا میں تربیت دی گئی؛ اور انتہا پسند تنظیم ابوسیاف کو پاکستانی اور افغان بنیاد پرستوں نے منظم کیا۔[۱۹] افریقہ میں سوڈان باقاعدگی سے ایتھوپیا سے خلاف لڑنے والے مسلمان اریٹریائی باغیوں کی مدد کرتا رہا۔ جواب میں ایتھوپیا نے سوڈان کے خلاف لڑنے والے ''باغی عیسائیوں'' کو ''نقل وحمل کی سہولتیں اور پناہ'' فراہم کی۔ ان عیسائیوں کو یوگنڈا سے بھی امداد حاصل ہوئی جس سے ''سوڈانی باغیوں سے اس کے مضبوط مذہبی اور نسلی رشتوں'' کی عکاسی ہوتی ہے۔ دوسری طرف سوڈانی حکومت کو ایران سے چینی ہتھیاروں کی شکل میں ۳۰ کروڑ ڈالر کی امداد اور ایرانی فوجی مشیروں سے تربیت ملی جس کے سہارے اس نے ۱۹۹۲ء میں باغیوں کے خلاف بڑی کارروائی شروع کی۔ مختلف مغربی مسیحی انجمنوں نے عیسائی باغیوں کو خوراک، ادویات، ضروری اشیا اور، سوڈانی حکومت کے مطابق، ہتھیار پہنچائے۔[۲۰]

سری لنکا میں ہندو تامل شورش پسندوں اور بدھ سنہالی حکومت کے درمیان جنگ میں بھارتی حکومت نے پہلے شورش پسندوں کو خاصی امداد بھیجی، جنوبی بھارت میں انہیں تربیت دی گئی اور اسلحہ

☆ نوٹ از مترجم: پاکستان کا سرکاری موقف یہ ہے کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی جو تحریک چل رہی ہے وہ مقامی ہے اور پاکستان کی طرف سے صرف سفارتی و اخلاقی حمایت کی جا رہی ہے۔

اور پیسہ دیا گیا۔ ۱۹۸۷ء میں جب سری لنکا کی سرکاری افواج کے ہاتھوں تامل ٹائیگروں کو شکست ہونے والی تھی تو اس ''نسل کشی'' کے خلاف بھارتی رائے عامہ ابھاری گئی اور بھارتی حکومت نے فضائی راستے سے تاملوں کو خوراک پہنچائی اور ''عملاً [صدر] جے وردھنے کو اشارہ دے دیا کہ بھارت انہیں ٹائیگروں کو بزورِ قوت کچلنے سے روکنے کا ارادہ رکھتا ہے''۔[۲۱] پھر بھارت اور سری لنکا کی حکومتوں میں یہ معاہدہ طے پایا کہ سری لنکا تامل علاقوں کو کچھ خود مختاری دے گا اور شورش پسند ہتھیار بھارتی فوج کے حوالے کردیں گے۔ بھارت نے معاہدے پر عمل درآمد کے لیے ۵۰ ہزار فوجی جزیرے میں تعینات کردیے لیکن تامل ٹائیگروں نے ہتھیار حوالے کرنے سے انکار کردیا اور بھارتی فوج نے خود کو ان چھاپہ ماروں سے برسرِ پیکار پایا جنھیں پہلے وہ مدد فراہم کرتی رہی تھی۔ ۱۹۸۸ء سے بھارتی فوج کی واپسی شروع ہوگئی۔ ۱۹۹۱ء میں بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کو قتل کردیا گیا جو بھارتیوں کے مطابق تامل شورش پسندوں کے حامیوں کی کارروائی تھی اور شورش کے بارے میں بھارتی حکومت کا رویہ مخالفانہ ہوتا گیا۔ اس کے باوجود حکومت جنوبی بھارت کے ۵ کروڑ تاملوں میں شورش پسندوں کے لیے ہمدردی اور حمایت کے جذبات کو ختم نہیں کرسکتی تھی۔ ان جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے تامل ناڈو حکومت کے عہدیداروں نے نئی دہلی کی مرضی کے خلاف تامل ٹائیگروں کو اپنی ریاست کے ۵۰۰ میل طویل ساحل پر ''تقریباً کھلی چھٹی'' دے دی اور انہیں تپلی سی آبنائے پلک کے پار سری لنکا میں شورش پسندوں کو سامان اور ہتھیار فراہم کرنے کی اجازت دی۔[۲۲]

۱۹۷۹ء اور اس کے بعد سوویت یونین اور پھر روس جنوب میں موجود مسلم ہمسایوں کے ساتھ تین بڑی رخنہ جنگوں میں شریک ہوئے: ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء کی افغان جنگ، اس سے منسلک ۱۹۹۲ء میں شروع ہونے والی تاجکستان کی جنگ اور چیچنیائی جنگ جو ۱۹۹۴ء میں چھڑی۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد تاجکستان میں ایک جانشین کمیونسٹ حکومت برسر اقتدار آئی۔ ۱۹۹۲ء کے موسم بہار میں اس حکومت کو للکارنے والی حزب اختلاف حریف علاقائی و نسلی گروہوں پر مشتمل تھی جس میں سیکولر اور اسلام پسند دونوں شامل تھے۔ اس حزب اختلاف نے جسے افغانستان سے آنے والے ہتھیاروں کی مدد حاصل تھی، روس نواز حکومت کو ستمبر ۱۹۹۲ء میں دارالحکومت دوشنبے سے نکال دیا۔ روسی اور ازبک حکومتوں نے سخت ردعمل ظاہر کیا اور انتباہ کیا کہ اسلامی بنیاد پرستی پھیل رہی ہے۔ روس کی ۲۰۱ ویں موٹرائزڈ رائفل ڈویژن، جو تاجکستان میں رہ گئی تھی، سرکاری افواج کو اسلحہ فراہم کرتی رہی اور افغانستان کے ساتھ سرحد کی حفاظت کے لیے روس نے اضافی فوجی بھیجے۔ نومبر ۱۹۹۲ء میں روس، ازبکستان، قازقستان اور کرغزستان کے درمیان روسی اور ازبک فوجی مداخلت پر

اتفاق ہوا، جو بظاہر قیام امن کے لیے لیکن اصل میں جنگ میں شرکت کے لیے تھا۔ اس حمایت سے نیز روسی اسلحے اور رقوم کی مدد سے سابق حکومت کی افواج دوشنبے پر دوبارہ قبضہ کرنے اور ملک کے بیشتر حصے پر دوبارہ اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اس کے بعد نسلی تطہیر کا عمل ہوا اور حزب اختلاف کے پناہ گزین اور فوجی افغانستان کی طرف پسپا ہوگئے۔

مشرق وسطیٰ کی مسلمان حکومتوں نے روسی فوجی مداخلت پر احتجاج کیا۔ ایران، پاکستان اور افغانستان نے رقوم، ہتھیاروں اور تربیت سے بڑھتی ہوئی اسلام پسندانہ حزب اختلاف کی امداد کی۔ بتایا گیا کہ ۱۹۹۳ء میں افغان مجاہدین ہزاروں جنگجوؤں کو تربیت دے رہے تھے اور ۱۹۹۳ء کے موسم بہار اور گرما میں تاجک شورش پسندوں نے افغانستان سے سرحد پار کئی حملے کیے اور متعدد روسی سرحدی محافظوں کو ہلاک کیا۔ روسیوں نے جواباً تاجکستان میں مزید فوجی تعینات کردیے اور افغانستان میں موجود اہداف ''توپخانے اور مورٹر کے بھاری'' حملے اور فضائی یورشیں کیں۔ ادھر عرب حکومتوں نے ان طیاروں کا مقابلہ کرنے کی خاطر اسٹنگر میزائل خریدنے کے لیے شورش پسندوں کو رقم فراہم کی۔ ۱۹۹۵ء تک روس کے لگ بھگ ۲۵ ہزار فوجی تاجکستان میں متعین ہوچکے تھے اور وہ اس کی حکومت کی حمایت کے لیے درکار رقم میں نصف سے زائد فراہم کررہا تھا۔ دوسری طرف افغان حکومت اور دوسری مسلمان ریاستیں شورش پسندوں کو بھرپور امداد دے رہی تھیں۔ جیسا کہ بارنیٹ روبن نے کہا، بین الاقوامی اداروں یا مغرب کی تاجکستان یا افغانستان کو امداد فراہم کرنے میں ناکامی نے اول الذکر کو روسیوں اور مؤخرالذکر کو اپنے مسلمان تہذیبی قرابت داروں پر مکمل انحصار کرنے پر مجبور کردیا۔ ''کوئی بھی افغان کمانڈر جو آج غیر ملکی امداد کی امید کرتا ہے اسے عرب اور پاکستانی فراہم کنندگان کی خواہشات کی پیروی کرنی ہوگی جو وسط ایشیا میں جہاد پھیلانا یا منشیات کی تجارت میں شامل ہونا چاہتے ہیں''۔[۲۳]

مسلمانوں کے خلاف روس کی تیسری جنگ جو شمالی قفقاز میں چیچنیائیوں سے ہوئی، اس کا ایک نمونہ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ہمسایہ آرتھوڈوکس اوسیٹشن اور مسلم انگش اقوام کے درمیان لڑائی میں سامنے آچکا تھا۔ مؤخرالذکر کو چیچنیائیوں اور دیگر مسلم اقوام کے ہمراہ دوسری جنگ عظیم کے دوران وسط ایشیا کی طرف بے دخل کردیا گیا تھا۔ اوسیٹشن وہیں رہ گئے اور انہوں نے انگش جائیدادوں پر قبضہ کرلیا۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں بے دخل کیے گئے لوگوں کو واپس آنے کی اجازت دی گئی اور جائیدادوں کی ملکیت اور علاقوں پر قبضے کے بارے میں تنازعات شروع ہوگئے۔ نومبر ۱۹۹۲ء میں انگش نے پریگورودنی علاقے پر جو سوویت حکومت نے اوسیٹینز کو دے دیا تھا، دوبارہ قبضے کے لیے

اپنی جمہوریہ سے حملہ کیا۔ روسیوں نے اس کا جواب یوں دیا کہ بھاری پیمانے پر مداخلت کی جس میں آرتھوڈوکس اوسیشینز کی مدد کے لیے کوسیک یونٹ استعمال کیے گئے۔ جیسا کہ ایک بیرونی مبصر نے بیان کیا: ''نومبر ۱۹۹۲ء میں روسی ٹینکوں نے اوسیشیا میں انگش دیہات کا گھیراؤ کر کے گولہ باری کی۔ جو بمباری سے بچ گئے وہ مار دیے گئے یا پکڑ لیے گئے۔ اوسیشین OMON [خصوصی پولیس] کے دستوں نے قتل عام کیا لیکن روسی فوجی، جو 'امن قائم رکھنے کے لیے' بھیجے گئے تھے، ان دستوں کے لیے ڈھال بنے رہے''۔[۲۴] دی اکنامسٹ نے بتایا کہ یہ ''سمجھ میں آنا مشکل تھا کہ ایک ہفتے سے بھی کم عرصے میں اتنی تباہی کیسے ہوسکتی ہے۔'' یہ ''روسی فیڈریشن میں نسلی تطہیر کی پہلی کارروائی تھی۔'' پھر روس نے اس تنازعے کو انگش قوم کے چچنیائی حلیفوں کو دھمکانے کے لیے استعمال کیا جس کے نتیجے میں ''چچنیا فوری طور پر متحرک ہوگیا اور [بھاری مسلمان اکثریت والی] کنفیڈریشن آف دی پیپلز آف کاکیکس (کے این کے) وجود میں آئی۔ کے این کے نے دھمکی دی کہ اگر روسی افواج چچنیائی علاقے سے نہیں ہٹیں تو ان کے خلاف ۵ لاکھ رضا کار بھیجے جائیں گے۔ سخت کشیدہ صورتحال پیدا ہوگئی اور اس کے بعد ماسکو پسپا ہوگیا تا کہ شمالی اوسیشین اور انگش تنازعے کی آگ پورے ملک میں نہ بھڑک اٹھے''۔[۲۵]

دسمبر ۱۹۹۴ء میں جب روس نے چچنیا پر بھرپور حملہ کیا تو اس سے بھی زیادہ شدت سے اور وسیع پیمانے پر آگ بھڑک اٹھی۔ دو آرتھوڈوکس جمہوریاؤں جارجیا اور آرمینیا کے رہنماؤں نے روسی کارروائی کی حمایت کی جبکہ یوکرینی صدر ''سفارتی طور پر بین بین رہے اور محض بحران کے پُرامن تصفیے کی بات کی۔'' روسی کارروائی کی حمایت آرتھوڈوکس شمالی اوسیشین حکومت اور ۵۵ سے ۶۰ فیصد اوسیشین عوام نے بھی کی۔[۲۶] اس کے برخلاف روسی فیڈریشن کے اندر اور باہر کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت چچنیائیوں کی حامی تھی۔ اسلامسٹ انٹرنیشنل نے فوراً آذربائیجان، افغانستان، پاکستان، سوڈان اور دیگر ممالک سے جنگجو فراہم کرنے شروع کردیے۔ مسلم ریاستوں نے چچنیائی نصب العین کی توثیق کی اور ترکی اور ایران نے اطلاعات کے مطابق مادی امداد دی جس سے روس کو مزید ترغیب ملی کہ وہ ایران کو رام کرنے کی کوشش کرے۔ آذربائیجان سے چچنیائیوں کے لیے اسلحے کی کمک مسلسل روسی فیڈریشن میں داخل ہونے لگی جس پر روس نے آذربائیجان کے ساتھ اپنی سرحد بند کردی اور نتیجتاً چچنیا کو پہنچنے والی طبی اور دیگر امداد بھی رک گئی۔[۲۷]

روسی فیڈریشن کے مسلمان چچنیائیوں کی حمایت میں اکٹھا ہوگئے۔ اگرچہ پورے قفقاز میں روس کے خلاف جہاد کی آواز بلند کرنے پر مطلوبہ کامیابی نہیں ملی تاہم چھ دولگا یورل جمہوریاؤں نے

مطالبہ کیا کہ روس اپنی فوجی کارروائی بند کرے اور قفقاز کی مسلمان جمہوریاؤں کے نمائندوں نے روسی حکمرانی کے خلاف شہری نافرمانی کی تحریک چلانے کا مطالبہ کیا۔ چوواش جمہوریہ نے چوواش سے بھرتی کیے جانے والوں کو اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف لڑنے سے مستثنیٰ کر دیا۔ ''جنگ کے خلاف شدید ترین احتجاج'' چچنیا کی دو پڑوسی جمہوریاؤں انگشیا اور داغستان میں ہوا۔ انگش نے چچنیا جانے والے روسی فوجیوں پر راستے میں حملہ کر دیا جس پر روسی وزیر دفاع نے بیان دیا کہ انگش حکومت نے ''روس کے خلاف تقریباً اعلان جنگ کر دیا ہے'' اور داغستان میں بھی روسی افواج پر حملے ہوئے۔ روسیوں نے جواباً انگش اور داغستانی دیہات پر گولہ باری کی۔[۴۸] جنوری ۱۹۹۶ء میں کزلیار شہر پر چچنیائی حملے کے بعد پروومیسکوئے گاؤں کو نیست و نابود کر دینے کے روسی اقدام سے داغستانی مخالفت میں مزید اضافہ ہوا۔

چچنیائی نصب العین کو چچنیائی منتشر آبادیوں سے بھی مدد ملی جو بڑی حد تک انیسویں صدی میں چچنیائی پہاڑی اقوام کے خلاف روسی جارحیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھیں۔ منتشر آبادی نے رقوم جمع کیں، ہتھیار حاصل کیے اور چچنیائی افواج کے لیے رضا کار فراہم کیے۔ خاص طور پر اردن اور ترکی میں یہ آبادی زیادہ تعداد میں تھی جس کے باعث اردن کو روسیوں کے خلاف سخت موقف اختیار کرنا پڑا اور ترکی کی چچنیائیوں کی مدد کرنے پر آمادگی بڑھ گئی۔ جنوری ۱۹۹۶ء میں جب جنگ ترکی تک پھیل گئی تو منتشر آبادی کے ارکان کے روسی بحری جہاز پکڑنے اور روسیوں کو یرغمال بنانے سے ترکی میں عوام کی ہمدردیاں روسیوں کے ساتھ ہوگئیں۔ چچنیائی رہنماؤں کی مدد سے ترک حکومت نے بحران ختم کرنے کے لیے اس انداز میں تصفیہ کرایا جس سے ترکی اور روس کے پہلے سے کشیدہ تعلقات اور خراب ہو گئے۔

داغستان میں چچنیائی یورش، روسی جوابی کارروائی اور ۱۹۹۶ء کے آغاز میں جہاز کے پکڑے جانے سے واضح ہوگیا کہ یہ تنازع روسیوں اور پہاڑی اقوام کے درمیان انہی خطوط پر عمومی لڑائی میں بدل سکتا ہے جو انیسویں صدی میں عشروں تک چلتی رہی تھی۔ فیونا ہل نے ۱۹۹۵ء میں انتباہ کیا تھا کہ ''شمالی قفقاز ایک بھڑوں کا چھتہ ہے جہاں ایک جمہوریہ میں تنازع سے پورے علاقے میں آگ بھڑک سکتی ہے جو خطے کی سرحدوں سے نکل کر بقیہ روسی فیڈریشن میں پھیل جائے گی اور اس میں جارجیا، آذربائیجان، ترکی، ایران اور شمالی قفقاز میں ان کی منتشر آبادیوں کو شامل ہونے کی ترغیب ملے گی۔ جیسا کہ چچنیا کی جنگ سے ثابت ہوتا ہے اس خطے میں تنازعے کو آسانی سے محدود نہیں کیا جاسکتا... اور لڑائی چچنیا سے ملحق جمہوریاؤں اور علاقوں تک پھیل چکی ہے۔'' اس بات سے

ایک روسی تجزیہ نگار نے یہ کہتے ہوئے اتفاق کیا کہ ''غیر رسمی اتحاد'' تہذیبی خطوط پر استوار ہو رہے ہیں۔ ''عیسائی جارجیا، آرمینیا، نگورنو کاراباخ اور شمالی اوسیشیا، مسلمان آذربائیجان، اباکازیا، چچنیا اور انگشیا کے خلاف صف آرا ہو رہے ہیں۔'' روس جو پہلے ہی تاجکستان میں لڑ رہا تھا ''مسلم دنیا سے طویل محاذ آرائی میں پڑ جانے کے خطرے سے دوچار تھا''۔[۲۹]

ایک اور آرتھوڈوکس مسلم رخنہ جنگ میں پہلی سطح کے شرکا نگورنو کاراباخ کے محصور علاقے آرمینیائی اور آذربائیجان کی حکومت اور عوام تھے، جس میں اول الذکر، مؤخرالذکر سے آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ آرمینیا کی حکومت دوسری سطح کی شریک تھی اور روس، ترکی اور ایران کی شمولیت تیسری سطح کی تھی۔ علاوہ ازیں، مغربی یورپ اور شمالی امریکا میں خاصی تعداد میں آرمینیائی منتشر آبادی نے اہم کردار ادا کیا۔ لڑائی ۱۹۸۸ء میں سوویت یونین کے خاتمے سے پہلے شروع ہوئی، ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء میں اس میں شدت آئی اور ۱۹۹۴ء میں جنگ بندی کے معاہدے کے بعد کم ہوگئی۔ ترک اور دوسری مسلم اقوام آذربائیجان کی طرف تھیں۔ روسیوں نے آرمینیائیوں کی حمایت کی لیکن پھر ان میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے آذربائیجان میں ترک اثرات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ جنگ صدیوں پہلے روسی اور عثمانی سلطنتوں کے درمیان بحیرۂ اسود اور قفقاز کے علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے جاری کشمکش اور آرمینیائیوں اور ترکوں کے مابین شدید عناد کا تازہ ترین مرحلہ تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں آرمینیائیوں اور ترکوں کی اس لڑائی میں ترکوں کے ہاتھوں آرمینیائیوں کا قتل عام ہوا تھا۔

اس جنگ میں ترکی آذربائیجان کا مستقل حامی اور آرمینیائیوں کا مخالف تھا۔ جب ترکی نے آذربائیجان کو تسلیم کیا تو کسی غیر بالٹک سوویت جمہوریہ کی آزادی کو پہلی بار کسی ملک نے تسلیم کیا تھا۔ تنازعے میں شروع سے آخر تک ترکی آذربائیجان کو مالی اور مادی امداد بہم پہنچاتا رہا اور آذربائیجانی سپاہیوں کو تربیت دیتا رہا۔ ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء میں جب تشدد کے واقعات میں تیزی آئی اور آرمینیائی آذربائیجان کے علاقے میں پیشقدمی کرنے لگے تو ترک رائے عامہ متحرک ہوگئی اور ترک حکومت پر دباؤ بڑھ گیا کہ وہ اپنے نسلی مذہبی قرابت داروں کی مدد کرے۔ ترک حکومت کو یہ بھی خوف تھا کہ اس سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تقسیم نمایاں ہو جائے گی، آرمینیا کے لیے مغربی امداد آنا شروع ہو جائے گی اور اس کے نیٹو کے اتحادی مخالف ہو جائیں گے۔ اس طرح ترکی کو اسی طرح کے مختلف سمتوں کے دباؤ کا سامنا تھا جو کسی رخنہ جنگ کے دوسری سطح کے شریک کو ہوتا ہے۔ تاہم ترک حکومت نے آذربائیجان کی حمایت کرنا اور آرمینیا سے ٹکر لینا اپنے مفاد میں جانا۔ ایک ترک عہدیدار

نے کہا کہ ''جب اپنے سگے مارے جا رہے ہوں تو متاثر نہ ہونا ناممکن ہے۔'' ایک اور عہدیدار نے اس میں اضافہ کیا کہ ''ہم پر دباؤ ہے۔ ہمارے اخبارات ظلم و ستم کی تصاویر سے بھرے ہوتے ہیں... ہوسکتا ہے ہمیں آرمینیا کو احساس دلانا پڑے کہ اس خطے میں بڑا ترکی موجود ہے۔'' صدر ترگت اوزال نے بھی اس بات سے اتفاق کیا اور یہ کہا کہ ترکی کو'' آرمینیائیوں کو تھوڑا ڈرانا چاہیے۔'' ترکی نے ایران کے ساتھ آرمینیائیوں کو خبردار کیا کہ وہ سرحدوں میں کوئی تبدیلی برداشت نہیں کرے گا۔ اوزال نے ترکی کے راستے آرمینیا جانے والی خوراک اور دیگر ساز و سامان کو روک لیا جس کے نتیجے میں آرمینیا کی آبادی ۹۳-۱۹۹۲ء کے موسم سرما میں قحط کا شکار ہونے والی تھی۔ اسی کے نتیجے میں روسی مارشل یوگینی شپوشنیکوف نے متنبہ کیا کہ ''اگر کوئی اور فریق'' [یعنی ترکی] جنگ میں شامل ہوا تو ''ہم تیسری جنگ عظیم کے قریب پہنچ جائیں گے۔'' ایک سال بعد بھی اوزال جنگ پر تلے ہوئے تھے۔ انہوں نے طنزاً کہا کہ ''آرمیینیائی کیا کر سکتے ہیں، اگر گولیاں چلائی گئیں تو... ترکی میں مارچ کرتے ہوئے پہنچ جائیں گے؟'' ترکی ''سبق سکھا دے گا''۔[۳۰]

۱۹۹۳ء کے موسم گرما اور خزاں میں آرمینیائی یورش نے جو ایرانی سرحد تک پہنچ رہی تھی، ترکی اور ایران دونوں کی طرف سے مزید ردعمل پیدا کیے جو آذربائیجان اور وسط ایشیائی مسلم ریاستوں میں اپنا اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ترکی نے اعلان کیا کہ اس یورش سے ترکی کی سلامتی کو خطرہ ہے۔ اس نے آرمینیائی افواج کے آذربائیجان کے علاقے سے ''فوراً اور غیر مشروط طور پر'' نکل جانے کا مطالبہ کیا اور آرمینیا کے ساتھ اپنی سرحد پر فوج میں اضافہ کر دیا۔ اس سرحد پر روسی اور ترک افواج کے درمیان فائرنگ کے تبادلے کی اطلاعات بھی ملیں۔ وزیراعظم تانسو چلر نے کہا کہ اگر آرمینیائی افواج ترکی کے قریب آذربائیجانی محصور علاقے ناخی چیون میں گئیں تو وہ اعلان جنگ کے لیے کہیں گی۔ ایران نے بھی اپنی فوجیں آگے بڑھائیں اور آذربائیجان میں داخل کر دیں جس کا مبینہ مقصد آرمینیائی یورش سے متاثر ہونے والے مہاجرین کے لیے کیمپ قائم کرنا تھا۔ ایرانی اقدام سے ترک یہ سمجھنے لگے کہ وہ روس کے جوابی اقدامات کے خدشے کے بغیر اضافی کارروائیاں کر سکتے ہیں اور اس سے انہیں آذربائیجان کو تحفظ فراہم کرنے کے سلسلے میں ایران کا مقابلہ کرنے کی مزید ترغیب بھی ملی۔ آخر کار ماسکو میں ترکی، آرمیدیا اور آذربائیجان کے رہنماؤں کے مذاکرات، آرمیدیائی حکومت پر امریکی دباؤ اور نگورنو کاراباخ کے آرمیدیائیوں پر آرمیدیائی حکومت کے دباؤ کے باعث بحران میں کمی آئی۔[۳۱]

چھوٹے سے، بندرگاہ سے محروم، معمولی وسائل والے اور ترک نسل کی اقوام سے گھرے

ہوئے ملک کے باشندے آرمینیائی تاریخ میں تحفظ کے لیے ہمیشہ اپنے آرتھوڈوکس قرابت داروں، جارجیا اور روس کی طرف دیکھتے رہے ہیں۔ خاص طور پر روس کو بڑا بھائی سمجھا جاتا رہا ہے۔ تاہم جب سوویت یونین ٹوٹ رہا تھا اور نگورنو کاراباخ کے آرمینیائیوں نے آزادی کی تحریک شروع کی تو گورباچیف کی حکومت نے ان کے مطالبات مسترد کر دیے اور باکو کی مدد کے لیے، جسے وفادار کمیونسٹ حکومت سمجھا جاتا تھا، فوج بھیجی۔ تاہم سوویت یونین کے خاتمے کے بعد ان پہلوؤں کی جگہ پرانے تاریخی اور ثقافتی معاملات نے لے لی اور آذربائیجان نے الزام لگایا کہ ''روسی حکومت ۱۸۰ درجے کے زاویے پر مڑ گئی ہے'' اور کھل کر عیسائی آرمینیا کی حمایت کر رہی ہے۔ آرمینیائیوں کے لیے روسی فوجی امداد اصل میں پہلے سوویت فوج کے اندر شروع ہوگئی تھی جس میں آرمینیائیوں کو مسلمانوں سے زیادہ بلند عہدے دیے گئے اور لڑاکا یونٹوں میں تعینات کیا گیا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو نگورنو کاراباخ میں متعین روسی فوج کی ۳۶۶ ویں موٹرائزڈ رائفل رجمنٹ نے خوجالی شہر پر آرمینیائی حملے میں اہم کردار ادا کیا جس میں مبینہ طور پر ایک ہزار تک آذری قتل کر دیے گئے۔ بعد ازاں روسی اسپٹسناز فوجیوں نے بھی لڑائی میں حصہ لیا۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے موسم سرما میں جب آرمینیا پر ترکی نے پابندیاں لگا رکھی تھیں، اسے ''روس سے اربوں روبل قرضے کی آمد نے مکمل اقتصادی انہدام سے بچایا۔'' اس موسم بہار میں روسی فوجیوں نے باقاعدہ آرمینیائی افواج سے مل کر آرمینیا کو نگورنو کاراباخ سے ملانے والی ایک راہداری کھول دی۔ پھر ۱۹۹۳ء کی گرمیوں میں اطلاعات کے مطابق چالیس ٹینکوں پر مشتمل روسی فورس نے کاراباخ پر یورش میں حصہ لیا۔[۳۲] جیسا کہ ہل اور جیوٹ نے بتایا، آرمینیا کے پاس جواب میں ''روس کے ساتھ قریبی اتحاد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ خام مال، توانائی و خوراک کی فراہمی اور اپنی سرحدوں پر آذربائیجان اور ترکی جیسے تاریخی دشمنوں کے خلاف دفاع کے لیے روس کا محتاج ہے۔ آرمینیا نے سی آئی ایس کے تمام اقتصادی و فوجی معاہدوں پر دستخط کیے ہیں، روسی افواج کو اپنی سرزمین پر تعیناتی کی اجازت دی ہے اور سابق روسی اثاثوں پر اپنے تمام دعووں سے روس کے حق میں دستبردار ہوگیا ہے۔''[۳۳]

آرمینیائیوں کے لیے روسی حمایت نے آذربائیجان میں روسی اثر و رسوخ میں اضافہ کر دیا۔ جون ۱۹۹۳ء میں آذربائیجان کے قوم پرست رہنما ابوالفیض ایلچی بے انقلابی کارروائی میں برطرف کر دیے گئے اور ان کی جگہ سابق کمیونسٹ اور مفروضہ طور پر روس نواز گیدر علیف برسر اقتدار آ گئے۔ علیف نے آرمینیا کو روکنے کے لیے روس سے مفاہمت کی ضرورت تسلیم کی۔ اس نے آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ میں شمولیت سے آذربائیجان کے انکار کے برعکس موقف اپنایا اور روسی فوج کو ملک

میں تعیناتی کی اجازت دی۔ اس نے آذربائیجان کا تیل صاف کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی کنسورشیم میں روسی شرکت کی راہ بھی ہموار کی۔ جواب میں روس نے آذربائیجان کی افواج کو تربیت دینا شروع کردی اور آرمینیا پر دباؤ ڈالا کہ وہ کاراباخ کی افواج کی حمایت ختم کرے اور انہیں آذربائیجانی علاقے سے پسپائی پر آمادہ کرے۔ اپنا وزن ایک پلڑے سے نکال کر دوسرے میں ڈال کر روس آذربائیجان سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے اور وہاں ایرانی اور ترک اثرات کا مقابلہ کرنے میں بھی کامیاب ہوا۔ اس طرح آرمینیا کے لیے روسی حمایت سے نا صرف قفقاز میں اس کا قریب ترین حلیف مضبوط ہوا بلکہ خطے میں سب سے بڑے مسلمان حریف بھی کمزور ہوئے۔

روس کے علاوہ آرمینیا کی حمایت کا بڑا منبع مغربی یورپ اور شمالی امریکا میں اس کی وسیع، متمول اور بااثر منتشر آبادی تھی جس میں امریکا میں لگ بھگ دس لاکھ اور فرانس میں ساڑھے چار لاکھ آرمینیائی شامل تھے۔ ان لوگوں نے آرمینیا کو ترکی کی پابندیوں کے زمانے میں اپنی بقا کے لیے رقوم اور ساز وسامان، آرمینیائی حکومت کے لیے عہدیدار اور آرمینیائی مسلح افواج کے لیے رضا کار فراہم کیے۔ امریکا میں مقیم برادری سے ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں پانچ کروڑ سے ساڑھے سات کروڑ ڈالر سالانہ امداد موصول ہوئی۔ منتشر آبادیوں کے ارکان نے، ان ملکوں کی حکومتوں پر بھی جہاں وہ مقیم تھے، خاصا سیاسی اثر ورسوخ استعمال کیا۔ امریکا میں سب سے بڑی آرمینیائی برادریاں کیلیفورنیا، میساچوسیٹس اور نیوجرسی جیسی ریاستوں میں ہیں۔ نتیجتاً کانگریس نے آذربائیجان کے لیے غیر ملکی امداد پر پابندی لگائی اور آرمینیا کو اتنی مدد پہنچائی کہ وہ فی کس آبادی کے لحاظ سے امریکی امداد کا تیسرا بڑا وصول کنندہ بن گیا۔ آرمینیا کی بقا کے لیے یہ امداد لازمی تھی اور اسے ''قفقاز کے اسرائیل'' کا موزوں خطاب مل گیا۔[۳۴] جیسے انیسویں صدی میں شمالی قفقاز کے باشندوں پر روسی حملوں کی پیدا کردہ منتشر آبادیوں نے روس کی مزاحمت کرنے میں چیچنیائیوں کی مدد کی تھی بالکل اسی طرح بیسویں صدی کے اوائل میں ترکوں کے ہاتھوں آرمینیائیوں کے قتل عام سے پیدا کردہ منتشر آبادیوں کے طفیل آرمینیا ترکی کی مزاحمت کرنے اور آذربائیجان کو شکست دینے میں کامیاب ہوا۔

سابق یوگوسلاویہ ۱۹۹۰ء کے عشرے کی ابتدا میں ہونے والی پیچیدہ ترین، الجھی ہوئی اور مکمل رخنہ جنگوں کا میدان تھا۔ پہلی سطح پر کروشیا میں کروشیائی حکومت اور کروٹس، کروشیائی سربوں سے لڑے اور بوسنیا ہرزیگووینا میں بوسنیائی حکومت بوسنیائی سربوں اور بوسنیائی کروٹس سے لڑی، جو آپس میں بھی لڑے۔ دوسری سطح پر سربیائی حکومت نے بوسنیائی اور کروشیائی سربوں کی مدد کرکے ''عظیم تر سربیا'' کے تصور کو فروغ دیا جبکہ کروشیائی حکومت نے ''عظیم تر کروشیا'' کے عزائم ظاہر کرتے ہوئے بوسنیائی

کروٹس کی حمایت کی۔ تیسری سطح پر بڑے پیمانے پر تہذیبی گروہ بندیاں ہوئیں جس میں جرمنی، آسٹریا، ویٹیکن، دوسرے یورپی کیتھولک ممالک اور گروہ اور بعد میں امریکا سربیا کی طرف ہوگئے؛ روس، یونان اور دیگر آرتھوڈوکس ممالک اور گروہ سربوں کی حمایت کرنے لگے؛ اور ایران، سعودی عرب، ترکی، لیبیا، اسلامسٹ انٹرنیشنل اور عمومی طور پر اسلامی ممالک نے بوسنیائی مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ بوسنیائی مسلمانوں کو امریکا سے بھی امداد ملی جو ایک غیر تہذیبی بے قاعدگی تھی ورنہ قرابت داروں کی جانب سے قرابت داروں کی مدد کا ہی سلسلہ چل رہا تھا۔ جرمنی میں کروشیائی منتشر آبادی اور ترکی میں بوسنیائی منتشر آبادی نے اپنے اپنے وطن کی حمایت کی۔ تینوں فریقوں میں کلیسا اور مذہبی گروہ فعال تھے۔ کم از کم جرمن، ترک، روسی اور آرمینیائی حکومتوں کے اقدامات پر ان کے معاشروں میں موجود پریشر گروپوں اور رائے عامہ کے خاصے اثرات پڑے۔

دوسری اور تیسری سطح کے شرکا کی مدد جنگ جاری رکھنے کے لیے اور ان کی پابندیاں اسے روکنے کے لیے ضروری تھیں۔ کروشیا اور سربیا کی حکومتوں نے دوسری جمہوریاؤں میں لڑنے والے افراد کے لیے ہتھیار، ساز وسامان، رقوم، پناہ اور بعض اوقات فوجی فراہم کیے۔ سربوں، کروٹس اور مسلمانوں سب کو سابق یوگوسلاویہ کے باہر تہذیبی قرابت داروں سے رقم، اسلحے، سامان، رضا کاروں، فوجی تربیت اور سیاسی وسفارتی حمایت کی شکل میں خاصی امداد موصول ہوئی۔ پہلی سطح کے غیر سرکاری شرکائے جنگ سرب اور کروٹس اپنی قوم پرستی میں بالعموم زیادہ انتہا پسند، مطالبات میں نرمی نہ کرنے والے اور اہداف کے حصول میں متشدد تھے۔ دوسری سطح کے شرکا کروشیائی اور سربیائی حکومتوں نے ابتدائی طور پر اپنے پہلی سطح کے قرابت داروں کی جوش وخروش سے حمایت کی لیکن پھر ان کے اپنے متنوع مفادات نے ان کو ثالثی اور تصفیے کے لیے کردار ادا کرنے کی جانب مائل کر دیا۔ اسی طرز پر تیسری سطح کے شرکا روسی، جرمن اور امریکی حکومتوں نے دوسری سطح کی حکومتوں پر تحمل اور مفاہمت کے لیے دباؤ ڈالا۔

یوگوسلاویہ کی ٹوٹ پھوٹ ۱۹۹۱ء میں شروع ہوئی جب سلووینیا اور کروشیا نے آزادی کی طرف بڑھنا شروع کیا اور مغربی یورپی طاقتوں سے مدد کی درخواست کی۔ مغرب کے ردعمل کا اظہار جرمنی کے موقف سے ہوا اور جرمنی کے ردعمل کا اظہار بڑی حد تک کیتھولک روابط سے متعین ہوا۔ بون حکومت پر جرمن کیتھولک حلقوں، بویریا میں اس کی سرکاری اتحادی کرسچین سوشل یونین پارٹی اور Frankfurter Allgemeine Zeitung اور دیگر ذرائع ابلاغ نے دباؤ ڈالا۔ علی الخصوص بویریائی ذرائع ابلاغ نے سلووینیا اور کروشیا کو تسلیم کرنے کے حق میں جرمن جذبات کو ابھارنے میں

اہم کردار ادا کیا۔ فلورا لوئیس نے بتایا کہ ''جب [سربوں سے] جنگ شروع ہوئی تو بہت قدامت پسند بویریائی حکومت اور مضبوط و محکم بویریائی کیتھولک کلیسا کا، جس کے کروشیا کے کلیسا سے قریبی روابط تھے، بویریائی ٹی وی پر دباؤ پورے جرمنی کے لیے ٹیلی وژن رپورٹوں کا باعث بنا۔ کوریج یکطرفہ تھی۔'' کروشیا کو تسلیم کیے جانے کے بارے میں جرمن حکومت متذبذب تھی لیکن جرمن معاشرے میں دباؤ کے پیش نظر اس کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ''جرمنی میں کروشیا کو تسلیم کیے جانے کی حمایت کا سبب رائے عامہ کا زور تھا سرکار کی مرضی نہیں۔'' جرمنی نے یورپی یونین پر دباؤ ڈالا کہ سلووینیا اور کروشیا کو آزاد ممالک تسلیم کرلے اور اس کے بعد خود یورپی یونین سے پہلے ہی انہیں تسلیم کرلیا۔ یورپی یونین نے دسمبر ۱۹۹۱ء میں تسلیم کیا۔ ایک جرمن دانشور نے ۱۹۹۵ء میں تبصرہ کیا کہ ''پورے تنازعے کے دوران بون نے اپنی خارجہ پالیسی میں کروشیا اور اس کے رہنما فرانجو ٹجمین کو لاڈلا بنائے رکھا جس کی غلط روی جھلا دینے والی تو تھی مگر وہ پھر بھی جرمنی کی بھرپور حمایت پر انحصار کرسکتا تھا۔''[۳۵]

آسٹریا اور اٹلی نے فوراً دونوں نئی ریاستوں کو تسلیم کرنے کے لیے اقدامات کیے اور بہت تیزی سے امریکا سمیت دوسرے مغربی ممالک نے بھی۔ ویٹیکن نے بھی مرکزی کردار ادا کیا۔ پوپ نے کروشیا کو [مغربی] ''مسیحیت کا قلعہ'' قرار دیا اور یورپی یونین سے پہلے دونوں ملکوں سے سفارتی تعلقات قائم کرلیے۔[۳۶] اس طرح ویٹیکن تنازعے میں فریق بن گیا جس کے نتائج ۱۹۹۴ء میں سامنے آئے جب پوپ نے تینوں جمہوریاؤں کے دورے کا ارادہ کیا۔ سربیائی آرتھوڈوکس کلیسا کی مخالفت کی وجہ سے وہ بلغراد نہ جاسکے اور ان کی سلامتی کی ضمانت دینے سے سربوں کے انکار کے باعث سرائیوو کا دورہ منسوخ ہوگیا۔ تاہم وہ زغرب گئے جہاں انہوں نے کارڈینل ایلوئی زیپے سپٹنیک کو اعزاز بخشا جو دوسری جنگ عظیم میں سربوں، جپسیز اور یہودیوں کو تنگ اور قتل کرنے والی فاشسٹ کروشیائی حکومت سے منسلک تھا۔

کروشیا نے خود کو مغرب سے تسلیم کرانے کے بعد اپنی فوجی قوت بڑھانی شروع کردی حالانکہ ستمبر ۱۹۹۱ء میں اقوام متحدہ نے یوگوسلاویہ کی تمام سابق جمہوریاؤں کے اسلحہ اکٹھا کرنے پر پابندی لگادی تھی۔ جرمنی، پولینڈ اور ہنگری جیسے یورپی کیتھولک ممالک نیز پناما، چلی اور بولیویا جیسے لاطینی امریکی ممالک سے ہتھیار کروشیا پہنچنے لگے۔ ۱۹۹۱ء میں جب جنگ میں تیزی آئی تو اسپین کی اسلحے کی برآمدات جن پر مبینہ طور پر ''زیادہ تر اوپس ڈی'' کا قبضہ تھا تھوڑے سے عرصے میں چھ گنا بڑھ گئیں جس میں سے زیادہ تر مفروضہ طور پر لیوبلیانا اور زغرب پہنچیں۔ ۱۹۹۳ء میں کروشیا نے

اطلاعات کے مطابق جرمنی اور پولینڈ سے کئی مگ ۲۱ طیارے حاصل کیے جس کا علم ان کی حکومتوں کو تھا۔ ''مغربی یورپ، کروشیائی منتشر آبادی اور مشرقی یورپ کے کیتھولک ملکوں کے'' سیکڑوں بلکہ شاید ہزاروں رضا کار، جو ''سربیائی کمیونزم اور اسلامی بنیاد پرستی دونوں کے خلاف مسیحی صلیبی جنگ'' میں لڑنے کے مشتاق تھے، کروشیائی دفاعی افواج سے آملے۔ مغربی ممالک کے فوجی پیشہ وروں نے تیکنیکی معاونت فراہم کی۔ قرابت دار ملکوں کی اس مدد کے باعث کروشیائی اپنی افواج کو مضبوط بنانے اور یوگوسلاویہ کی فوج کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوئے جس پر سربوں کا غلبہ تھا۔[۳۷]

کروشیا کے لیے مغربی حمایت میں نسلی تطہیر اور انسانی حقوق کی پامالی اور جنگ کے قوانین کو نظرانداز کرنا شامل تھا جس پر سربوں کی مسلسل مذمت کی جارہی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں جب بحال شدہ کروشیائی فوج نے کرائینا کے سربوں پر، جو صدیوں سے وہاں تھے، حملہ کیا اور لاکھوں کو بوسنیا اور سربیا میں جلاوطن کردیا تو مغرب خاموش رہا۔ کروشیا کو اپنی بڑی منتشر آبادی سے بھی فائدہ ہوا۔ مغربی یورپ اور شمالی امریکا کے دولت مند کروشیائیوں نے اسلحے اور سازوسامان کے لیے رقوم بھیجیں۔ امریکا میں کروشیائیوں کی انجمنوں نے اپنے وطن کی طرف سے کانگریس اور صدر پر اثرورسوخ استعمال کیا۔ جرمنی میں مقیم چھ لاکھ کروشیائی بطور خاص اہم اور بااثر تھے۔ ''کینیڈا، امریکا، آسٹریلیا اور جرمنی میں کروٹ آبادیاں اپنے نوآزاد وطن کے دفاع کے لیے متحرک ہوگئیں'' اور کروشیائی فوج کے لیے سیکڑوں رضا کار فراہم کیے۔[۳۸]

۱۹۹۴ء میں امریکا کروشیائی فوج کو مضبوط بنانے کے عمل میں شریک ہوگیا۔ کروشیائیوں نے اقوام متحدہ کی لاگو کی ہوئی اسلحے پر پابندیوں کی جو خلاف ورزیاں کیں ان کو نظرانداز کرتے ہوئے امریکا نے کروشیائیوں کو فوجی تربیت دی اور اعلیٰ ریٹائرڈ امریکی جنرلوں نے انہیں مشاورت فراہم کی۔ امریکی اور جرمن حکومتوں نے ۱۹۹۵ء میں کرائینا پر کروشیائی حملے کی اجازت دی۔ اس امریکی طرز کے حملے کی منصوبہ بندی میں امریکی فوجی مشیروں نے شرکت کی جس میں کروشیائیوں کے مطابق امریکی جاسوس سیاروں کی دی ہوئی خفیہ معلومات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ امریکی محکمہ خارجہ کے ایک عہدیدار نے اعلان کیا کہ کروشیا ''ہمارا حقیقی عسکری اتحادی'' بن چکا ہے۔ یہ کہا گیا کہ یہ پیش رفت ''ایک طویل المیعاد فکر کی [آئینہ دار ہے] کہ بالآخر دنیا کے اس حصے میں دو مقامی طاقتیں حاوی ہوں گی، ایک زغرب میں، ایک بلغراد میں؛ ایک واشنگٹن سے وابستہ، دوسری ماسکو تک پھیلے ہوئے سلافی بلاک سے بندھی ہوئی''۔[۳۹]

یوگوسلاویہ کی جنگوں میں آرتھوڈوکس دنیا بھی تقریباً متفقہ طور پر سربیا کے پیچھے اکٹھی ہوگئی۔

روسی قوم پرستوں، فوجی افسران، پارلیمنٹیر ینز اور آرتھوڈوکس کلیسا کے رہنماؤں نے سربیا کی حمایت، بوسنیائی ''ترکوں'' کی مذمت اور مغربی اور نیٹو کی سامراجیت پر کھل کر تنقید کی۔ روسی اور سربیائی قوم پرستوں نے مغرب کے ''نئے عالمی نظام'' کے خلاف دونوں ملکوں میں مخالفت ابھارنے کے لیے مل جل کر کام کیا۔ یہ جذبات خاصی حد تک روسی عوام میں پائے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ماسکو کے ۶۰ فیصد سے زائد لوگوں نے ۱۹۹۵ء کے موسم گرما میں نیٹو کے فضائی حملوں کی مخالفت کی۔ روسی قوم پرست گروپوں نے کئی بڑے شہروں میں ''سلافی بھائی چارے کے نصب العین'' میں شرکت کے لیے نوجوان روسیوں کو کامیابی سے بھرتی کیا۔ اطلاعات کے مطابق ایک ہزار یا زائد روسی، رومانیہ اور یونان کے رضا کاروں کے ہمراہ، سربیائی افواج میں بھرتی ہوگئے تاکہ بقول ان کے ''کیتھولک فاشسٹوں'' اور ''اسلامی شدت پسندوں'' سے لڑسکیں۔ ۱۹۹۲ء میں بتایا گیا کہ ''کوسیک وردیوں میں'' ایک روسی یونٹ بوسنیا میں لڑ رہا ہے۔ ۱۹۹۵ء میں روسی خصوصی سربیائی یونٹوں میں موجود تھے اور، اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق، روسی اور یونانی جنگجوؤں نے اقوام متحدہ کے محفوظ علاقے زیپا پر سربیائی حملے میں حصہ لیا۔[۴۰]

اسلحے پر پابندی کے باوجود سربیا کے آرتھوڈوکس دوستوں نے اس کو وہ ہتھیار اور سازوسامان فراہم کیا جس کی اسے ضرورت تھی۔ ۱۹۹۳ء کے اوائل میں روسی فوجی اور انٹیلی جنس اداروں نے سربوں کو بظاہر ۳۰ کروڑ ڈالر مالیت کے ٹی ۵۵ ٹینک، میزائل شکن میزائل اور طیارہ شکن میزائل فروخت کیے۔ روسی فوج کے تیکنیکی ماہرین یہ آلات چلانے کے لیے اور سربوں کو اس کی تربیت دینے کے لیے مبینہ طور پر سربیا گئے۔ سربیا نے دوسرے آرتھوڈوکس ملکوں سے بھی ہتھیار حاصل کیے جن میں رومانیہ اور بلغاریہ ''فعال ترین'' فراہم کنندگان تھے اور یوکرین بھی ذریعہ تھا۔ مزید برآں مشرقی سلووینیا میں روسی امن افواج نے اقوام متحدہ کی رسد سربوں کی طرف موڑ دی، سربیائی فوجی نقل وحرکت کے لیے سہولتیں پیدا کیں اور سربیائی افواج کو ہتھیاروں کے حصول میں مدد دی۔[۴۱]

اقتصادی پابندیوں کے باوجود سربیا ایندھن اور دیگر اشیا کی بھاری اسمگلنگ کرکے خود کو معقول طریقے سے سنبھالے رکھنے میں کامیاب رہا۔ تمی سورا سے اس اسمگلنگ کا اہتمام رومانیہ کے سرکاری اہلکاروں نے کیا اور البانیہ سے پہلے اطالوی اور پھر یونانی کمپنیوں نے یونانی حکومت کی ملی بھگت سے کیا۔ یونان سے خوراک، کیمیکلز، کمپیوٹروں اور دیگر سامان کی کھیپ یونان سے مقدونیہ کے راستے سربیا جاتی اور اتنی ہی مقدار میں سربیائی برآمدات آتیں۔[۴۲] ڈالروں کے لالچ اور ثقافتی قرابت دار سے ہمدردی کے امتزاج نے سربیا کے خلاف اقوام متحدہ کی اقتصادی پابندیوں کا اسی

طرح مذاق اڑایا جیسے یوگوسلاویہ کی تمام سابق جمہوریاؤں کے خلاف اقوام متحدہ کی اسلحے پر پابندیوں کا اڑایا۔

یوگوسلاویہ کی جنگوں کے دوران ابتدا سے آخر تک یونانی حکومت نے نیٹو کے مغربی ارکان کے توثیق شدہ اقدامات سے لاتعلقی اختیار کیے رکھی، بوسنیا میں نیٹو کی فوجی کارروائی کی مخالفت کی، اقوام متحدہ میں سربوں کی حمایت کی اور سربیا پر عائد معاشی پابندیاں اٹھانے کے لیے امریکی حکومت پر اثر ورسوخ استعمال کرتی رہی۔ ۱۹۹۴ء میں یونانی وزیر اعظم اینڈریاس پاپانڈریو نے، سربیا سے آرتھوڈوکس تعلق پر زور دیتے ہوئے، ویٹیکن، جرمنی اور یورپی یونین پر کڑی تنقید کی کہ انہوں نے ۱۹۹۱ء کے آخر میں سلووینیا اور کروشیا کو سفارتی طور پر تسلیم کرنے میں بہت جلد بازی کا مظاہرہ کیا۔[۴۳]

بورس یلسن پر، جو تیسری سطح کے رہنما تھے، دہرا دباؤ تھا۔ ایک طرف تو یہ کہ وہ مغرب سے اچھے تعلقات کو برقرار رکھیں، توسیع دیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں اور دوسری طرف یہ کہ سربوں کی مدد کریں اور اپنے سیاسی مخالفین کو غیر مسلح کریں جو مسلسل ان پر مغرب سے مل جانے کا الزام لگا رہے تھے۔ مجموعی طور پر مؤخر الذکر دباؤ کی فتح ہوئی اور سربوں کے لیے روسی سفارتکارانہ حمایت باقاعدگی سے جاری رہی۔ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۵ء میں روسی حکومت نے سربیا پر زیادہ سخت اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کی مخالفت کی اور روسی پارلیمنٹ نے تقریباً متفقہ طور پر سربوں پر موجودہ پابندیاں اٹھانے کی حمایت میں ووٹ دیا۔ روس نے مسلمانوں کے خلاف اسلحے پر پابندی سخت کرنے اور کروشیا پر اقتصادی پابندیاں لگانے کے لیے بھی دباؤ ڈالا۔ دسمبر ۱۹۹۳ء میں معاشی پابندیاں نرم کرنے پر زور دیا تاکہ وہ سربیا کو سردیوں کے لیے قدرتی گیس فراہم کر سکے۔ امریکا اور برطانیہ نے اس تجویز کو منظور نہ ہونے دیا۔ ۱۹۹۴ء میں اور پھر ۱۹۹۵ء میں روس نے بوسنیائی سربوں پر نیٹو کے فضائی حملوں کی شدید مخالفت کی۔ بعد کے برسوں میں روسی ڈوما نے تقریباً متفقہ ووٹ سے بمباری کی مذمت کی اور وزیر خارجہ آندرے کوزیریف کے استعفے کا مطالبہ کیا جو بلقان میں روسی قومی مفادات کا مؤثر دفاع کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ۱۹۹۵ء میں ہی روس نے نیٹو پر سربوں کی ''نسل کشی'' کا الزام عائد کیا اور صدر یلسن نے متنبہ کیا کہ مسلسل بمباری نیٹو کی ''شراکت برائے امن'' میں اس کی شمولیت کے معاملے سمیت مغرب کے ساتھ روس کے تعاون کو بہت متاثر کرے گی۔ انہوں نے دریافت کیا ''ہم نیٹو سے معاہدہ کیسے کر سکتے ہیں جبکہ نیٹو سربوں پر بمباری کر رہا ہے؟'' یہ ظاہر تھا کہ مغرب دہرا معیار اپنائے ہوئے تھا: ''یہ کیا بات ہے کہ جب مسلمان حملہ کرتے ہیں تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاتی؟ یا جب کروٹس حملہ کرتے ہیں؟''[۴۴] روس یوگوسلاویہ کی سابق جمہوریاؤں کے خلاف اسلحے

پر پابندی معطل کرنے کی کوششوں کی مسلسل مخالفت بھی کرتا رہا جس کے سب سے زیادہ اثرات بوسنیائی مسلمانوں پر پڑے اور باقاعدگی سے اس پابندی کو مزید سخت کرنے کے حق میں کوشاں رہا۔

روس نے کئی دیگر طریقوں سے بھی اقوام متحدہ میں اور دوسرے اداروں میں اپنے مقام کو سرب مفادات کے دفاع کے لیے استعمال کیا۔ دسمبر ۱۹۹۴ء میں اس نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی ایک قرارداد کو ویٹو کر دیا جو مسلم ممالک نے پیش کی تھی اور جس سے سربیا سے بوسنیائی اور کروشیائی سربوں کو ایندھن کی رسد ممنوع قرار پاتی۔ اپریل ۱۹۹۴ء میں روس نے اقوام متحدہ کی ایک قرارداد منظور نہ ہونے دی جس میں نسلی تطہیر پر سربوں کی مذمت کی گئی تھی۔ روس نے نیٹو کے کسی ملک کے نمائندے کو اقوام متحدہ کی طرف سے جنگی جرائم کا وکیل استغاثہ بھی مقرر نہ ہونے دیا کیونکہ وہ سربوں کے خلاف متعصب ہوسکتا تھا، جنگی جرائم کے بین الاقوامی ٹریبونل میں بوسنیائی سرب فوجی کمانڈر ریٹکو ملاڈک پر فرد جرم پر اعتراض کیا اور ملاڈک کو روس میں پناہ کی پیشکش کی۔[۴۵] ستمبر ۱۹۹۳ء میں روس نے سابق یوگوسلاویہ میں اقوام متحدہ کے ۲۲ ہزار امن فوجیوں کے لیے اقوام متحدہ کی توثیق نو رکوائے رکھی۔ ۱۹۹۵ء کے موسم گرما میں روس نے سلامتی کونسل کی اس قرارداد کی مخالفت کی لیکن ویٹو نہیں کیا جس میں ۱۲ ہزار مزید فوجیوں کی تعیناتی کی اجازت دی گئی۔ اس نے کرائینا کے سربوں کے خلاف کروٹس کے حملے اور مغربی حکومتوں کی جانب سے اس حملے کے خلاف کوئی کارروائی کرنے میں ناکامی پر سخت نکتہ چینی کی۔

وسیع ترین اور مؤثر ترین تہذیبی گروہ بندی بوسنیائی مسلمانوں کے حق میں مسلم دنیا کی تھی۔ بوسنیائی نصب العین مسلمان ملکوں میں آفاقی مقبولیت کا حامل تھا۔ بوسنیائیوں کے لیے متعدد سرکاری و نجی ذرائع سے امداد پہنچی۔ مسلم حکومتوں خصوصاً ایران اور سعودی عرب نے بڑھ چڑھ کر مدد فراہم کی اور اس طرح اپنے اثر و رسوخ میں اضافہ کیا۔ مراکش سے ملائشیا تک سنی اور شیعہ، بنیاد پرست اور سیکولر، عرب اور غیر عرب مسلمان معاشرے سب شریک ہوگئے۔ بوسنیائیوں کے لیے مسلمانوں کی امداد کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوا۔ ان میں انسانی امداد (سعودی عرب میں ۱۹۹۵ء میں جمع کردہ ۹ کروڑ ڈالر سمیت) سے لے کر سفارتی حمایت اور بھاری فوجی مدد سے لے کر تشدد کی کارروائیاں تک شامل تھیں جیسے ۱۹۹۳ء میں الجزائر میں اسلامی انتہا پسندوں کے ہاتھوں بارہ کروشیائی باشندوں کی ہلاکت کا واقعہ جو ''ہمارے مسلمان بھائیوں کے قتل عام کے جواب میں [پیش آیا] جن کے بوسنیا میں گلے کاٹے گئے ہیں''۔[۴۶] اس گروہ بندی نے جنگ کی سمت متعین کرنے کے حوالے سے بڑے اثرات مرتب کیے۔ بوسنیائی ریاست کی بقا اور سربوں کی ابتدائی طوفانی فتوحات کے بعد اپنے علاقے

چھڑانے کے لیے یہ گروہ بندی لازمی تھی۔ اس سے بوسنیائی معاشرے کی اسلامی خطوط پر استواری اور بوسنیائی مسلمانوں کی عالمی اسلامی برادری کے ساتھ شناخت کو بڑی تحریک ملی۔ اور اس سے امریکا کو بوسنیائی ضروریات سے ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے کی ترغیب بھی فراہم ہوئی۔

انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے مسلمان حکومتوں نے بار بار بوسنیائی ہم مذہبوں کے ساتھ اپنی یکجہتی کا اظہار کیا۔ ایران نے ۱۹۹۲ء میں پہل کی اور جنگ کو عیسائی سربوں کے ساتھ مذہبی تنازع قرار دیا جو بوسنیائی سربوں کی نسل کشی کر رہے تھے۔ فواد عجمی نے تبصرہ کیا کہ ایران نے اس طرح پہل کر کے ''بوسنیائی حکومت کی شکرگزاری کے لیے نقد ادائیگی'' کی اور ترکی اور سعودی عرب جیسی دوسری مسلم طاقتوں کے لیے مثال قائم کردی اور محرک پیدا کیا کہ وہ اس کی تقلید کریں۔ ایران کی ایما پر اسلامی کانفرنس کی تنظیم میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا اور اقوام متحدہ میں بوسنیائی نصب العین کے حق میں آواز بلند کرنے کے لیے ایک گروپ تشکیل دیا گیا۔ اگست ۱۹۹۲ء میں اسلامی نمائندوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں مبینہ نسل کشی کی مذمت کی اور او آئی سی کی طرف سے ترکی نے ایک قرارداد متعارف کرائی جس میں اقوام متحدہ کے منشور کی شق ے کے تحت فوجی مداخلت کا مطالبہ کیا گیا۔ مسلم ممالک نے بوسنیائیوں کے تحفظ کے لیے مغرب کو اوائل ۱۹۹۳ء کی حتمی تاریخ دے دی جس کے بعد وہ بوسنیا کو اسلحہ پہنچانے میں آزاد ہوتے۔ مئی ۱۹۹۳ء میں او آئی سی نے مغربی اقوام اور روس کے وضع کردہ اس منصوبے کی مذمت کی جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو محفوظ مقامات فراہم کیے جائیں گے اور سربیا کے ساتھ سرحد کی نگرانی کی جائے گی لیکن فوجی مداخلت سے اجتناب کیا جائے گا۔ او آئی سی نے اسلحے پر پابندی کے خاتمے، سربیائی بھاری ہتھیاروں کے خلاف قوت کے استعمال، سربیائی سرحد پر جارحانہ گشت اور امن افواج میں مسلم ملکوں کے فوجیوں کی شمولیت کا مطالبہ کیا۔ اگلے ماہ او آئی سی نے مغربی و روسی اعتراضات کے ساتھ اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے انسانی حقوق سے سربوں کی مذمت اور کروٹس کی جارحیت کی مذمت میں اور اسلحے پر پابندی ختم کرنے کے حق میں قرارداد منظور کرائی۔ جولائی ۱۹۹۳ء میں مغرب کو اس وقت کسی حد تک پریشانی کا سامنا کرنا پڑا جب او آئی سی نے اقوام متحدہ کو ۱۸ ہزار امن فوجی فراہم کرنے کی پیشکش کی جس میں ایران، ترکی، ملائشیا، تیونس، پاکستان اور بنگلہ دیش کے فوجی شامل ہوتے۔ امریکا نے ایران کی شمولیت کو ویٹو کر دیا اور سربوں نے ترک فوجیوں پر شدت سے اعتراض کیا۔ تاہم مؤخرالذکر ۱۹۹۴ء کے موسم گرما میں بوسنیا پہنچے اور ۱۹۹۵ء تک اقوام متحدہ کی حفاظتی فوج کی ۲۵ ہزار کی نفری میں ترکی، پاکستان، ملائشیا، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش کے ۷ ہزار فوجی شامل تھے۔ اگست ۱۹۹۳ء میں ترک وزیر خارجہ کی قیادت میں او آئی سی

کے ایک وفد نے بطروس غالی اور وارن کرسٹوفر پر زور دیا کہ وہ سربوں کے حملوں سے بوسنیائیوں کو بچانے کے لیے نیٹو کے فوری فضائی حملوں کی حمایت کریں۔ یہ بتایا گیا کہ یہ قدم نہ اٹھائے جانے سے ترکی اور اس کے نیٹو کے اتحادیوں کے درمیان سنگین کشیدگی پیدا ہوگی۔[۴۷]

بعد ازاں ترکی اور پاکستان کے وزراءِ اعظم نے مسلمانوں کی تشویش کو نمایاں کرنے کے لیے سرائیوو کا دورہ کیا جس کی بہت تشہیر کی گئی اور او آئی سی نے بوسنیائیوں کو فوجی امداد فراہم کرنے کے مطالبات کا پھر اعادہ کیا۔ ۱۹۹۵ء کے موسم گرما میں محفوظ قرار دیے گئے علاقوں کا سربوں کے حملوں سے دفاع کرنے میں مغرب کی ناکامی پر ترکی نے بوسنیا کے لیے فوجی امداد اور بوسنیائی فوجیوں کی تربیت کی منظوری دی، ملائشیا نے اقوام متحدہ کی پابندی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انہیں ہتھیار فروخت کرنے کا عزم ظاہر کیا اور متحدہ عرب امارات نے فوجی و انسانی مقاصد کے لیے رقوم فراہم کرنے کی بات کی۔ اگست ۱۹۹۵ء میں او آئی سی کے نو ملکوں کے وزراء خارجہ نے اقوام متحدہ کی اسلحے پر پابندیوں کو ناجائز قرار دیا اور ستمبر میں او آئی سی کے باون ارکان نے بوسنیائیوں کے لیے ہتھیاروں اور اقتصادی امداد کی منظوری دی۔

کسی اور مسئلے پر پوری اسلامی دنیا میں اس سے زیادہ متفقہ موقف سامنے نہیں آیا اور ترکی میں بوسنیائی مسلمانوں کی حالتِ زار پر بطور خاص ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ بوسنیا ۱۸۷۸ء تک عملی اور ۱۹۰۸ء تک نظری اعتبار سے سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہا تھا اور بوسنیائی تارکین اور پناہ گزین ترکی کی آبادی کا لگ بھگ ۵ فیصد ہیں۔ ترک قوم میں بوسنیائی نصب العین کے لیے ہمدردی اور بوسنیائیوں کو تحفظ دینے میں مغرب کی مبینہ ناکامی پر غم وغصہ عام تھا۔ حزب اختلاف کی رفاہ پارٹی نے حکومت کے خلاف اس مسئلے کو استعمال کیا۔ جواب میں سرکاری عہدیداروں نے بلقان کے تمام مسلمانوں کے حوالے سے ترکی کی ذمے داریوں پر زور دیا اور حکومت بوسنیائی مسلمانوں کی حفاظت کی خاطر اقوام متحدہ کی فوجی مداخلت کے لیے دباؤ ڈالتی رہی۔[۴۸]

بوسنیائی مسلمانوں کے لیے امہ کی تا حال اہم ترین مدد فوجی تعاون تھا: ہتھیار، ہتھیار خریدنے کے لیے رقم، فوجی تربیت اور رضا کار۔ جنگ شروع ہونے کے فوراً بعد بوسنیائی حکومت نے مجاہدین کو دعوت دی اور رضا کاروں کی مجموعی تعداد ۴ ہزار تک ہوگئی جو سربوں یا کروٹس کے لیے لڑنے والے غیر ملکیوں سے زیادہ تھی۔ ان میں ایرانی ری پبلکن گارڈز کے یونٹ اور بہت سے ایسے شامل تھے جو افغانستان میں لڑ چکے تھے۔ ان میں پاکستان، ترکی، ایران، الجزائر، سعودی عرب، مصر اور سوڈان کے اصل باشندے نیز جرمنی، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کے البانوی اور ترک مہمان کارکن شامل تھے۔

سعودی مذہبی تنظیموں نے بہت سے رضا کار بھیجے۔ ۱۹۹۲ء میں جنگ کے بہت ابتدائی مہینوں میں دو درجن سعودی ہلاک ہوئے اور ''مسلمان نوجوانوں کی عالمی اسمبلی'' زخمی جنگجوؤں کو علاج کے لیے فضائی راستے سے جدہ لے گئی۔ ۱۹۹۲ء کے موسم خزاں میں شیعہ لبنانی حزب اللہ کے چھاپہ مار بوسنیائی فوج کو تربیت دینے کے لیے پہنچے۔ بعد میں اس تربیت کی ذمے داری زیادہ تر ایرانی ری پبلیکن گارڈز نے سنبھال لی۔ ۱۹۹۴ء کے موسم بہار میں مغربی انٹیلی جنس اداروں نے اطلاع دی کہ ۴۰۰ ارکان پر مشتمل ایرانی ری پبلکن گارڈز کا ایک یونٹ انتہا پسند چھاپہ ماروں اور دہشت گردوں کے یونٹوں کو تربیت دے رہا ہے۔ ایک امریکی عہدیدار نے کہا کہ ''ایرانیوں کی نظر میں یہ یورپ کی ناف کے نیچے ضرب لگانے کا ایک طریقہ ہے۔'' اقوام متحدہ کے مطابق مجاہدین نے خصوصی اسلام پسند بریگیڈز کے لیے تین سے پانچ ہزار بوسنیائیوں کو تربیت دی۔ بوسنیائی حکومت نے مجاہدین کو ''دہشت گردانہ، غیرقانونی سرگرمیوں'' کے لیے استعمال کیا حالانکہ یہ یونٹ اکثر مقامی آبادی کو ہراساں اور حکومت کے لیے دوسرے مسائل پیدا کرتے تھے۔ ڈیٹن معاہدوں کے تحت تمام غیرملکی جنگجوؤں کے لیے بوسنیا سے رخصت ہوجانا ضروری تھا لیکن بوسنیائی حکومت نے بعض جنگجوؤں کو بوسنیا کی شہریت دے کر قیام کا موقع دیا اور ایرانی ری پبلکن گارڈز کو امدادی کارکنوں کی حیثیت سے بھرتی کیا۔ ۱۹۹۶ء کے اوائل میں ایک امریکی عہدیدار نے انتباہ کیا کہ ''بوسنیائی حکومت پر ان گروپوں، خصوصاً ایرانیوں کا بہت احسان ہے۔'' ''حکومت ان کے مقابلے پر نہیں آسکتی۔ بارہ ماہ کے اندر ہم جا چکے ہوں گے لیکن مجاہدین رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں''۔[۴۹]

امہ کے امیر ملکوں نے جن میں سعودی عرب اور ایران پیش پیش تھے بوسنیائی فوجی قوت بڑھانے کے لیے بے تحاشا رقم خرچ کی۔ ۱۹۹۲ء میں جنگ کے ابتدائی مہینوں میں سعودی حکومت اور نجی ذرائع نے بوسنیائیوں کو ۱۵ کروڑ ڈالر امداد فراہم کی جو بظاہر انسانی مقاصد کے لیے تھی لیکن وسیع پیمانے پر تسلیم کیا گیا کہ فوجی کاموں میں استعمال ہوئی۔ بتایا گیا کہ بوسنیائیوں نے جنگ کے پہلے دو برسوں کے دوران ۱۶ کروڑ ڈالر کے ہتھیار وصول کیے۔ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۵ء کے دوران بوسنیائیوں کو اسلحے کے لیے سعودیوں سے مزید ۳۰ کروڑ ڈالر ملے۔ ۵۰ کروڑ ڈالر ان کے علاوہ تھے جسے انسانی امداد بتایا گیا۔ ایران بھی فوجی تعاون کا بڑا وسیلہ تھا اور، امریکی عہدیداروں کے مطابق، اس نے بوسنیائیوں کے لیے اسلحے پر کروڑوں ڈالر سالانہ خرچ کیے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق لڑائی کے ابتدائی برسوں میں بوسنیا میں جانے والے کل دو ارب ڈالر کے ہتھیاروں کا ۸۰ سے ۹۰ فیصد مسلمانوں کو ملا۔ اس مالی معاونت کے نتیجے میں بوسنیائی ہزاروں ٹن ہتھیار خریدنے کے

قابل ہوگئے۔ پکڑی جانے والی کھیپوں میں ایک ۴ہزار رائفلوں اور دس لاکھ کارتوسوں پر مشتمل تھی، دوسری میں ۱۱ہزار رائفلیں، ۳۰ مورٹر اور ساڑھے سات لاکھ کارتوس تھے جبکہ تیسری میں سطح سے سطح پر مار کرنے والے راکٹ، کارتوس، جیپیں اور پستولیں شامل تھیں۔ یہ تمام سامان ایران سے آرہا تھا جو اسلحے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا مگر ترکی اور ملائشیا بھی ہتھیاروں کے اہم فراہم کنندگان تھے۔ بعض ہتھیار براہِ راست بوسنیا فضائی راستے سے پہنچائے گئے لیکن بیشتر براستہ کروشیا اس طرح پہنچائے گئے کہ یا تو زغرب تک فضائی اور پھر زمینی راستے سے پہنچے یا پھر سمندری راستے سے اسپلٹ یا دوسری کروشیائی بندرگاہوں تک اور پھر زمینی راستے سے منزل تک پہنچے۔ اس کی اجازت دینے کے عوض کروشیائیوں نے ہتھیاروں کا ایک حصہ، مبینہ طور پر ایک تہائی، وصول کیا اور، اس خیال کے تحت کہ مستقبل میں بوسنیا سے پھر لڑائی چھڑ سکتی ہے، اپنے علاقے سے ٹینک اور دوسرا بھاری توپخانہ گزارنے کی اجازت نہیں دی۔[۵۰]

ایران، سعودی عرب، ترکی اور دوسرے مسلمان ملکوں سے ملنے والی رقوم، افرادی قوت، تربیت اور اسلحے سے بوسنیائی اپنی "بے ہنگم" آرمی کو اچھی خاصی سازوسامان سے لیس اور اہل فوج بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۹۴ء کے موسم سرما تک مبصرین کے مطابق اس فوج کی تنظیمی ہم آہنگی اور فوجی کارکردگی میں ڈرامائی اضافہ ہوگیا۔[۵۱] اپنی نئی فوجی قوت کو کام میں لاتے ہوئے بوسنیائیوں نے جنگ بندی توڑی اور پہلے کروشیائی ملیشیا اور پھر موسم بہار میں سربوں کے خلاف کامیاب حملے کیے۔ ۱۹۹۴ء کے خزاں میں بوسنیائی پانچویں کور اقوام متحدہ کے محفوظ علاقے بہاج سے باہر نکلی اور سرب افواج کو پیچھے دھکیل دیا جو اس وقت تک سب سے بڑی بوسنیائی فتح تھی۔ انہوں نے سربوں سے خاصا علاقہ واپس لے لیا۔ مارچ ۱۹۹۵ء میں بوسنیائی فوج نے پھر جنگ بندی توڑی اور تزلا کے قریب بڑی پیشقدمی کی جس کے بعد جون میں سرائیوو کے پاس حملہ کیا گیا۔ بوسنیائی حکومت کے مسلمان قرابت داروں کی حمایت ایک ضروری اور فیصلہ کن عامل تھی جس کے ذریعے وہ بوسنیا کے فوجی توازن میں یہ تبدیلیاں لاسکی۔

بوسنیا میں جنگ تہذیبوں کی جنگ تھی۔ پہلی سطح کے تینوں شرکا مختلف تہذیبوں کے تھے اور مختلف مذاہب پر یقین رکھتے تھے۔ ایک جزوی استثنا کے ساتھ، دوسری اور تیسری سطح کے شرکا بالکل تہذیبی خطوط پر چلے۔ تمام مسلمان ریاستوں اور اداروں نے بوسنیائی مسلمانوں کی حمایت اور کروٹس اور سربوں کی مخالفت کی۔ تمام آرتھوڈوکس ملکوں اور اداروں نے سربوں کی حمایت کی اور کروٹس اور مسلمانوں کی مخالفت کی۔ مغربی حکومتیں کروٹس کی حامی، سربوں کے خلاف فعال اور عموماً مسلمانوں

سے لاتعلق یا خوفزدہ رہیں۔ جنگ جاری رہی اور گروہوں کے درمیان منافرت اور خلیجیں گہری ہوتی گئیں اور مذہبی و تہذیبی شناختوں میں شدت آتی گئی، خصوصاً مسلمانوں میں۔ بحیثیت مجموعی بوسنیا کی جنگ سے جو سبق حاصل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔ اول، رخنہ جنگوں کے پہلی سطح کے شرکا اپنے تہذیبی قرابت داروں سے مدد کے حصول پر انحصار کر سکتے ہیں جو خاصی مقدار میں ہو سکتی ہے۔ دوم، یہ مدد جنگ کا نقشہ بدل سکتی ہے۔ سوم، کسی تہذیب کی حکومتیں اور عوام دوسری تہذیب کے لوگوں کو رخنہ جنگ لڑنے کے لیے اپنا خون اور خزانہ صرف نہیں کرتے۔

اس تہذیبی صورتحال کا ایک جزوی استثنا امریکا تھا جس کے رہنماؤں نے بیانات میں مسلمانوں کی حمایت کی۔ تاہم عملاً امریکی حمایت محدود تھی۔ کلنٹن انتظامیہ نے امریکی فضائی قوت کے استعمال کی منظوری دی لیکن اقوام متحدہ کے محفوظ علاقوں کے دفاع کے لیے زمینی فوج کی منظوری نہیں دی اور اسلحے پر پابندی کے خاتمے کی حمایت کی۔ اُس نے اِس خاتمے کے لیے اپنے اتحادیوں پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالا تاہم بوسنیائیوں کو ایران کی طرف سے اسلحے کی فراہمی اور بوسنیائیوں کے لیے ہتھیاروں کی خریداری کی خاطر سعودی رقوم کی ترسیل دونوں سے چشم پوشی کی اور ۱۹۹۴ء میں پابندی پر نفاذ ختم کر دیا۔[۵۲] یہ اقدامات کر کے امریکا نے اپنے حلیفوں کی ناراضی مول لی جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کو نیٹو میں بڑا بحران تصور کیا جاتا ہے۔ ڈیٹن معاہدوں پر دستخط کے بعد امریکا بوسنیائی افواج کو تربیت دینے اور لیس کرنے میں سعودی عرب اور دیگر مسلم ممالک سے تعاون پر آمادہ ہو گیا۔ پس سوال یہ ہے: جنگ کے دوران اور بعد میں امریکا واحد ملک کیوں تھا جس نے تہذیبی طرز کی خلاف ورزی کی اور بوسنیائی مسلمانوں کے مفادات کو فروغ دینے والا اور ان کی طرف سے مسلمان ملکوں کے ساتھ کام کرنے والا واحد غیر مسلم ملک بن گیا؟ اس امریکی بے قاعدگی کی کیا تشریح ہے؟

ایک امکان یہ ہے کہ یہ درحقیقت بے قاعدگی نہیں تھی بلکہ بہت سوچی سمجھی تہذیبی سیاست تھی۔ امریکا بوسنیائیوں کی حمایت کر کے اور پابندی کے خاتمے کا ناکام مطالبہ کر کے ایران اور سعودی عرب جیسے بنیاد پرست مسلم ممالک کے بوسنیائیوں پر، جو پہلے سیکولر اور یورپی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اثرات کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم اگر محرک یہ تھا تو امریکا نے ایران اور سعودی عرب کی جانب سے امداد کی ترسیل پر کیوں صاد کیا اور پابندی ختم کرنے کے لیے اور شدت سے کوشش کیوں نہ کی جس سے مغربی امداد کا جواز فراہم ہو جاتا؟ امریکی عہدیداروں نے بلقان میں اسلامی بنیاد پرستی کے خطرات سے خبردار کیوں نہیں کیا؟ امریکی طرزِ عمل کی ایک اور متبادل توضیح یہ ہے کہ امریکی حکومت مسلم دنیا میں اپنے حلیفوں کے دباؤ میں تھی خاص طور پر ترکی اور سعودی عرب کے، اور اس

نے ان سے اچھے روابط رکھنے کی خاطر ان کی خواہشات تسلیم کیں۔ تاہم ان روابط کی بنیاد جن مشترکہ مفادات پر ہے ان کا بوسنیا سے کوئی تعلق نہیں، اور امریکا کے بوسنیا کی مدد نہ کرنے سے ان کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ علاوہ ازیں، اس توضیح سے اس بات کی تشریح بھی نہیں ہوتی کہ امریکا ایک ایسے وقت بوسنیا میں ایرانی اسلحے کی بڑی مقدار کی ترسیل پر کیوں معترض نہیں تھا جب دوسرے محاذوں پر وہ مسلسل ایران کو چیلنج کر رہا تھا اور سعودی عرب بوسنیا میں اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے ایران سے مقابلہ کر رہا تھا۔

تہذیبی حقیقی سیاست نے امریکی طرزِ عمل کو تشکیل دینے میں کچھ کردار ادا کیا ہوگا لیکن دوسرے عوامل کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔ امریکی کسی بھی غیر ملکی تنازعے میں خیر کی قوتوں اور شر کی قوتوں میں تمیز کرنا اور اول الذکر کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔ جنگ کے شروع میں سربوں کے مظالم نے انہیں ''بدمعاشوں'' کے روپ میں پیش کیا جو معصوم افراد کو قتل کر رہے تھے اور نسل کشی میں ملوث تھے جبکہ بوسنیائی خود کو بے یار و مددگار مجروحین کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ پوری جنگ کے دوران امریکی اخبارات نے کروٹس اور مسلمانوں کی جانب سے نسلی تطہیر اور جنگی جرائم یا بوسنیائی افواج کی جانب سے اقوامِ متحدہ کے محفوظ علاقوں اور جنگ بندی کی خلاف ورزی پر بہت کم توجہ دی۔ ربیکا ویسٹ کے الفاظ میں امریکیوں کے لیے بوسنیائی ''پسندیدہ بلقانی قوم [بن گئے] جن کا ان کے دلوں میں مظلوم و معصوم کی حیثیت سے مقام بن گیا، جو ہمیشہ قتیل ہوتے تھے اور کبھی قتال نہیں۔''[۵۳]

امریکی اعلیٰ طبقات بوسنیائیوں کی طرف اس لیے بھی جھکاؤ رکھتے تھے کہ وہ کثیر ثقافتی ملک کا تصور پسند کرتے تھے اور جنگ کے ابتدائی مراحل میں بوسنیائی حکومت نے کامیابی سے یہ تاثر پھیلایا۔ جنگ میں شروع سے آخر تک امریکی پالیسی سختی سے کثیر نسلی بوسنیا کے حق میں رہی ہرچند کہ بوسنیائی سرب اور بوسنیائی کروٹس کی بھاری اکثریت اسے مسترد کر رہی تھی۔ اگرچہ کثیر نسلی ریاست کی تخلیق واضح طور پر ناممکن تھی کیونکہ، جیسا کہ امریکی خود بھی یقین رکھتے تھے، ایک نسلی گروہ دوسرے کی نسل کشی کر رہا تھا لیکن امریکی اعلیٰ طبقات نے ان متضاد تصویروں کو اپنے ذہنوں میں گڈمڈ کر کے بوسنیائی نصب العین کے لیے عام ہمدردی پیدا کر دی۔ اس طرح امریکی عینیت پسندی، اخلاق پسندی، انسان دوستی کی جبلتوں، سادہ لوحی اور بلقان سے متعلق لاعلمی نے انہیں بوسنیائیوں کا حامی اور سربوں کا مخالف بنا دیا۔ ساتھ ہی بوسنیا میں امریکی سلامتی کے مفادات کے فقدان اور کوئی ثقافتی تعلق نہ ہونے کے باعث امریکی حکومت کے پاس کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بوسنیائیوں کی مدد کے لیے کچھ کرتی سوائے اس کے کہ ایرانیوں اور سعودیوں کو انہیں اسلحہ پہنچانے کی اجازت دیتی۔ جنگ کو

اس کے صحیح پس منظر میں دیکھنے سے انکار کر کے امریکی حکومت نے اپنے اتحادیوں کو خود سے دور کرلیا۔ اس کی وجہ سے لڑائی طول پکڑ گئی اور بلقان میں ایک مسلم ریاست قائم ہوگئی جس پر ایران کے گہرے اثرات تھے۔ آخر میں بوسنیائی امریکا سے سخت نالاں تھے جس نے باتیں تو بڑی بڑی کی تھیں لیکن کیا کچھ نہیں، اور وہ اپنے مسلمان قرابت داروں کے بہت شکر گزار تھے جو ان کی بقا اور فتوحات کے لیے رقوم اور ہتھیار لے کر آئے تھے۔

برنارڈ ہنری لیوی نے کہا کہ ''بوسنیا ہمارا اسپین ہے'' اور ایک سعودی مدیر نے اس رائے سے اتفاق کیا: ''بوسنیا اور ہرزیگووینا کی جنگ اسپینی خانہ جنگی میں فاشزم کے خلاف لڑائی کا جذباتی مترادف بن گئی ہے۔ وہاں جان دینے والوں کو شہید سمجھا جاتا ہے جنہوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو بچانے کی کوشش کی''۔[54] یہ صحیح موازنہ ہے۔ تہذیبوں کے دور میں بوسنیا ہر ایک کا اسپین ہے۔ اسپینی خانہ جنگی سیاسی نظاموں اور نظریات کی جنگ تھی، بوسنیا کی جنگ تہذیبوں اور مذاہب کی جنگ تھی۔ جمہوریت پسند، کمیونسٹ اور فاشسٹ اپنے نظریاتی ساتھیوں کے ہمراہ لڑنے کے لیے اسپین گئے تھے اور جمہوریت پسندوں، کمیونسٹوں اور سب سے بڑھ کر فاشسٹ حکومتوں نے امداد پہنچائی تھی۔ یوگوسلاویہ کی جنگوں میں بھی اسی طرح مغربی مسیحی، آرتھوڈوکس مسیحی اور مسلمان اپنے تہذیبی قرابت داروں کی حمایت میں بڑے پیمانے پر متحرک ہوئے۔ آرتھوڈوکسی، اسلام اور مغرب کی بڑی بڑی طاقتیں سب اس میں پوری طرح شامل ہوگئیں۔ چار سال بعد اسپینی خانہ جنگی فرانکو کی افواج کی فتح کے بعد حتمی اختتام تک پہنچ گئی۔ بلقان میں مذہبی آبادیوں کے درمیان جنگوں کی شدت میں کمی آسکتی ہے اور عارضی طور پر رک سکتی ہیں لیکن امکان یہ ہے کہ کوئی بھی فیصلہ کن فتح حاصل نہیں کرسکے گا اور فتح نہ ہونے کا مطلب ہے کہ اختتام بھی نہیں ہوگا۔ اسپینی خانہ جنگی دوسری جنگ عظیم کا پیش خیمہ تھی۔ بوسنیا کی جنگ تہذیبوں کے جاری تصادم میں ایک اور خونریز باب ہے۔

رخنہ جنگوں کو روکنا

دانا کہتے ہیں ''ہر جنگ کو ختم ہونا چاہیے۔'' کیا یہ بات رخنہ جنگوں کے بارے میں بھی درست ہے؟ اس کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔ رخنہ تشدد کسی خاص عرصے کے دوران بالکل رک سکتا ہے مگر یہ مستقل طور پر شاذ ہی ختم ہوتا ہے۔ رخنہ جنگوں کے درمیان بار بار جنگ بندی، عارضی صلح اور وقتی فائر بندی کے واقعات ہوتے ہیں لیکن ایسے جامع امن معاہدے نہیں ہوتے جن سے مرکزی سیاسی

مسائل حل ہوجائیں۔ ان جنگوں میں یہ خاصیت اس لیے ہوتی ہے کہ ان کی جڑیں گہرے رخنہ تنازعات میں ہوتی ہیں اور ان تنازعات میں مختلف تہذیبوں سے متعلق گروہوں کے مستقل معاندانہ روابط ہوتے ہیں۔ یہ تنازعات کا منبع جغرافیائی قربت، مختلف مذاہب اور ثقافتیں، علیحدہ سماجی ڈھانچے اور دونوں معاشروں کے تاریخی حافظے ہوتے ہیں۔ طویل وقت گزرنے پر ان معاشروں کے ارتقا کے ساتھ تنازع ختم ہوسکتا ہے۔ یا اگر ایک گروہ دوسرے کا صفایا کردے تو یہ تنازع تیزی سے اور سفاکانہ انداز میں ختم ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کچھ بھی نہ ہو تو تنازع جاری رہے گا اور تشدد کے ادوار آتے رہیں گے۔ رخنہ جنگیں وقتاً فوقتاً ہوتی ہیں، رخنہ تنازعات وقتی نہیں ہوتے۔

کسی رخنہ جنگ میں عارضی تعطل لانے کا انحصار بھی دو شرائط پر ہے۔ ایک شرط یہ ہے کہ پہلی سطح کے شرکا تھک کر چور ہو چکے ہوں۔ کسی موقعے پر جب ہلاکتیں ہزاروں میں ہوچکی ہوں، پناہ گزینوں کی تعداد لاکھوں ہوگئی ہو، شہر -- بیروت، گروزنی، وکوور -- ملبے کا ڈھیر بن چکے ہوں، تو لوگ چیخ اٹھتے ہیں "دیوانگی، دیوانگی، بہت ہوچکا۔" دونوں فریقوں کی طرف کے شدت پسند عام لوگوں میں غصہ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے، مذاکرات جو برسوں سے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہورہے تھے پھر زندہ ہوجاتے ہیں اور اعتدال پسند اپنا موقف پھر محکم طور پر بیان کرنے لگتے ہیں اور قتل و غارتگری رکوانے کے لیے کوئی نہ کوئی معاہدہ کرلیتے ہیں۔ ۱۹۹۴ء کے موسم بہار تک نگورنو کاراباخ پر ہونے والی چھ سالہ جنگ نے آرمینیائیوں اور آذربائیجانیوں دونوں کو "تھکا" دیا تھا اس لیے وہ جنگ بندی پر رضامند ہوگئے۔ اسی طرح ۱۹۹۵ء کے موسم خزاں میں بتایا گیا کہ بوسنیا میں "تمام فریق تھک چکے ہیں" اور ڈیٹن معاہدے طے پائے۔[۵۵] تاہم تعطل کے یہ واقعات محدود نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان سے دونوں فریقوں کو آرام کرنے اور اپنے وسائل اکٹھا کرنے کی مہلت مل جاتی ہے۔ پھر جب کسی ایک فریق کو اچھا موقع نظر آتا ہے تو جنگ دوبارہ چھڑ جاتی ہے۔

عارضی تعطل کے لیے ایک اور شرط بھی ہے: دوسری اور تیسری سطح کے شرکا لڑنے والوں کو قریب لانے کے لیے دلچسپی اور اثر ورسوخ کے حامل ہوں۔ رخنہ جنگیں پہلی سطح کے فریقوں کے براہ راست مذاکرات سے تقریباً کبھی ختم نہیں ہوتیں اور غیر جانبدار فریقوں کی ثالثی سے شاذ و نادر ہی ختم ہوتی ہیں۔ دونوں فریقوں کے ثقافتی فاصلے، شدید نفرت اور ایک دوسرے پر کیے گئے تشدد کی وجہ سے ان کا ساتھ بیٹھ کر جنگ بندی کے لیے نتیجہ خیز مذاکرات کرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔ اصل سیاسی مسائل یعنی کون کن علاقوں اور آبادیوں پر کن شرائط کے تحت قابض ہوگا، ابھر کر آتے رہتے ہیں اور محدود معاملات پر باہم اتفاق نہیں ہو پاتا۔

مشترکہ ثقافت والے ممالک یا گروہوں کے مابین تنازعات بعض اوقات کوئی ایسا تیسرا غیر جانبدار فریق طے کرا سکتا ہے جو اس ثقافت سے تعلق رکھتا ہو، اس ثقافت کے اندر تسلیم شدہ جائز مقام کا حامل ہو اور اسی لیے دونوں فریق اس پر اعتبار کر سکیں کہ وہ اس ثقافت کی اقدار کی مناسبت سے کوئی حل ڈھونڈ سکے گا۔ پوپ کو ارجنٹینا اور چلی کے سرحدی قضیے کی ثالثی کرانے میں کامیابی ہوئی۔ لیکن مختلف تہذیبی گروہوں کے تنازعات میں کوئی غیر جانبدار فریق نہیں ہوتا۔ کوئی ایسا فرد، ادارہ یا ریاست تلاش کرنا بے انتہا مشکل ہوتا ہے جسے دونوں فریق معتبر تصور کریں۔ کوئی بھی ممکنہ ثالث متصادم تہذیبوں میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا ہے یا پھر کسی تیسری تہذیب سے متعلق ہوتا ہے جس کی الگ ثقافت اور دوسرے مفادات ہوتے ہیں جس سے تنازعے میں شامل کسی فریق میں اعتماد کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ پوپ کو چیچنیائی اور روسی یا تامل اور سنہالی نہیں بلائیں گے۔ بین الاقوامی ادارے بھی عموماً اسی لیے ناکام ہو جاتے ہیں کہ وہ فریقوں پر کوئی بوجھ ڈالنے کی اہلیت رکھتے ہیں نہ ان کو فوائد کی پیشکش کر سکتے ہیں۔

رخنہ جنگیں غیر جانبدار افراد، گروہ یا ادارے ختم نہیں کراتے بلکہ جانبدار دوسری اور تیسری سطح کے شرکا ختم کراتے ہیں جو اپنے قرابت داروں کی حمایت میں اکٹھا ہو چکے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ معاہدے طے کر سکتے ہیں اور اپنے قرابت دار کو ان معاہدوں کو قبول کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ حمایتی قرابت داروں کے اکٹھا ہونے سے جنگ شدت اور طول پکڑتی ہے تاہم عام طور پر یہ جنگ کو محدود کرنے اور روکنے کے لیے بھی ایک لازمی شرط ہے گو کافی شرط نہیں۔ دوسری اور تیسری سطح کے شرکا بالعموم براہ راست جنگ میں شامل ہونا نہیں چاہتے اس لیے جنگ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے مفادات بھی پہلی سطح کے شرکا سے زیادہ متنوع ہوتے ہیں جن کی تمام تر توجہ جنگ پر ہوتی ہے۔ دوسری اور تیسری سطح کے شرکا ایک دوسرے سے تعلقات میں دوسرے مسائل سے بھی سروکار رکھتے ہیں۔ پس کسی مرحلے پر لڑائی روکنا انہیں اپنے مفاد میں معلوم ہو سکتا ہے۔ چونکہ انہوں نے اپنے قرابت دار کی حمایت کی ہوتی ہے اس لیے اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پس حمایت کے لیے گروہ بندی کرنے والے فریق جنگ رکوانے اور معطل کرانے والے بن جاتے ہیں۔

جن جنگوں میں دوسری اور تیسری سطح کے شرکا نہیں ہوتے ان کے پھیلنے کا امکان کم ہوتا ہے لیکن انہیں روکنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح مرکزی ریاستوں سے محروم تہذیبی گروہوں کے درمیان جنگوں کو روکنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ ایسی رخنہ جنگوں میں بھی مخصوص مسائل پیدا ہوتے ہیں جہاں کسی مستحکم ریاست کے اندر شورش ہو اور قرابت داروں کی طرف سے حمایت کا عنصر بھی موجود نہ

ہو۔ اگر جنگ کچھ عرصے جاری رہے تو شورش پسندوں کے مطالبات خود مختاری سے بڑھ کر مکمل آزادی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو حکومت مسترد کر دیتی ہے۔ عموماً حکومت لڑائی کے خاتمے کے پہلے مرحلے کے طور پر شورش پسندوں کے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کرتی ہے جو شورش پسند مسترد کر دیتے ہیں۔ فطری طور پر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ یہ خالصتاً داخلی مسئلہ ہے جس میں ''مجرم عناصر'' ملوث ہیں، اور غیر متعلقہ فریقوں کی مداخلت کی مزاحمت کرتی ہے۔ اسے داخلی مسئلہ کہنے سے دوسری ریاستوں کو اس میں شامل نہ ہونے کا عذر مل جاتا ہے جیسے مغربی طاقتوں اور چیچنیا کے معاملے میں ہوا۔

جب تہذیبوں میں مرکزی ریاستیں نہ ہوں تو یہ مسائل پیچیدہ تر ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سوڈان میں ۱۹۵۶ء میں شروع ہونے والی جنگ ۱۹۷۲ء میں رکی جب فریقین تھک گئے اور کلیساؤں کی عالمی کونسل اور کلیساؤں کی کل افریقی کونسل نے جنوبی سوڈان کے لیے خود مختاری کا معاہدہ عدیس ابابا طے کرایا۔ یہ غیر سرکاری بین الاقوامی اداروں کا منفرد کارنامہ تھا۔ تاہم ایک دہائی بعد حکومت نے معاہدہ منسوخ کر دیا، جنگ پھر چھڑ گئی، شورش پسندوں کے اہداف بڑھ گئے، حکومت کا موقف سخت تر ہو گیا اور ایک اور جنگ بندی کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ عرب دنیا اور افریقہ دونوں میں ایسی مرکزی ریاستوں کا فقدان تھا جو فریقوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے دلچسپی اور اثر و رسوخ کی حامل ہوتیں۔ جمی کارٹر اور مختلف افریقی رہنماؤں کی ثالثی کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں نہ ہی کینیا، اریٹیریا، یوگنڈا اور ایتھوپیا پر مشتمل مشرقی افریقی ریاستوں کی ایک کمیٹی جنگ بند کرا سکی۔ امریکا براہ راست قدم نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ اس کے سوڈان سے انتہائی مخاصمانہ تعلقات تھے، نہ ہی وہ ایران، عراق یا لیبیا سے، جن کے سوڈان سے قریبی روابط تھے، مفید کردار ادا کرنے کو کہہ سکتا تھا۔ پس قرعہ فال سعودی عرب کے نام پڑا لیکن سوڈان پر سعودی اثرات بھی محدود تھے۔[۵۶]

عموماً جنگ بندی کے مذاکرات اسی حد تک آگے بڑھتے ہیں جس حد تک دوسری اور تیسری سطح کے فریقوں کی دونوں جانب سے متوازی اور مساوی شمولیت ہو۔ ۱۹۹۲ء میں یورپ میں سلامتی و تعاون کی کانفرنس (Conference on Security and Cooperation in Europe, CSCE) نے آرمینیائی آذربائیجانی جنگ میں ثالثی کی کوشش کی۔ منسک گروپ کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں تنازعے کے پہلی، دوسری اور تیسری سطح کے شرکا (نگورنو کاراباخ کے آرمینیائی، آرمینیا، آذربائیجان، روس، ترکی) نیز فرانس، جرمنی، اٹلی، سویڈن، چیک جمہوریہ، بیلا روس اور امریکا شامل تھے۔ امریکا اور فرانس کے سوا، جن میں آرمینیائی منتشر آبادیاں خاصی تھیں، یہ مؤخر الذکر ممالک جنگ ختم کرنے کے حوالے سے برائے نام دلچسپی یا صلاحیت رکھتے

تھے۔ جب تیسری سطح کے دو فریق روس اور ترکی نیز امریکا ایک منصوبے پر متفق ہو گئے تو نگورنو کاراباخ کے آرمینیائیوں نے اسے مسترد کر دیا۔ تاہم روس نے آزادانہ طور پر ماسکو میں آرمینیا اور آذربائیجان کے درمیان مذاکرات کا ایک طویل سلسلہ منعقد کرایا جس سے ''منسک گروپ کا ایک متبادل پیدا ہوا اور... اس طرح بین الاقوامی برادری کی کوشش زائل ہو گئی''۔[۵۷] آخر میں جب پہلی سطح کے شرکا تھک چکے تھے اور روس نے مذاکرات کے لیے ایران کی حمایت حاصل کر لی تھی تو روسی کوشش جنگ بندی کے معاہدے پر منتج ہوئی۔ دوسری سطح کے شرکا کی حیثیت سے روس اور ایران نے تاجکستان میں جنگ بندی کرانے کی وقتاً فوقتاً کامیاب کوششوں میں بھی تعاون کیا۔

ماورائے قفقاز میں روس کی موجودگی برقرار رہے گی اور اس کی جنگ بندی کرانے کی صلاحیت بھی قائم رہے گی جب تک وہ اس سے دلچسپی لیتا رہے۔ یہ صورت بوسنیا کے حوالے سے امریکا کی صورتحال سے بالکل مختلف ہے۔ ڈیٹن معاہدے ان تجاویز کی بنیاد پر تشکیل پائے جو جانبدار مرکزی ریاستوں کے رابطہ گروپ (جرمنی، برطانیہ، فرانس، روس اور امریکا) نے پیش کی تھیں لیکن تیسری سطح کے دیگر فریق حتمی معاہدے کی شرائط طے کرنے میں شامل نہیں تھے اور جنگ کے تین پہلی سطح کے شرکا میں سے دو کو مذاکرات میں ضمنی حیثیت حاصل تھی۔ معاہدے کے نفاذ کا انحصار نیٹو پر ہے جس پر امریکا کا غلبہ ہے۔ اگر امریکا بوسنیا سے اپنی فوج نکال لیتا ہے تو نہ یورپی طاقتوں کو اور نہ روس کو معاہدے پر عملدرآمد جاری رکھنے سے رغبت ہوگی، بوسنیائی حکومت، سربوں اور کروٹس کو، تازہ دم ہونے کے بعد لڑائی دوبارہ شروع کرنے کی بہت زیادہ ترغیب ملے گی اور سربیائی اور کروشیائی حکومتیں عظیم تر سربیا اور عظیم تر کروشیا کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیں گی۔

رابرٹ پٹنام نے بیان کیا ہے کہ دو ریاستوں کے مابین مذاکرات ''دو سطحی کھیل'' ہوتے ہیں جن میں سفارتکار اپنے ملک کے اندر اور مخصوص حلقوں اور ان کی مناسبت سے دوسرے ملک کے اندر مخصوص حلقوں سے گفت وشنید کرتے ہیں۔ اسی طرح کے ایک تجزیے میں ہن ٹنگٹن نے بتایا کہ کسی مستبد حکومت میں اصلاح پسندوں کو حزب اختلاف کے اعتدال پسندوں سے جمہوریت لانے کے مسئلے پر گفت وشنید کرتے وقت حکومت کے اندر سخت موقف رکھنے والوں سے بھی بات چیت کرنی پڑے گی یا ان سے نمٹنا پڑے گا جبکہ اعتدال پسندوں کو بھی حزب اختلاف کے شدت پسندوں کے ساتھ اسی طرح کرنا پڑے گا۔[۵۸] ان دو سطحی کھیلوں میں کم از کم چار فریق ہوتے ہیں ورنہ تین تو ہوتے ہی ہیں جن کے درمیان چار روابط ہوتے ہیں۔ تاہم ایک پیچیدہ رخنہ جنگ سہ سطحی کھیل ہے جس میں کم از کم چھ فریق اور ان کے درمیان سات تعلقات ہوتے ہیں۔ (دیکھئے شکل ۱۱۔۱)۔

رخنوں کے ساتھ ساتھ افقی تعلقات پہلی، دوسری اور تیسری سطح کے فریقین کے درمیان ہوتے ہیں۔ فریقوں کے مابین عمودی تعلقات ہر تہذیب کے اندر مختلف درجوں پر ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک ''کامل نمونہ'' جنگ رکوانے میں مندرجہ ذیل کی ضرورت ہوگی:

- دوسری اور تیسری سطح کے فریقوں کی فعال شرکت؛
- تیسری سطح کے فریقوں کا لڑائی روکنے کے لیے موٹی موٹی شرائط طے کرانا؛
- تیسری سطح کے فریقوں کی جانب سے ترغیب اور دباؤ کا استعمال تاکہ دوسری سطح کے فریق ان شرائط کو قبول کریں اور پہلی سطح کے شرکا پر زور دیں کہ ان شرائط کو تسلیم کریں؛
- دوسری سطح کے شرکا کا اپنی حمایت واپس لے لینا بلکہ عملاً پہلی سطح کے فریقوں سے دغابازی کرنا؛ اور
- اس دباؤ کے نتیجے میں پہلی سطح کے شرکا کا شرائط قبول کر لینا گوکہ جب بھی ان کے مفاد میں ہوگا وہ ان کی خلاف ورزی کریں گے۔

بوسنیا کے قیام امن کے عمل میں یہ تمام عناصر شامل تھے۔ انفرادی کرداروں امریکا، روس، یورپی یونین کی معاہدہ کرانے کی کوششیں ناکام تھیں۔ مغربی طاقتیں اس عمل میں روس کو بھرپور طریقے سے شریک کرنے سے گریزاں تھیں۔ روس نے خود کو باہر رکھے جانے پر سخت احتجاج کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ اس کے سربوں سے تاریخی روابط ہیں اور بلقان میں دوسری بڑی طاقتوں سے زیادہ بلاواسطہ مفادات ہیں۔ روس کا اصرار تھا کہ وہ تنازعات کا تصفیہ کرنے میں بھرپور کردار ادا کرے گا اور اس نے ''امریکا کے اپنی شرائط منوانے کے رجحان'' کی شدید مذمت کی۔ روسیوں کو شامل کرنے کی ضرورت فروری ۱۹۹۴ء میں واضح ہوگئی۔ روس سے مشورہ کیے بغیر نیٹو نے بوسنیائی سربوں کو الٹی میٹم دیا کہ وہ سرائیوو کے گرد سے بھاری ہتھیار ہٹالیں ورنہ فضائی حملوں کا سامنا کریں۔ سربوں نے اس مطالبے کی مزاحمت کی اور نیٹو کے ساتھ پُرتشدد مقابلے کا امکان نظر آنے لگا۔ یلسن نے متنبہ کیا کہ ''بعض لوگ روس کی شرکت کے بغیر بوسنیا کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں'' اور ''ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔'' پھر روسی حکومت نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور سربوں کو راضی کر لیا کہ اگر روس سرائیوو کے علاقے میں اپنی امن فوج تعینات کرے تو وہ اپنے ہتھیار ہٹالیں گے۔ اس سفارتی انقلاب سے تشدد بڑھنے سے بچ گیا، مغرب پر ثابت ہوگیا کہ روس سربوں پر کتنا اثر و رسوخ رکھتا ہے اور روسی فوجیں اس علاقے کے قلب میں جا پہنچیں جو بوسنیائی مسلمانوں اور سربوں کے درمیان متنازع تھا۔[59] اس حکمت عملی کے ذریعے روس نے بوسنیا کے مسئلے

سے نمٹنے کے بارے میں مغرب کے ساتھ ''مساوی شرکت'' کا دعویٰ مستحکم کرلیا۔

تاہم اپریل میں نیٹو نے پھر سربیائی ٹھکانوں پر روس سے مشورہ کیے بغیر حملے کی منظوری دی۔ اس سے روس کے تمام سیاسی حلقوں میں زبردست منفی ردعمل پیدا ہوا اور یلسن اور کوزیریف کی قوم پرستانہ مخالفت مضبوط ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد تیسری سطح کی متعلقہ طاقتوں برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس اور امریکا نے تصفیہ کرنے کے لیے رابطہ گروپ بنایا۔ جون ۱۹۹۴ء میں اس گروپ نے ایک منصوبہ پیش کیا جس میں بوسنیا کا ۵۱ فیصد حصہ ایک مسلم کروٹ وفاق اور ۴۹ فیصد بوسنیائی سربوں کے حوالے کیا گیا۔ یہ منصوبہ بعد میں ڈیٹن معاہدے کی بنیاد بنا۔ اگلے سال ڈیٹن معاہدوں کے نفاذ کے لیے روس کی شرکت کے انتظامات کرنا ضروری ہوگیا۔

تیسری سطح کے شرکا کے درمیان معاہدوں کو دوسری اور پہلی سطح کے فریقوں سے قبول کرانا لازمی ہوتا ہے۔ جیسا کہ روسی سفارتکار وتالی چرکن نے کہا، امریکیوں کو بوسنیائیوں، جرمنوں کو کروٹس اور روسیوں کو سربوں پر دباؤ ڈالنا چاہیے۔[60] یوگوسلاویہ کی جنگوں کے ابتدائی مراحل میں روس نے سربیا کے خلاف معاشی پابندیوں پر اتفاق کرکے بہت بڑی رعایت دی تھی۔ روس نے قرابت دار ملک کی حیثیت سے، جس پر سرب بھروسا کرسکتے تھے، مختلف مواقع پر سربوں کو بعض حدود کا پابند کیا اور انہیں ایسے سمجھوتوں پر راضی کیا جو بصورت دیگر وہ مسترد کردیتے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۵ء میں روس نے یونان کے ہمراہ بوسنیائی سربوں کو ان ولندیزی امن فوجیوں کی رہائی پر رضامند کیا جنہیں وہ یرغمال بنائے ہوئے تھے۔ تاہم بعض اوقات بوسنیائی سرب ان معاہدوں سے پھر گئے جو انہوں نے روس کے دباؤ میں آکر قبول کرلیے تھے اور اس طرح روس کو شرمندہ کیا کہ وہ اپنے قرابت دار سے بات نہیں منوا سکا۔ مثال کے طور پر اپریل ۱۹۹۴ء میں روس نے بوسنیائی سربوں کی طرف سے گورازدے پر ان کا حملہ ختم کرانے کا معاہدہ کرایا لیکن سربوں نے معاہدہ توڑ دیا۔ روسی سخت مشتعل ہوئے: ایک روسی سفارتکار نے کہا کہ بوسنیائی سرب ''جنگ کرنے کے لیے پاگل ہوگئے ہیں۔'' یلسن نے زور دیا کہ ''سربیائی قیادت وہ عہد پورا کرے جو اس نے روس نے کیا ہے'' اور روس نے نیٹو کے فضائی حملوں پر اپنے اعتراضات واپس لے لیے۔[61]

کروشیا کی حمایت کرتے ہوئے اور اسے تقویت دیتے ہوئے جرمنی اور دوسری مغربی ریاستوں نے بھی کروشیائی رویے پر بند باندھے۔ صدر تجمین اپنے کیتھولک ملک کو یورپی ملک کی حیثیت سے تسلیم کرانے اور یورپی اداروں کی رکنیت کے لیے سخت متفکر تھے۔ مغربی طاقتوں نے کروشیا کو فراہم کردہ سفارتی، اقتصادی اور فوجی امداد اور ''کلب'' میں داخلے کی کروشیائی خواہش کو استعمال

کر کے تجمین کو بہت سے معاملات پر سمجھوتا کرنے پر مجبور کیا۔ مارچ ۱۹۹۵ء میں تجمین کو یہ موقف پیش کیا گیا کہ اگر وہ مغرب کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو انہیں کرائینا میں اقوام متحدہ کی حفاظتی فوج کو قیام کی اجازت دینی ہوگی۔ ایک یورپی سفارتکار نے کہا کہ ''مغرب میں شمولیت تجمین کے لیے بہت اہم ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ انہیں سربوں اور روسیوں کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا جائے۔'' جب ان کے فوجیوں نے کرائینا میں اور سربوں کی آبادی والے علاقے فتح کیے تو تجمین کو نسلی تطہیر کو محدود کرنے کے لیے بھی انتباہ کیا گیا اور اپنی یلغار مشرقی سلووینیا تک نہ پھیلانے کی تلقین کی گئی۔ ایک اور مسئلے پر کروشیائیوں سے کہا گیا کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ وفاق میں شریک نہ ہوئے تو، ایک امریکی عہدیدار کے الفاظ میں ''مغرب کے دروازے ان پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے''۔[۴۲] خصوصاً جرمنی کروشیائی رویے پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں تھا کیونکہ وہ کروشیا کے لیے مالیاتی امداد کا سب سے بڑا بیرونی وسیلہ تھا۔ امریکا نے کروشیا سے جو قریبی روابط پیدا کر لیے تھے انہوں نے بھی کم از کم ۱۹۹۵ء کے دوران تجمین کو اپنی بوسنیا ہرزیگووینا کو کروشیا اور سربیا کے درمیان بانٹنے کی خواہش پر عمل کرنے سے باز رکھا جس کا اظہار وہ اکثر کر چکے تھے۔

روس اور جرمنی کے برخلاف امریکا اپنے بوسنیائی ساتھی کے ساتھ ثقافتی اشتراک نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے وہ مسلمانوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے کمزور پوزیشن میں تھا۔ علاوہ ازیں امریکا نے بیان بازی کے سوا بوسنیائیوں کی صرف یہ مدد کی کہ ایران اور دوسرے مسلمان ممالک کی جانب سے ہتھیاروں پر پابندی کی خلاف ورزی کی طرف سے آنکھیں بند کیے رکھیں۔ نتیجتاً بوسنیائی مسلمان وسیع تر اسلامی برادری کے زیادہ شکر گزار رہے اور انہی کے ساتھ خود کو شناخت کرتے رہے۔ ساتھ ہی انہوں نے امریکا کے ''دہرے معیار'' پر جارحیت کو نہ روکنے پر، جیسے اس نے کویت کے خلاف روکی تھی، شدید مذمت کی۔ بوسنیائی مسلمانوں کے خود کو مظلوم کے لبادے میں پیش کرنے سے امریکا کے لیے ان پر دباؤ ڈالنا اور مشکل ہو گیا۔ اس طرح وہ امن تجاویز مسترد کرتے رہے، اپنے مسلمان دوستوں کی مدد سے فوجی قوت بڑھاتے رہے اور بالآخر خود کارروائی کر کے اپنا کھویا ہوا خاصا علاقہ واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔

پہلی سطح کے شرکا میں مفاہمت کے خلاف مزاحمت شدید ہوتی ہے۔ ماورائے قفقاز جنگ میں انتہائی قوم پرست آرمینیائی انقلابی وفاق (دشنک)، جو آرمینیائی منتشر آبادی میں بہت مضبوط تھا، نگورنو کاراباخ پر چھایا رہا، اس نے مئی ۱۹۹۳ء کی وہ ترک-روسی-امریکی امن تجویز مسترد کر دی جو آرمینیا اور آذربائیجان کی حکومتوں نے قبول کی تھی، فوجی یورشیں کیں جن میں نسلی تطہیر کے الزامات

لگے، وسیع تر جنگ کے امکانات پیدا کرنے کا سبب بنا اور نسبتاً اعتدال پسند آرمینیائی حکومت کے ساتھ اپنے تعلقات بگاڑ لیے۔ نگورنو کاراباخ کے حملے نے آرمینیا کے لیے مسائل کو جنم دیا جو ترکی اور ایران سے تعلقات بہتر بنانے کے لیے فکرمند تھا تا کہ جنگ اور ترکی کے راستہ بند کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غذا و توانائی کی قلت کی پریشانی کم ہو۔ ایک مغربی سفارتکار نے تبصرہ کیا کہ ''کاراباخ میں جتنی بہتر صورتحال ہو رہی ہے یریون کے لیے اتنی ہی مشکلات پیدا ہو رہی ہیں''۔[۶۳] آرمینیا کے صدر لیون ٹیر پٹروشین کو، صدر یلسن کی طرح، اپنی مقننہ میں قوم پرستوں کے دباؤ اور وسیع تر خارجہ پالیسی کے مفادات کے درمیان توازن پیدا کرنا پڑا اور ۱۹۹۴ء کے اواخر میں ان کی حکومت نے آرمینیا میں دشنک پارٹی پر پابندی عائد کردی۔

نگورنو کاراباخ کے آرمینیائیوں کی مانند بوسنیائی سربوں اور کروٹس نے سخت موقف اختیار کیے۔ نتیجے کے طور پر جب کروشیائی اور سربیائی حکومتیں امن کے عمل میں مدد کرنے کے لیے دباؤ میں آئیں تو اپنے بوسنیائی قرابت دار کے ساتھ ان کے تعلقات میں خرابیاں پیدا ہوئیں۔ کروٹس کے معاملے میں یہ خرابیاں کم سنگین تھیں کیونکہ بوسنیائی کروٹس عملاً نہیں تو رسمی طور پر مسلمانوں کے ساتھ وفاق میں شامل ہونے پر تیار ہو گئے تھے۔ اس کے مقابلے میں صدر میلاسووچ اور بوسنیائی سرب رہنما رادودن کاراجک کے درمیان تنازع ذاتی مخاصمت کی بنا پر شدید اور مشہور ہو گیا۔ اگست ۱۹۹۴ء میں کاراجک نے میلاسووچ کا منظور کردہ امن منصوبہ مسترد کر دیا۔ سربیائی حکومت نے، جو پابندیاں ختم کرانے کے لیے فکرمند تھی، اعلان کیا کہ وہ خوراک اور ادویات کے سوا بوسنیائی سربوں کے ساتھ تمام تجارتی تعلقات ختم کر رہی ہے۔ جواب میں اقوام متحدہ نے سربیا پر پابندیاں نرم کر دیں۔ اگلے برس میلاسووچ نے کروشیائی فوج کو سربوں کو کرائینا سے نکالنے اور کروشیائی اور مسلمان افواج کو انہیں شمال مغربی بوسنیا تک پیچھے دھکیلنے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے ٹجمین کے ساتھ یہ معاہدہ بھی کیا کہ سرب مقبوضہ مشرقی سلووینیا کو بتدریج دوبارہ کروشیائیوں کے زیر اقتدار لانے کی اجازت دی جائے گی۔ پھر بڑی طاقتوں کی منظوری سے میلاسووچ نے بوسنیائی سربوں کو اپنے وفد میں شامل کر کے انہیں عملاً ڈیٹن معاہدوں کے ''حوالے'' کر دیا۔

میلاسووچ کے اقدامات سے سربیا کے خلاف اقوام متحدہ کی پابندیاں ختم ہو گئیں۔ بین الاقوامی برادری کی طرف سے جو متحیر سی تھی محتاط انداز میں پسندیدگی کا اظہار بھی کیا گیا۔ ۱۹۹۲ء کا قوم پرست، جارح، نسلی تطہیر کرنے والا، عظیم تر سربیا کا علمبردار جنگجو ۱۹۹۵ء کا امن کا داعی بن چکا تھا۔ تاہم بیشتر سربوں کے لیے وہ غدار بن چکا تھا۔ بلغراد میں سربیائی قوم پرستوں نے اور آرتھوڈوکس کلیسا کے

رہنماؤں نے میلاسووچ کی شدید مذمت کی اور کرائینا اور بوسنیائی سربوں نے ان پر بغاوت کے الزامات عائد کیے۔ اس عمل میں انہوں نے وہی الزامات دہرائے جو غرب اردن کے آبادکاروں نے اسرائیلی حکومت پر تنظیم آزادی فلسطین سے معاہدہ کرنے پر لگائے تھے۔ رخنہ جنگ میں امن کی قیمت قرابت دار کی دغابازی ہے۔

جنگ کی تھکاوٹ اور تیسری سطح کے فریقوں کی ترغیبات اور دباؤ دوسری اور پہلی سطح کے شرکا میں تبدیلیاں لاتے ہیں۔ یا تو اعتدال پسند برسراقتدار انتہاپسندوں کی جگہ آجاتے ہیں یا پھر انتہاپسند میلاسووچ کی طرح اعتدال پسند بننا اپنے مفاد میں پاتے ہیں۔ مگر ان کے اس عمل میں کچھ خطرات ہوتے ہیں۔ جنہیں غدار تصور کیا جاتا ہے وہ دشمنوں سے کہیں زیادہ نفرت کا نشانہ بنتے ہیں۔ کشمیری مسلمانوں، چیچنیائیوں اور سری لنکن سنہالیوں کے رہنماؤں کو نصب العین سے دغا اور کٹر دشمن کے ساتھ مفاہمتی حل نکالنے کی کوشش کرنے پر سادات اور رابن جیسے انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۱۴ء میں ایک سربیائی قوم پرست نے آسٹریائی آرچ ڈیوک کو قتل کر دیا۔ ڈیٹن کے بعد اس کا نمایاں ترین ہدف سلوبودان میلاسووچ ہوتا۔

رخنہ جنگ کو روکنے کا معاہدہ اسی حد تک کامیاب ہوگا، خواہ عارضی طور پر ہو، جس حد تک وہ پہلی سطح کے شرکا کے درمیان طاقت کے مقامی توازن اور تیسری اور دوسری سطح کے فریقوں کے مفادات کا عکاس ہو۔ ۱۹۹۴ء میں جب سرب ملک کے ۷۰ فیصد علاقے پر قابض تھے، بوسنیا کی ۵۱ فیصد ۴۹-فیصد والی تقسیم چل نہیں سکتی تھی۔ یہ تقسیم اس وقت عملی طور پر ممکن ہوئی جب کروشیائیوں اور مسلمانوں کے حملوں نے سربیائی قبضہ کم کر کے تقریباً نصف تک محدود کر دیا۔ امن کے عمل کو نسلی تطہیر سے بھی مدد ملی جس کی وجہ سے سرب کروشیا کی آبادی کے ۳ فیصد سے بھی کم رہ گئے اور تینوں گروپوں کے ارکان بوسنیا میں جبراً یا رضاکارانہ طور پر الگ الگ کر دیے گئے۔ علاوہ ازیں جنگ میں قابل عمل حل نکالنے کے لیے دوسری اور تیسری سطح کے شرکا کے، جن میں مؤخر الذکر اکثر تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں ہوتی ہیں، حقیقی سلامتی کے یا گروہی مفادات ہونے چاہئیں۔ پہلی سطح کے شرکا تنہا رخنہ جنگوں کو نہیں روک سکتے۔ انہیں روکنے اور عالمی جنگ میں تبدیل نہ ہونے دینے کا انحصار دنیا کی بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کے اقدامات اور مفادات پر ہوتا ہے۔ رخنہ جنگیں نیچے سے ابلتی ہیں، رخنہ امن اوپر سے بہتے ہوئے آتا ہے۔

حصہ پنجم

تہذیبوں کا مستقبل

بارھواں باب

مغرب، تہذیبیں اور تہذیب

مغرب کا احیا؟

تاریخ کم از کم ایک بار ختم ہوتی ہے اور ہر تہذیب کی تاریخ میں کئی بار۔ جب تہذیب کی آفاقی ریاست پیدا ہوتی ہے تو اس کے افراد کو ٹائن بی کے الفاظ میں ''ہمیشگی کا سراب'' اندھا کر دیتا ہے اور انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ انسانی معاشرے کی آخری صورت وہی ہے جو ان کے معاشرے کی ہے۔ سلطنت روما، عباسی خلافت، مغلیہ سلطنت اور عثمانی سلطنت سب کے ساتھ یہی ہوا۔ ان آفاقی ریاستوں کے شہری ''بیّن حقائق کے برخلاف... اسے ویرانے میں رات بھر کا بسیرا نہیں سمجھتے بلکہ ارض موعود اور انسانی کاوشوں کا حاصل خیال کرتے ہیں۔'' یہی بات برطانوی سلطنت کے عروج پر اُس کے بارے میں بھی درست تھی۔ ۱۸۹۷ء میں انگریز متوسط طبقے کے لیے'' جیسا کہ انہیں نظر آ رہا تھا، تاریخ ان کے لیے ختم ہو چکی تھی... اور وہ خود کو انبساط کی اُس مستقل کیفیت پر مبارکباد کا مستحق سمجھتے تھے جو تاریخ کے اس خاتمے نے ان کو عطا کی''[1] تاہم وہ معاشرے جو یہ فرض کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ ختم ہو چکی ہے عموماً وہ معاشرے ہوتے ہیں جن کی تاریخ زوال پذیر ہونے والی ہو۔

کیا مغرب اس اصول سے مستثنیٰ ہے؟ دو کلیدی سوالات میلکو نے بہت اچھی طرح تشکیل دیے ہیں:

اول، کیا مغربی تہذیب ایک نئی نوع ہے، اپنے طور پر ایک علیحدہ طبقہ، جو آج تک وجود میں آنے

والی دوسری تمام تہذیبوں سے مختلف ہے؟

دوم، کیا اس کی عالمگیر توسیع سے دوسری تمام تہذیبوں کی ترقی کا امکان خطرے میں پڑ جاتا ہے (یا بہتر ہو جاتا ہے)؟[۲]

فطری امر ہے کہ بیشتر اہلِ مغرب ان دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں دینے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور شاید وہ درست سوچتے ہیں۔ بہرکیف ماضی میں دوسری تہذیبوں کے لوگوں نے بھی اسی طرز پر سوچا اور غلط سوچا۔

مغرب بلاشبہ اس لحاظ سے آج تک وجود میں آنے والی دوسری تمام تہذیبوں سے مختلف ہے کہ اس کا ۱۵۰۰ء سے اب تک ساری دیگر تہذیبوں پر گہرا اثر پڑا ہے۔ اس نے جدیدیت اور صنعت کاری کا بھی آغاز کیا جو عالمگیر ہوگئی اور نتیجے کے طور پر دوسری سب تہذیبوں کے معاشرے دولت اور جدت میں مغرب تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ تاہم کیا مغرب کی ان خصوصیات کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ارتقا اور حرکیات اساسی اعتبار سے دوسری تمام تہذیبوں سے مختلف ہیں؟ تاریخ کے شواہد اور تہذیبوں کی تقابلی تاریخ کے محقق کچھ اور کہتے ہیں۔ اب تک مغرب نے اپنے سفر میں ان ارتقائی نمونوں سے بہت انحراف نہیں کیا ہے جو ساری تاریخ میں تہذیبوں میں مشترک رہے ہیں۔ اسلامی احیا اور ایشیا کے معاشی تحرک سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری تہذیبیں زندہ اور جاندار ہیں اور کم از کم ممکنہ طور پر مغرب کے لیے خطرہ ہیں۔ مغرب اور دوسری تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کے درمیان بڑی جنگ ناگزیر نہیں، مگر ہو سکتی ہے۔ اس کی بجائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مغرب کا بتدریج اور بے قاعدہ زوال جو بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا تھا، عشروں بلکہ شاید صدیوں تک جاری رہے۔ یا یہ ہوسکتا ہے کہ مغرب میں احیا کا دور آئے، وہ عالمی امور میں اپنے اثرات کے زوال کا عمل الٹ دے اور اپنی قائدانہ حیثیت پھر مضبوط بنالے جس کی دوسری تہذیبیں تقلید اور نقالی کریں۔

کیرول کوئیگلی نے تہذیبوں کے ارتقا کے سات مراحل بتائے ہیں اور یہ تہذیبوں کے تاریخی ارتقا کی غالباً سب سے مفید درجہ بندی ہے۔[۳] (دیکھیے صفحہ ۴۹) کوئیگلی کے استدلال کے مطابق ۳۷۰ء اور ۷۵۰ء کے درمیان رفتہ رفتہ مغربی تہذیب کی صورت پذیری شروع ہوئی اور اس میں کلاسیکی، سامی، مسلم اور غیر مہذب (barbarian) ثقافتوں کے عناصر شامل ہوئے۔ اس کے زمانہ حمل کے بعد، جو آٹھویں صدی کے وسط سے لے کر دسویں صدی کے اختتام تک رہا، یکے بعد دیگرے توسیع اور تنازع کے مراحل کا دور آیا جو تہذیبوں میں غیر معمولی ہے۔ کوئیگلی کے مطابق اور تہذیبوں کے دوسرے محققین کی نگاہ میں بھی اس وقت مغرب بظاہر تنازع کے مرحلے سے نکل رہا ہے۔ مغربی

تہذیب حفاظتی حصار بن گئی ہے۔ مغرب کے اندر مختلف اقوام میں جنگیں، سوائے ایک اتفاقی سرد جنگ کے، تقریباً ناقابلِ تصور ہیں۔ جیسا کہ دوسرے باب میں کہا گیا، مغرب میں ایک آفاقی سلطنت کا متبادل پیدا ہو رہا ہے جو کنفیڈریشنوں، وفاقوں، حکومتوں اور باہمی تعاون کے دوسرے اداروں کے ایک پیچیدہ نظام کی شکل میں ہے جو تہذیبی سطح پر جمہوری و تکثیری سیاست سے اس کی وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مغرب ایک پختہ معاشرہ بن گیا ہے اور اس دور میں داخل ہو رہا ہے جسے تہذیبوں کے اس سیلِ رواں میں مستقبل کی نسلیں ''سنہری زمانہ'' کہیں گی، امن کا وہ زمانہ جو کوئیگلی کے الفاظ میں ''تہذیبوں کے علاقے کے اندر باہم محاذ آرا اکائیوں کی عدم موجودگی اور باہر کے معاشروں کے ساتھ کشمکش کی دوری بلکہ عدم موجودگی'' کے نتیجے میں شروع ہوا۔ یہ خوشحالی کا زمانہ بھی ہے جو ''اندرونی جنگی تباہی کے خاتمے، اندرونی تجارتی بندشوں کی کمی، اوزان، پیمائش اور سکے کے مشترکہ نظام کے قیام اور سرکاری اخراجات کے وسیع نظام سے جو ایک آفاقی سلطنت کے قیام سے منسلک ہے'' نمودار ہوا۔

گزشتہ تہذیبوں میں پُرمسرت سنہری دور کا یہ مرحلہ جس میں ہمیشگی کے تصورات جنم لیتے ہیں یا تو کسی بیرونی معاشرے کی فتح کے نتیجے میں ڈرامائی انداز میں اور تیزی سے ختم ہوا یا پھر اتنی ہی اذیت کے ساتھ داخلی شکست و ریخت کے باعث انجام کو پہنچا۔ کسی تہذیب کے اندر جو کچھ ہو رہا ہو وہ بیرونی ذرائع سے اس کی بربادی کو روکنے کی صلاحیت کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا داخلی انتشار سے بچنے کے لیے۔ کوئیگلی نے ۱۹۶۱ء میں کہا کہ تہذیبیں اس لیے پروان چڑھتی ہیں کہ ان کے اندر کوئی ''آلہ توسیع'' ہوتا ہے، یعنی فوجی، مذہبی، سیاسی یا اقتصادی ادارہ جو فاضل مقدار کو اکٹھا کرتا ہے اور اسے پیداواری اختراعات میں لگاتا ہے۔ تہذیبیں اس وقت زوال پذیر ہوتی ہیں جب وہ ''فاضل مقدار کو کام کرنے کے نئے طریقوں پر لاگو کرنا [چھوڑ دیتی ہیں]۔ جدید اصطلاحات میں ہم کہیں گے کہ سرمایہ کاری کی شرح گھٹ جاتی ہے۔'' یہ اس لیے ہوتا ہے کہ فاضل مقدار پر قابض سماجی گروہوں کا پوشیدہ مفاد اسے ''غیر مقداری لیکن انا پرستانہ مقاصد'' کے لیے استعمال کرنے میں ہوتا ہے جس سے ''فاضل مقدار خرچ تو ہوتی ہے لیکن پیداوار کے زیادہ مؤثر طریقے فراہم نہیں ہوتے۔'' لوگ اپنے سرمائے پر زندگی بسر کرتے ہیں اور تہذیب آفاقی ریاست کے مرحلے سے زوال کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ

> شدید اقتصادی کساد بازاری، زوال پذیر معیار زندگی، مختلف پوشیدہ مفادات کے درمیان خانہ جنگیوں اور بڑھتی ہوئی ناخواندگی [کا دور ہوتا ہے]۔ سماج کمزور سے کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔

قانون سازی کے ذریعے زیاں کو روکنے کی لاحاصل کوششیں کی جاتی ہیں۔ لیکن زوال جاری رہتا ہے۔ معاشرے کے مذہبی، علمی، سماجی اور سیاسی طبقات عام لوگوں کی وفاداری سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نئی مذہبی تحریکیں معاشرے کو لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ لوگ معاشرے کے لیے لڑنے بلکہ محصولات ادا کر کے بھی اس کی مدد کرنے میں پس وپیش کرنے لگتے ہیں۔

پھر زوال یلغار کے مرحلے کی طرف لے جاتا ہے ''جب تہذیب، جو اس لیے اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں کہ وہ اپنا دفاع کرنے پر آمادہ نہیں، 'وحشی حملہ آوروں' کے لیے کھلی ہوتی ہے'' جو اکثر ''کسی اور، جواں تر اور طاقتور تر تہذیب'' سے تعلق رکھتے ہیں۔

بااین ہمہ سب سے بڑھ کر تاریخ کا سبق یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ممکن ہیں لیکن کوئی چیز ناگزیر نہیں۔ تہذیبیں اپنی اصلاح اور احیا کو ممکن بنا سکتی ہیں اور بنا چکی ہیں۔ مغرب کے لیے مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ آیا بیرونی چیلنجوں سے قطع نظر وہ اپنے زوال کے داخلی عمل کو روکنے اور الٹ دینے کے قابل ہے۔ کیا مغرب اپنا احیا کر سکتا ہے یا مسلسل داخلی انحطاط اس کو تیزی سے اختتام کی سمت لے جائے گا اور/یا وہ دیگر تہذیبوں سے مغلوب ہو جائے گا جو اقتصادی اور آبادیاتی اعتبار سے زیادہ متحرک ہیں۔☆

۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں مغرب میں ایسی بہت سی خصوصیات تھیں جنھیں کوئیگلی نے زوال سے دوچار پختہ تہذیب کے خواص قرار دیا ہے۔ معاشی اعتبار سے مغرب دوسری تہذیبوں سے کہیں زیادہ دولت مند تھا، لیکن معاشی نمو کی شرحیں، بچت کی شرحیں اور سرمایہ کاری کی شرحیں خصوصاً مشرقی ایشیا کے سماجوں کے مقابلے میں کم تھیں۔ انفرادی اور اجتماعی صرف وخرچ کو مستقبل کے لیے اقتصادی وفوجی طاقت بڑھانے پر ترجیح حاصل تھی۔ آبادی میں اضافے کا تناسب کم تھا خصوصاً اسلامی ملکوں کے مقابلے میں۔ تاہم یہ ناگزیر نہیں کہ یہ مسائل تباہ کن نتائج کا باعث بنیں۔ مغربی معیشتیں اب بھی ترقی کر رہی ہیں؛ مجموعی طور پر مغربی اقوام کی حالت میں بہتری آ رہی ہے اور

☆ کوئیگلی نے یہ نتیجہ نکالا ہے جس میں کی گئی پیشگوئی درست ہو سکتی ہے لیکن مصنف کے اپنے نظریاتی وتجرباتی تجزیے سے اخذ نہیں کی جا سکتی ہے: ''مغربی تہذیب لگ بھگ ۵۰۰ء میں موجود نہیں تھی؛ ۱۵۰۰ء میں بھرپور وجود نہیں رکھتی تھی اور یقینی طور پر مستقبل میں کسی وقت معدوم ہو جائے گی شاید ۲۵۰۰ء سے پہلے۔'' کوئیگلی کا کہنا ہے کہ اس کے بعد چین اور بھارت میں نئی تہذیبیں مغرب کی جگہ آئیں گی، ان کی توسیع کے مراحل شروع ہوں گے اور مغربی اور آرتھوڈوکس دونوں تہذیبوں کے لیے خطرہ بنیں گے۔ کیرول کوئیگلی، *The Evolution of Civilizations: An Introduction to Historical Analysis* (انڈیاناپولس: لبرٹی پریس، ۱۹۷۹ء؛ پہلی بار مکملن نے ۱۹۶۱ء میں شائع کی)، صفحات ۱۲۷، ۱۶۴ تا ۱۶۶۔

مغرب ابھی تک سائنسی تحقیق اور تیکنیکی اختراعات میں رہبر کی حیثیت کا حامل ہے۔ ولادت کی کم شرحوں کا مسئلہ حکومتیں حل نہیں کرسکتی تھیں (جن کی یہ کوششیں آبادی میں اضافہ روکنے کی کوششوں سے بھی زیادہ ناکام ہوتی ہیں)۔ تاہم نقل مکانی نئی توانائی اور انسانی سرمائے کا ممکنہ وسیلہ تھی اگر دو شرائط پوری ہوتیں: اول، اگر اہل، قابل، توانا افراد کو ترجیح دی جاتی جو میزبان ملک کی ضروریات کے مطابق صلاحیتوں اور مہارتوں سے آراستہ ہوتے؛ دوم، اگر نئے تارکین اور ان کی اولاد اس ملک اور مغرب کی ثقافت میں رچ بس جاتے۔ امریکا کو پہلی اور یورپی ملکوں کو دوسری شرط پوری کرنے میں مسائل کا سامنا ہونے کا امکان تھا۔ تاہم مغربی حکومتوں کے پاس تارکین کے طبقات، علاقوں کے انتخاب، خصوصیات اور ان کے رچنے بسنے کے عمل سے متعلق پالیسیاں تشکیل دینے کا تجربہ بھی ہے اور اہلیت بھی۔

معاشیات اور آبادیات سے کہیں زیادہ اہم مغرب میں اخلاقی انحطاط، ثقافتی خودکشی اور سیاسی نفاق کے مسائل ہیں۔ اخلاقی انحطاط کی جن علامات کی اکثر نشاندہی کی جاتی ہے ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

۱۔ سماج دشمن رویے میں اضافہ جیسے جرائم، منشیات کا استعمال اور عام تشدد کا رجحان؛
۲۔ خاندان کی ٹوٹ پھوٹ جن میں طلاق کی شرحوں، ناجائز بچوں کی پیدائش، نوعمر لڑکیوں کا حاملہ ہونا اور صرف باپ یا صرف ماں پر مشتمل خاندانوں میں اضافہ شامل ہے؛
۳۔ کم از کم امریکا میں ''سماجی سرمائے'' میں کمی یعنی رضا کار انجمنوں کی رکنیت اور ایسی رکنیت سے وابستہ باہمی اعتماد میں کمی۔
۴۔ ''اخلاقیات کار'' میں عمومی طور پر کمزوری اور ذاتی عیش وعشرت کے رجحان کا بڑھنا؛
۵۔ علم وحکمت سے وابستگی میں کمی جس کا اظہار امریکا میں علمی کارناموں کی کمتر سطحوں سے ہوتا ہے۔

مغرب کی آئندہ صحت اور دوسرے معاشروں پر اس کے اثر ورسوخ کا دارومدار خاصی حد تک ان رجحانات سے کامیابی سے نمٹنے پر ہے جو بلاشبہ مسلمانوں اور ایشیائیوں کی جانب سے اخلاقی برتری کے دعووں کا سبب بنتے ہیں۔

مغربی معاشروں کے اندر بھی کچھ گروہ مغربی ثقافت کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ دوسری تہذیبوں کے تارکین ہیں جو معاشرے میں گھلنے ملنے سے منکر ہوتے ہیں اور اپنے آبائی معاشروں کی اقدار، رواجوں اور ثقافتوں سے وابستہ رہتے ہیں اور ان کو فروغ دیتے ہیں۔ یہ

بات سب سے زیادہ یورپ میں مقیم مسلمانوں میں دیکھنے میں آتی ہے جو بہرحال چھوٹی اقلیت ہیں۔ اس سے کچھ کم امریکا میں ہسپانوی نژاد افراد میں یہ رجحان نظر آتا ہے جو بڑی اقلیت ہیں۔ ان کے معاملے میں اگر رچنے بسنے کا عمل نہ ہوسکا تو امریکا شکستہ ملک بن جائے گا اور اس میں داخلی انتشار اور عدم اتحاد کے وہ تمام امکانات ہوں گے جو ایسے ملکوں میں ہوتے ہیں۔ یورپ میں مغربی تہذیب اپنے مرکزی عنصر عیسائیت کی کمزوری کی وجہ سے بھی تباہ ہوسکتی ہے۔ ایسے یورپی افراد کی تعداد کم سے کم ہوتی جارہی ہے جو مذہبی عقائد کو مانتے ہیں، مذہبی رسوم ورواج پر عمل کرتے ہیں اور مذہبی سرگرمیوں میں شریک ہوتے ہیں۔[5] یہ رجحان مذہب دشمنی سے زیادہ مذہب سے بیگانگی کا عکاس ہے۔ تاہم مسیحی تصورات، اقدار اور رسومات یورپی تہذیب میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک سویڈ نے کہا ''سویڈ غالباً یورپ میں سب سے غیر مذہبی لوگ ہیں لیکن جب تک آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے ادارے، معاشرتی رواج، خاندان، سیاست اور طرز زندگی بنیادی طور پر ہمارے لوتھرن ورثے سے تشکیل پائے ہیں تب تک آپ اس ملک کو نہیں سمجھ سکتے۔'' اہل یورپ کے برخلاف امریکی زیادہ تر خدا پر یقین رکھتے ہیں، خود کو مذہبی سمجھتے ہیں اور بڑی تعداد میں گرجا گھروں میں جاتے ہیں۔ اگرچہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط تک امریکا میں مذہب کے احیا کے شواہد موجود نہ تھے تاہم اگلے عشرے میں مذہبی سرگرمیوں میں تیزی دکھائی دے رہی تھی۔[6] مغرب کے لوگوں میں عیسائیت کے خاتمے کو مغربی تہذیب کی خیروعافیت کے لیے زیادہ سے زیادہ بہت طویل مدتی خطرہ کہا جاسکتا ہے۔

امریکا میں اس سے زیادہ فوری اور خطرناک چیلنج موجود ہے۔ تاریخی اعتبار سے امریکا کا قومی تشخص ثقافتی طور پر مغربی تہذیب کے ورثے اور سیاسی طور پر امریکی شعار (American Creed) کے اصولوں سے متعین ہوا ہے جس پر امریکیوں کی بڑی اکثریت یقین رکھتی ہے: آزادی، جمہوریت، فرد پسندی، قانونی مساوات، آئین، نجی ملکیت۔ بیسویں صدی کے اواخر میں امریکی تشخص کے دونوں اجزا اہلِ علم اور تشہیر بازوں کی ایک مختصر لیکن بااثر تعداد کے زبردست اور مستقل حملے کی زد میں آگئے ہیں۔ کثیر ثقافتی نظریے کے نام پر انہوں نے مغربی تہذیب کے ساتھ امریکا کے تشخص کو ہدف تنقید بنایا ہے، مشترکہ امریکی ثقافت کے وجود سے انکار کیا ہے اور نسلی اور دیگر ذیلی قومی ثقافتی شناختوں اور گروہ بندیوں کو فروغ دیا ہے۔ انہی کی ایک رپورٹ کے الفاظ میں، انہوں نے تعلیم کے شعبے میں ''یورپی ثقافت اور اس سے ماخوذ عناصر کی جانب باقاعدہ جھکاؤ'' اور ''یورپی امریکی یک ثقافتی نقطہ نظر کے غلبے'' کی مذمت کی ہے۔ جیسا کہ آرتھر ایم شلیسنگر جونیر نے کہا، کثیر ثقافت کے حامی ''زیادہ تر نسلیت کے دائرے میں قید وہ علیحدگی پسند ہوتے ہیں جنہیں

مغربی جرائم کے سوا مغربی ورثے میں کچھ نظر نہیں آتا۔'' ان کا ''میلان یہ ہوتا ہے کہ امریکیوں کو گنہ آلود یورپی ورثے سے نجات دلائی جائے اور غیر مغربی ثقافتوں کی برکتوں سے متمتع ہوا جائے''۔[۷]

کثیر ثقافتی رجحان کا اظہار ۱۹۶۰ء کے عشرے کے شہری حقوق کے قوانین کے بعد قانون سازی کے مختلف اقدامات میں ہوا اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں کلنٹن انتظامیہ نے کثرت وتنوع کی حوصلہ افزائی کو اپنا ایک اہم مقصد بنا لیا۔ ماضی سے موازنہ کیا جائے تو تضاد نمایاں ہے۔ ملک کے بانیوں نے تنوع کو ایک حقیقت اور مسئلہ سمجھا تھا: پس انہوں نے e pluribus unum کا قومی نصب العین اپنایا جو بنجمن فرینکلن، ٹامس جیفرسن اور جان ایڈمز پر مشتمل کمیٹی نے چنا تھا۔ بعد میں نسلی، گروہی، معاشی اور ثقافتی اختلافات کے خطرات سے (جس کی بنا پر ۱۸۱۵ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان صدی کی سب سے بڑی جنگ ہوئی) خوفزدہ سیاسی رہنماؤں نے بھی ''سب ایک ہو جائیں'' کے نعرے میں آواز ملائی اور قومی اتحاد کے فروغ کو اپنی مرکزی ذمے داری ٹھہرایا۔ تھیوڈور روزویلٹ نے خبردار کیا کہ ''اس قوم کو تباہی سے دوچار کرنے اور قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے سے روکنے کا واحد مطلقاً یقینی طریقہ یہ ہے اسے باہم دست وگریباں قومیتوں کا ملغوبہ بنا دیا جائے''۔[۸] تاہم ۱۹۹۰ء کی دہائی میں امریکا کے رہنماؤں نے اپنے عوام میں اتحاد کی بجائے اختلاف کی نا صرف اجازت دی بلکہ تندہی سے اس کی ترویج بھی کی۔

دوسرے ملکوں کے رہنما بھی، جیسا کہ تذکرہ ہو چکا ہے، بعض اوقات اپنے ثقافتی ورثے کو رد کرنے اور اپنے ملک کی شناخت کو ایک تہذیب سے دوسری میں بدلنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے آج تک کوئی کامیاب نہیں ہوا بلکہ ان رہنماؤں کی کوششوں کے نتیجے میں منقسم تشخص کے حامل مقطوع ممالک پیدا ہوئے ہیں۔ امریکا کے کثیر ثقافت کے حامی بھی اسی طرح اپنے ملک کے ثقافتی ورثے کو مسترد کرتے ہیں۔ امریکا کو کسی اور تہذیب سے منسلک کرنے کی بجائے وہ بہت سی تہذیبوں کا ملک وجود میں لانا چاہتے ہیں جس کا مطلب ہے کسی بھی تہذیب سے ربط اور ثقافتی بنیاد سے محرومی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس طرح تشکیل شدہ کوئی بھی ملک طویل عرصے تک ہم آہنگ معاشرے کی حیثیت سے قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک کثیر تہذیبی امریکا، ریاست ہائے متحدہ امریکا نہیں ہوگا، اقوام متحدہ ہوگا۔

کثیر ثقافت کے حامیوں نے امریکی شعار کے ایک مرکزی عنصر کو بھی چیلنج کیا اور افراد کے حقوق کی جگہ گروہوں کے حقوق کی بات کی جو نسل، جنس اور جنسی رجحانات کی بنیاد پر تشکیل دیے گئے ہوں۔ گنر مرڈل نے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں یہ بات کہی تھی جس سے ہیکٹر سینٹ جان ڈی کریوکور اور

الیکسز ڈی ٹوکیول تک غیر ملکی مبصرین کے تبصروں کو تقویت ملتی ہے، کہ ''اس عظیم اور مختلف النوع قوم کی ساخت میں'' امریکی شعار کی حیثیت سیمنٹ کی سی رہی ہے۔ رچرڈ ہوفسٹیڈر نے اتفاق کیا کہ ''من حیث القوم ہماری تقدیر یہ رہی ہے کہ کوئی نظریات نہ ہوں بلکہ ہم ایک رہیں''۔[9] اگر شہریوں کی خاصی تعداد اس نظریے کو مسترد کر دیتی ہے تو امریکا کا کیا ہوگا؟ ایک اور بڑے ملک سوویت یونین کا انجام امریکیوں کے لیے مقام عبرت ہے جس کی یکجہتی و اتحاد کا تعین امریکا سے بھی بڑھ کر نظریاتی حوالوں سے کیا گیا تھا۔ جاپانی فلسفی تاکیشی اومے ہارا نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ''مارکسزم کی مکمل ناکامی... اور سوویت یونین کی ڈرامائی ٹوٹ پھوٹ مغربی لبرل ازم کے، جو جدیدیت کا اصل دھارا ہے، انہدام کا پیش خیمہ ہیں۔ مارکسزم کا متبادل اور تاریخ کے خاتمے پر غالب نظریہ بننے کی بجائے لبرل ازم اگلی دیوار ہوگی جو گرے گی''۔[10] اس دور میں جب اقوام ہر جگہ ثقافتی حوالوں کو اپنی پہچان قرار دے رہی ہیں ایسے سماج کا کیا مقام ہے جس کی ثقافتی بنیاد نہ ہو اور اس کا تعین فقط سیاسی شعار سے کیا جائے؟ پائیدار برادری کی تعمیر کے لیے سیاسی اصول کمزور اساس ہیں۔ ایک کثیر تہذیبی دنیا میں جہاں اہمیت ثقافت کی ہے، ہوسکتا ہے کہ امریکا محض اُس زوال پذیر مغربی دنیا کی بے جوڑ باقیات میں سے ہو جہاں نظریات کی اہمیت تھی۔

امریکی شعار اور مغربی تہذیب کے استرداد کا مطلب اُس ریاست ہائے متحدہ امریکا کا خاتمہ ہے جس سے ہم آشنا ہیں۔ اس کا مطلب مغربی تہذیب کا عملاً خاتمہ بھی ہے۔ اگر امریکا سے مغربیت خارج ہوگئی تو مغرب یورپ اور چند بہت کم آبادی والے یورپی آباد کار ممالک تک محدود رہ جائے گا۔ امریکا کے بغیر مغرب کی حیثیت صرف اتنی رہ جائے گی کہ وہ دنیا کی آبادی کا ایک بہت مختصر زوال پذیر حصہ ہوگا جو یوریشین خطہ زمین کے کونے پر ایک چھوٹے اور غیر اہم جزیرہ نما پر آباد ہوگا۔

کثیر ثقافت کے حامیوں اور مغربی تہذیب اور امریکی شعار کا دفاع کرنے والوں کے مابین تصادم جیمز کرتھ کے الفاظ میں مغربی تہذیب کے امریکی جزو کے اندر ''حقیقی تصادم'' ہے۔[11] امریکی اس قضیے سے دامن نہیں بچا سکتے: ہم مغربی قوم ہیں یا کچھ اور ہیں؟ امریکا اور مغرب کے مستقبل کا انحصار امریکیوں کے مغربی تہذیب سے وابستگی کا ازسرنو اثبات کرنے پر ہے۔ ملکی سطح پر اس کا مطلب ہے کثیر ثقافت کی تقسیم کرنے والی خطرے کی گھنٹیوں کو مسترد کرنا۔ بین الاقوامی سطح پر اس کا مطلب ہے امریکا کو ایشیا کے ساتھ شناخت کرنے کے ناقابل فہم اور پُرفریب مطالبات کو مسترد کرنا۔ ایشیا اور امریکا میں اقتصادی تعلقات کچھ بھی ہوں ان کے معاشروں میں بنیادی ثقافتی خلیج کے باعث ان کا یکجا ہونا محال ہے۔ اہل امریکا ثقافتی اعتبار سے یورپی خاندان کا حصہ ہیں؛ کثیر ثقافت کے

حامی اس تعلق کو نقصان تو پہنچا سکتے ہیں بلکہ برباد کر سکتے ہیں لیکن اس کی جگہ کوئی اور تعلق نہیں لا سکتے۔ جب امریکی اپنی ثقافتی جڑیں ڈھونڈیں گے انہیں یورپ میں ملیں گی۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط میں مغرب کی نوعیت اور مستقبل کے بارے میں نئی بحث ہوئی، نئے سرے سے یہ اعتراف کیا گیا کہ اس حقیقت کا وجود ہے اور اس بارے میں تشویش بڑھی کہ اس کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا جائے۔ اس کا جزوی سبب یہ تھا کہ اہم مغربی ادارے نیٹو میں مشرق کی سمت واقع مغربی ممالک کی شمولیت کے لیے توسیع کی ضرورت محسوس کی گئی اور یوگوسلاویہ کی تقسیم پر ردعمل کے حوالے سے سخت اختلافات پیدا ہوئے۔ اس سے سوویت خطرے کی عدم موجودگی میں مغرب کی آئندہ یکجہتی کے بارے میں اور خاص طور پر یورپ سے امریکا کی وابستگی کے حوالے سے تشویش کی عکاسی ہوئی۔ جوں جوں طاقتور غیر مغربی معاشروں سے مغربی ممالک کا ربط ضبط بڑھ رہا ہے، انہیں اپنے مشترکہ ثقافتی مرکز اور اساس کا زیادہ سے زیادہ احساس ہوتا جا رہا ہے جو انہیں ایک بندھن میں باندھتی ہے۔ بحر اوقیانوس کے دونوں جانب کے رہنماؤں نے اوقیانوسی برادری کو پھر زندہ و متحرک کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء میں جرمن اور برطانوی وزراء دفاع، فرانسیسی و امریکی وزراء خارجہ، ہنری کسنجر اور دیگر مختلف صف اول کی شخصیات نے اس نصب العین کے حق میں آواز اٹھائی۔ ان کے موقف کا خلاصہ برطانوی وزیر دفاع میلکم رفکنڈ نے بیان کیا جنہوں نے نومبر ۱۹۹۴ء میں نکتہ پیش کیا کہ چار ستونوں پر قائم ''اوقیانوسی برادری'' کی ضرورت ہے: نیٹو کی صورت میں دفاع اور سلامتی؛ ''قانون کی حکمرانی اور پارلیمانی جمہوریت پر مشترکہ یقین''؛ ''لبرل سرمایہ داری اور آزاد تجارت''؛ اور ''مشترکہ یورپی ورثہ جو یونان و روما سے برآمد ہوکر اور نشاۃ ثانیہ سے گزرتے ہوئے ہمارے اپنے ملک کی مشترکہ اقدار، عقائد اور تہذیب تک آتا ہے''۔[۱۲]

۱۹۹۵ء میں یورپی کمیشن نے ماورائے اوقیانوس تعلقات کو ''بحال'' کرنے کا ایک منصوبہ شروع کیا جس کے نتیجے میں یورپی یونین اور امریکا کے درمیان ایک وسیع معاہدے پر دستخط ہوئے۔ ساتھ ہی یورپی سیاسی و تجارتی رہنماؤں نے ماورائے اوقیانوس آزاد تجارتی علاقے کی تشکیل کی حمایت کی۔ اگرچہ AFL-CIO نے نیفٹا اور تجارتی آزادی کے دوسرے اقدامات کی مخالفت کی تاہم اس کے سربراہ نے ایسے ماورائے اوقیانوس آزاد تجارتی معاہدے کی گرمجوشی سے حمایت کی جس سے امریکی روزگار کو کم اجرت والے ممالک سے مسابقت کا خطرہ نہ ہو۔ یورپی اور امریکی دونوں کے قدامت پسندوں (بالترتیب مارگریٹ تھیچر اور نیوٹ گنگرچ) نیز کینیڈین اور دیگر برطانوی

رہنماؤں نے بھی اس کی حمایت کی۔

جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر ہوا، مغرب پہلے ترقی و توسیع کے یورپی مرحلے سے گزرا جو کئی صدیوں تک چلا۔ پھر دوسرا امریکی مرحلہ بیسویں صدی میں آیا۔ اگر شمالی امریکا اور یورپ اپنی اخلاقی زندگی میں نئی روح پھونک دیں، ثقافتی اشتراک کو مستحکم کریں اور نیٹو میں سلامتی کے تعاون کے ساتھ ساتھ اقتصادی و سیاسی اتحاد بڑھائیں تو مغربی معاشی خوشحالی اور سیاسی اثر ورسوخ کے تیسرے یورو امریکی مرحلے کا آغاز ہوسکتا ہے۔ بامعنی سیاسی اتحاد سے دنیا کے لوگوں، اقتصادی پیداوار اور فوجی صلاحیت میں مغرب کے کم ہوتے ہوئے حصے کی کسی حد تک تلافی ہوسکتی ہے اور دوسری تہذیبوں کے رہنماؤں کی نگاہ میں مغرب کی طاقت بحال ہوسکتی ہے۔ وزیراعظم مہاتیر نے ایشیائیوں کو خبردار کیا کہ ''یورپی یونین اور نیفٹا کا اتحاد اپنے تجارتی اثر ورسوخ سے بقیہ دنیا پر اپنی شرائط مسلط کرسکتا ہے''۔[۱۳] مغرب کے سیاسی و معاشی اعتبار سے یکجا ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا امریکا مغربی قوم کی حیثیت سے اپنے تشخص کا ازسرنو اثبات کرتا ہے اور مغربی تہذیب کے قائد کے طور پر اپنے عالمی کردار کا تعین کرتا ہے۔

مغرب دنیا میں

یہ دنیا جس کے اندر ثقافتی شناختیں-- نسلی، قومی، مذہبی، تہذیبی-- مرکزی مقام رکھتی ہیں اور ثقافتی قربت اور اختلاف کی بنیاد پر اتحاد، دشمنیاں اور ریاستوں کی پالیسیاں صورت پذیر ہوتی ہیں، مغرب کے لیے بالعموم اور امریکا کے لیے بالخصوص تین مضمرات کی حامل ہے۔

اول، سیاست کار اسی وقت حقیقت کو تعمیری انداز میں بدل سکتے ہیں جب وہ اسے تسلیم کریں اور سمجھیں۔ ثقافت کی ابھرتی ہوئی سیاست، غیر مغربی تہذیبوں کی چڑھتی ہوئی طاقت اور ان معاشروں کے بڑھتے ہوئے ثقافتی اثبات کو غیر مغربی دنیا میں بڑے پیمانے پر تسلیم کیا گیا ہے۔ یورپی رہنماؤں نے ان ثقافتی قوتوں کی نشاندہی کی ہے جو لوگوں کو قریب لا رہی ہیں اور دور لے جارہی ہیں۔ اس کے مقابلے میں امریکی اعلیٰ طبقات نے ان ابھرتے ہوئے حقائق کو قبول کرنے اور سمجھنے میں دیر کی ہے۔ بش اور کلنٹن کی حکومتوں نے کثیر ثقافتی سوویت یونین، یوگوسلاویہ، بوسنیا اور روس کی اکائی کی حمایت کی اور ان طاقتور نسلی و ثقافتی قوتوں کو روکنے کی بے سود کوشش کی جو انتشار کی طرف لے جارہی تھیں۔ انہوں نے کثیر تہذیبی اقتصادی اتحاد کے منصوبوں کو فروغ دیا جو یا تو بے معنی

ہوتے ہیں جیسے ایپک، یا ان کے اَن دیکھے معاشی و سیاسی نقصانات ہوتے ہیں جیسے نیفٹا اور میکسیکو۔ انہوں نے دوسری تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی جیسے روس کے ساتھ ''عالمی شراکت داری'' یا چین کے ساتھ ''تعمیری ربط'' حالانکہ امریکا اور ان ملکوں کے مفادات کے درمیان فطری تنازعات موجود ہیں۔ ساتھ ہی کلنٹن انتظامیہ بوسنیا میں امن کے لیے روس کو کھلے دل سے شامل کرنے میں ناکام رہی حالانکہ روس آرتھوڈوکسی کی مرکزی ریاست کی حیثیت سے اس جنگ سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ کلنٹن انتظامیہ بوسنیا کو کثیر ثقافتی ملک بنانے کی قیاس آرائیوں کی طرف دوڑتی رہی، سربیائی و کروشیائی اقلیتوں کو خود ارادیت دینے سے انکار کردیا اور بلقان میں ایران کے یک جماعتی حلیف کو وجود میں لے آئی۔ اسی طرح امریکی حکومت نے مسلمانوں کے آرتھوڈوکس حکمرانوں کے زیر اقتدار رہنے کی حمایت کی اور یہ موقف اختیار کیا کہ ''بلاشبہ چیچنیا روسی فیڈریشن کا جزو ہے''۔[14]

ہرچند کہ تمام اہلِ یورپ مغربی عالمِ مسیحیت اور آرتھوڈوکسی و اسلام کے مابین خطِ تقسیم کی اساسی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن امریکی وزیر خارجہ نے کہا کہ امریکا ''یورپ کے کیتھولک، آرتھوڈوکس اور اسلامی حصوں کے درمیان کسی اساسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرے'' گا۔ لیکن اساسی اختلافات کو تسلیم نہ کرنے والوں کا انجام ان اختلافات کے ہاتھوں مایوسی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ابتدا میں کلنٹن انتظامیہ امریکا اور مشرقی ایشیائی معاشروں کے مابین طاقت کے بدلتے ہوئے توازن سے بے خبر معلوم ہوتی تھی اس لیے بار بار اس نے تجارت، انسانی حقوق، جوہری پھیلاؤ اور دیگر مسائل پر ایسے اہداف کا اعلان کیا جو وہ حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ مجموعی اعتبار سے امریکی حکومت کو ایک ایسے دور سے مطابقت پیدا کرنے میں غیر معمولی دشواری پیش آرہی ہے جس میں عالمی سیاست ثقافتی اور تہذیبی دھاروں سے تشکیل پاتی ہے۔

دوم، خارجہ پالیسی کے حوالے سے امریکی طرز فکر میں سرد جنگ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنائی گئی پالیسیاں ترک کرنے، بدلنے اور بعض اوقات ان پر نظر ثانی کرنے کے سلسلے میں بھی ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی۔ بعض افراد میں یہ خرابی اس طرح ظاہر ہوئی کہ وہ سوویت یونین کے دوبارہ زندہ ہونے اور ممکنہ خطرہ بننے کے اندیشوں میں مبتلا ہوگئے۔ لیکن عام طور پر لوگ سرد جنگ کے اتحادوں اور ہتھیاروں کے معاہدوں کو مقدس گائے بنانے کی جانب مائل تھے: نیٹو کو اسی طرح رکھا جائے جیسی وہ سرد جنگ میں تھی، جاپانی امریکی معاہدہ سلامتی (Japanese-American Security Treaty) مشرقی ایشیا کی سلامتی کے لیے ضروری ہے، اے بی ایم کا معاہدہ پامال

نہیں کیا جاسکتا ہے، سی ایف ای کے معاہدے پر عمل لازمی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرد جنگ کے ان ورثوں کو یا دیگر ورثوں کو یونہی اٹھا کر نہیں پھینکا جاسکتا لیکن امریکا یا مغرب کے مفاد میں یہ بھی نہیں کہ ان کو اسی شکل میں جاری رکھا جائے جس میں وہ سرد جنگ کے زمانے میں تھے۔ کثیرتہذیبی دنیا کے حقائق کا تقاضا ہے کہ نیٹو میں دوسرے مغربی معاشرے شامل کیے جائیں جو شامل ہونا چاہتے ہیں اور دو ایسی ریاستوں کی شمولیت کو بے معنی تسلیم کیا جائے جو ایک دوسرے کی بدترین دشمن ہیں اور دونوں کی دیگر ارکان سے ثقافتی قربت بھی نہیں۔ اے بی ایم معاہدہ جو سرد جنگ کے دور میں سوویت اور امریکی معاشروں کے ایک دوسرے کے خلاف خطرے کے پیش نظر اور امریکا روس جوہری جنگ سے بچاؤ کے لیے کیا گیا تھا، اب امریکا اور دوسرے معاشروں کے ان دیکھے جوہری خطرات اور دہشت گرد تحریکوں اور نامعقول آمروں سے تحفظ کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ امریکی جاپانی سلامتی کے معاہدے نے جاپان کے خلاف روسی جارحیت کو روکے رکھا۔ مابعد سرد جنگ کے دور میں اس کا کیا کام ہے؟ چین کی روک تھام کرنا؟ ابھرتے ہوئے چین سے جاپان کی مفاہمت کا عمل سست کرنا؟ جاپان کی فوجی قوت میں اضافے کو روکنا؟ اپنے ہاں امریکی فوجی موجودگی کے بارے میں جاپان میں اور جاپان کے دفاع سے یکطرفہ وابستگی کی ضرورت کے بارے میں امریکا میں شبہات کا اظہار کیا جارہا ہے۔ یورپ میں روایتی افواج (Conventional Forces in Europe) کا معاہدہ وسطی یورپ میں نیٹو اور معاہدہ وارسا کی محاذ آرائی کو کم کرنے کے لیے کیا گیا تھا جو ختم ہوچکی ہے۔ اب اس معاہدے کا اثر یہ ہورہا ہے کہ روس کو اپنے جنوب میں ان مسائل سے نمٹنے میں مشکلات پیدا ہورہی ہیں جنہیں وہ مسلم اقوام کی جانب سے سلامتی کے خطرات سمجھتا ہے۔

سوم، ثقافتی وتہذیبی تنوع اس مغربی خصوصاً امریکی عقیدے کو چیلنج کرتا ہے کہ مغربی ثقافت کی آفاقی اہمیت ہے۔ یہ عقیدہ بیانیہ اور معیاری دونوں طریقوں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ بیانیہ طریقے کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ تمام معاشروں کے افراد مغربی اقدار، اداروں اور رواجوں کو اپنانا چاہتے ہیں۔ اگر بظاہر ان میں یہ خواہش نظر نہیں آتی اور وہ اپنی روایتی ثقافتوں سے جڑے ہیں تو وہ ایک ''جھوٹے شعور'' کا شکار ہیں جیسے مارکسسٹ سرمایہ داری کی حمایت کرنے والے پرولتاریوں میں پاتے تھے۔ معیاری طریقے کے مطابق مغربی آفاقیت پر عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ پوری دنیا کے لوگوں کو مغربی اقدار، اداروں اور ثقافت کو اپنانا چاہیے کیونکہ یہ بنی نوع انسان کی اعلیٰ ترین، سب سے روشن خیال، آزاد ترین، معقول ترین، جدید ترین اور مہذب ترین فکر ہے۔

نسلی تنازعے اور تہذیبی تصادم کی ابھرتی ہوئی دنیا میں مغربی ثقافت کی آفاقیت کے مغربی

عقیدے میں تین خرابیاں ہیں: یہ جھوٹا ہے؛ یہ غیر اخلاقی ہے؛ اور یہ خطرناک ہے۔ یہ بات کہ یہ عقیدہ جھوٹا ہے، اس کتاب کا مرکزی خیال تھا۔ مائیکل ہاورڈ نے اس مرکزی خیال کا خلاصہ بہت اچھی طرح کیا ہے: یہ ''عام مغربی مفروضہ ... قطعی درست نہیں کہ ثقافتی تنوع محض ایک تاریخی عجوبہ ہے جو ایک مشترک، مغرب کے رنگ میں ڈھلی ہوئی، ہماری بنیادی اقدار کو تشکیل دینے والی انگریز پسند عالمی ثقافت کی ترقی کے باعث تیزی سے غائب ہوتا جارہا ہے''[۱۵] جو قاری اب تک سر مائیکل کے اس دانشمندانہ بیان کا قائل نہیں وہ اس کتاب میں بیان کردہ دنیا سے بہت دور ہے۔

یہ عقیدہ کہ غیر مغربی اقوام کو مغربی اقدار، اداروں اور ثقافت کو اختیار کرنا چاہیے غیر اخلاقی ان اقدامات کی وجہ سے ہے جو اس عمل کے لیے ضروری ہوں گے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں یورپی طاقت کی تقریباً ہر جگہ رسائی اور بیسویں صدی کے اواخر میں امریکا کی عالمی بالادستی نے مغربی تہذیب کو بڑی حد تک دنیا بھر میں پھیلا دیا۔ تاہم یورپی عالمگیریت اب ختم ہوچکی ہے۔ امریکی بالادستی کم ہورہی ہے کیونکہ اب امریکا کو سرد جنگ جیسے سوویت فوجی خطرے سے تحفظ کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا طاقت کے بعد ثقافت کی باری آتی ہے۔ اگر غیر مغربی تہذیبوں کو ایک بار پھر مغربی ثقافت کے مطابق ڈھلنا ہے تو یہ عمل صرف مغربی طاقت کی توسیع، اطلاق اور اثرات کے نتیجے میں ہوگا۔ سامراجیت آفاقیت کا لازمی منطقی نتیجہ ہے۔ مزید برآں پختہ ہوتی ہوئی تہذیب کی حیثیت سے مغرب میں اب وہ اقتصادی یا آبادیاتی تحرک موجود نہیں جو دوسرے معاشروں پر اپنی مرضی ٹھونسنے کے لیے درکار ہوتا ہے اور ایسا کرنے کی کوشش خود ارادیت اور جمہوریت کی مغربی اقدار کے خلاف بھی ہوگی۔ جیسے جیسے ایشیائی اور مسلم تہذیبیں اپنی ثقافت کی آفاقیت کا زیادہ سے زیادہ اثبات کریں گی، آفاقیت اور سامراجیت کے درمیان تعلق اہل مغرب کی سمجھ میں اتنا ہی زیادہ آئے گا۔

مغربی آفاقیت دنیا کے لیے خطرناک اس لیے ہے کہ یہ مرکزی ریاستوں کے درمیان بڑی بین التہذیبی جنگ پر منتج ہوسکتی ہے اور مغرب کے لیے اس لیے خطرناک ہے کہ یہ مغرب کی شکست پر منتج ہوسکتی ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد اہل مغرب اپنی تہذیب کو ایسے زور آور کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس کا کوئی ہمسر نہیں جبکہ کمزور ایشیائی، مسلم اور دیگر معاشرے مضبوط ہوتے جارہے ہیں۔ لہٰذا وہ بروٹس کی مشہور اور طاقتور منطق استعمال کرنے کی طرف راغب ہوسکتے ہیں:

Our legions are brim-full, our cause is ripe.
The enemy increaseth every day;

We at the height, are ready to decline.
There is a tide in the affairs of men,
Which taken at the flood, leads on to fortune;
Omitted, all voyage of their life
Is bound in shallows and miseries.
On such a full sea are we now afloat,
And we must take the current when it serves,
Or lose our venture.

بہر حال یہ منطق فلمی میں بروٹس کی شکست کا باعث بنی اور مغرب کے لیے محتاط راستہ یہی ہے کہ وہ طاقت میں تبدیلی کو روکنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اتھلی کھاڑیوں (shallows) میں کشتی اتارنا، تکالیف (miseries) کو برداشت کرنا اور اپنی مہم جوئیوں (ventures) کو اعتدال پر رکھنا سیکھے اور اپنی ثقافت کی حفاظت کرے۔

تمام تہذیبیں پیدائش، عروج اور زوال کے ایک جیسے عمل سے گزرتی ہیں۔ مغرب دوسری تہذیبوں سے اس ارتقا کے عمل کی وجہ سے مختلف نہیں بلکہ اپنی اقدار اور اداروں کی مخصوص نوعیت کے باعث مختلف ہے۔ ان میں سب سے نمایاں عیسائیت، تکثیریت، فرد پسندی اور قانون کی حکمرانی ہیں جنھوں نے مغرب کے لیے جدیدیت ایجاد کرنا، پوری دنیا میں پھیل جانا اور دوسرے معاشروں کے لیے قابل رشک ہونا ممکن بنایا۔ اجتماعی طور پر یہ خصوصیات صرف مغرب میں پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ آرتھر ایم شلیسنگر جونیر نے کہا ہے، یورپ ''انفرادی حریت، سیاسی جمہوریت، قانون کی حکمرانی، انسانی حقوق اور ثقافتی آزادی کے تصورات [کا] سرچشمہ [ہے]، منفرد سرچشمہ... یہ یورپی تصورات ہیں، نہ ایشیائی ہیں، نہ افریقی، نہ مشرق وسطیٰ کے، سوائے اس کے کہ [ان معاشروں نے انھیں] اختیار کیا ہو''[۱۶] یہ تصورات مغربی تہذیب کو منفرد بناتے ہیں اور مغربی تہذیب اس لیے قابل قدر نہیں کہ یہ آفاقی ہے بلکہ اس لیے کہ یہ منفرد ہے۔ پس مغربی رہنماؤں کی سب سے بڑی ذمے داری دوسری تہذیبوں کو مغرب کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا نہیں جو ان کی زوال پذیر طاقت سے بعید ہے بلکہ مغربی تہذیب کی منفرد خصوصیات کو بچانا، محفوظ رکھنا اور بحال کرنا ہے۔ چونکہ ریاست ہائے متحدہ امریکا طاقتور ترین مغربی ملک ہے اس لیے یہ ذمے داری زیادہ تر اسی پر عائد ہوتی ہے۔

زوال پذیر مغربی طاقت کے باوجود مغربی تہذیب کو محفوظ کرنے کے لیے امریکا اور یورپی ملکوں کے مفاد میں ہے کہ:

سیاسی، اقتصادی اور فوجی اتحاد بڑھائیں اور اپنی پالیسیوں کو اس طرح ہم آہنگ کریں کہ دوسری تہذیبوں کی ریاستیں ان کے مابین اختلافات سے فائدہ نہ اٹھا سکیں؛
یورپی یونین اور نیٹو میں وسطی یورپ کی مغربی ریاستوں کو شامل کریں یعنی واِسگریڈ ممالک، بالٹک جمہوریائیں، سلووینیا اور کروشیا؛
لاطینی امریکا کی ''مغربیت'' اور جہاں تک ممکن ہو مغرب کے ساتھ لاطینی امریکی ممالک کے قریبی روابط کی حوصلہ افزائی کریں؛
اسلامی اور صینی ممالک کی روایتی اور غیر روایتی فوجی طاقت کی ترقی کی روک تھام کریں؛
جاپان کی مغرب سے دوری اور چین سے مفاہمت کی رفتار آہستہ کریں؛
روس کو آرتھوڈوکسی کی مرکزی ریاست اور بڑی علاقائی طاقت تسلیم کریں جس کے اپنی جنوبی سرحدوں کی سلامتی کے حوالے سے جائز مفادات ہیں؛
دوسری تہذیبوں پر مغربی تیکنیکی اور فوجی برتری قائم رکھیں؛
اور سب سے اہم بات، یہ تسلیم کریں کہ دوسری تہذیبوں کے معاملات میں مغربی مداخلت کثیر تہذیبی دنیا میں عدم استحکام اور ممکنہ عالمی تنازعے کا خطرناک ترین منبع ہے۔

سرد جنگ کے فوراً بعد امریکا میں زبردست بحثیں شروع ہوگئیں کہ امریکی خارجہ پالیسی اب کس راستے پر چلنی چاہیے۔ اس دور میں امریکا دنیا پر غالب آسکتا ہے نہ دنیا سے فرار اختیار کرسکتا ہے۔ نہ بین الاقوامیت نہ ہی تنہائی، نہ کثیر جہتی نہ ہی یک جہتی اس کے مفادات کے کارآمد ہوگی۔ ان مفادات کا بہترین فروغ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ ان انتہاؤں سے گریز کرکے ایک اطلانطسی (Atlanticist) پالیسی اختیار کی جائے یعنی اپنے یورپی حلیفوں سے قریبی تعاون رکھا جائے تاکہ ان کے ساتھ مشترک مفادات اور اقدار کا تحفظ و ترویج ہوسکے۔

تہذیبی جنگ اور نظام

ایسی عالمی جنگ کا بہت کم امکان ہے جس میں دنیا کی بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں شریک ہوں لیکن ناممکن نہیں۔ جیسا کہ ہم نے تذکرہ کیا، اس طرح کی جنگ مختلف تہذیبوں کے گروہوں کے درمیان رخنہ جنگ کے پھیل جانے سے چھڑ سکتی ہے جس میں سب سے زیادہ امکان ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف غیر مسلموں کے ہونے کا ہے۔ جنگ پھیل جانے کا امکان اس صورت میں زیادہ ہوگا جب مرکزی ریاست کی حیثیت کے امیدوار مسلم ممالک اپنے برسرپیکار ہم مذہبوں کو امداد فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ دوسری اور تیسری سطح کے قرابت دار ملکوں کے مفادات جو انہیں

رخنہ جنگ میں بہت زیادہ شمولیت سے روکیں عالمی جنگ کے امکان کو کم کرتے ہیں۔ بین التہذیبی جنگ کا ایک زیادہ خطرناک منبع تہذیبوں اور ان کی مرکزی ریاستوں کے درمیان طاقت کا بدلتا ہوا توازن ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تو چین کا عروج اور اِس ''تاریخ انسانی کے سب سے بڑے کھلاڑی'' کے بڑھتے ہوئے اثباتی رویے سے اکیسویں صدی کے اوائل میں بین الاقوامی استحکام پر زبردست دباؤ پڑے گا۔ مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا میں بالادست طاقت کے طور پر چین کا ابھرنا ان امریکی مفادات کے خلاف ہوگا جیسا کہ تاریخ میں ان کا تصور رہا ہے۔[1]

اس امریکی دلچسپی کے پیش نظر امریکا اور چین کے درمیان جنگ کیسے آگے بڑھے گی؟ فرض کیجیے سن ۲۰۱۰ء ہے۔ امریکی فوجیں کوریا سے نکل چکی ہیں جو متحد ہوگیا ہے اور جاپان میں امریکا کی فوجی موجودگی بہت کم ہو چکی ہے۔ تائیوان اور مین لینڈ چین میں مفاہمت ہوگئی ہے کہ تائیوان اپنی حقیقی آزادی قائم رکھے گا لیکن بیجنگ کی بالادستی تسلیم کرے گا اور چین کی سرپرستی میں وہ اسی طرز پر اقوام متحدہ کا رکن بن گیا ہے جیسے ۱۹۴۶ء میں یوکرین اور بیلا روس بنے تھے۔ بحیرۂ جنوبی چین میں تیل کے ذخائر کو زیادہ تر چینی سرپرستی میں لیکن بعض علاقوں میں ویت نام کے ماتحت امریکی کمپنیوں کے ہاتھوں تیزی سے ترقی دی گئی ہے۔ چین، جس کا اعتماد اپنی نئی طاقت کے اظہار کی صلاحیتوں کے باعث بڑھ گیا ہے، اعلان کرتا ہے کہ وہ پورے سمندر پر اپنا قبضہ قائم کرے گا جس کے تمام حصے پر وہ ہمیشہ خودمختاری کا دعویدار رہا ہے۔ ویت نامی مزاحمت کرتے ہیں اور چینی اور ویت نامی بحری جنگی جہازوں میں لڑائی ہوتی ہے۔ چین اپنی ۱۹۷۹ء کی رسوائی کا بدلہ لینے کے لیے ویت نام پر حملہ کر دیتا ہے۔ ویت نام امریکا سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ چین خبردار کرتا ہے کہ امریکا معاملے سے باہر رہے۔ جاپان اور دوسری اقوام کوئی قدم اٹھانے سے ہچکچا رہی ہیں۔ امریکا کہتا ہے کہ وہ چین کو ویت نام فتح کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ چین پر معاشی پابندیاں لگا دیتا ہے اور اپنی جو چند کیریئر ٹاسک فورسز رہ گئی ہیں ان میں سے ایک کو بحیرۂ جنوبی چین بھیجتا ہے۔ چین اس کارروائی کو چینی سمندری حدود کی خلاف ورزی کہتے ہوئے مذمت کرتا ہے اور ٹاسک فورس پر فضائی حملے کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل اور جاپانی وزیر اعظم کی جنگ بندی کرانے کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور لڑائی مشرقی ایشیا میں دوسرے مقامات تک پھیل جاتی ہے۔ جاپان چین کے خلاف کارروائی کے لیے جاپان میں امریکی اڈوں کے استعمال کی ممانعت کر دیتا ہے۔ امریکا اس ممانعت کو نظرانداز کرتا ہے اور جاپان اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرتے ہوئے اڈوں کو چہار جانب سے بند کر دیتا ہے۔ چینی آبدوزیں اور طیارے تائیوان اور مین لینڈ دونوں جگہ سے کارروائی کرتے ہوئے امریکی

بحری جہازوں اور مشرقی ایشیا میں اس کی تنصیبات کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ دریں اثنا چینی زمینی افواج ہنوئی میں داخل ہوجاتی ہیں اور ویت نام کے بڑے علاقے پر قبضہ کرلیتی ہیں۔

چونکہ چین اور امریکا دونوں کے پاس ایسے میزائل ہیں جو ایک دوسرے پر جوہری ہتھیاروں سے یلغار کرسکتے ہیں اس لیے دونوں ازخود رک جاتے ہیں اور جنگ کے ابتدائی مراحل میں یہ ہتھیار استعمال نہیں کیے جاتے۔ تاہم دونوں معاشروں خصوصاً امریکا میں ان حملوں کا خوف پایا جاتا ہے۔ بہت سے امریکی سوال کرنے لگتے ہیں کہ انہیں اس خطرے سے کیوں دوچار کیا جارہا ہے؟ کیا فرق پڑتا ہے اگر چین بحیرۂ جنوبی چین، ویت نام بلکہ جنوب مشرقی ایشیا پر قابض ہوجائے؟ امریکا کے جنوب مغرب کے ہسپانوی نژاد آبادی والی ریاستوں میں خاص طور پر جنگ کی مخالفت کی جارہی ہے جہاں عوام اور حکومتیں کہتی ہیں کہ ''یہ ہماری جنگ نہیں ہے'' اور وہ ۱۸۱۲ء کی جنگ میں نیوانگلینڈ کی طرز پر جنگ سے باہر رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جب مشرقی ایشیا میں چینی اپنے ابتدائی مفتوحہ علاقوں پر قبضہ مستحکم کرلیتے ہیں تو امریکی رائے عامہ اسی سمت میں مڑنے لگتی ہے جس کی امید جاپان نے ۱۹۴۲ء میں کی تھی: بالادست قوت کے اس تازہ ترین اظہار کو شکست دینے کی قیمت بہت زیادہ ہوگی؛ مغربی بحرالکاہل میں جاری ''جعلی جنگ'' یا وقتاً فوقتاً جھڑپوں کے خاتمے کے لیے گفت وشنید کرلی جائے۔

تاہم اس دوران جنگ دوسری تہذیبوں کی بڑی ریاستوں پر اثرانداز ہونے لگی ہے۔ چین کے ہاتھ مشرقی ایشیا میں بندھے ہوئے ہیں اس لیے بھارت اس موقعے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور پاکستان پر تباہ کن حملہ کردیتا ہے تاکہ اس کی جوہری اور روایتی فوجی صلاحیت کو مکمل طور پر ختم کردے۔ حملہ شروع میں کامیاب رہتا ہے مگر پاکستان، ایران اور چین کے درمیان فوجی اتحاد فعال ہوجاتا ہے اور ایران جدید ونفیس آلات سے لیس افواج کے ساتھ پاکستان کی مدد کو آجاتا ہے۔ ایرانی فوجیوں اور مختلف نسلی گروہوں کے پاکستانی چھاپہ ماروں سے لڑتے ہوئے بھارت شدید مشکلات میں گھر جاتا ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں عرب ممالک سے مدد کی درخواست کرتے ہیں۔ بھارت جنوب مغربی ایشیا میں ایرانی غلبے کے خطرے سے خبردار کرتا ہے لیکن امریکا کے خلاف چین کی ابتدائی فتوحات مسلمان معاشروں میں مغرب مخالف تحریکوں کو ہوا دیتی ہیں۔ مسلم نوجوان اکثریتی آبادی کے جنگجوؤں کی قوت سے لبریز اسلام پسند تحریکیں عرب ملکوں اور ترکی میں چند بچی کھچی مغرب نواز حکومتوں کو گرادیتی ہیں۔ مغربی کمزوری سے پیدا ہونے والی اس مغرب دشمنی کے نتیجے میں اسرائیل پر زوردار عرب حملہ ہوتا ہے۔ چھٹا امریکی بیڑہ جس کی نفری اور سازوسامان خاصا کم کردیا گیا ہے، یہ حملہ روکنے کے قابل نہیں ہوتا۔

چین اور امریکا دوسری اہم ریاستوں کی حمایت کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ جوں جوں چین فوجی کامیابیاں حاصل کرتا ہے، جاپان گھبراہٹ میں چین کی تقلید کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے اور باضابطہ غیر جانبداری کے موقف کو چین نواز مثبت غیر جانبداری میں بدل لیتا ہے اور پھر چینی مطالبات کے آگے سرتسلیم خم کرکے اس کے ساتھ جنگ میں شریک ہو جاتا ہے۔ جاپانی افواج جاپان میں بچے کھچے اڈوں پر قبضہ کرلیتی ہیں اور امریکا جلدی سے اپنے فوجیوں کو وہاں سے نکال لیتا ہے۔ امریکا جاپان کی ناکہ بندی کا اعلان کرتا ہے اور مغربی بحرالکاہل میں امریکی و جاپانی بحری جہازوں کے درمیان کہیں کہیں جھڑپیں ہونے لگتی ہیں۔ جنگ کے آغاز پر چین نے روس کے ساتھ باہمی سلامتی کے ایک معاہدے کی تجویز پیش کی ہوتی ہے (ہٹلر اسٹالن معاہدے کی خام سی شکل)۔ تاہم چینی کامیابیوں کا جاپان پر جو اثر ہوا ہے روس پر اس کے برعکس اثر ہوتا ہے۔ چینی فتح اور مشرقی ایشیا میں مکمل چینی بالادستی کا امکان ماسکو کو دہشت زدہ کردیتا ہے۔ جب روس چین مخالف سمت میں اقدامات کرتا ہے اور سائبیریا میں اپنی افواج بڑھانا شروع کردیتا ہے تو سائبیریا میں متعدد چینی آبادکاران کارروائیوں میں مداخلت کرتے ہیں۔ پھر چین اپنے ہم وطنوں کی حفاظت کے لیے فوجی مداخلت کرتا ہے اور ولادی ووستوک، آمور دریا کی وادی اور مشرقی سائبیریا کے دوسرے کلیدی علاقوں پر قبضہ کرلیتا ہے۔ جب وسطی سائبیریا میں روسی اور چینی افواج کے درمیان جنگ پھیلتی ہے تو منگولیا میں شورشیں پیدا ہوتی ہیں جسے چین نے پہلے ایک ''پروٹیکٹوریٹ'' کے ماتحت کردیا تھا۔

تیل پر قبضہ اور اس تک رسائی تمام جنگی شرکا کے لیے مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ جوہری توانائی میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کے باوجود جاپان ابھی تک تیل کی درآمدات پر بہت انحصار کرتا ہے اور اس سے چین کے ساتھ مفاہمت کرنے اور خلیج فارس، انڈونیشیا اور بحیرۂ جنوبی چین سے تیل کی ترسیل کو یقینی بنانے کے جاپانی رجحان کو تقویت ملتی ہے۔ جنگ کے دوران جب عرب ممالک اسلامی شدت پسندوں کے زیر اقتدار آجاتے ہیں تو مغرب کے لیے خلیج فارس کی تیل کی ترسیلات نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر مغرب روسی، قفقازی اور وسط ایشیائی ذرائع پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے لگتا ہے۔ پس مغرب روس کو اپنی حمایت میں لانے کی کوششیں کرتا ہے اور روس کے جنوب کی سمت تیل سے زرخیز ملکوں پر اس کے اثرات بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔

اس دوران امریکا اپنے یورپی حلیفوں کی بھرپور حمایت کو متحرک کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ سفارتی و معاشی امداد تو دیتے ہیں مگر فوجی شمولیت سے گریزاں ہیں۔ تاہم چین اور ایران کو خدشہ ہے کہ مغربی ممالک بالآخر امریکا کی حمایت میں اکٹھا ہو جائیں گے جیسے امریکا دو عالمی جنگوں میں

برطانیہ اور فرانس کی مدد کو آیا تھا۔ اس کی روک تھام کے لیے وہ خفیہ طور پر بوسنیا اور الجزائر میں جوہری ہتھیاروں سے لیس میزائل نصب کر دیتے ہیں اور یورپی طاقتوں کو انتباہ کرتے ہیں کہ وہ جنگ سے باہر رہیں۔ جاپان کے سوا دوسرے ملکوں کو دھمکانے کی چینی کوششوں کا ہمیشہ جو انجام ہوا وہی اس کا ہوتا ہے یعنی جو چین چاہتا تھا اس کے الٹ نتائج نکلتے ہیں۔ امریکی جاسوس اداروں کو میزائلوں کی تنصیب کی خبر لگ جاتی ہے اور وہ اس کی اطلاع دیتے ہیں۔ نیٹو کونسل اعلان کرتی ہے کہ میزائل فوراً ہٹا لیے جائیں۔ تاہم نیٹو کی کارروائی سے پہلے سربیا بوسنیا پر حملہ کر دیتا ہے جو ترکوں کے خلاف اپنے محافظ عیسائیت کے تاریخی کردار کو جتانے کا خواہاں ہے۔ وہ میزائلوں پر قبضہ کر لیتا ہے اور نسلی تطہیر کا وہ عمل مکمل کرنے کی کوششیں شروع کر دیتا ہے جو ۱۹۹۰ء کی دہائی میں روک دیا گیا تھا۔ البانیہ اور ترکی بوسنیائیوں کی مدد کرتے ہیں؛ یونان اور بلغاریہ ترکی کے یورپی علاقے پر حملے کرتے ہیں اور جب ترک باسفورس عبور کر کے فرار ہوتے ہیں تو استنبول میں بوکھلاہٹ پھیل جاتی ہے۔ اس دوران الجزائر سے جوہری ہتھیار سے لیس میزائل داغا جاتا ہے جو مارسیل کے قریب پھٹتا ہے جس پر نیٹو شمالی افریقی اہداف پر تباہ کن فضائی حملے کرتی ہے۔

یوں امریکا، یورپ، روس اور بھارت، چین جاپان اور بیشتر اسلامی ممالک کے خلاف ایک حقیقی عالمی کشمکش میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس طرح کی جنگ کا انجام کیا ہوگا؟ دونوں فریقوں کے پاس جوہری اسلحہ ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اگر یہ اسلحہ انتہائی معمولی کارروائیوں سے بڑھ کر استعمال ہوا تو دونوں جانب کے اہم ممالک تباہ ہو سکتے ہیں۔ اگر باہمی ڈیٹرنس مؤثر ہوئی تو دونوں فریق تھک ہار کے جنگ بندی کے مذاکرات پر مجبور ہو سکتے ہیں مگر اس سے مشرقی ایشیا میں چینی بالادستی کا بنیادی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ایک متبادل یہ ہو سکتا ہے کہ مغرب روایتی فوجی قوت کے استعمال کے ذریعے چین کو شکست دینے کی کوشش کرے۔ تاہم جاپان سے اتحاد کے طفیل چین کو ایک حفاظتی حصار مہیا ہو جاتا ہے جو امریکا کو ساحلوں کے ساتھ چینی آبادی اور صنعت کے مراکز پر اپنی بحری قوت استعمال کرنے سے باز رکھتا ہے۔ چین تک پہنچنے کا دوسرا راستہ مغرب سے ہے۔ روس اور چین کے درمیان لڑائی کے باعث نیٹو روس کو رکن کے طور پر قبول کر لیتی ہے اور سائبیریا میں چینی مداخلت کو روکنے میں روس سے تعاون کرتی ہے۔ اس طرح وسط ایشیا کے تیل اور گیس کے ذخائر والے مسلم ممالک پر روسی قبضہ برقرار رہتا ہے، تبتیوں، یوغوروں اور منگولوں کی طرف سے چینی اقتدار کے خلاف شورشیں اٹھتی ہیں اور مغربی و روسی افواج رفتہ رفتہ مشرق کی جانب سائبیریا میں متحرک اور تعینات ہوتی جاتی ہیں تاکہ دیوار چین کے پار بیجنگ، منچوریا اور ہان کے مرکزی علاقوں پر حتمی حملہ کر سکیں۔

اس عالمی تہذیبی جنگ کا فوری نتیجہ کچھ بھی ہو-- باہمی جوہری بربادی، تھکن کی وجہ سے جنگ بندی پر اتفاق یا بالآخر تیانن مین اسکوائر میں روسی و مغربی افواج کی رسائی-- وسیع تر طویل المیعاد نتیجہ تقریباً لازمی طور پر یہ ہوگا کہ جنگ کے تمام اہم شرکا کی معاشی، آبادیاتی اور فوجی طاقت میں نمایاں کمی ہوجائے گی۔ لہٰذا عالمی طاقت جو صدیوں تک مشرق سے مغرب کی سمت منتقل ہوتی رہی تھی اور مغرب سے مشرق کو منتقل ہونا شروع ہوگئی تھی، اب شمال سے جنوب کو منتقل ہوگی۔ تہذیبوں کی جنگ سے سب سے زیادہ فائدہ ان تہذیبوں کو پہنچتا ہے جو اس میں شریک نہیں ہوتیں۔ مغرب، روس، چین اور جاپان کی مختلف درجوں کی تباہی کے بعد اب بھارت کے لیے راستہ کھلا ہے کہ وہ دنیا کو ہندو خطوط پر آراستہ کرنے کی کوشش کرے بشرطیکہ وہ جنگ میں شریک ہونے کے باوجود اتنی تباہی سے بچ جائے۔ امریکی عوام کی بڑی تعداد امریکا کے بے حد کمزور ہوجانے پر اعلیٰ واسپ☆ طبقات کی تنگ نظر مغربی ذہنیت کو موردِ الزام ٹھہراتی ہے اور ہسپانوی نژاد رہنما جنگ میں شریک نہ ہونے والے پھلتے پھولتے لاطینی امریکی ممالک سے مارشل پلان قسم کی امداد کا وعدہ کرکے اقتدار میں آجاتے ہیں۔ دوسری طرف افریقہ یورپ کی تشکیل نو کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کی بجائے سماجی لحاظ سے متحرک افریقی افراد کے غول کے غول جنگ کی باقیات کو اپنا شکار بناتے ہیں۔ ایشیا میں، اگر چین، جاپان اور کوریا جنگ سے تباہ نہیں ہوئے تو طاقت جنوب کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ انڈونیشیا، جو غیر جانبدار رہا تھا بالادست ملک بن جاتا ہے اور، اپنے آسٹریلوی مشیروں کی رہنمائی میں مشرق میں نیوزی لینڈ سے لے کر مغرب میں میانمار اور سری لنکا تک اور شمال میں ویت نام تک واقعات کا رخ متعین کرنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ مستقبل میں بھارت سے تنازعے اور چین کی دوبارہ بحالی کا پیش خیمہ ہے۔ بہرحال عالمی سیاست کا مرکز جنوب کی سمت منتقل ہوجاتا ہے۔

اگر قاری کو یہ منظرنامہ قطعی ناقابلِ یقین خیالی کہانی معلوم ہوتا ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔ امید کرنی چاہیے کہ عالمی تہذیبی جنگ کا کوئی اور منظرنامہ اس سے زیادہ قابلِ یقین نہیں ہوگا۔ تاہم اس منظرنامے میں سب سے قابلِ یقین اور اسی لیے سب سے پریشان کن پہلو جنگ کا سبب ہے: ایک تہذیب کی مرکزی ریاست (امریکا) کی دوسری تہذیب کی مرکزی ریاست (چین) اور اُس تہذیب کی رکن ریاست (ویت نام) کے مابین تنازعے میں مداخلت۔ امریکا کے لیے یہ مداخلت

☆ نوٹ از مترجم: واسپ (WASP)، متوسط طبقے کا امریکی سفید فام پروٹسٹنٹ جو انگریز آبادکاروں کی نسل سے ہو۔ یہ White Anglo-Saxon Protestant کا مخفف ہے۔

بین الاقوامی قانون کی بالادستی قائم رکھنے، جارحیت کو روکنے، سمندروں کی آزادی کی حفاظت کرنے، بحیرۂ جنوبی چین کے تیل تک اپنی رسائی برقرار رکھنے اور مشرقی ایشیا پر ایک طاقت کے غلبے کو روکنے کے لیے ضروری تھی۔ چین کے لیے یہ مداخلت بالکل ناقابل برداشت اور صف اول کی مغربی ریاست کی جانب سے چین کی تذلیل کرنے اور دھمکانے، چین کے جائز دائرۂ اثر میں اس کی مخالفت بھڑکانے اور چین کو عالمی امور میں اپنے موزوں کردار سے محروم کرنے کی پُرغرور کوشش تھی۔

المختصر، آنے والے دور میں بڑی بین التہذیبی جنگوں سے بچاؤ کے لیے مرکزی ریاستوں کو دوسری تہذیبوں کے تنازعات میں مداخلت سے اجتناب کرنا ہوگا۔ یہ ایک سچائی ہے جسے بعض ممالک خصوصاً امریکا کے لیے بلاشک وشبہ قبول کرنا مشکل ہوگا۔ یہ گریز کا اصول کہ مرکزی ریاستیں دوسری تہذیبوں کے تنازعات میں مداخلت سے احتراز کریں ایک کثیر تہذیبی، کثیر قطبی دنیا میں امن کی پہلی شرط ہے۔ دوسری شرط مشترکہ ثالثی کا اصول ہے یعنی یہ کہ اپنی تہذیبوں یا گروہوں کے درمیان رخنہ جنگیں رکوانے یا محدود کرنے کے لیے مرکزی ریاستیں ایک دوسرے سے گفت وشنید کریں۔

ان اصولوں کو اور تہذیبوں کے مابین زیادہ مساوات والی دنیا کو قبول کرنا مغرب کے لیے یا ان تہذیبوں کے لیے آسان نہ ہوگا جو بالادستی میں مغرب کے ساتھ شامل ہونے یا اس کی جگہ لینے کی کوشش کرسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایسی دنیا میں مرکزی ریاستیں جوہری ہتھیار رکھنا اور اپنی تہذیب کے دوسرے ارکان کے یہ ہتھیار رکھنے پر پابندی عائد کرنا اپنا استحقاق خیال کرسکتی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے لیے ''مکمل جوہری صلاحیت'' حاصل کرنے کی جو کوششیں کی تھیں ان کے بارے میں انہوں نے یہ جواز بیان کیا: ''ہم جانتے ہیں کہ اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے پاس مکمل جوہری صلاحیت ہے۔ عیسائی، یہودی اور ہندو تہذیبوں کے پاس یہ صلاحیت ہے۔ صرف اسلامی تہذیب اس سے محروم تھی لیکن یہ صورتحال بدلنے والی تھی''۔[18] مرکزی ریاست نہ رکھنے والی تہذیبوں کے اندر قیادت کے لیے مقابلے کے باعث بھی جوہری ہتھیاروں کے حصول کی دوڑ شروع ہوسکتی ہے۔ اگرچہ ایران کے پاکستان سے بہت زیادہ تعاون پر مبنی تعلقات ہیں لیکن وہ واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ جوہری ہتھیاروں کی اسے بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی پاکستان کو ہے۔ دوسری جانب برازیل اور ارجنٹینا نے اپنے جوہری پروگرام ترک کردیے اور جنوبی افریقہ نے اپنے جوہری ہتھیار تلف کردیے گوکہ اگر نائجیریا نے یہ صلاحیت حاصل کی تو جنوبی افریقہ دوبارہ ان کے حصول کا خواہشمند ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اسکاٹ ساگاں اور دیگر نے نشاندہی کی ہے، ہرچند جوہری پھیلاؤ میں خطرات ہیں لیکن ایک ایسی دنیا خاصی مستحکم ہوگی جس میں ہر بڑی تہذیب کی ایک یا دو مرکزی

ریاستوں کے پاس جوہری ہتھیار ہوں اور کسی اور ریاست کے پاس نہ ہوں۔

زیادہ تر بڑے بین الاقوامی ادارے جنگ عظیم دوم کے بعد قائم ہوئے اور مغربی مفادات، اقدار اور رواجوں کے مطابق تشکیل دیے گئے ہیں۔ دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں مغربی طاقت کے زوال پذیر ہونے کے ساتھ ان اداروں کی اُن تہذیبوں کے مفادات کی مناسبت سے تشکیل نو کے لیے دباؤ پیدا ہوگا۔ واضح ترین، اہم ترین اور غالباً متنازع ترین مسئلہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کا ہے۔ یہ رکنیت دوسری جنگ عظیم کی اہم فاتح قوتوں پر مشتمل رہی ہے اور دنیا میں طاقت کے حقائق سے اس کا ربط کم ہوتا جارہا ہے۔ طویل مدتی بنیادوں پر یا تو اس رکنیت میں تبدیلیاں ہوں گی یا سلامتی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے دوسرے کم باقاعدہ طریقے سامنے آنے کا امکان ہے جیسے جی سیون کے اجلاسوں میں عالمی معاشی مسائل سے نمٹا جاتا رہا ہے۔ ایک کثیر تہذیبی دنیا میں بہترین صورتحال یہ ہوگی کہ سلامتی کونسل میں ہر بڑی تہذیب کی کم از کم ایک مستقل نشست ہو۔ فی الحال صرف تین تہذیبوں کی ہیں۔ امریکا نے جاپانی اور جرمن رکنیت کی توثیق کی ہے لیکن یہ واضح ہے کہ وہ اسی وقت مستقل رکن بنیں گے جب دوسرے ممالک بھی بنیں۔ برازیل نے ویٹو کے اختیار کے بغیر پانچ مستقل ارکان کی تجویز پیش کی ہے یعنی جرمنی، جاپان، بھارت، نائجیریا اور خود برازیل۔ اس سے دنیا کے ایک ارب مسلمان نمائندگی سے محروم رہ جائیں گے سوائے اس کے کہ نائجیریا اس ذمے داری کو اٹھائے۔ تہذیبی نقطہ نگاہ سے یہ واضح ہے کہ جاپان اور بھارت کو مستقل رکن ہونا چاہیے اور افریقہ، لاطینی امریکا اور مسلم دنیا کی مستقل نشستیں ہونی چاہئیں جن پر ان تہذیبوں کی اہم ریاستیں یکے بعد دیگرے آئیں اور ان کا چناؤ اسلامی کانفرنس کی تنظیم، افریقی اتحاد کی تنظیم اور امریکی ریاستوں کی تنظیم (ریاست ہائے متحدہ امریکا کو چھوڑ کر) کریں۔ یہ بھی مناسب ہوگا کہ برطانیہ اور فرانس کی نشستوں کو یورپی یونین کی ایک نشست میں تبدیل کردیا جائے جس پر یکے بعد دیگرے یورپی یونین کا چنیدہ ملک براجمان ہو۔ اس طرح سات تہذیبوں کی ایک ایک اور مغرب کی دو مستقل نشستیں ہوں گی جس سے دنیا کے افراد، دولت اور طاقت کی وسیع تر نمائندگی ہوگی۔

تہذیبوں کے مشترک خواص

بعض امریکیوں نے ملک کے اندر کثیر ثقافتی نظریے کو فروغ دیا ہے۔ بعض نے بیرون ملک آفاقیت کو ترویج دی ہے۔ کچھ نے دونوں کام کیے ہیں۔ ملک کے اندر کثیر ثقافتی نظریہ امریکا اور مغرب کے

لیے خطرہ ہے، ملک سے باہر آفاقیت مغرب اور دنیا کے لیے خطرہ ہے۔ دونوں سے مغربی ثقافت کی نفی ہوتی ہے۔ عالمی یک ثقافتی نظریے کے حامی دنیا کو امریکا جیسا بنانا چاہتے ہیں۔ ملکی کثیر ثقافتی نظریے کے داعی امریکا کو دنیا جیسا بنانا چاہتے ہیں۔ کثیر ثقافتی امریکا ممکن نہیں کیونکہ غیر مغربی امریکا امریکی نہیں ہوگا۔ کثیر ثقافتی دنیا ناگزیر ہے کیونکہ عالمی سلطنت ناممکن ہے۔ امریکا اور مغرب کے بقا کا تقاضا ہے کہ مغربی تشخص کا احیا کیا جائے۔ عالمی سلامتی کا تقاضا ہے کہ دنیا میں کثیر ثقافتوں کو قبول کیا جائے۔

کیا مغربی آفاقیت کا کھوکھلا پن اور عالمی ثقافتی تنوع لازماً اخلاقی وثقافتی اضافیت کی طرف لے جائے گا جس سے واپسی نہیں ہو سکے گی؟ اگر آفاقیت سے سامراجیت کا جواز فراہم ہوتا ہے تو کیا اضافیت جبر کو جائز قرار دیتی ہے؟ ایک بار پھر ان سوالوں کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔ ثقافتیں اضافی ہوتی ہیں؛ اخلاقیات مطلق ہوتی ہے۔ جیسا کہ مائیکل والزر نے کہا، ثقافتیں ''گاڑھی'' ہوتی ہیں؛ وہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے ادارے اور برتاؤ کے طور طریقے متعین کرتی ہیں جو کسی خاص معاشرے میں درست ہوتے ہیں۔ اس جمعی (maximalist) اخلاقیات سے ماورا، پرے اور برآمد ہونے والی ایک ''پتلی'' اقلی (minimalist) اخلاقیات ہوتی ہے جس میں ''مخصوص گاڑھے یا جمعی اخلاقی نظاموں کے دہرائے گئے خواص'' ہوتے ہیں۔ سچائی اور عدل کے اقلی اخلاقی تصورات تمام گاڑھے اخلاقی نظاموں میں پائے جاتے ہیں اور ان سے علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔ اقلی اخلاقی ''سلبی احکامات [بھی ہوتے ہیں] جو زیادہ تر قتل، فریب دہی، اذیت رسانی، ظلم اور جبر کے خلاف اصول'' ہوتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان جو کچھ مشترک ہوتا ہے وہ ''کسی مشترک ثقافت سے وابستگی سے زیادہ مشترک دشمن [یا برائی] کا فہم ہے۔'' انسانی معاشرہ اس لیے ''عام ہے کہ یہ انسانی [ہے]، اس لیے خاص ہے کہ یہ ایک معاشرہ ہے۔'' بعض اوقات ہم دوسروں کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہیں، بعض اوقات اکیلے۔[19] تاہم مشترکہ انسانی حالات سے ایک ''پتلی'' اقلی اخلاقیات ضرور اخذ ہوتی ہے اور ''آفاقی طبائع'' تمام ثقافتوں میں پائی جاتی ہیں☆۔[20] ایک تہذیب کے مفروضہ آفاقی خواص کو فروغ دینے کی بجائے ثقافتی بقائے باہمی کا تقاضا ہے کہ بیشتر تہذیبوں کے مشترک اثاثے تلاش کیے جائیں۔ ایک کثیر تہذیبی دنیا میں تعمیری طریقہ یہ ہے کہ آفاقیت کو مسترد کر دیا جائے، تنوع کو قبول

☆ نوٹ از مترجم: ان چند سطور کا مطلب صرف یہ ہے کہ کچھ باتیں تمام معاشروں کی اخلاقیات میں مشترک ہوتی ہیں اور کچھ ہر معاشرے میں الگ الگ ہوتی ہیں۔

کیا جائے اور مشترکہ خواص تلاش کیے جائیں۔

ایک بہت چھوٹی جگہ پر ایسے مشترک خواص تلاش کرنے کی ایک کوشش ۱۹۹۰ء کی دہائی میں سنگاپور میں ہوئی۔ سنگاپور کے لوگ لگ بھگ ۷۶ فیصد چینی، ۱۵ فیصد ملائی و مسلم اور ۶ فیصد بھارتی ہندو اور سکھ ہیں۔ ماضی میں حکومت نے اپنے عوام میں ''کنفیوشین اقدار'' کو فروغ دینے کی کوشش کی لیکن اس نے ہر ایک کے تعلیم حاصل کرنے اور انگریزی میں رواں ہونے پر بھی زور دیا۔ جنوری ۱۹۸۹ء میں صدر وی کم وی نے پارلیمنٹ کے افتتاحی اجلاس سے خطاب میں نشاندہی کی کہ مغرب کے بیرونی ثقافتی اثرات نے ۲۷ لاکھ سنگاپوریوں کو ''باہر سے آنے والے نئے خیالات اور ٹیکنالوجیز سے روشناس کرایا ہے'' لیکن ان کے لیے ''اجنبی طرز ہائے زندگی اور اقدار کے راستے بھی کھول دیے ہیں۔'' انہوں نے خبردار کیا کہ ''اخلاقیات، فرض اور معاشرے کے روایتی ایشیائی تصورات جو ماضی میں ہمیں سنبھالے رہے ہیں'' ان کی جگہ ''زندگی کا زیادہ مغرب زدہ، فرد پسندانہ اور خودغرضانہ انداز نظر آرہا ہے۔'' ان کا کہنا تھا کہ ان بنیادی اقدار کو شناخت کرنا ضروری ہے جو سنگاپور کی مختلف نسلی و مذہبی برادریوں میں مشترک ہیں جو ''ایک سنگاپوری کے وجود کا جوہر ہیں۔''

صدر وی نے ایسی چار اقدار کا ذکر کیا: ''معاشرے کو ذات پر فوقیت دینا، خاندان کو معاشرے کی بنیاد کے طور پر اہمیت دینا، بڑے تنازعات کو نفاق کی بجائے اتفاق رائے سے طے کرنا اور نسلی و مذہبی رواداری اور ہم آہنگی پر زور دینا۔'' ان کے خطاب کے نتیجے میں سنگاپوری اقدار پر تفصیلی بحث مباحثے ہوئے اور دو سال بعد ایک قرطاس ابیض سامنے آیا جس میں حکومت کا نقطہ نظر بیان کیا گیا۔ قرطاس ابیض میں ان چاروں اقدار کی توثیق کی گئی جن کا صدر نے تذکرہ کیا تھا تاہم فرد کی حمایت میں پانچویں کا اضافہ کیا گیا جس کا مقصد سنگاپوری معاشرے میں حفظ مراتب اور خاندان کی کنفیوشسی اقدار کے مقابلے میں انفرادی میرٹ کی ترجیح پر زور دینا تھا کیونکہ یہ کنفیوشسی اقدار اقربا پرستی کی طرف لے جاسکتی تھیں۔ قرطاس ابیض نے سنگاپوریوں کی ''مشترکہ اقدار'' کو یوں متعین کیا:

> [نسلی] برادری سے پہلے قوم اور ذات سے پہلے معاشرہ؛
> خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی؛
> فرد کے لیے احترام اور برادری کا تعاون؛
> تنازعے کی بجائے اتفاق رائے؛
> نسلی اور مذہبی ہم آہنگی۔

پارلیمانی جمہوریت اور حکومت کے نظم و نسق میں بہترین کارکردگی سے سنگاپور کی وابستگی کا

تذکرہ کرتے ہوئے مشترکہ اقدار کے بیان میں سیاسی اقدار کو واضح طور پر دائرے سے خارج کر دیا گیا۔ حکومت نے زور دیا کہ سنگاپور ''نہایت اہم پہلوؤں سے ایک ایشیائی معاشرہ'' ہے اور رہنا چاہیے۔ ''سنگاپوری امریکی یا اینگلو سیکسن نہیں، گو کہ ہم انگریزی بولتے ہیں اور مغربی لباس پہنتے ہیں۔ اگر طویل مدت میں سنگاپوری امریکیوں، برطانویوں یا آسٹریلویوں سے مختلف نہ رہے یا اس سے بھی بدتر یہ کہ ان کی ناقص نقل بن گئے [یعنی مقطوع ملک] تو ہم مغربی معاشروں پر اپنی فوقیت کھو دیں گے جس کی بنا پر ہم بین الاقوامی طور پر خود کو قائم رکھنے کے قابل ہیں''۔[۲۱]

سنگاپور کا منصوبہ سنگاپوری ثقافتی تشخص کا، جو اس کی نسلی و مذہبی برادریوں میں مشترک تھا اور جو اسے مغرب سے ممتاز بناتا تھا، تعین کرنے کی ایک پرجوش اور روشن خیالی پر مبنی کاوش تھا۔ یقیناً مغربی خصوصاً امریکی اقدار کو بیان کیا جائے تو برادری کی بہ نسبت فرد کے حقوق کو، اظہار کی آزادی اور خیالات کی جنگ سے برآمد ہونے والی سچائی کو، سیاسی شرکت اور مسابقت کو اور ماہرین، دانشمندوں اور ذمے دار حکمرانوں کی حکومت کی بہ نسبت قانون کی حکمرانی کو کہیں زیادہ وزن دیا جائے گا۔ اگرچہ اہلِ مغرب سنگاپوری اقدار کو کم ترجیح دیں گے تاہم بہت کم ایسے ہوں گے جو ان کو بالکل فضول قرار دیں۔ کم از کم ایک بنیادی ''پتلی'' اخلاقی سطح، کچھ مشترک خواص ایشیا اور مغرب کے درمیان موجود ہیں۔ علاوہ ازیں جیسا کہ متعدد اہل قلم نے نشاندہی کی ہے، دنیا کے بڑے مذاہب-- مغربی مسیحیت، آرتھوڈوکسی، ہندومت، بدھ مت، اسلام، کنفیوشنزم، تاؤازم، یہودیت-- جس حد بھی نوع انسانی کو تقسیم کرتے ہوں، ان میں مشترک کلیدی اقدار بھی پائی جاتی ہیں۔ اگر انسانوں نے کبھی ایک آفاقی تہذیب پیدا کی تو وہ بتدریج ان مشترک خواص کی تلاش اور توسیع کے نتیجے میں پروان چڑھے گی۔ اس طرح گریز کے اصول اور مشترکہ ثالثی کے اصول کے علاوہ کثیر تہذیبی دنیا میں امن کا تیسرا اصول ہے مشترک خواص کا اصول: تمام تہذیبوں کے افراد کو اُن اقدار، اداروں اور رواجوں کو ڈھونڈنے اور وسعت دینے کی کوشش کرنی چاہیے جو اُن میں اور دوسری تہذیبوں کے افراد میں مشترک ہیں۔

یہ کوشش نا صرف تہذیبوں کے تصادم کو محدود کرنے میں مدد دے گی بلکہ صیغہ واحد میں تہذیب (یہاں وضاحت کی خاطر موٹے حروف میں لکھا گیا ہے) کو بھی مضبوط بنائے گی۔ صیغہ واحد میں تہذیب شاید اخلاقیات، مذہب، علم وحکمت، فن، فلسفہ، ٹیکنالوجی، مادی خوشحالی اور غالباً دیگر چیزوں کے ایک پیچیدہ آمیزے کا نام ہے۔ ظاہر ہے یہ چیزیں ایک ساتھ تغیر پذیر نہیں ہوتیں۔ تاہم اہل علم تہذیبوں کی تاریخ میں تہذیب کے نقطہ ہائے عروج اور نقطہ ہائے زوال کی بآسانی

نشاندہی کرتے ہیں۔ تو پھر سوال یہ ہے: ہم انسانی ارتقا کی تاریخ میں تہذیب کے نشیب و فراز کی نقشہ کشی کیسے کر سکتے ہیں؟ کیا انفرادی تہذیبوں سے ماورا کوئی عمومی سیکولر رجحان ہے جو تہذیب کی بلند تر سطحوں کی طرف گامزن ہو؟ اگر ایسا کوئی رجحان ہے تو کیا یہ جدیدیت کے عمل کی پیداوار ہے جو ماحول پر انسان کی قدرت میں اضافہ کرتا ہے اور اس طرح تیکنیکی ترقی اور مادی خوشحالی کی اعلیٰ سے اعلیٰ تر سطحیں پیدا کرتا جاتا ہے؟ چنانچہ آیا عصرِ حاضر میں تہذیب کی بلند تر سطح جدیدیت کی بلند تر سطح سے مشروط ہے؟ یا تہذیب کی سطح انفرادی تہذیبوں کی تاریخ کے اندر تغیر پذیر رہتی ہے؟

یہ مسئلہ تاریخ کی خطی یا گردشی نوعیت سے متعلق بحث کا ایک اور رخ ہے۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ زیادہ تعلیم، شعور اور انسانی سماج اور اس کے فطری ماحول کی بہتر تفہیم سے پیدا شدہ جدیدیت اور انسانی اخلاقی ترقی تہذیب کی اعلیٰ سے اعلیٰ تر سطحوں کی جانب مسلسل پیش رفت کا سبب بنتی ہوں۔ دوسری جانب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تہذیب کی سطحیں محض تہذیبوں کے ارتقا میں مختلف مراحل کی آئینہ دار ہوں۔ جب پہلی بار تہذیبیں نمودار ہوتی ہیں تو ان کے افراد عموماً پُرجوش، متحرک، سفاک، فعال اور توسیع پسند ہوتے ہیں۔ وہ نسبتاً غیر مہذب ہوتے ہیں۔ جب تہذیب ترقی کرتی ہے تو اس میں استحکام آتا ہے اور ایسی مہارتیں اور ہنر پیدا ہوتے ہیں جو اسے زیادہ مہذب بناتے ہیں۔ جب اس کے اجزائے ترکیبی کے درمیان مسابقت کی شدت کم ہو جاتی ہے اور ایک آفاقی ریاست وجود میں آتی ہے تو تہذیب تہذیب کی اعلیٰ ترین سطح پر پہنچ جاتی ہے جو اس کا ''سنہری زمانہ'' ہوتا ہے جس میں اخلاقیات، فن، ادب، فلسفہ، ٹیکنالوجی اور فوجی، اقتصادی اور سیاسی مسابقت پھل پھول رہی ہوتی ہے۔ جب بطور تہذیب وہ زوال پذیر ہوتی ہے تو اس میں تہذیب کی سطح بھی زوال پذیر ہو جاتی ہے اور کسی اور ابھرتی ہوئی تہذیب کی یلغار میں، جس کے اندر تہذیب کی سطح کم ہوتی ہے، معدوم ہو جاتی ہے۔

جدیدیت نے بالعموم پوری دنیا میں تہذیب کی مادی سطح بڑھائی ہے۔ لیکن کیا اس نے تہذیب کی اخلاقی و ثقافتی جہات میں بھی اضافہ کیا ہے؟ بعض پہلوؤں سے ایسا ہی لگتا ہے۔ غلامی، اذیت رسانی، افراد کے ساتھ شدید زیادتی موجودہ دنیا میں کم سے کم قابل قبول ہو گئی ہیں۔ مگر کیا یہ محض دوسری ثقافتوں پر مغربی تہذیب کے اثر کی وجہ سے ہوا ہے اور مغربی طاقت کے زوال پذیر ہونے پر اخلاقی رجعت واقع ہو گی؟ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں عالمی امور کے ''کلی انتشار'' والے خاکے کے حق میں خاصے شواہد موجود ہیں: امن و امان کا عالمی انحطاط، دنیا کے بہت سے علاقوں میں ناکام ریاستیں اور بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی، جرائم کی عالمی لہر، جرائم پیشہ اور منشیات کی بین الاقوامی

تنظیمیں، بہت سے معاشروں میں منشیات کی بڑھتی ہوئی وبا، خاندان کے ادارے کی عمومی کمزوری، بہت سے ملکوں میں سماجی استحکام اور اعتماد کا زوال، نسلی، مذہبی اور تہذیبی تشدد اور دنیا کے بیشتر حصے میں اسلحے کی حکمرانی۔ ماسکو، ریوڈی جنیرو، بنکاک، شنگھائی، لندن، روم، وارسا، ٹوکیو، جوہانس برگ، دہلی، کراچی، قاہرہ، بوگوٹا، واشنگٹن-- شہروں میں ایک ایک کر کے جرائم بڑھتے ہوئے اور تہذیب کے بنیادی عناصر مدھم ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لوگ حکومتی نظم و نسق کے عالمی بحران کی بات کرتے ہیں۔ اقتصادی اشیا پیدا کرنے والی بین الاقوامی کارپوریشنوں کے عروج کے ساتھ بین الاقوامی جرائم پیشہ تنظیمیں، منشیات کے گروہ اور دہشت گرد ٹولیاں بھی ابھر رہی ہیں جو تہذیب پر یورش کر رہی ہیں۔ امن و امان کی پہلی شرط تہذیب ہے اور بیشتر دنیا میں-- افریقہ، لاطینی امریکا، سابق سوویت یونین، جنوبی ایشیا، مشرق وسطیٰ-- یہ ختم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ عالمگیر بنیاد پر متعدد پہلوؤں سے تہذیب بربریت کے آگے گھٹنے ٹیکتی جا رہی ہے جس سے ایک ایسی صورتحال کا تصور پیدا ہو رہا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، ایک عالمی تاریک دور جو انسان پر اتر رہا ہے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں لیسٹر پیئرسن نے خبردار کیا کہ انسان ایک ایسے زمانے میں داخل ہو رہے ہیں جہاں مختلف تہذیبوں کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پُرامن لین دین کے ساتھ ایک دوسرے سے سیکھتے ہوئے، ایک دوسرے کی تاریخ اور آدرشوں اور فن و ثقافت کا مطالعہ کرتے ہوئے، ایک دوسرے کی زندگیوں کو زرخیز بناتے ہوئے رہنا سیکھنا ہوگا۔ اس پُرہجوم چھوٹی سی دنیا میں دوسرا راستہ کشیدگی، تصادم اور آفات کا ہے''۔[۲۲] امن اور تہذیب دونوں کے مستقبل کا انحصار دنیا کی بڑی تہذیبوں کے سیاسی، روحانی اور علمی رہنماؤں کے درمیان افہام و تفہیم اور تعاون پر ہے۔ تہذیبوں کے تصادم میں یورپ اور امریکا ساتھ ہوں گے یا الگ الگ ہوں گے۔ تہذیب اور بربریت کے درمیان عالمی ''حقیقی تصادم'' میں دنیا کی عظیم تہذیبیں بھی، مذہب، فن، ادب، فلسفے، سائنس، ٹیکنالوجی، اخلاقیات اور جذبہ ہمدردی کے حوالے سے اپنے بھرپور کارناموں کے ہمراہ، ساتھ ہوں گی یا الگ الگ ہوں گی۔ ابھرتے ہوئے دور میں تہذیبوں کے تصادم امنِ عالم کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور تہذیبوں کی بنیاد پر ایک بین الاقوامی نظام عالمی جنگ سے تحفظ کی سب سے یقینی ضمانت ہے۔

حواشی

۱۔ ہنری اے کسنجر، Diplomacy (نیویارک: سائمن اینڈ شسٹر، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۲۳ تا ۲۴۔

۲۔ ایچ ڈی ایس گرین وے کی استعمال کردہ ترکیب، Boston Globe، ۳ دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۹۔

۳۔ واکلاف ہیول، "The New Measure of Man," New York Times، ۸ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ A۲۷؛ یاک ڈیلرز "Questions Concerning European Security" انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار سٹرے ٹیجک اسٹڈیز، برسلز میں خطاب، ۱۰ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲۔

۴۔ ٹامس ایس کوہن، The Structure of Scientific Revolutions (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۶۲ء)، صفحات ۱۷ تا ۱۸۔

۵۔ جان لوئیس گیڈس، "Toward the Post-Cold War World." Foreign Affairs 70، (موسم بہار ۱۹۹۱ء)، ۱۰۱؛ جوڈتھ گولڈسٹائن اور رابرٹ او کیوہین "Ideas and Foreign Policy: An Analytical Framework" جوڈتھ گولڈسٹائن اور رابرٹ او کیوہین کی مدون کردہ Ideas and Foreign Policy: Beliefs, Institutions, and Political Change (اتھاکا: کورنیل یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء)، صفحات ۸ تا ۱۷۔

۶۔ فرانسس فوکویاما، "The End of History," The National Interest 16، (موسم گرما ۱۹۸۹ء)، ۴، ۱۸۔

۷۔ "Address to the Congress Reporting on the Yalta Confernece" یکم مارچ ۱۹۴۵ء، سیموئیل آئی روزمین کی مدون کردہ Public Papers and Addresses of Franklin D. Roosevelt (نیویارک: رسل اینڈ رسل، ۱۹۶۹ء)، سیزدہم، صفحہ ۵۸۶۔

۸۔ دیکھئے میکس سنگر اور آرون ولڈاوسکی، The Real World Order: Zones of Peace,

Zones of Turmoil (چیٹ ہم، نیوجرسی: چیٹ ہم ہاؤس، ۱۹۹۳ء)؛ رابرٹ او کیوہین اور جوزف ایس نائے کا مضمون "Introduction: The End of the Cold War in Europe," کیوہین، نائے اور اسٹینلے ہوف مین کی مرتبہ کتاب *After the Cold War: International Institutions and State Strategies in Europe, 1989-1991* (کیمبرج: ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۶؛ اور جیمز ایم گولڈگائیر اور مائیکل مک فال، "A Tale of Two Worlds: Core and Periphery in the Post-Cold War Era," *International Organization* 46 (موسم بہار ۱۹۹۲ء)، صفحات ۴۶۷ تا ۴۹۱۔

۹۔ دیکھیے ایف ایس سی نارتھ روپ، *The Meeting of East and West: An Inquiry Concerning World Understanding* (نیویارک: مک ملن، ۱۹۴۶ء)۔

۱۰۔ ایڈورڈ ڈبلیو سعید، *Orientalism* (نیویارک: پین تھین بکس، ۱۹۷۸ء)، صفحات ۴۳ تا ۴۴۔

۱۱۔ دیکھیے کینتھ این والز "The Emerging Structure of International Politics," *International Security* 18 (موسم خزاں ۱۹۹۳ء)، صفحات ۴۴ تا ۷۹؛ جان جے میرز ہائیمر، "Back to the Future: Instability in Europe after the Cold War," *International Security* 15 (موسم گرما ۱۹۹۰ء)، صفحات ۵ تا ۵۶۔

۱۲۔ اسٹیون ڈی کریسنر نے اس خیال کو محل نظر قرار دیا ہے کہ ویسٹ فیلیا ایک اہم تاریخی موڑ ہے۔ دیکھیے اس کا مضمون "Westphalia and All That," گولڈسٹائن اور کیوہین کی مرتبہ کتاب *Ideas and Foreign Policy* میں، صفحات ۲۳۵ تا ۲۶۴۔

۱۳۔ زبگنیو بریزنسکی، *Out of Control: Global Turmoil on the Eve of the Twenty-first Century* (نیویارک: اسکربنر، ۱۹۹۳ء)؛ ڈینیل پیٹرک موئنی ہان، *Pandaemonium: Ethnicity in International Politics* (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء)؛ علاوہ ازیں دیکھیے رابرٹ کپلان "The Coming Anarchy," *Atlantic Monthly* 273 (فروری ۱۹۹۴ء)، صفحات ۴۴ تا ۷۶۔

۱۴۔ دیکھیے *New York Times*، ۷ فروری ۱۹۹۳ء صفحات ۱، ۱۴؛ اور گیبرئیل شوئین فیلڈ، "Outer Limits," *Post-Soviet Prospects* 17 (جنوری ۱۹۹۳ء)، ۳؛ جس میں روسی وزارت دفاع کے اعداد و شمار کا حوالہ دیا گیا ہے۔

۱۵۔ دیکھیے گیڈس "Toward the Post-Cold War World"؛ بنجمن آر باربر "Jihad vs. McWorld," *Atlantic Monthly* 269 (مارچ ۱۹۹۲ء)، صفحات ۵۳ تا ۶۳ اور *Jihad vs. McWorld* (نیویارک: ٹائمز بکس، ۱۹۹۵ء)؛ ہنز مارک، "After Victory in the Cold War: The Global Village or Tribal Warfare" جے جے لی اور والٹر کورٹر کی مدون کردہ کتاب

Europe in Transition: Political, Economic, and Security Prospects for the 1990s (ایل بی جے اسکول آف پبلک افیئرز، یونیورسٹی آف ٹیکساس ایٹ آسٹن، مارچ ۱۹۹۰ء)، صفحات ۱۹ تا ۲۷۔

۱۶۔ جان جے میئرز ہائیمر، "The Case for a Nuclear Deterrent," Foreign Affairs 72 (موسم گرما ۱۹۹۳ء)، ۵۴۔

۱۷۔ لیسٹر بی پیئرسن، Democracy in World Politics (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۵ء)، صفحات ۸۲ تا ۸۳۔

۱۸۔ جان گلٹنگ نے عالمی سیاست میں سات آٹھ بڑی تہذیبوں اور ان کی مرکزی ریاستوں کے نمایاں کردار کے بارے میں اپنے طور پر ایک تجزیہ کیا ہے جو میرے تجزیے سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ دیکھئے اس کا مضمون "The Emerging Conflict Formations" کیتھرین اور ماجد تہرانی کی مرتبہ کتاب Restructuring for World Peace: On the Threshold of the Twenty-First Century (کیریسکل نیوجرسی: ہیمپٹن پریس، ۱۹۹۲ء) میں صفحات ۲۳ تا ۲۴۔ گلٹنگ کی نظر میں سات علاقائی ثقافتی گروہ ابھر رہے ہیں جن پر بالادست قوتوں کا غلبہ ہوگا: امریکا، یورپی برادری، جاپان، چین، روس، بھارت اور ایک "اسلامی مرکز"۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں اسی طرح کے نظریات پیش کرنے والے دوسرے مصنفین میں مندرجہ ذیل شامل ہیں: مائیکل لنڈ، "American as an Ordinary Country," American Enterprise 1 (ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۰ء)، صفحات ۱۹ تا ۲۳؛ بیری بوزن، "New Patterns of Global Security in the Twenty-first Century," International Affairs 67 (۱۹۹۱ء)، صفحات ۴۴۱، ۴۴۸ تا ۴۴۹؛ رابرٹ گلپن، "The Cycle of Great Powers: Has It Finally Been Broken?" (پرنسٹن یونیورسٹی، غیر مطبوعہ مقالہ، ۱۹ مئی ۱۹۹۳ء)، صفحات ۶ اور اس کے بعد؛ ولیم ایس لنڈ "North-South Relations: Returning to a World of Cultures in Conflict," Current World Leaders 35 (دسمبر ۱۹۹۲ء)، صفحات ۱۰۷۳ تا ۱۰۸۰ اور "Defending Western Cutlure," Foreign Policy 84 (موسم خزاں ۱۹۹۴ء)، صفحات ۴۰ تا ۵۰؛ "Looking Back from 2992: A World History" تیرھواں باب: "The Disastrous 21st Century," Economist، ۲۶ دسمبر ۱۹۹۲ء تا ۸ جنوری ۱۹۹۳ء، صفحات ۱۷ تا ۱۹؛ "The New World Order: Back to the Future," Economist، ۸ جنوری ۱۹۹۴ء، صفحات ۲۱ تا ۲۳؛ "A Survey of Defence and the Democracies," Economist، یکم ستمبر ۱۹۹۰ء؛ سولٹ روستوئیوانی، "Clash of Civilizations and Cultures: Unity and Disunity of World Order," (غیر مطبوعہ مقالہ، ۲۹ مارچ ۱۹۹۱ء)؛ مائیکل ولاہوس، "Culture and Foreign

Policy," *Foreign Policy* 82 (موسم بہار ۱۹۹۱ء)، صفحات ۵۹ تا ۷۸؛ ڈونالڈ جے پچالا، "The History of the Future of International Relations," *Ethics and International Affairs* 8 (۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۷۷ تا ۲۰۲؛ مہدی المنظرہ، "Cultural Diversity: Key to Survival in the Future" (مطالعہ مستقبل پر پہلی میکسیکن کانگریس میں پیش کردہ مقالہ، میکسیکو سٹی، ستمبر ۱۹۹۴ء)۔ ۱۹۹۱ء میں المنظرہ نے عربی میں ایک کتاب شائع کرائی جو اگلے سال *Premiere Guerre Civilisationnelle* (کاسابلانکا: ایڈیتوبکل، ۱۹۸۲ء، ۱۹۹۴ء) کے نام سے فرانسیسی میں منظر عام پر آئی۔

۱۹۔ فرنینڈ براؤڈل، *On History* (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۸۰ء)، صفحات ۲۱۰ تا ۲۱۱۔

دوسرا باب:

۱۔ ''عالمی تاریخ بڑی بڑی ثقافتوں کی تاریخ ہے۔'' اوسوالڈ اسپینگلر *Decline of the West* (نیویارک: اے اے نوپف، ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۸ء)، دوم، ۱۷۰۔ ان اہلِ علم کی اہم تحریریں جن میں تہذیبوں کی نوعیت اور حرکیات کا تجزیہ کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل شامل ہیں: میکس ویبر، *The Sociology of Religion* (بوسٹن: بیکن پریس، ترجمہ افرائیم فشکوف، ۱۹۶۸ء)؛ ایمائیل ڈرکہائیم اور مارسل ماؤس، "Note on the Notion of Civilization," *Social Research* 38 (۱۹۷۱ء)، صفحات ۸۰۸ تا ۸۱۳؛ اوسوالڈ اسپینگلر، *Decline of the West*؛ پٹریم سوروکن، *Social and Cultural Dynamics* (نیویارک: امریکن بک کمپنی، چار جلدیں، ۱۹۳۷ء تا ۱۹۸۵ء)؛ آرنلڈ ٹائن بی، *A Study of History* (لندن: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۲ جلدیں، ۱۹۳۴ء تا ۱۹۶۱ء)؛ الفرڈ ویبر، *Kulturgeschichte als Kultursoziologie* (لائیڈن: اے ڈبلیو سیتھوف یوئٹ گرورز ماشاپی این وی، ۱۹۳۵ء)؛ اے ایل کروئبر، *Configurations of Culture Growth* (برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۴۴ء)، اور *Style and Civilizations* (ویسٹ پورٹ، سی ٹی: گرین وڈ پریس، ۱۹۷۳ء)؛ فلپ بیگ بی، *Culture and History: Prolegomena to the Comparative Study of Civilizations* (لندن: لانگ مینز، گرین، ۱۹۵۸ء)؛ کیرول کوئیگلی، *The Evolution of Civilizations: An Introduction to Historical Analysis* (نیویارک: مک ملن، ۱۹۶۱ء)؛ رشٹن کولبرن، *The Origin of Civilized Societies* (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۹ء)؛ ایس این آئزن شٹاٹ، "Cultural Traditions and Political Dynamics: The Origins and Modes of Ideological Politics," *British Journal of Sociology* 32 (جون ۱۹۸۱ء)، صفحات ۱۵۵ تا ۱۸۱؛ فرنینڈ براؤڈل،

History of Civilizations (نیویارک: ایلن لین -- پینگوئن پریس، ۱۹۹۴ء) اور On History (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۸۰ء)؛ ولیم ایچ مک نیل، The Rise of the West: A History of the Human Community (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۶۳ء)؛ ایڈا بی بوزمین، "Civilizations Under Stress," Virginia Quarterly Review 51، (موسم سرما ۱۹۷۵ء)، ۱ تا ۱۸، Strategic Intelligence and Statecraft (واشنگٹن: برایز (امریکا)، ۱۹۹۲ء)، اور Politics and Culture in International History: From the Ancient Near East to the Opening of the Modern Age (نیوبرونسک، نیوجرسی: ٹرانزیکشن پبلشرز، ۱۹۹۴ء)؛ کرسٹوفر ڈاسن، Dynamics of World History (لاسیل، آئی ایل: شیروڈ بجن کمپنی، ۱۹۷۸ء)، اور The Movement of World Revolution (نیویارک: شیڈ اینڈ وارڈ، ۱۹۵۹ء)؛ ایمانوئیل ویلرسٹائن، Geopolitics and Geoculture: Essays on the Changing World-system (کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۲ء)؛ فلیپ فرنانڈز آرمسٹو، Millennium: A History of the Last Thousand Years (نیویارک: اسکربنرز، ۱۹۹۵ء)۔ سب سے آخر میں ان تحریروں میں لوئیس بارٹز کی کتاب A Synthesis of World History (زیورچ: ہیومنٹی پریس، ۱۹۸۳ء) کا اضافہ کیا جاسکتا ہے جو سیموئیل بیر کے تبصرے کے مطابق ''بڑی دور رس نگاہ کے ساتھ نوع انسانی کی' پانچ بڑے'' ثقافتی حصوں میں تقسیم کی پیشگوئی کرتی ہے'': عیسائی، مسلمان، ہندو، کنفیوشین اور افریقی۔ Memorial Minute، لوئیس ہارٹز، Harvard University Gazette 89، (۲۷ مئی ۱۹۹۴ء)۔ تہذیبوں کے ایک طائرانہ جائزے اور تعارف کے لیے میتھیو میلکو کی The Nature of Civilizations (بوسٹن: پورٹر سارجنٹ، ۱۹۶۹ء) کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ میں اپنے Foreign Affairs والے مضمون پر ہیورڈ ڈبلیو ایلکر جونیر کے مقالے "If Not Huntington's Civilizations,' Then Whose?" (غیر مطبوعہ مقالہ، میساچوسیٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، ۲۵ مارچ ۱۹۹۴ء) میں دی گئی تجاویز پر بھی ان کا شکرگزار ہوں۔

۲۔ براؤڈل، On History، صفحات ۱۷۷ تا ۱۸۱، ۲۱۲ تا ۲۱۴ اور History of Civilizations صفحات ۴ تا ۵؛ جیرٹ ڈبلیو گونگ، The Standard of "Civilization" in International Society (اوکسفرڈ: کلیرینڈن پریس، ۱۹۸۴ء)، صفحہ ۸۱ اور اس سے آگے، ۹۷ تا ۱۰۰؛ ویلرسٹائن، Geopolitics and Geoculture صفحات ۱۶۰ اور اس سے آگے نیز ۲۱۵ اور اس سے آگے؛ آرنلڈ جے ٹائن بی، Study of History، جلد دہم، صفحات ۲۷۴ تا ۲۷۵، اور Civilization on Trial (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۴۸ء)، صفحہ ۲۴۔

۳۔ براؤڈل، On History، صفحہ ۲۰۵۔ ثقافت اور تہذیب کی مزید تفصیلی تعریف خصوصاً جرمن نقطۂ نظر کے لیے دیکھئے اے ایل کروبر اور کلائیڈ کلاکون Culture: A Critical Review of Concepts and

Definitions (کیمبرج: پی باڈی میوزیم آف امریکن آرکیالوجی اینڈ اتھنولوجی کے مقالات، ہارورڈ یونیورسٹی، جلد ۴۷، نمبر ایک، ۱۹۵۲ء) مختلف صفحات پر حوالے ہیں مگر خصوصاً صفحات ۱۵ تا ۲۹۔

۴۔ بوز مین، "Civilizations Under Stress" صفحہ ۱۔

۵۔ ڈرکھائیم اور ماؤس، "Notion of Civilization" صفحہ ۸۱۱؛ براؤڈل، *On History* صفحات ۱۷۷، ۲۰۲؛ *Nature of Civilizations,* صفحہ ۸؛ ویلرسٹائن، *Geopolitics and Geoculture*، صفحہ ۲۱۵؛ ڈاسن، *Dynamics of World History*، صفحات ۵۱، ۴۰۲؛ اسپینگلر، *Decline of the West*، جلد اول، صفحہ ۳۱۔ دلچسپ امر ہے کہ *International Encyclopedia of the Social Sciences* (نیویارک: مک ملن اینڈ فری پریس، مدیر ڈیوڈ ایل سلز، ۱۷ جلدیں، ۱۹۶۸ء) میں صیغہ واحد میں ''تہذیب'' یا صیغہ جمع میں ''تہذیبوں'' پر کوئی بنیادی مضمون نہیں۔ "Urban Revolution" کے عنوان سے ایک مضمون کے ذیلی حصے میں ''تہذیب کے تصور'' (صیغہ واحد) پر بحث کی گئی ہے جبکہ تہذیبوں (صیغہ جمع) کا "Culture" کے عنوان سے ایک مضمون میں سرسری تذکرہ کیا ہے۔

۶۔ ہیروڈوٹس، *The Persian Wars* (ہارمنڈزورتھ، انگلینڈ: پینگوئن بکس، ۱۹۷۲ء)، صفحات ۵۴۳ تا ۵۴۴۔

۷۔ ایڈورڈ اے ٹریاکیان، "Reflections on the Sociology of Civilizations" *Sociological Analysis* 35 (موسم گرما ۱۹۷۴ء)، ۱۲۵۔

۸۔ ٹائن بی، *Study of History*، جلد اول، صفحہ ۴۵۵، جس کا حوالہ میلکو، *Nature of Civilizations*، صفحات ۸ تا ۹؛ اور براؤڈل، *On History*، صفحہ ۲۰۲ پر دیا گیا ہے۔

۹۔ براؤڈل، *History of Civilizations*، صفحہ ۳۵، اور *On History*، صفحات ۲۰۹ تا ۲۱۰۔

۱۰۔ بوز مین، *Strategic Intelligence and Statecraft*، صفحہ ۲۶۔

۱۱۔ کوئیگلی، *Evolution of Civilizations*، صفحات ۱۴۶ اور اس سے آگے؛ میلکو، *Nature of Civilizations*، صفحات ۱۰۱ اور اس سے آگے۔ ملاحظہ ہو ڈی سی سمرویل، "Argument" جو اس نے آرنلڈ جے ٹائن بی کی *Study of History*، جلد اول تا ششم (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۴۶ء) کی تلخیص میں شامل کیا ہے، صفحہ ۵۶۹ اور اس سے آگے۔

۱۲۔ لیوسین ڈبلیو پائی، "China Erratic State, Frutrated Society," *Foreign Affair* 69، (موسم خزاں ۱۹۹۰ء)، صفحہ ۵۸۔

۱۳۔ دیکھیے کوئیگلی، *Evolution of Civilizations*، باب ۳، خصوصاً صفحات ۷۷، ۸۴؛ میکس ویبر، *From Max Weber: Essays in Sociology* (لندن: روٹلیج، ترجمہ و تدوین ایچ ایچ گرتھ اور سی رائٹ ملز، ۱۹۹۱ء) میں "The Social Psychology of the World Religions"، صفحہ ۲۶۷؛ بیگ بی، *Culture and History*، صفحات ۱۶۵ تا ۱۷۴؛ اسپینگلر،

Decline of the West، جلد دوم، صفحہ ۳۱ اور اس سے آگے؛ ٹائن بی، Study of History، جلد اول، صفحہ ۱۳۳؛ جلد دوازدہم، صفحہ ۵۴۶ تا ۵۴۷؛ براؤڈل، History of Civilizations، مختلف صفحات پر تذکرہ؛ مک نیل، The Rise of the West، مختلف صفحات پر تذکرہ؛ اور روستووانی، "Clash of Civilizations"، صفحات ۸ تا ۹۔

۱۴۔ میلکو، Nature of Civilizations، صفحہ ۱۳۳۔

۱۵۔ براؤڈل، On History، صفحہ ۲۲۶۔

۱۶۔ ان تحریروں میں ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ایک اہم اضافہ کلاڈیو ویلیز نے کیا جو دونوں ثقافتوں سے واقف ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب The New World of the Gothic Fox (برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۹۴ء)۔

۱۷۔ دیکھئے چارلس اے اور میری آر بیئرڈ کی The Rise of American Civilization (نیویارک: مک ملن، دو جلدیں، ۱۹۲۷ء) اور میکس لرنر کی America as a Civilization (نیویارک: سائمن اینڈ شسٹر، ۱۹۵۷ء)۔ حب الوطنی کے جوش میں لرنر کہتا ہے کہ "اچھا ہے یا برا ہے، امریکا جو ہے وہ ہے، اپنے وجود میں خود ایک ثقافت جس کی قوت اور معانی کے بہت سے تانے بانے اسے یونان وروما کے درجے کی تاریخ کی ایک عظیم ممتاز تہذیب بناتے ہیں۔" تاہم وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ "تاریخ کے عظیم نظریات میں بلا استثنا امریکا کو فی نفسہٖ ایک تہذیب سمجھنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔" (صفحات ۵۸ تا ۵۹)۔

۱۸۔ یورپی تہذیب کے مختلف ٹکڑوں کے شمالی امریکا، لاطینی امریکا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا میں نئے معاشروں کو جنم دینے کے عمل پر مباحثے کے لیے دیکھئے The Founding of New Societies: Studies in the History of the United States, Latin America, South Africa, Canada, and Australia (نیویارک: ہارٹ کورٹ، بریس اینڈ ورلڈ، ۱۹۶۴ء)۔

۱۹۔ ڈاسن، Dynamics of World History، صفحہ ۱۲۸۔ نیز ملاحظہ ہو میری سی بیٹسن کا مضمون "Beyond Sovereignty: An Emerging Global Civilization" آر بی جے واکر اور سال ایچ مینڈلووٹز کی مدون کردہ کتاب Contending Sovereignties: Redefining Political Community (بولڈر: لن رائنر، ۱۹۹۰ء)، صفحات ۱۴۸ تا ۱۴۹۔

۲۰۔ ٹائن بی نے تھراواڈا اور لامائی بدھ مت دونوں کو فوسل تہذیبیں قرار دیا ہے، Study of History، جلد اول، صفحات ۳۵، ۹۱ تا ۹۲۔

۲۱۔ مثال کے طور پر دیکھئے برنارڈ لوئیس، Islam and the West (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء)؛ Study of History، نواں باب "Contacts between Civilizations in Space (Encounters between Contemporaries)"، جلد ہشتم، صفحہ ۸۸ اور اس سے آگے؛ بنجمن نیلسن، "Civilizational Complexes and Intercivilizational

Encounters," *Sociological Analysis* 34، (موسم گرما ۱۹۷۳ء)، صفحات ۷۹ تا ۱۰۵۔

۲۲۔ ایس این آئزن شٹاٹ، "Cultural Traditions and Political Dynamics: The Origins and Modes of Ideological Politics," *British Journal of Sociology* 32، (جون ۱۹۸۱ء)، ۱۵۷، اور "The Axial Age: The Emergence of Transcendental Visions and the Rise of Clerics," *Archieves Europeennes de Sociologie* 22، (نمبر۱، ۱۹۸۲ء)، ۲۹۸۔ مزید دیکھئے بنجمن آئی شوارٹز، "The Age of Transcendence in Wisdom, Revolution, and Doubt: Perspectives on the First Millennium B.C.," *Daedalus* 104، (موسم بہار ۱۹۷۵ء)، ۳۔ محوری عہد کا تصور کارل جیسپرز کی کتاب *Vom Ursprung und Ziel der Geschichte* (زیورچ: آرٹی مس ورلگ، ۱۹۴۹ء) سے ماخوذ ہے۔

۲۳۔ ٹائن بی، *Civilization on Trial* صفحہ ۶۹۔ موازنے کے لیے ملاحظہ ہو ولیم ایچ مک نیل، *The Rise of the West*، صفحات ۲۹۵ تا ۲۹۸، جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسیحی دور کی آمد نے ''منظم تجارتی گزرگاہوں کو، زمین کے راستے بھی اور سمندر کے راستے بھی... براعظم کی چار عظیم ثقافتوں کو ملا دیا۔''

۲۴۔ براؤڈل، *On History*، صفحہ ۱۴ ''... ثقافتی اثرات تھوڑا تھوڑا کرکے طویل سفر طے کرنے کے بعد پھیلے۔ اگر مؤرخین کی بات مانی جائے تو تانگ دور [۶۱۸ تا ۹۰۷ء] کے چینی فیشن اتنے سست رفتاری سے چلے کہ پندرھویں صدی سے قبل قبرص کے جزیرے اور لوسیگنن کے شاندار دربار تک نہ پہنچ سکے۔ وہاں سے وہ بحیرۂ روم کی تجارت کی بنا پر نسبتاً تیز رفتاری سے فرانس اور چارلس ششم کے بے ڈھنگے دربار تک پہنچے جہاں لمبے نوک والے جوتے بے پناہ مقبول ہو گئے جو ایک معدوم دنیا کا ورثہ تھے -- جیسے روشنی ان ستاروں سے ہم تک پہنچتی ہے جو فنا ہو چکے ہیں۔''

۲۵۔ دیکھئے ٹائن بی، *Study of History*، جلد ہشتم، صفحات ۳۴۷ تا ۳۴۸۔

۲۶۔ مک نیل، *Rise of the West*، صفحہ ۵۴۷۔

۲۷۔ ڈی کے فیلڈ ہاؤس، *Economics and Empire, 1830-1914* (لندن: مک ملن، ۱۹۸۴ء)، صفحہ ۳؛ ایف جے سی ہیرن شا، *Sea Power and Empire* (لندن: جارج ہیرپ اینڈ کو، ۱۹۴۰ء)، صفحہ ۱۷۹۔

۲۸۔ جیوفری پارکر، *The Military Revolution: Military Innovation and the Rise of the West* (کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء)، صفحہ ۴؛ مائیکل ہاورڈ، "The Military Factor in European Expansion," ہیڈلے بل اور ایڈم واٹسن کی مدون کردہ کتاب *The Expansion of International Society* (اوکسفرڈ: کلیرینڈن پریس، ۱۹۸۴ء)، صفحات ۳۳

اور اس سے آگے۔

۲۹۔ اے جی کین وڈ اور اے ایل لفیڈ، The Growth of the International Economy 1820-1990 (لندن: روٹلیج، ۱۹۹۲ء)، صفحات ۷۸ تا ۷۹؛ اینگس میڈیسن، Dynamic Forces in Capitalist Development (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء)، صفحات ۳۲۶ تا ۳۲۷؛ ایلن ایس بلائنڈر، New York Times، ۱۲ مارچ ۱۹۹۵ء میں محولہ، صفحہ E5۔ مزید برآں دیکھئے سائمن کزنٹس، "Quantitative Aspects of the Economic Growth of Nations–X. Level and Structure of Foreign Trade: Long-term Trends," *Economic Development and Cultural Change* 15 (جنوری ۱۹۶۷ء، حصہ دوم)، صفحات ۲ تا ۱۰۔

۳۰۔ چارلس ٹلی کا مضمون "Reflections on the History of European State-making" ٹلی کی مدون کردہ کتاب *The Formation of National States in Western Europe* (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۵ء)، صفحہ ۱۸۔

۳۱۔ آر آر پامر، "Frederick the Great, Guibert, Bulow: From Dynastic to National War" پیٹر پیرٹ کی مدون کردہ کتاب *Makers of Modern Strategy from Machiavelli to the Nuclear Age* (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۶ء)، صفحہ ۱۱۹۔

۳۲۔ ایڈورڈ مورٹیمر، "Christianity and Islam," *International Affairs* 67 (جنوری ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۷۔

۳۳۔ ہیڈلے بل، *The Anarchical Society* (نیویارک: کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۷ء)، صفحات ۹ تا ۱۳۔ علاوہ ازیں دیکھئے ایڈم واٹسن، *The Evolution of International Society* (لندن: روٹلیج، ۱۹۹۲ء) اور بیری بوزن، "From International System to International Society: Structural Realism and Regime Theory Meet the English School", *International Organization* 47 (موسم گرما ۱۹۹۳ء)، صفحات ۳۲۷ تا ۳۵۲ جو بین الاقوامی معاشرے کے "تہذیبی" اور "وظائفی" نمونوں کے درمیان تفریق کرتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "تاریخ میں تہذیبی بین الاقوامی معاشروں کا غلبہ رہا ہے" اور یہ کہ خالصتاً "وظائفی" بین الاقوامی معاشروں کی کوئی مثال نہیں دکھائی دیتی (صفحہ ۳۳۶)۔

۳۴۔ اسپنگلر، *Decline of the West*، جلد اول، صفحات ۹۳ تا ۹۴۔

۳۵۔ ٹائن بی، *Study of History*، جلد اول، صفحات ۱۴۹ اور اس سے آگے، ۱۵۴، ۱۵۷ اور اس سے آگے۔

۳۶۔ براوڈل، *On History*، صفحہ xxxiii۔

تیسرا باب:

۱۔ وی ایس نے پال، "Our Universal Civilization" ۱۹۹۰ء کا رسٹن لیکچر، مین ہٹن انسٹی ٹیوٹ، New York Review of Books، ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء، صفحہ ۲۰۔

۲۔ دیکھئے جیمز کیو ولسن، The Moral Sense (نیو یارک: فری پریس، ۱۹۹۳ء)؛ مائیکل والزر، Thick and Thin: Moral Argument at Home and Abroad (نوٹرے ڈیم: یونیورسٹی آف نوٹرے ڈیم پریس، ۱۹۹۴ء)، خصوصاً پہلا اور چوتھا باب؛ اور مختصر جائزے کے لیے، فرانسس وی ہاربر، "Basic Moral Values: A Shared Core," *Ethics and International Affairs* 9 (۱۹۹۵ء)، صفحات ۱۵۵ تا ۱۷۰۔

۳۔ واکلاف ہیول، "Civilization's Thin Veneer," *Harvard Magazine* 97 (جولائی اگست ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۳۲۔

۴۔ ہیڈلے بل، *The Anarchical Society:* A Study of Order in World Politics (نیو یارک: کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۷ء)، صفحہ ۳۱۷۔

۵۔ جان راک ویل، "The New Colossus: American Culture as Power Export" اور مختلف مصنفین "Channel-Surfing Through U.S. Culture in 20 Lands," ۳۰ جنوری ۱۹۹۴ء، حصہ ۲، صفحہ ۱ اور اس سے آگے؛ ڈیوڈ ریف، "A Global Culture," *World Policy Journal* 10، *New York Times* (موسم سرما ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۴ء)، صفحات ۷۳ تا ۸۱۔

۶۔ مائیکل ولاہوس، "Culture and Foreign Policy", *Foreign Policy* 82 (موسم بہار ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۶۹؛ کشور محبوبانی، "The Dangers of Decadence: What the Rest Can Teach the West," *Foreign Affairs* 72 (ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۱۲۔

۷۔ ایرون ایل فرائیڈبرگ، "The Future of American Power," *Political Science Quarterly* 109 (موسم بہار ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۵۔

۸۔ رچرڈ پارکر، "The Myth of Global News," *New Perspectives Quarterly* 11، (موسم سرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۴۱ تا ۴۴؛ مائیکل گورویچ، مارک آر لیوی اور اسحاق روح کا مضمون "Global Newsroom: convergences and diversities in the globalization of television news" پیٹر ڈالگرن اور کولن اسپارکس کی مدون کردہ کتاب *Communication and Citizenship: Journalism and the Public Sphere in the New Media* (لندن: روٹلیج، ۱۹۹۱ء) میں، صفحہ ۲۱۵۔

۹۔ رونالڈ ڈور کا مضمون "Unity and Diversity in World Culture" ہیڈلے بل اور ایڈم واٹسن کی مدون کردہ کتاب *The Expansion of International Society* (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونیورسٹی

پریس، ۱۹۸۴ء)، صفحہ ۲۲۳۔

۱۰۔ رابرٹ ایل بارٹلے، "The Case for Optimism — The West Should Believe in Itself," *Foreign Affairs 72* (ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۱۶۔

۱۱۔ دیکھئے جوشوا اے نش مین کا مضمون "The Spread of English as a New Perspective for the Study of Language Maintenance and Language Shift" جوشوا اے نش مین، رابرٹ ایل کوپر اور اینڈریو ڈبلیو کونریڈ کی کتاب *The Spread of English: The Sociology of English as an Additional language* (راؤلی، ایم اے: نیوبری ہاؤس، ۱۹۷۷ء)، صفحہ ۱۰۸ اور اس سے آگے۔

۱۲۔ فش مین، "Spread of English as a New Perspective" صفحات ۱۱۸ تا ۱۱۹۔

۱۳۔ رینڈولف کوئیرک کا مضمون، براج بی کچرو کی کتاب *The Indianization of English* (دہلی: اوکسفرڈ، ۱۹۸۳ء)، صفحہ ii؛ آر ایس گپتا اور کپل کپور کی مرتب کردہ *English in India — Issues and Problems* (دہلی: اکیڈمک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۲۱۔ موازنہ کیجئے سروپیلی گوپال، "The English Language in India," *Encounter 73* (جولائی/اگست ۱۹۸۹ء)، صفحہ ۱۶ جس کے تخمینے کے مطابق ساڑھے تین کروڑ بھارتی ''کسی نہ کسی قسم کی انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں۔'' عالمی بینک، *World Development Report 1985, 1991* (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس)، جدول ا۔

۱۴۔ کپور اور گپتا، "Introduction" گپتا اور کپور کی مرتب کردہ *English in India*، صفحہ ۲۱؛ گوپال، *"English Language"*، صفحہ ۱۶۔

۱۵۔ فش مین، "Spread of English as a New Perspective" صفحہ ۱۱۵۔

۱۶۔ دیکھئے *Newsweek*، ۱۹ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲۲۔

۱۷۔ گپتا اور کپور کی مرتبہ *English in India* میں صفحہ ۱۹۱ پر آر این سری واستو اور وی پی شرما کے مضمون "Indian English Today" میں محولہ؛ گوپال، "English Language" صفحہ ۱۷۔

۱۸۔ *New York Times*، ۱۶ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ A۹؛ *Boston Globe*، ۱۵ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۳۔

۱۹۔ *World Christian Encyclopedia* کے علاوہ دیکھئے جین بورژوا پشاٹ، "Le nombre des hommes: État et prospective"، البرٹ جیکارڈ اور دیگر، *Les Scientifiques Parlent* (پیرس: ہے شٹ، ۱۹۸۷ء)، صفحات ۱۴۰، ۱۴۳، ۱۵۱، ۱۵۴ تا ۱۵۶۔

۲۰۔ وی ایس نے پال کے بارے میں ایڈورڈ سعید، برینٹ اسٹےپلز، "Con Men and Conquerors" *New York Times Book Review*، ۲۲ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۲۔

۲۱۔ اے جی کین وڈ اور اے ایل لفیڈ، *The Growth of the International Economy*

1820–1990 (لندن: روٹلیج، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۹۲ء)، صفحات ۷۸ تا ۷۹؛ اینگس میڈیسن، Dynamic Forces in Capitalist Development (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء)، صفحات ۳۲۶ تا ۳۲۷؛ ایلین ایس بلائنڈر، New York Times، ۱۲ مارچ ۱۹۹۵ء، صفحہ E5۔

۲۲۔ ڈیوڈ ایم رو، "The Trade and Security Paradox in International Politics" (غیر مطبوعہ مسودہ، اوہایو اسٹیٹ یونیورسٹی، ۱۵ ستمبر ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۶۔

۲۳۔ ڈیل سی کوپلینڈ، "Economic Interdependence and War: A Theory of Trade Expectations", *International Security 20* (موسم بہار ۱۹۹۶ء)، صفحہ ۲۵۔

۲۴۔ ولیم جے مک گائر اور کلیئروی مک گائر، "Content and Process in the Experience of Self", *Advances in Experimental Social Psychology 21* (۱۹۸۸ء)، ۱۰۲۔

۲۵۔ ڈونالڈ رابرٹسن، "Ethnic Conflict Management for Policy-Makers" جوزف وی مونٹ ول اور ہنز بنن ڈک کی مرتبہ *Conflict and Peacemaking in Multiethnic Societies* (لیکسنگٹن، ایم اے: لیکسنگٹن بکس، ۱۹۹۰ء)، صفحہ ۱۲۱۔

۲۶۔ رونالڈ رابرٹسن، "Globalization Theory and Civilizational Analysis", *Comparative Civilizations Review 17* (موسم خزاں ۱۹۸۷ء)، صفحہ ۲۲؛ جیفری اے شیڈ جونیر، "Globalization and Islamic Resurgence", *Comparative Civilizations Review 19* (موسم خزاں ۱۹۸۸ء)، صفحہ ۶۷۔

۲۷۔ دیکھئے سرل ای بلیک، *The Dynamics of Modernization: A Study in Comparative History* (نیویارک: ہارپر اینڈ رو، ۱۹۶۶ء)، صفحات ۱ تا ۳۴؛ رائن ہارڈ بینڈکس، "Tradition and Modernity Reconsidered", *Comparative Studies in Society and History 9* (اپریل ۱۹۶۷ء)، صفحات ۲۹۲ تا ۲۹۳۔

۲۸۔ فرینڈ براؤڈل، *On History* (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۸۰ء)، صفحہ ۲۱۳۔

۲۹۔ مغربی تہذیب کی ممتاز خصوصیات کے بارے میں بے پناہ مواد موجود ہے۔ دیگر تحریروں کے علاوہ دیکھئے ولیم ایچ مک نیل، *Rise of the West: A History of the Human Community* (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۶۳ء)؛ براؤڈل، *On History* اور اس سے پہلے کی تحریریں؛ امانوئیل ویلرسٹائن، *Geopolitics and Geoculture: Essays on the Changing World-System* (کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء)۔ کارل ڈبلیو ڈوئش نے ایکس جغرافیائی، اقتصادی، تیکنیکی، معاشرتی اور سیاسی عوامل کے حوالے سے مغرب اور دیگر نو تہذیبوں کا موازنہ کیا ہے جو بھرپور، جامع اور بہت سودمند ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مغرب کس حد تک دوسروں سے مختلف ہے۔ دیکھئے کارل ڈبلیو ڈوئش، "On Nationalism, World Regions, and the Nature of the

West"، پیر ٹورسوک کی مرتبہ *Mobilization, Center Periphery Structures, and Nation-building: A Volume in Commemoration of Stein Rokkan* (برگین: یونیورسٹیٹ فورلاگیٹ، ۱۹۸۱ء)، صفحات ۵۱ تا ۹۳۔ ۱۵۰۰ء میں مغربی تہذیب کے نمایاں اور ممتاز خواص کے مختصر جائزے کے لیے ملاحظہ ہو چارلس ٹلی کا مضمون "Reflections on the History of European State-making" ٹلی کی مرتبہ *The Formation of National States in Western Europe* (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۵ء)، صفحات ۱۸ اور اس سے آگے۔

۳۰۔ ڈوئش، "Nationalism, World Regions, and the West"، صفحہ ۷۷۔

۳۱۔ دیکھئے رابرٹ پٹنام، *Making Democracy Work: Civil Traditions in Modern Italy* (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۱۲۱ اور اس سے آگے۔

۳۲۔ ڈوئش، "Nationalism, World Regions, and the West" صفحہ ۷۸۔ مزید برآں دیکھئے اسٹائن روکن، "Dimensions of State Formation and Nation-building: A Possible Paradigm for Research on Variations within Europe"، چارلس ٹلی کی مرتبہ کتاب *The Formation of National States in Western Europe* (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۵ء)، صفحہ ۵۷۶ اور پٹنام، *Making Democracy Work*، صفحات ۱۲۴ تا ۱۲۷۔

۳۳۔ جیرٹ ہوفسٹیڈ، "National Cultures in Four Dimensions: A Research-based Theory of Cultural Differences among Nations", *International Studies of Management and Organization 13* (۱۹۸۳ء)، صفحہ ۵۲۔

۳۴۔ ہیری سی ٹرائنڈس، "Cross-Cultural Studies of Individualism and Collectivism"، کتاب *Nebraska Symposium on Motivation 1989* (لنکن: یونیورسٹی آف نبراسکا پریس، ۱۹۹۰ء)، صفحات ۴۴ تا ۱۳۳، اور *New York Times*، ۲۵ دسمبر ۱۹۹۰ء، صفحہ ۴۱۔ علاوہ ازیں ملاحظہ ہو جارج سی لاج اور ایزرا ایف ووگل، مدیران کی *Ideology and National Competitiveness: An Analysis of Nine Countries* (بوسٹن: ہارورڈ بزنس اسکول پریس ۱۹۸۷ء)، مختلف صفحات۔

۳۴۔ تہذیبوں کے مابین روابط کی بحث میں ردعمل کے اظہار کا کسی نہ کسی شکل میں لازماً حوالہ ہوتا ہے۔ دیکھئے *Study of History* (لندن: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۳۵ء تا ۱۹۶۱ء)، جلد دوم، صفحہ ۱۸۷ اور اس سے آگے، جلد ہشتم صفحات ۱۵۲ تا ۱۵۳، ۲۱۴؛ جان ایل ڈیسپوسٹو، *The Islamic Threat: Myth or Reality* (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۲ء) صفحات ۵۳ تا ۶۲؛ ڈینیل پائپس، *In the Path of God: Islam and Political Power* (نیویارک: بیسک بکس، ۱۹۸۳ء)، صفحات

۱۰۵ تا ۱۴۲۔

۳۵۔ تہذیبوں کے مابین روابط کے بارے میں جو مباحث کیے گئے ہیں ان میں ردِعمل کے اظہار کی اسی طرح کی کوئی نہ کوئی شکل بیان کی گئی ہے۔ دیکھئے: آرنلڈ جے ٹائن بی، *Study of History* (لندن: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۳۵ء تا ۱۹۶۱ء)، جلد دوم صفحات ۱۸۷ اور مابعد؛ جان ایل ایسپوسٹو، *The Islamic Threat: Myth or Reality*، (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۲ء) صفحات ۵۳ تا ۶۲؛ ڈینیل پائپس، *In the Path of God: Islam and Political Power*، (نیویارک: بیسک بکس، ۱۹۸۳ء)، صفحات ۱۰۵ تا ۱۴۲۔

۳۶۔ پائپس، *Path of God*، صفحہ ۳۴۹۔

۳۷۔ ولیم فاف، "Reflections: Economic Development" *New Yorker*، ۲۵ دسمبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۴۷۔

۳۸۔ پائپس، *Path of God*، صفحات ۱۹۷ تا ۱۹۸۔

۳۹۔ علی الامین مزروئی، *Cultural Forces in World Politics* (لندن: جیمز کری، ۱۹۹۰ء)، صفحات ۴ تا ۵۔

۴۰۔ ایسپوسٹو، *Islamic Threat*، صفحہ ۵۵؛ عمومی تبصروں کے لیے دیکھئے صفحات ۵۵ تا ۶۲؛ اور پائپس، *Path of God*، صفحات ۱۱۴ تا ۱۲۰۔

۴۱۔ ریزی بام، "Authority and Identity—The Invariance Hypothesis II", *Zeitschrift für Soziologie 6* (اکتوبر ۱۹۷۷ء)، صفحات ۳۶۸ تا ۳۶۹۔ مزید دیکھئے ریزی بام، "Authority Codes: The Invariance Hypothesis", *Zeitschrift für Soziologie 6* (جنوری ۱۹۷۷ء)، صفحات ۵ تا ۲۸۔

۴۲۔ دیکھئے ایڈا بی بوزمین، "Civilizations Under Stress", *Virginia Quarterly Review* 51 (موسم سرما ۱۹۷۵ء)، صفحہ ۵ اور اس سے آگے؛ لیو فروبی نیس، *Paideuma: Umrisse einer Kultur-und Seelenlehre* (میونخ: سی ایچ بیک، ۱۹۲۱ء)، صفحات ۱۱ اور اس سے آگے؛ اوسوالڈ اسپنگلر، *The Decline of the West* (نیویارک: الفرڈ اے نوپف، دو جلدیں، ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۸ء)، جلد دوم، صفحہ ۵۷ اور اس سے آگے۔

۴۳۔ بوزمین، "Civilizations Under Stress"، صفحہ ۷۔

۴۴۔ ولیم ای ناف، "Reflections on the Question of 'East and West' from the Point of View of Japan", *Comparative Civilizations Review 13/14* (موسم خزاں ۱۹۸۵ء اور موسم بہار ۱۹۸۶ء)، صفحہ ۲۲۲۔

۴۵۔ ڈیوڈ ای اپٹر، "The Role of Traditionalism in the Political Modernization

of Ghana and Uganda", *World Politics 13* (اکتوبر ۱۹۶۰ء)، صفحات ۴۷ تا ۶۸۔

۴۶۔ ایس این آئزن شٹاٹ، "Transformation of Social, Political, and Cultural Orders in Modernization", *American Sociological Review 30* (اکتوبر ۱۹۶۵ء)، صفحات ۶۵۹ تا ۶۷۳۔

۴۷۔ پائپس، *Path of God*، صفحات ۱۰۷، ۱۹۱۔

۴۸۔ براوڈل، *On History*، صفحات ۲۱۲ تا ۲۱۳۔

چوتھا باب:

۱۔ جیفری آر بارنیٹ، "Exclusion as National Security Policy", *Parameters* ۲۴ (موسم بہار ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۵۴۔

۲۔ آرون ایل فرائیڈبرگ، "The Future of american Power", *Political Science Quarterly 109* (موسم بہار ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۲۰ تا ۲۱۔

۳۔ ہیڈلے بل، "The Revolt Against the West"، ہیڈلے بل اور ایڈم واٹس، مدیران کی کتاب *Expansion of International Society* (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۴ء)، صفحہ ۲۱۹۔

۴۔ بیری جی بوزن، "New Patterns of Global Security in the Twenty-first Century", *International Affairs 67* (جولائی ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۴۵۱۔

۵۔ *Project 2025* (مسودہ) ۲۰ ستمبر ۱۹۹۱ء، صفحہ ۷؛ عالمی بینک، *World Development Report 1990* (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۰ء)، صفحات ۲۲۹، ۲۴۴؛ *he World Almanac and Book of Facts 1990* (ماہوا، نیوجرسی: فنک اینڈ ویگنال، ۱۹۸۹ء)، صفحہ ۵۳۹۔

۶۔ اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام، *Human Development Report 1994* (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۳۶ تا ۱۳۷، ۲۰۷ تا ۲۱۱؛ عالمی بینک، *World Development Report 1984, 1986, 1990, 1994*؛ بروس رسل اور دیگر، *World Handbook of Political and Social Indicators* (نیوہیون: ییل یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۲۲۲ تا ۲۲۶۔ d Development Indicators",

۷۔ پال بیروچ، "International Industrialization Levels from 1750 to 1980", *Journal of European Economic History 11* (موسم خزاں ۱۹۸۲ء)، صفحات ۲۹۶، ۳۰۴۔

۸۔ *Economist*، ۱۵ مئی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۸۳، محولہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ، "The *World Economic Outlook*; "The Global Economy", *Economist*، یکم اکتوبر ۱۹۹۴ء، صفحات ۳ تا ۹؛

Wall Street Journal، ۱۷ مئی ۱۹۹۳ء، صفحہ A12؛ نکولس ڈی کرسٹوف، "The Rise of China", Foreign Affairs 72 (نومبر/دسمبر ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۶۱؛ کشور محبوبانی، "The Pacific Way", Foreign Affairs 74 (جنوری/فروری ۱۹۹۵ء)، صفحات ۱۰۰ تا ۱۰۳۔

۹۔ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرے ٹجک اسٹڈیز، "Tables and Analyses", The Military Balance 1994-95 (لندن: براسیز، ۱۹۹۴ء)۔

۱۰۔ Project 2025 صفحہ ۱۳؛ رچرڈ اے بٹ زنگر، The Globalization of Arms Production: Defense Markets in Transition (واشنگٹن ڈی سی: دفاعی بجٹ پروجیکٹ، ۱۹۹۳ء)، مختلف صفحات۔

۱۱۔ جوزف ایس نائے، "The Changing Nature of World Power", Political Science Quarterly 105 (موسم گرما ۱۹۹۰ء)، صفحات ۱۸۱ تا ۱۸۲۔

۱۲۔ ولیم ایچ مک نیل، The Rise of the West: A History of the Human Community (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۶۳ء)، صفحہ ۵۴۵۔

۱۳۔ رونالڈ ڈور، "Unity and Diversity in Contemporary World Culture" بل اور واٹس کی مرتبہ Expansion of International Society صفحات ۴۲۰ تا ۴۲۱۔

۱۴۔ ولیم ایچ ناف، "Reflections on the Question of 'East and West' from the Point of View of Japan", Comparative Civilizations Review 13/14 (موسم خزاں ۱۹۸۵ء اور موسم بہار ۱۹۸۶ء)، صفحہ ۲۱۹؛ اریتا آنسوز یکی، "Escaping the Cycle of Eternal Resources", New Perspectives Quarterly 9 (موسم بہار ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۱۸۔

۱۵۔ رچرڈ سسیون، "Culture and Democratization in India" لیری ڈائمنڈ کی کتاب Political Culture and Democracy in Developing Countries (بولڈر: لن رائنر، ۱۹۹۳ء)، صفحات ۵۵ تا ۶۱۔

۱۶۔ گراہم ای فلر، "The Appeal of Iran", National Interest 37 (موسم خزاں ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۹۵۔

۱۷۔ الیسوکے ساکا کی بارا، "The End of Progressivism: A Search for New Goals", Foreign Affairs 74 (ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۵ء)، صفحات ۸ تا ۱۴۔

۱۸۔ ٹی ایس ایلیٹ، Idea of a Christian Society (نیویارک: ہارکورٹ، بریس اینڈ کمپنی، ۱۹۴۰ء)، صفحہ ۶۴۔

۱۹۔ جلس کیپل، The Revenge of God: The Resurgence of Islam, Christianity and

Judaism in the Modern World (یونیورسٹی پارک، پنسلوانیا: پنسلوانیا اسٹیٹ یونیورسٹی، ترجمہ ایلن بارلے ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۲۔

۲۰۔ جارج کیمپل "Religion and Peace: An Argument Complexified", Washington Quarterly 14 (موسم بہار ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۲۷۔

۲۱۔ جیمز ایچ بلنگٹن، "The Case for Orthodoxy" New Republic، ۳۰ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۲۶؛ سوزین میسی، "Back to the Future", Boston Globe ۲۸ مارچ ۱۹۹۳ء، صفحہ ۷۲۔

۲۲۔ Economist، ۸ جنوری ۱۹۹۳ء، صفحہ ۴۶؛ جیمز ریوپرٹ، "Dateline Tashkent: Post-Soviet Central Asia; Foreign Policy 87 (موسم گرما ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۱۸۰۔

۲۳۔ فرید زکریا، "Culture Is Destiny: A Conversation with Lee Kuan Yew", Foreign Affairs 73، (مارچ/اپریل ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۱۸۔

۲۴۔ حسن الترابی، "The Islamic Awakening's Second Wave", New Perspectives Quarterly 9 (موسم گرما ۱۹۹۲ء)، صفحات ۵۲تا۵۵؛ ٹیڈ جی جیلن، The Political Mobilization of Religious Belief (نیویارک: پراگیر، ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۵۵ اور اس سے آگے۔

۲۵۔ برنارڈ لوئیس، "Islamic Revolution" New York Review of Books، ۲۱ جنوری ۱۹۸۸ء، صفحہ ۴۷؛ کیپل، Revenge of God، صفحہ ۸۲۔

۲۶۔ سدھیر کاکڑ، Religion, and he Colors of Violence: Cultural Identities, Conflict" (غیر مطبوعہ مسودہ)، باب ۶، "A New Hindu Identity"، صفحہ ۱۱۔

۲۷۔ سوزین میسی، "Back to the Future" صفحہ ۷۲؛ ریوپرٹ، "Dateline Tashkent"، صفحہ ۱۸۰۔

۲۸۔ روزمیری ریڈفرڈ رتھر، "A World on Fire with Faith", New York Times Book Review، ۲۶ جنوری ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۰؛ ولیم ایچ مک نیل، "Fundamentalism and the World of the 1990s" مارٹن ای مارٹی اور آر اسکاٹ ایپل بی کی مرتبہ Fundamentalisms and Society (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۵۶۱۔

۲۹۔ New York Times، ۱۵ جنوری ۱۹۹۳ء، صفحہ A9؛ ہنری کلیمنٹ مور، Images of Development: Egyptian Engineers in Search of Industry (کیمبرج: ایم آئی ٹی پریس، ۱۹۸۰ء)، صفحات ۲۲۷تا۲۲۸۔

۳۰۔ ہنری اسکاٹ اسٹوکس، "Korea's Church Militant", New York Times Magazine، ۲۸ نومبر ۱۹۷۲ء، صفحہ ۶۸۔

۳۱۔ ایڈورڈ جے ڈوگرٹی، ایس جے، *New York Times*، ۴ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۰؛ ٹموتھی گڈمین، "Latin America's Reformation", *American Enterprise 2* (جولائی اگست ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۴۳؛ *New York Times*، ۱۱ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱؛ *Time*، ۲۱ جنوری ۱۹۹۱ء، صفحہ ۶۹۔

۳۲۔ *Economist*، ۶ مئی ۱۹۸۹ء، صفحہ ۴۱؛ *Times* (لندن)، ۱۲ اپریل ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۲؛ *Observer*، ۲۷ مئی ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۸۔

۳۳۔ *New York Times*، ۱۶ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ A9؛ *Boston Globe*، ۱۵ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۳۔

۳۴۔ دیکھئے مارک جوئیرگینزمیئر، *The New Cold War? Religious Nationalism Confronts the Secular State* (برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۹۳ء)۔

۳۵۔ زکریا، "Conversation with Lee Kuan Yew" صفحہ ۱۱۸؛ الترابی، "Islamic Awakening's Second Wave" صفحہ ۵۳۔ دیکھئے ٹیرنس کیرول، "Secularization and States of Modernity", *World Politics 36* (اپریل ۱۹۸۴ء)، صفحات ۳۶۲ تا ۳۸۴۔

۳۶۔ جان ایل ایسپوسٹو، *The Islamic Threat: Myth or Reality* (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۲ء) صفحہ ۱۰۔

۳۷۔ رجس ڈیبرے، "God and the Political Planet" *New Perspectives Quarterly 11* (موسم بہار ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۵۔

۳۸۔ ایسپوسٹو، *Islamic Threat* صفحہ ۱۰؛ جلس کیپل جس کا حوالہ سوفی لینز، "La revanche de Dieu — Interview with Gilles Kepel", *Geopolitique 33* (موسم بہار ۱۹۹۱ء) میں دیا گیا، صفحہ ۱۴؛ مور، *Images of Development* صفحات ۲۱۴ تا ۲۱۶۔

۳۹۔ جوئیرگینزمیئر، *The New Cold War*، صفحہ ۷۱؛ ایڈورڈ اے گارگن، "Hindu Rage Against Muislims Transforming Indian Politics", *New York Times*، ۱۷ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ A1؛ خشونت سنگھ، "India, the Hindu State" *New York Times* ۳ اگست ۱۹۹۳ء، صفحہ A17۔

۴۰۔ ڈور کی تحریر، بل اور واٹسن کی مرتبہ *Expansion of International Society* صفحہ ۴۱۱؛ مک نیل کی تحریر، مارٹن اور ایپل بی کی مرتبہ *Fundamentalisms and Society* صفحہ ۵۶۹۔

پانچواں باب:

۱۔ کشور محبوبانی، "The Pacific Way", *Foreign Affairs 74* (جنوری/فروری ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۳؛ *IMD Executive Opinion Survey*، *Economist*، ۶ مئی ۱۹۹۵ء، صفحہ ۵؛ عالمی بینک، *Global Economic Prospects and the Developing Countries 1993*

(واشنگٹن: ۱۹۹۳ء) صفحات ۶۶ تا ۶۷۔

۲۔ ٹومی کوہ، America's Role in Asia: Asian Views (ایشیا فاؤنڈیشن، سنٹر فار ایشین پیسفک افیئرز، رپورٹ نمبر ۱۳، نومبر ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۱۔

۳۔ ایلکس کیر، Japan Times، ۶ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۰۔

۴۔ یاشنگ ہوانگ، "Why China Will Not Collapse", Foreign Policy 95 (موسم گرما ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۵۷۔

۵۔ Cable News Network، ۱۰ مئی ۱۹۹۴ء؛ ایڈورڈ فرائیڈمین، "A Failed Chinese Modernity", Daedalus 122 (موسم بہار ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۵؛ پیری لنک، "China's 'Core' Problem، ایضاً، صفحات ۲۰۱ تا ۲۰۴۔

۶۔ Economist، ۲۱ جنوری ۱۹۹۵ء، صفحات ۳۸ تا ۳۹؛ ولیم تھیوڈور ڈی بیری، "The New Confucianism in Beijing", American Scholar 64 (موسم بہار ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۷۵ اور اس سے آگے؛ بنجمن ایل سیلف، "Changing Role for Confucianism in China", Woodrow Wilson Center Report 7 (ستمبر ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۴ تا ۵؛ New York Times، ۲۶ اگست ۱۹۹۱ء، صفحہ A19۔

۷۔ لی تنگ ہوئی، "Chinese Culture and Political Renewal", Journal of Democracy 6 (اکتوبر ۱۹۹۵ء)، صفحات ۶ تا ۸۔

۸۔ ایلکس کیر، Japan Times، ۶ نومبر ۱۹۹۴ء صفحہ ۱۰؛ کازو ہیکو اوزاوا، "Ambivalence in Asia", Japan Update 44 (مئی ۱۹۹۵ء)، صفحات ۱۸ تا ۱۹۔

۹۔ ان میں سے بعض مسائل کے تذکرے کے لیے ملاحظہ کیجیے آئیون پی ہال، "Japan's Asia Card", National Interest 38 (موسم سرما ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۹ اور اگلے صفحات۔

۱۰۔ کیسی میر یوست "America's Role in Asia: one Year Later", (ایشیا فاؤنڈیشن، سنٹر فار ایشین پیسفک افیئرز، رپورٹ نمبر ۱۵، فروری ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۴؛ یوئی چی فونو باشی، "The Asianization of Asia", Foreign Affairs 72 (نومبر/دسمبر ۱۹۹۳ء)، ۷۸؛ انور ابراہیم، International Herald Tribune، ۳۱ جنوری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۶۔

۱۱۔ کشور محبوبانی، "Asia and a United States in Decline", Washington Quarterly17 (موسم بہار ۱۹۹۴ء)، صفحات ۵ تا ۲۳؛ اس کے جواب کے لیے دیکھیے ایرک جونز، "Asia's Fate: A Response to the Singapore School", National Interest 35 (موسم بہار ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۸ تا ۲۸۔

۱۲۔ مہاتیر بن محمد، Mare jirenma (ملائی مخمصہ) (ٹوکیو: ایمورا بنکا جکیو، ترجمہ تکاتا ماسا یوشی، ۱۹۸۳ء)، صفحہ

۲۶۷، بحوالہ اوگورا کازوا، A Call for a New Concept of Asia", Japan Echo 20 (موسم خزاں ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۴۰۔

۱۳۔ لی زیانگ یو، Straits Times"A Post-Cold War Alternative from East Asia", ۱۰ فروری ۱۹۹۲ء، صفحہ ۲۴۔

۱۴۔ یوتارو کوبایاشی، "Re-Asianize Japan", New Perspectives Quarterly 9 (موسم سرما ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۲۴: فونو باشی، "The Asianization of Asia"، صفحہ ۷۵ اور اس سے آگے؛ جارج یونگ سون لی، "New East Asia in a Multicultural World" International Herald Tribune، ۱۵ جولائی ۱۹۹۲ء، صفحہ ۸۔

۱۵۔ یوئی چی فونو باشی، "Globalize Asia", New Perspectives Quarterly 9 (موسم سرما ۱۹۹۲ء)، صفحات ۲۳ تا ۲۴: کشور ایم محبوبانی، "The West and the Rest", National Interest 28 (موسم گرما ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۷؛ ہیزو، "New Concept of Asia"، صفحہ ۴۱۔

۱۶۔ Economist، ۹ مارچ ۱۹۹۶ء، صفحہ ۳۳۔

۱۷۔ بندر بن سلطان، New York Times، ۱۰ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۲۰۔

۱۸۔ جان ایل ایسپوسٹو، The Islamic Threat: Myth or Reality (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۱۲؛ علی ای ہلال دیسوکی، "The Islamic Resurgence" علی ای ہلال دیسوکی کی مرتبہ Islamic Resurgence in the Arab World (نیویارک: پراٹیگر، ۱۹۸۲ء)، صفحات ۹ تا ۱۳۔

۱۹۔ ٹامس کیس، بحوالہ در مائیکل والزر، The Revolution of the Saints: A Study in the Origins of Radical Politics (کیمبرج: ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۵ء)، صفحات ۱۰ تا ۱۱؛ حسن الترابی، "The Islamic Awakening's Second Wave" New Perspectives Quarterly 9 (موسم گرما ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۵۲۔ بیسویں صدی کے اواخر کی اسلامی بنیاد پرستی کی نوعیت، کشش، حدود اور تاریخی کردار کو سمجھنے کے لیے مفید ترین کتاب والزر کی ہوسکتی ہے جس میں سولھویں اور سترہویں صدی کے انگلش کالونسٹ پیورٹنزم کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۰۔ ڈونالڈ کے ایمرسن، "Islam and Regime in Indonesia: Who's Coopting Whom?" (غیر مطبوعہ مقالہ، ۱۹۸۹ء)، صفحہ ۱۶؛ ایم ناصر تمارا، Indonesia in the Wake of Islam 1965-1985 (کوالالمپور: انسٹی ٹیوٹ آف سٹرے ٹجک اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز ملائشیا، ۱۹۸۶ء)، صفحہ ۲۸؛ Economist، ۱۴ دسمبر ۱۹۸۵ء، صفحات ۳۵ تا ۳۶؛ ہنری ٹیمز، "Islam Challenges Secular Society", International Herald Tribune، ۲۷ جون ۱۹۸۷ء، صفحات ۷ تا ۸؛ صابری سیاری، "Politicization of Islamic Re-traditionalism: Some

Preliminary Notes میٹن ہمپر اور رافیل اسرائیلی کی مرتبہ *Islam and Politics in the Modern Middle East* (لندن: کروم ہیلم، ۱۹۸۴ء)، صفحہ ۱۲۵؛ *New York Times* ۲۶ مارچ ۱۹۸۹ء، صفحہ ۱۴؛ ۲ مارچ ۱۹۹۵ء، صفحہ A8۔ مثال کے طور پر دیکھئے ان ملکوں کے بارے میں رپورٹیں، *New York Times*، ۱۷ نومبر ۱۹۸۵ء، صفحہ E2؛ ۱۵ نومبر ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۳؛ ۶ مارچ ۱۹۹۱ء، صفحہ A11؛ ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء، صفحہ ۴؛ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱؛ ۸ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ A15؛ اور *Economist*، ۱۵ جون ۱۹۸۵ء، صفحات ۳۶ تا ۳۷ اور ۱۸ ستمبر ۱۹۹۲ء، صفحات ۲۳ تا ۲۵۔

۲۱۔ *New York Times*، ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء، صفحہ A8؛ ۲۹ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ A4؛ ۳ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱؛ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۵؛ ایریکا جی ایلین، "Dynamics of the Palestinian Uprising: An Assessment of Causes, Character, and Consequences", *Comparative Politics* (۲۶ جولائی ۱۹۹۴ء)، ۴۹۴؛ *New York Times*، ۸ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ A15؛ جیمز پی کاک، "The Impact of Islam", *Wilson Quarterly 5*، (موسم بہار ۱۹۸۱ء)، صفحہ ۱۴۲؛ تمارا، *Indonesia in the Wake of Islam*، صفحہ ۲۲۔

۲۲۔ اولیویئر رائے، *The Failure of Political Islam* (لندن: ٹورس، ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۴۹ اور مابعد؛ *New York Times*، ۱۹ جنوری ۱۹۹۲ء، صفحہ E3؛ *Washington Post*، ۲۱ نومبر ۱۹۹۰ء، صفحہ A1۔ دیکھئے جلس کیپل، *The Revenge of God: The Resurgence of Islam, Christianity, and Judaism in the Modern World* (یونیورسٹی پارک پنسلوانیا: پنسلوانیا اسٹیٹ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳۲؛ فریدہ فوزیہ شرقی، "When Galileo Meets Allah", *New Perspectives Quarterly 11* (موسم بہار ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳۰؛ ایسپوسٹو، *Islamic Threat*، صفحہ ۱۰۔

۲۳۔ مہناز اصفہانی، "Varieties of Muslim Experience", *Wilson Quarterly 13*، (موسم خزاں ۱۹۸۹ء)، صفحہ ۷۲۔

۲۴۔ سعدالدین ابراہیم، "Appeal of Islamic Fundamentalism" (ہم عصر مسلم دنیا میں اسلام اور سیاست کے موضوع پر منعقدہ کانفرنس میں پیش کردہ مقالہ، ہارورڈ یونیورسٹی، ۱۵ تا ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۵ء)، صفحات ۹ تا ۱۰، اور "Islamic Militancy as a Social Movement: The Case of Two Groups in Egypt" دیسوکی کی مرتب کردہ کتاب *Islamic Resurgence* میں، صفحات ۱۲۸ تا ۱۳۱۔

۲۵۔ *Washington Post*، ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۰ء، صفحہ ۲۳؛ پی کاک، "Impact of Islam"، صفحہ ۱۴۰؛ الکے سونار اور بناز توپراک، "Islam in Politics: The Case of Turkey", *Government and Opposition 18* (موسم خزاں ۱۹۸۳ء)، ۴۳۶؛ رچرڈ ڈبلیو بلیٹ، "The

Israeli-PLO Accord: The Future of the Islamic Movement" *Foreign Affairs 72* (نومبر/دسمبر ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۴۲۔

۲۶۔ ارنسٹ جیلنر، *New Republic* ،"Up from Imperialism" ۲۲ مئی ۱۹۸۹ء، صفحہ ۳۵؛ جان مرے براؤن، *World* ،"Tansu Ciller and the Question of Turkish Identity" *Policy Journal 11* (موسم خزاں ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۵۸؛ رائے، *Failure of Political Islam*، صفحہ ۵۳۔

۲۷۔ فواد عجمی، *New Republic 2* "The Impossible Life of Muslim Liberalism" جون ۱۹۸۶ء، صفحہ ۲۷۔

۲۸۔ کلیمنٹ مور، ہنری، "The Mediterranean Debt Crescent" (غیر مطبوعہ مقالہ)، صفحہ ۳۴۶؛ مارک این کاٹز، "Emerging Patterns in the International Relations of Central Asia", *Central Asian Monitor* (نمبر ۲، ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۲۷؛ مہرداد ہغیائے ئی، "Islamic Revival in the Central Asian Republics", *Central Asian Survey 13* (نمبر ۲، ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۲۵۵۔

۲۹۔ *New York Times*، ۱۱۰اپریل ۱۹۸۹ء، صفحہ A۳؛ ۲۲ دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۵؛ *Economist*، ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۴۱۔

۳۰۔ *Economist*، ۲۰ جولائی ۱۹۹۱ء، صفحہ ۳۵؛ ۲۱ دسمبر ۱۹۹۱ء تا ۳ جنوری ۱۹۹۲ء، صفحہ ۴۰؛ محفوظ الحق چوہدری، "Nationalism, Religion and Politics in Bangladesh" رفیع الدین احمد کی مرتبہ کتاب *Bangladesh: Society, Religion and Politics* (چٹاگانگ: ساؤتھ ایشیا اسٹڈیز گروپ، ۱۹۸۵ء)، صفحہ ۶۸؛ *New York Times*، ۳۰ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ A۱۴؛ *Wall Street Journal*، یکم مارچ ۱۹۹۵ء، صفحات A۶، ا۔

۳۱۔ ڈونالڈ ایل ہورووٹز، "The Qur'an and the Common Law: Islamic Law Reform and the Theory of Legal Change", *American Journal of Comparative Law 42* (بہار اور گرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۲۳۴ اور مابعد۔

۳۲۔ دیسوکی، "Islamic Resurgence" صفحہ ۲۳۔

۳۳۔ ڈینیل پائپس، *In the Path of God: Islam and Political Power* (نیویارک: بیسک بکس، ۱۹۸۳ء)، صفحات ۲۸۲ تا ۲۸۳، ۲۹۰ تا ۲۹۲؛ جان بیرٹ کیلی، *Arabia, the Gulf and the West* (نیویارک بیسک بکس، ۱۹۸۰ء)، صفحات ۲۶۱، ۴۲۳، بحوالہ پائپس، *Path of God*، صفحہ ۲۹۱۔

۳۴۔ اقوام متحدہ آبادی ڈویژن، *World Population Prospects: The 1992*

Revision (نیویارک: اقوام متحدہ، ۱۹۹۳ء)، جدول A۱۸؛ عالمی بینک، World Development Report 1995 (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء)، جدول ۲۵؛ جین بورژوا پے شٹ، "Le Nombre des Hommes: Etat et Prospective" البرٹ جیکارڈ کی مرتبہ Les Scientifiques Parlent (پیرس: ہیشٹ، ۱۹۸۷ء)، صفحات ۱۵۴، ۱۵۶۔

۳۵۔ جیک اے گولڈ سٹون، Revolution and Rebellion in the Early Modern World (برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۹۱ء)، مختلف صفحات لیکن خاص طور پر ۲۴ تا ۳۹۔

۳۶۔ ہربرٹ موئیلر، "Youth as a Force in the Modern Worl", Comparative Studies in Society and History 10 (اپریل ۱۹۶۸ء)، صفحات ۲۳۷ تا ۲۶۰؛ لوئیس ایس فوئیر، "Generations and the Theory of Revolution", Survey 18 (گرما ۱۹۷۲ء)، صفحات ۱۶۱ تا ۱۸۸۔

۳۷۔ پیٹر ڈبلیو ولسن اور ڈگلس ایف گراہم، Saudi Arabia: The Coming Storm (آرمونک، نیویارک: ایم ای شارپ، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۲۸ تا ۲۹۔

۳۸۔ فلپ فارگوس، "Demographic Explosion or Social Upheaval" غاسن سلامے کی مرتبہ Democracy Without Democrats? The Renewal of Politics in the Muslim World (لندن: آئی بی تورس، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۵۸ تا ۱۶۲، ۱۷۵ تا ۱۷۷۔

۳۹۔ Economist، ۲۹ اگست ۱۹۸۱ء، صفحہ ۴۰؛ ڈینس ڈریگونسکی، "Threshold of Violence", Freedom Review 26 (مارچ/اپریل ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۱۔

چھٹا باب:

۱۔ اینڈریاس پاپانڈریو، "Europe Turns Left", New Perspectives Quarterly 11 (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۵۳؛ ووک ڈریسکووچ بحوالہ جینیس اے براؤن "Islam in the Balkans", Freedom Review 22 (نومبر/دسمبر ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۳۱؛ ایف اسٹیون لارابی، "Instability and Change in the Balkans", Survival 34 (گرما ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۴۳؛ میشا گلینی، "Heading Off War in the Southern Balkans", Foreign Affairs 74 (مئی/جون ۱۹۹۵ء)، صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۳۔

۲۔ علی الامین مزروئی، Cultural Forces in World Politics (لندن: جیمز کری، ۱۹۹۰ء)، صفحہ ۱۳۔

۳۔ مثال کے طور پر دیکھئے Economist، ۱۶ نومبر ۱۹۹۱ء، صفحہ ۴۵، ۶ مئی ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳۶۔

۴۔ رونالڈ بی پامر اور تامس جے ریکفرڈ، Building ASEAN: 20 Years of South-east

Asian Cooperation (نیویارک: پرائیگر، ۱۹۸۷ء)، صفحہ ۱۰۹؛ Economist، ۲۳ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحات ۳۱ تا ۳۲۔

۵۔ بیری بوزن اور جیرالڈ سیگل، "Rethinking East Asian Security", *Survival* 36 (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۶۔

۶۔ *Far Eastern Economic Review*، ۱۱ اگست ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۴۔

۷۔ ملائشیا کے دستک سری مہاتیر بن محمد اور کینی تی اوے کے درمیان انٹرویو، صفحات ۳، ۷؛ رفیضہ از یہ، *New York Times*، ۱۲ فروری ۱۹۹۱ء، صفحہ D۶۔

۸۔ *Japan Times*، ۷ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۹؛ *Economist*، ۱۹ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۷۔

۹۔ مرے وائیڈن بام، "Greater China: A New Economic Colossus?" *Washington Quarterly 16* (خزاں ۱۹۹۳ء)، صفحات ۷۸ تا ۸۰۔

۱۰۔ *Wall Street Journal*، ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ A۸؛ *New York Times* 17 فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ A۶۔

۱۱۔ *Economist*، ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۴۳؛ اینڈریس سربن، "Towards an Association of Caribbean States: Raising Some Awkward Questions", *Journal of Interamerican Studies* 36 (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحات ۶۱ تا ۹۰۔

۱۲۔ *Far Eastern Economic Review*، ۵ جولائی ۱۹۹۰ء، صفحات ۲۴ تا ۲۵، ۵ ستمبر ۱۹۹۱ء، صفحات ۲۶ تا ۲۷؛ *New York Times*، ۱۶ فروری ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۶؛ *Economist*، ۱۵ جنوری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۸؛ رابرٹ ڈی ہورمیٹس، "Making Regionalism Safe", *Foreign Affairs 73* (مارچ/اپریل ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۳؛ *Economist*، ۱۰ جون ۱۹۹۴ء، صفحات ۴۷ تا ۴۸؛ *Boston Globe*، ۵ فروری ۱۹۹۴ء صفحہ ۷۔ مرکوسر کے بارے میں ملاحظہ کیجئے لوئیگی منزیتی، "The Political Economy of MERCOSUR", Approaches to Economic Integration in the Southern Cone", *Washington Quarterly 18* (گرما ۱۹۹۵ء)، صفحات ۱۱۳ تا ۱۲۲۔

۱۳۔ *New York Times*، ۸ اپریل ۱۹۹۴ء، صفحہ A۳، ۱۳ جون ۱۹۹۴ء، صفحات D۱، D۵، ۴ جنوری ۱۹۹۵ء، صفحہ A۸؛ مہاتیر کا اوے کو انٹرویو، صفحات ۲، ۵؛ "Asian Trade New Directions", *AMEX Bank Review 20* (۲۲ مارچ ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۱ تا ۷۔

۱۴۔ دیکھئے برائن پولنز، "Does Trade Still Follow the Flag?" *American Political Science Review 83* (جون ۱۹۸۹ء)، صفحات ۴۶۵ تا ۴۸۰؛ جوآنا گوا اور ایڈورڈ مینفیلڈ، "Power Politics and International Trade", *American Political*

Science Review 87 (جون ۱۹۹۳ء)، صفحات ۴۰۸ تا ۴۲۱؛ اور ڈیوڈ ایم رو "Trade and Security in International Relations" (غیر مطبوعہ مقالہ: اوہایو اسٹیٹ یونیورسٹی، ۱۵ ستمبر ۱۹۹۴ء)، مختلف صفحات۔

۱۵۔ سڈنی ڈبلیو منٹز، "Can Haiti Change?" *Foreign Affairs 75* (جنوری/فروری ۱۹۹۵ء)، ۷۳؛ ارنسٹو پیریز بیلاڈریس اور جولیین کک کا لا محولہ "Haiti's Traditions of Isolation Makes U.S. Task Harder"، *Washington Post*، ۲۵ جولائی ۱۹۹۵ء، صفحہ A1۔

۱۶۔ *Economist*، ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۵۳۔

۱۷۔ *Boston Globe*، ۲۱ مارچ ۱۹۹۳ء، صفحات ۱، ۱۶، ۱۷؛ *Economist*، ۱۹ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۲۳، ۱۱ جون ۱۹۹۴ء، صفحہ ۹۰۔ اس پہلو سے ترکی اور میکسیکو کی مماثلت کی نشاندہی ان مضامین میں کی گئی ہے: بیری بوزن، "New Patterns of Global Security in the Twenty-first Century"، *International Affairs 67* (جولائی ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۴۴۹، اور جگدیش بھگواتی، *The World Trading System at Risk* (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۷۲۔

۱۸۔ دیکھئے مارکوئس ڈی کسٹائن، *Empire of the Czar: A Journey Through Eternal Russia* (نیویارک: ڈبل ڈے، ۱۹۸۹ء؛ سب سے پہلے پیرس میں ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی)، مختلف صفحات۔

۱۹۔ پی یا شادئیف، *Articles and Letters* [اَتیتی ای پسما] (ماسکو: ۱۹۸۹ء)، صفحہ ۱۷۸ اور این یا ڈینی لیفسکی، *Russia and Europe* [روسیا ای یوروپا] (ماسکو: ۱۹۹۱ء)، صفحات ۲۶۷ تا ۲۶۸، محولہ سرگئی ولادی سلافووچ چگروف، "Russia Between East and West" اسٹیو ہرش کی مرتبہ، *MEMO 3:In Search of Answers in the Post-Soviet Era* (واشنگٹن ڈی سی: بیوریو آف نیشنل افیرز، ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۱۳۸۔

۲۰۔ دیکھئے لیون ایرن، "The Battle for the Soul of Russian Foreign Policy"، *The American Enterprise 3* (نومبر/دسمبر ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۱۰ اور مابعد؛ الیکسی جی آرباٹوف، "Russia's Foreign Policy Alternatives"، *International Security* 18 (خزاں ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۵ اور مابعد۔

۲۱۔ سرگئی اسٹین کیوچ، "Russia in Search of Itself"، *National Interest 28* (گرما ۱۹۹۲ء)، صفحات ۴۸ تا ۴۹۔

۲۲۔ البرٹ موٹیوز، " 'Openness to the West' in Eurpean Russia"، *RFE/RL Research Report 1* (۲۷ نومبر ۱۹۹۲ء)، صفحات ۶۰ تا ۶۲۔ اہل قلم نے مختلف طریقوں سے ووٹوں کی تقسیم کا حساب لگایا ہے جن کے باعث نتائج میں معمولی اختلافات ہیں۔ میں نے جس تجزیے پر انحصار کیا

ہے وہ یہ ہے: سرگئی شگروف، "Political Tendencies in Russia's Regions: Evidence from the 1993 Parliamentary Elections"(غیر مطبوعہ مقالہ، ہارورڈ یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء)۔

۲۳۔ شگروف، "Russia Between" صفحہ ۱۴۰۔

۲۴۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، Political Order in Changing Societies (نیوہیون: ییل یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۸ء)، صفحات ۳۵۰ تا ۳۵۱۔

۲۵۔ ڈوئیکو بازوگلو سیزر، "Turkey's Grand Strategy Facing a Dilemma", International Spectator 27 (جنوری/مارچ ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۲۴۔

۲۶۔ کلائیڈ ہیبر مین، "On Iraq's Other Front" New York Times Magazine ۱۸ نومبر ۱۹۸۰ء، صفحہ ۴۲؛ بروس آر کونی ہوم، "Turkey and the West", Foreign Affairs 70 (بہار ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۳۵ تا ۳۶۔

۲۷۔ ایان لیسر، Turkey and the West after the Gulf War", International Spectator 27 (جنوری/مارچ ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۳۳۔

۲۸۔ Financial Times، ۹ مارچ ۱۹۹۲ء، صفحہ ۲؛ New York Times، ۵ اپریل ۱۹۹۲ء، صفحہ E3؛ تانسوچلر، "The Role of Turky in 'the New World' ", Strategic Review 22 (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۹؛ ہیبر مین، "Iraq's Other Front" صفحہ ۴۴؛ جان مرے براؤن، "Tansu Ciller and the Question of Turkish Identity" World Policy Journal 11 (خزاں ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۵۸۔

۲۹۔ سیزر، "Turkey's Grand Strategy"، صفحہ ۲۷؛ Washington Post 22 مارچ ۱۹۹۲ء؛ New York Times، ۱۹ جون ۱۹۹۴ء، صفحہ ۴۔

۳۰۔ New York Times، ۱۴ اگست ۱۹۹۳ء، صفحہ A3؛ ۱۹ جون ۱۹۹۴ء، صفحہ ۴؛ فلپ روبنز، "Between Sentiment and Self-Interest: Turkey's Policy toward Azerbaijan and the Central Asian States", Middle East Journal 47 (خزاں ۱۹۹۳ء)، صفحات ۵۹۳ تا ۶۱۰؛ Economist کے ۱۰ جون ۱۹۹۵ء، صفحات ۳۸ تا ۳۹۔

۳۱۔ باہری یلماز، "Turkey's new Role in International Politics",Aussenpolitik 45 (جنوری ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۹۴۔

۳۲۔ ایرک رولو، "The Challenges to Turkey", Foreign Affairs 72 (نومبر/دسمبر ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۱۱۹۔

۳۳۔ رولو، "Challenges"، صفحات ۱۲۰ تا ۱۲۱؛ New York Times، ۲۶ مارچ ۱۹۸۹ء، صفحہ ۱۴۔

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ براؤن، "Question of Turkish Identity"، صفحہ ۵۸۔

۳۶۔ بیزر، "Turkey's Grand Strategy"، صفحات ۲۹ تا ۳۰۔

۳۷۔ چلر، "Turkey in 'the New World' " صفحہ ۹؛ براؤن، "Question of Turkish Identity" صفحہ ۵۶؛ تانسلو چلر، "Turkey and NATO: Stability in the Vortex of Change", *NATO Review 42* (اپریل ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۶؛ سلیمان دیمرل، BBC *Summary of World Broadcasts*، ۲ فروری ۱۹۹۴ء۔ پل کا استعارہ ان مصنفین نے بھی استعمال کیا ہے: بروس آر کونی ہوم، "Turkey and the West", *Foreign Affairs* 70 (بہار ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۳۹؛ لیسر، "Turkey and the West" صفحہ ۳۳۔

۳۸۔ آکٹیو پاز "The Border of Time"، ناتھن گارڈلز کو انٹرویو، *New Perspectives Quarterly* 8 (سرما ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۳۶۔

۳۹۔ دیکھیے ڈینیل پیٹرک موئنی ہان، "Free Trade with an Unfree Society: A Commitment and its Consequences", *National Interest* (گرما ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۲۸ تا ۳۳۔

۴۰۔ *Financial Times*، ۱۱ تا ۱۲ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۴؛ *New York Times*، ۱۶ اگست ۱۹۹۲ء، صفحہ ۳۔

۴۱۔ *Economist*، ۲۳ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۵؛ آیرین موس، انسانی حقوق کی کمشنر (آسٹریلیا)، *New York Times*، ۱۶ اگست ۱۹۹۲ء، صفحہ ۳؛ *Economist*، ۲۳ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۵؛ *Boston Globe*، ۷ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲؛ *Cable News Network* خبری رپورٹ، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء؛ رچرڈ ہگوٹ، "Closing a Branch Office of Empire: Australian Foreign Policy and the UK at Century's End", *International Affairs* 70 (جنوری ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۵۸۔

۴۲۔ جاٹ سجا میکو، *The Australian*، ۵ مئی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۸، محولہ ہگوٹ، "Closing a Branch" صفحہ ۶۲؛ ہگوٹ، "Closing a Branch" صفحہ ۶۳؛ *Economis*، ۱۲ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۴۔

۴۳۔ کینیشے اوے کو انٹرویو کی نقل، ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء، صفحات ۵ تا ۶۔ مزید دیکھیے *Japan Times*، ۷ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۹۔

۴۴۔ سابق سفیر رچرڈ وولکوٹ (آسٹریلیا)، *New York Times*، ۱۶ اگست ۱۹۹۲ء، صفحہ ۳۔

۴۵۔ پال کیلی، "Reinventing Australia", *National Interest 30* (سرما ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۶۶؛

Economist، ۱۱ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۴؛ گوٹ، "Closing a Branch" صفحہ ۵۸۔

۴۶۔ لی کوآن یو، بحوالہ گوٹ، "Closing a Branch"، صفحہ ۴۹۔

ساتواں باب:

۱۔ Economist ، ۱۴ جنوری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴۵؛ ۲۶ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۵۶، جس میں یورپ کے Le Monde، ۱۸ نومبر ۱۹۹۴ء میں شائع ہونے والے مضمون کا خلاصہ کیا گیا؛ New York Times، ۴ ستمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۱۔

۲۔ مائیکل ہاورڈ، "Lessons of the Cold War", *Survival 36* (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۳؛ پیری بے ہار، "Central Europe: The New Lines of Fracture", Geopolitique 39 (انگریزی ایڈیشن، اگست ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۴۲؛ میکس جیکب سن، "Collective Security in Europe Today", *Washington Quarterly* 18 (بہار ۱۹۹۵ء)، ۶۹؛ میکس بیلوف، "Fault Lines and Steeples: The Divided Loyalties of Europe", *Natinoal Interest* 23 (بہار ۱۹۹۱ء)، ۷۸۔

۳۔ اینڈریاس اوپلانکا، "Vienna and the Mirror of History", *Geopolitique 35* (انگریزی ایڈیشن، خزاں ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۲۵؛ وائی ٹاؤتاس لینڈزبرگیس، "The Choice", Geopolitique 35 (انگریزی ایڈیشن، خزاں ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۳؛ New York Times، ۲۳ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ E5۔

۴۔ کارل بلٹ، "The Baltic Litmus Test", *Foreign Affairs 73* (ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۸۴۔

۵۔ New York Times، ۱۵ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ A10۔

۶۔ *RFE/RL Research Bulletin 10* (۱۶ مارچ ۱۹۹۳ء)، صفحات ۱، ۶۔

۷۔ ولیم ڈی جیکسن، "Imperial Temptations: Ethnics Abroad", *Orbis 38* (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۵۔

۸۔ ایان بریزنسکی، New York Times، ۱۳ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ A8۔

۹۔ جان ایف میرزہائمر، "The Case for a Ukrainian Nuclear Deterrent: Debate", Foreign Affairs 72 (گرما ۱۹۹۳ء)، صفحات ۵۰ تا ۶۶۔

۱۰۔ New York Times، ۳۱ جنوری ۱۹۹۴ء، صفحہ A8۔

۱۱۔ بحولہ اولا ٹوناندر، "New European Dividing Lines?" ، والٹر اینگل کی مرتبہ Norway

Facing a Changing Europe: Perspectives and Options (اوسلو: نارویجن فارن پالیسی اسٹڈیز نمبر ۷۹، فریجوف نینسن انسٹی ٹیوٹ اور دیگر، ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۵۵۔

۱۲۔ جان موریسن، "Pereyaslav and After: The Russian-Ukrainian Relationship", International Affairs 69 (اکتوبر ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۶۷۷۔

۱۳۔ جان کنگ فیئر بینک (مدیر)، The Chinese World Order: Traditional China's Foreign Relations (کیمبرج: ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۸ء)، صفحات ۲ تا ۳۔

۱۴۔ پیری لنک، "The Old Man's New China", New York Review of Books 9، جون ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۲۔

۱۵۔ پیری لنک، "China's 'Core' Problem", Daedalus 122 (بہار ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۲۰۵؛ ویمنگ تو، "Cultural China: The Periphery as the Center", Daedalus 120 (بہار ۱۹۹۱ء)، ۲۲؛ Economist، ۸ جولائی ۱۹۹۵ء، صفحات ۳۱ تا ۳۲۔

۱۶۔ Economist، ۲۷ نومبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۳؛ ۱۷ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۶۱۔

۱۷۔ Economist، ۲۷ نومبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۳؛ یوئی چی فونو باشی، "The Asianization of Asia", Foreign Affairs 72 (نومبر/دسمبر ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۸۰۔ عموی تبصروں کے لیے ملاحظہ کیجئے مرے وائیڈن بام اور سیموئیل ہیوز، The Bamboo Network (نیویارک: فری پریس، ۱۹۹۶ء)۔

۱۸۔ کرسٹوفر گرے، محولہ در Washington Post، یکم دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ A۳۰؛ لی کوآن یو، محولہ میگی فارلے، "The Bamboo Network", Boston Globe Magazine، ۱۷ اپریل ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۸؛ International Herald Tribune، ۲۳ نومبر ۱۹۹۳ء۔

۱۹۔ International Herald Tribune، ۲۳ نومبر ۱۹۹۳ء؛ جارج ہکس اور جے اے سی میکی، "A Question of Identity: Despite Media Hype, They Are Firmly Settle in Southeast Asia", Far Eastern Economic Review، ۱۴ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۴۷۔

۲۰۔ Economist، ۱۶ اپریل ۱۹۹۴ء، صفحہ ۷۱؛ نکولس ڈی کرسٹوف، "The Rise of China", Foreign Affairs 72؛ گیرٹ ڈبلیو گونگ، "China's Fourth Revolution", Washington Quarterly 17 (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳۷؛ Wall Street Journal، ۱۷ مئی ۱۹۹۳ء، صفحہ A۷A؛ مرے ایل وائیڈن بام، Greater China: The Next Economic Superpower? (سینٹ لوئیس: واشنگٹن یونیورسٹی سنٹر فار دی اسٹڈی آف امریکن بزنس، کن ٹمپریری ایشوز سیریز ۵۷، فروری ۱۹۹۳ء)، صفحات ۲ تا ۳۔

۲۱۔ اسٹیون موفسن، Washington Post، ۱۴ اگست ۱۹۹۴ء، صفحہ A۳۰؛ Newsweek، ۱۹ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲۴؛ Economist، ۷ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۵۔

۲۲۔ دیکھئے والٹری کلیمنز جونیئر اور جون ژان، "Chiang Ching-Kuo's Role in the ROC-PRC Reconciliation", *American Asian Review* 12 (بہار ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۵۱ تا ۱۵۴۔

۲۳۔ کوچین فو، محولہ *Economist*، یکم مئی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۱؛ لنک، "Old Man's New China" صفحہ ۳۲۔ دیکھئے "Cross-Strait Relations: Historical Lessons", *Free China Review 44* (اکتوبر ۱۹۹۴ء)، صفحات ۴۲ تا ۵۲۔ گونگ، "China's Changing Shape: The Middle Kingdom?" *Foreign Affairs 73* صفحہ ۳۹؛ ۲ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۸؛ جیرالڈ سیگل، (مئی/جون ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۴۹؛ روس ایچ منرو، "Giving Taipei a Place at the Table", *Foreign Affairs* 73 (نومبر/دسمبر ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۱۵؛ *Wall Street Journal*، ۱۷ مئی ۱۹۹۳ء، صفحہ A۷؛ *Free China Journal*، ۲۹ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۔

۲۴۔ *Economist*، ۱۰ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحات ۲۸ تا ۲۹؛ ۱۲ اپریل ۱۹۹۴ء، صفحات ۳۴ تا ۳۵؛ *International Herald Tribune*، ۲۳ نومبر ۱۹۹۳ء؛ *Wall Street Journal*، ۱۷ مئی ۱۹۹۳ء، صفحہ A۷؛

۲۵۔ ایرا ایم لیپی ڈس، *History of Islamic Societies* (کیمبرج، یوکے: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء)، صفحہ ۳۔

۲۶۔ محمد زاہی مغربی، "Tribalism, Religion and the Challenge of Political Participation: The Case of Libya" (عرب دنیا میں جمہوری چیلنجز کے بارے میں کانفرنس میں پیش کردہ مقالہ، مرکز برائے مطالعہ سیاسی و بین الاقوامی ترقی، قاہرہ، ۲۲ تا ۲۷ ستمبر ۱۹۹۲ء)، صفحات ۱، ۹؛ *Economist* (عرب مشرق کا سروے)، ۶ فروری ۱۹۸۸ء، صفحہ ۷؛ عدلان اے الہردالو، "Sufism and Tribalism: The Case of Sudan" (عرب دنیا میں جمہوری چیلنجز کے بارے میں کانفرنس میں پیش کردہ مقالہ، مرکز برائے مطالعہ سیاسی و بین الاقوامی ترقی، قاہرہ، ۲۲ تا ۲۷ ستمبر ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۲؛ *Economist* (۳۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء)، صفحہ ۴۵؛ جان ڈیوک انتھنی، "Saudi Arabia: From Tribal Society to Nation-State"، رجائی الملاخ اور ڈورتھی ایچ الملاخ کی مرتبہ *Saudi Arabia, Energy, Developmental Planning, and Industrialization* (لیک سنگٹن، میساچوسیٹس: لیک سنگٹن، ۱۹۸۲ء) صفحات ۹۳ تا ۹۴۔

۲۷۔ یلمان اوناران، "Economics and Nationalism: The Case of Muslim Central Asia", *Central Asian Survey 13* (نمبر ۴ ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۴۹۳؛ ڈینس ڈریگونسکی، "Threshold of Violence", *Freedom Review 26* (مارچ/اپریل ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۲۔

۲۸۔ باربرا ڈیلی منکاف "The Comparative Study of Muslim Societies", *Items 40* (مارچ ۱۹۸۶ء)، صفحہ ۳۔

۲۹۔ مکاف، "Muslim Societies"، صفحہ ۳۔
۳۰۔ Boston Globe، ۱۲ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۔ مقبول عرب اور اسلامی کانفرنس پر عمومی تبصرے کے لیے دیکھئے "The Popular Arab and Islamic Conference (PAIC): A New 'Islamist International'?" *TransState Islam 1* (بہار ۱۹۹۵ء)، صفحات ۱۲ تا ۱۶۔
۳۱۔ برنارڈ شششر مین اور بریڈفرڈ آر مک گن، "Linkages Between Sunni and Shi'i Radical Fundamentalist Organizations: A New Variable in Middle Eastern Politics?" *The Political Chronicle 1* (فروری ۱۹۸۹ء)، صفحات ۲۲ تا ۳۴؛ *New York Times*، ۶ دسمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۵۔

آٹھواں باب:

۱۔ جارجی آرباٹوف، "Neo-Bolsheviks of the I.M.F.", *New York Times*، ۷ مئی ۱۹۹۲ء، صفحہ A۲۷۔
۲۔ شمالی کوریائی نقطہ نظر کا خلاصہ ایک سینئر امریکی تجزیہ نگار نے بیان کیا، *Washington Post*، ۱۲ جون ۱۹۹۴ء، صفحہ C1؛ بھارتی جنرل کے بیان کا حوالہ اس تحریر میں ہے: لیس ایسپن، "From Deterrence to Denuking: Dealing with Proliferation in the 1990's" میمورنڈم، ۱۸ فروری ۱۹۹۲ء، صفحہ ۶۔
۳۔ لارنس فریڈمین، "Great Powers, Vital Interests and Nuclear Weapons", *Survival 36* (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳۷؛ لیس ایسپن، ریمارکس، نیشنل اکیڈمی آف سائنسز، کمیٹی آن انٹرنیشنل سیکورٹی اینڈ آرمز کنٹرول، ۷ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۔
۴۔ اسٹینلے نورس، *Boston Globe*، ۲۵ نومبر ۱۹۹۵ء، صفحات ۱، ۷؛ السٹیئر ایان جانسٹن، "China's New 'Old Thinking': The Concept of Limited Deterrence", *International Security 20* (سرما ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۶ء)، صفحات ۲۱ تا ۲۳۔
۵۔ فلپ ایل رچی سن، "Iranian Military Resurgence: Scope, Motivations, and Implications for Regional Security", *Armed Forces and Society 21* (گرما ۱۹۹۵ء)، صفحات ۵۷۵ تا ۵۷۶۔ وارن کرسٹوفر کا خطاب، کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ، ۲۰ جنوری ۱۹۹۵ء؛ *Time*، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۱ء صفحہ ۴۷؛ علی الامین مزروئی، *Cultural Forces in World Politics* (لندن: جے کری، ۱۹۹۰ء)، صفحات ۲۲۰، ۲۲۴۔
۶۔ *New York Times*، ۱۵ نومبر ۱۹۹۱ء، صفحہ A1؛ *New York Times*، ۲۱ فروری ۱۹۹۲ء، صفحہ

A۹ :۱۲ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱؛ جین ٹوئیفل ڈریئر، "U.S/China Military Relations: Sanctions or Rapprochement?" In Depth 1 (بہار ۱۹۹۱ء)، صفحات ۱۷ تا ۱۸؛ Time، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۱ء، صفحہ ۴۸؛ Boston Globe، ۵ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۲؛ مونٹے آر بلارڈ، "U.S.-china Relations: The Strategic Calculus", Parameters 23 (گرما ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۸۸۔

۷۔ محولہ در کارل ڈبلیو ایکن بری، Explaining and Influencing Chinese Arms Transfers (واشنگٹن ڈی سی: نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ فار نیشنل اسٹرٹیجک اسٹڈیز، مک نائر پیپر نمبر ۳۶، فروری ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۷ ۳؛ حکومت پاکستان کا بیان، Boston Globe، ۵ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۹؛ آر بیلس گل، "Curbing Beijing's Arms Sales", Orbis 36 (گرما ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۳۸۶؛ چونگ پن لن، "Red Army", New Republic 20 نومبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۸؛ New York Times، ۸ مئی ۱۹۹۲ء، صفحہ ۳۱۔

۸۔ رچرڈ اے بٹ زنگر، "Arms to Go: Chinese Arms Sales to the Third World", International Security 17 (خزاں ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۸۷؛ فلپ ریچی سن، "Iranian Military Resurgence" صفحات ۵۷۶، ۵۷۸؛ Washington Post، ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۱ء، صفحات A1، A24؛ Time، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۱ء، صفحہ ۴۷؛ New York Times، ۱۸ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ A8؛ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱؛ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴؛ مونٹے بلارڈ، "U.S.-China Relations" صفحہ ۸۸، New York Times، ۲۲ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱؛ گل، "Curbing Beijing's Arms" صفحہ ۳۸۸؛ New York Times، ۸ اپریل ۱۹۹۳ء، صفحہ A9؛ ۲۰ جون ۱۹۹۳ء، صفحہ ۶۔

۹۔ جان ای ریلی، "The Public Mood at Mid-Decade", Foreign Policy 98 (بہار ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۸۳؛ Executive Order 12930، ۲۹ ستمبر ۱۹۹۴ء؛ Executive Order 12938، ۱۴ نومبر ۱۹۹۴ء۔ ان احکامات کے ذریعے ۱۶ نومبر ۱۹۹۰ء کے Executive Order 12735 کی توسیع ہوئی جس میں صدر بش نے کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کے حوالے سے قومی ہنگامی حالت کا اعلان کیا تھا۔

۱۰۔ جیمز فیلوز، "The Panic Gap: Reactions to North Korea's Bomb", National Interest 38 (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحات ۴۰ تا ۴۵؛ ڈیوڈ سینگر، New York Times، ۱۲ جون ۱۹۹۴ء، صفحات ۱، ۱۶۔

۱۱۔ New York Times، ۲۶ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۔

۱۲۔ Washington Post، ۱۲ مئی ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۔

۱۳۔ بیلاہاری کوسی کان، "Asia's Different Standard", Foreign Policy 92 (خزاں

۱۹۹۳ء)، صفحات ۲۸ تا ۲۹۔

۱۴۔ Economist، ۳۰ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۱؛ ۵ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۵؛ ۲۷ اگست ۱۹۹۴ء، صفحہ ۵۱؛ لیش گئی، "Human Rights and Governance: The Asian Debate" (ایشیا فاؤنڈیشن سنٹر فار ایشین پیسفک افیئرز، اوکیژنل پیپر نمبر ۴، نومبر ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۴۔

۱۵۔ رچرڈ ایم نکسن، *Beyond Peace* (نیویارک: رینڈم ہاؤس، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۲۷ تا ۱۲۸۔

۱۶۔ Economist، ۴ فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳۰۔

۱۷۔ چارلس جے براؤن، "In the Trenches: The Battle Over Rights", *Freedom Review 24* (ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۹؛ ڈگلس ڈبلیو پین، "Showdown in Vienna" ایضاً، صفحات ۶ تا ۷۔

۱۸۔ چارلس نورشی، "The Ayatollah and the Author: Rethinking Human Rights", *Yale Journal of World Affairs 1* (گرما ۱۹۸۹ء)، صفحہ ۱۶؛ کوی کان، "Asia's Different Standard" صفحہ ۳۲۔

۱۹۔ رچرڈ کوہن، *The Earth Times*، ۲ اگست ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۴۔

۲۰۔ *New York Times*، ۱۹ ستمبر ۱۹۹۳ء صفحہ E4؛ ۲۴ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحات ۱، B9، B12؛ ۹ ستمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ A26؛ *Economist*، ۲۱ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۷۵؛ ۱۸ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحات ۳۷ تا ۳۸؛ *Financial Times*، ۲۵ تا ۲۶ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۱؛ *Straits Times*، ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۔

۲۱۔ اعداد و شمار اور حوالے اس کتاب سے لیے گئے ہیں: *Global Migration Crisis* (نیویارک: ہارپر کولنز، ۱۹۹۵ء) صفحات ۲۱ تا ۲۸۔

۲۲۔ وائنر، *Global Migration Crisis*، صفحہ ۲۔

۲۳۔ اسٹینلے ہوفمین، "The Case for Leadership", *Foreign Policy 81* (سرما ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۳۰۔

۲۴۔ دیکھیے بی اے رابرسن، "Islam and Europe: An Enigma or a Myth?" *Middle East Journal 48* (بہار ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳۰۲؛ *New York Times*، ۵ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱؛ ۵ مئی ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱؛ جوئیل کلاٹکن اور اینڈریس فان ایگٹ، "Bedouins: Tribes That Have Made it", *New Perspectives Quarterly 8* (خزاں ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۵۱؛ جوڈتھ طر، "Strangers at the Gate", *New York Time Magazine* 15 ستمبر ۱۹۹۱ء، صفحہ ۴۹۔

۲۵۔ *International Herald Tribune*، ۲۹ مئی ۱۹۹۰ء، صفحہ ۵؛ *New York Times*، ۱۵ ستمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ A21۔ فرانس والا سروے فرانسیسی حکومت نے اور جرمن پول امریکن جیوئش کمیٹی نے کرایا تھا۔

۲۶۔ دیکھیے ہنز جارج بٹز، "The New Politics of Resentment: Radical Right-Wing

(جولائی Populist Parties in Western Europe", *Comparative Politics 25* ۱۹۹۳ء)، صفحات ۴۱۳ تا ۴۲۷۔

۲۷۔ *International Herald Tribune*، ۲۸ جون ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳؛ *Wall Street Journal* ۲۳ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ B1؛ لارنس ایچ فکس، "The Immigration Debate: Little Room for Big Reforms", *American Experiment 2* (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۲۔

۲۸۔ جیمز سی کلیڈ، "Slowing the Wave", *Foreign Policy 95* (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۴۳؛ ریٹا جے سائمن اور سوسین ایچ الیگزینڈر *The Ambivalent Welcome: Print Media, Public Opinion and Immigration* (ویسٹ پورٹ، سی ٹی: پرائیگر، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۴۶۔

۲۹۔ *New York Times*، ۱۱ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ E14۔

۳۰۔ جین راسپیل، *The Camp of the Saints* (نیویارک: اسکریبنر، ۱۹۷۵ء) اور ژاں کلاڈ شیسنائی، *Le Crepuscule de l'Occident: Demographie et Politique* (پیرس: رابرٹ لیفونٹ، ۱۹۹۵ء)؛ پیری لیلوشے، محولہ در طر "Strangers at the Gate"، صفحہ ۸۰۔

۳۱۔ فلپ فرگوئیس، "Demographic Explosion or Social Upheaval?" غسان سلامے کی مرتبہ *Democracy Without Democrats? The Renewal of Politics in the Muslim World* (لندن: آئی بی ٹورس، ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۵۷ اور مابعد۔

نواں باب:

۱۔ ایڈابی بوزمین، *Strategic Intelligence and Statecraft: Selected Essays* (واشنگٹن: براسیز (یوایس)، ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۵۰؛ بیری بوزن، "New Patterns of Global Security in the Twenty-first Century", *International Affairs 67* (جولائی ۱۹۹۱ء)، صفحات ۴۴۸ تا ۴۴۹۔

۲۔ جان ایل ایسپوسٹو، *The Islamic Threat: Myth or Reality* (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۴۶۔

۳۔ برنارڈ لوئیس، *Islam and the West* (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۱۳۔

۴۔ ایسپوسٹو، *Islamic Threat*، صفحہ ۴۴۔

۵۔ ڈینیل پائپس، *In the Path of God: Islam and Political Power* (نیویارک: بیسک بکس، ۱۹۸۳ء)، صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۳، ۱۶۹ تا ۱۷۳؛ لوئیس ایف رچرڈسن، *Statistics of Deadly Quarrels* (پٹس برگ: باکس ووڈ پریس، ۱۹۶۰ء)، صفحات ۲۳۵ تا ۲۳۷۔

۶۔ ایرا ایم لیپی ڈس، A History of Islamic Societies (کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء)، صفحات ۴۱ تا ۴۲؛ شہزادی اینا کومنینا، ان کتابوں میں حوالہ دیا گیا: کیرن آرمسٹرانگ، Holy War: The Crusades and Their Impact on Today's World (نیویارک: ڈبل ڈے اینکر، ۱۹۹۱ء)، صفحات ۳ تا ۴ اور آرنلڈ ٹائن بی، Study of History (لندن: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۴ء)، جلد ہشتم، صفحہ ۳۹۰۔

۷۔ بیری بوزن، "New Patterns" صفحات ۴۴۸ تا ۴۴۹؛ برنارڈ لوئیس، "The Roots of Muslim Rage: Why So Many Muslims Deeply Resent the West and Why Their Bitterness Will Not Be Easily Mollified", Atlantic Monthly266 (ستمبر ۱۹۹۰ء)، صفحہ ۶۰۔

۸۔ محمد سد احمد، "Cybernetic Colonialism and the Moral Searth", New Perspectives Quarterly 11 (بہار ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۹؛ ایم جے اکبر، محولہ Time، ۱۵ جون ۱۹۹۲ء، صفحہ ۲۴؛ عبدالوہاب بالواہل، محولہ ایضاً، صفحہ ۲۶۔

۹۔ ولیم ایچ مک نیل، "Epilogue: Fundamentalism and the World of the 1990's"، مارٹن ای مارٹی اور آر اسکاٹ اپیل بی کی مرتبہ :Fundamentalisms and Society Reclaiming the Sciences, the Family, and Education (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس)، صفحہ ۵۶۹۔

۱۰۔ فاطمہ مرنیسی، Islam and Democracy: Fear of the Modem World (ریڈنگ، ایم اے: ایڈیسن ویسلی، ۱۹۹۲ء)۔

۱۱۔ ایسی رپورٹوں کے ایک انتخاب کے لیے ملاحظہ ہو Economist، یکم اگست ۱۹۹۲ء، صفحات ۳۴ تا ۳۵۔

۱۲۔ جان ای ریلی کی مرتبہ American Public Opinion and U.S. Foreign Policy 1995 (شکاگو: شکاگو کونسل آن فارن ریلیشنز، ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۲۱؛ Le Monde، ۲۰ ستمبر ۱۹۹۱ء، صفحہ ۱۲، محولہ مارگریٹ بلنڈن، "Insecurity on Europe's Southern Flank", Survival 36 (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۳۸؛ رچرڈ مورن، Washington Post (نیشنل ویکلی ایڈیشن)، ۸ تا ۱۴ نومبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۷؛ Foreign Policy Association نیشنل اوپی نین بیلٹ رپورٹ، نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۵۔

۱۳۔ Boston Globe، ۳ جون ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۸؛ جان ایل ایسپوسٹو، "Symposium: Resurgent Islam in the Middle East", Middle East Policy 3 (نمبر ۲، ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۹؛ International Herald Tribune، ۱۰ مئی ۱۹۹۴ء، صفحات ۱، ۴؛ Christian Science Monitor، ۲۴ فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۔

۱۴۔ رابرٹ ایلز ورتھ، Wall Street Journal، یکم مارچ ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۵؛ ولیم ٹی جانسن، NATO's New Front Line: The Growing Importance of the Southern Tier (کارلسلی بیرکس، پنسلوانیا: اسٹرے ٹجک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ، یوایس آرمی وار کالج، ۱۹۹۲ء)، صفحہ vii؛ روبن لیرڈ، French Security Policy in Transition: Dynamics of Continuity and Change (واشنگٹن ڈی سی: انسٹی ٹیوٹ فار نیشنل اسٹرے ٹجک اسٹڈیز، مک نائر پیپر ۳۸، مارچ ۱۹۹۵ء)، صفحات ۵۰ تا ۵۲۔

۱۵۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی، Islam and Revolution (برکلے، کیلیفورنیا: مرزا پریس، ۱۹۸۱ء)، صفحہ ۳۰۵۔

۱۶۔ Economist، ۲۳ نومبر ۱۹۹۱ء، صفحہ ۱۵۔

۱۷۔ بیری بوزن اور جیرالڈ سیگل، "Rethinking East Asian Security", *Survival 36* (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۵۔

۱۸۔ Can China's Armed Forces Win the Next War? سے ترجمہ شدہ اقتباسات جو اس مطبوعہ میں شائع ہوئے: روس ایچ منرو، "Eavesdropping on the Chinese Military: Where It Expects War — Where It Doesn't", *Orbis* 38 (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳۶۵۔ اس دستاویز کے مصنفین نے کہا کہ تائیوان کے خلاف فوجی قوت کا استعمال ''واقعی غیر دانشمندانہ فیصلہ ہوگا۔''

۱۹۔ بوزن اور سیگل، "Rethinking East Asian Security" صفحہ ۷؛ رچرڈ کے بیٹس، "Wealth, Power and Instability: East Asia and the United States After the Cold War", *International Security 18* (سرما ۱۹۹۳ء/۱۹۹۴ء)، صفحات ۳۴ تا ۷۷؛ آرون ایل فرائیڈ برگ، "Ripe for Rivalry: Prospects for Peace in Multipolar Asia", *International Security 18* (سرما ۱۹۹۳ء/۱۹۹۴ء)، صفحات ۵ تا ۳۳۔

۲۰۔ Can China's Armed Forces Win the Next War? ترجمہ شدہ اقتباسات جو منرو، "Eavesdropping on the Chinese" میں شائع ہوئے، صفحہ ۳۵۵ اور مابعد؛ New York Times، ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ء، صفحہ A۶؛ فرائیڈ برگ، "Ripe for Rivalry" صفحہ ۷۔

۲۱۔ ڈیسمنڈ بال، "Arms and Affluence: Military Acquisitions in the Asia-Pacific Region", *International Security 18* (سرما ۱۹۹۳ء/۱۹۹۴ء)، صفحات ۹۵ تا ۱۱۱؛ مائیکل ٹی کلیئر، "The Next Great Arms Race", *Foreign Affairs 72* (گرما ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۱۳۷ اور مابعد؛ بوزن اور سیگل، "Rethinking East Asian Security" صفحات ۸ تا ۱۱؛ جیرالڈ سیگل، "Managing New Arms Races in the Asia/Pacific", *Washington*

Quarterly 15 (گرما ۱۹۹۲ء)، صفحات ۸۳ تا ۱۰۲؛ ۲۰ فروری ۱۹۹۳ء، *Economist* صفحات ۱۹ تا ۲۲۔

۲۲۔ مثال کے طور پر دیکھیے *Economist*، ۲۶ جون ۱۹۹۳ء، صفحہ ۷۵؛ ۲۴ جولائی ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۵: *Time*، ۳ جولائی ۱۹۹۵ء، صفحات ۳۰ تا ۳۱؛ اور چین کے بارے میں جیکب ہیلبرن، "The Next Cold War", *New Republic*، ۲۰ نومبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۷ اور مابعد۔

۲۳۔ تجارتی جنگوں کی اقسام اور ایسی جنگیں کب فوجی لڑائیوں پر منتج ہوتی ہیں، اس بارے میں بحث کے لیے دیکھیے *Trade Wars and International Security: The Political Economy of International Economic Conflict* (ورکنگ پیپر نمبر ۶، پروجیکٹ آن چینج جنگ سیکورٹی انوائرنمنٹ اینڈ امریکن نیشنل انٹرسٹس، جان ایم اولن انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرےٹجک اسٹڈیز، ہارورڈ یونیورسٹی، جولائی ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۷ اور مابعد۔

۲۴۔ *New York Times*، ۶ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ A1، A6؛ *Time*، ۱۰ فروری ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۶ اور مابعد؛ *Economist*، ۱۷ فروری ۱۹۹۰ء، صفحات ۲۱ تا ۲۴؛ *Boston Globe*، ۲۵ نومبر ۱۹۹۱ء، صفحات ۱، ۸؛ ڈین اوبرڈورفر، *Washington Post*، یکم مارچ ۱۹۹۲ء، صفحہ A1۔

۲۵۔ محولہ در *New York Times*، ۲۱ اپریل ۱۹۹۲ء، صفحہ A10؛ *New York Times*، ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ء، صفحہ E2؛ ۲۱ اپریل ۱۹۹۲ء، صفحہ A1؛ ۱۹ ستمبر ۱۹۹۱ء، صفحہ A7؛ یکم اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ A2؛ *International Herald Tribune*، ۲۴ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴؛ *China Post (Taipei)*، ۲۶ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲؛ *New York Times*، یکم اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ A2، جس میں بیجنگ میں لیے گئے انٹرویوز پر ڈیوڈ شمبا کی رپورٹ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

۲۶۔ ڈونالڈ زگوریا، American Foreign Policy Newsletter، اکتوبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳؛ *Can China's Armed Forces Win the Next War?*، اس مطبوعہ میں: منرو، "Eavesdropping on the Chinese Military" صفحہ ۳۵۵ اور مابعد۔

۲۷۔ روجر سی آلٹ مین، "Why Pressure Tokyo? The US-Japan Rift", *Foreign Affairs 73*، (مئی جون ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳؛ جیفری کارٹن، "The Clinton Asia Policy", *International Economy 8* (مارچ اپریل ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۸۔

۲۸۔ ایڈورڈ جے لنکن، *Japan's Unequal Trade* (واشنگٹن ڈی سی: بروکنگز انسٹی ٹیوشن، ۱۹۹۰ء)، صفحات ۲ تا ۳۔ دیکھیے سی فریڈ برگسٹن اور مارکس نولینڈ، *Reconcilable Differences? United States-Japan Economic Conflict* (واشنگٹن: انسٹی ٹیوٹ فار انٹرنیشنل اکنامکس، ۱۹۹۳ء)؛ ایسوکے ساکا کی بارا، "Less Like You", *International Economy* (اپریل مئی ۱۹۹۰ء)، ۳۶، جس نے امریکی سرمایہ دارانہ منڈی کی معیشت اور جاپانی غیر سرمایہ دارانہ منڈی کی معیشت کے درمیان

امتیاز کیا ہے؛ میری اینکورڈوگی، "Japanese-American Trade Conflict and Supercomputers", *Political Science Quarterly* ۱۰۹ (بہار ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳۶، جس میں رڈیگر ڈورن بش، پال کرگ مین، ایڈورڈ جے لنکن اور مورڈے چائی ای کریشن کا حوالہ دیا گیا ہے؛ ایمون فنگل ٹن، "Japan's Invisible Leviathan", *Foreign Affairs 74* (مارچ/اپریل ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۷۰۔

۲۹۔ ثقافت، اقدار، سماجی تعلقات اور رویوں میں اختلافات کے مختصر تذکرے کے لیے ملاحظہ کیجئے *American Exceptionalism: A Double-Edged Sword* (نیویارک: ڈبلیو ڈبلیو نورٹن، ۱۹۹۶ء)، ساتواں باب، "American Exceptionalism—Japanese Uniqueness".

۳۰۔ *Washington Post*، ۵ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ A۳۸؛ *Daily Telegraph*، ۶ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۶؛ *Boston Globe*، ۶ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۱؛ *New York Times*، ۱۳ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۰؛ کارل ڈی جیکسن، "How to Rebuild America's Stature in Asia", *Orbis 39* (سرما ۱۹۹۵ء)، ۱۴؛ یوہی کونو، محولہ شامرز جونسن اور ای بی کین، "The Pentagon's Ossified Strategy", *Foreign Affairs 74* (جولائی/اگست ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۰۶۔

۳۱۔ *New York Times*، ۲ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ A۱۰۔

۳۲۔ بیری بوزن اور جیرالڈ سیگل، "Asia: Skepticism About Optimism", *National Interest 39* (بہار ۱۹۹۵ء)، صفحات ۸۳ تا ۸۴؛ آرتھر والڈرن، "Deterring China", *Commentary 100* (اکتوبر ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۸؛ نکولس ڈی کرسٹوف، "The Rise of China", *Foreign Affairs 72* (نومبر/دسمبر ۱۹۹۳ء)، ۷۴۔

۳۳۔ اسٹیون پی والٹ، "Alliance Formation in Southwest Asia: Balancing and Bandwagoning in Cold War Competition" رابرٹ جرویس اور جیک اسنائیڈر کی مرتبہ *Dominoes and Bandwagons: Strategic Beliefs and Great Power Competition in the Eurasian Rimland* (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء)، صفحات ۵۳، ۶۹۔

۳۴۔ رینڈال ایل شویلر، "Bandwagoning for Profit: Bringing the Revisionist State Back In", *International Security 19* (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۷۲ اور مابعد۔

۳۵۔ لوسین ڈبلیو پائی، *Dynamics of Factions and Consensus in Chinese Politics: A Model and Some Propositions* (سانٹا مونیکا، کیلیفورنیا: رینڈ ۱۹۸۰ء)، صفحہ ۱۲۰؛ آرتھر والڈرن، *From War to Nationalism: China's Turning Point, 1924-1925* (کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء)، صفحات ۴۸ تا ۴۹، ۲۱۲؛ ایوری گولڈسٹائن،

From Bandwagon to Balance-of-Power Politics: Structured Constraints in Politics in China, 1949-1978 (اسٹین فرڈ، کیلیفورنیا: اسٹین فرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء)، صفحات ۵ تا ۲۵، ۳۵ اور مابعد۔ نیز دیکھئے لوسین ڈبلیو پائی، "Social Science Theories in Search of Chinese Realities", China Quarterly 132 (دسمبر ۱۹۹۲ء)، صفحات ۱۱۶۱ تا ۱۱۷۔

۳۶۔ سیموئیل ایس کم اور لوویل ڈٹمر، "Whither China's Quest for National Identity" لوویل ڈٹمر اور سیموئیل ایس کم کی مرتبہ China's Quest for National Identity (اتھاکا، نیو یارک: کورنیل یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۲۴۰؛ پال ڈب، Towards a New Balance of Power in Asia (لندن: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرے ٹیجک اسٹڈیز، ایڈلفی پیپر ۲۹۵، ۱۹۹۵ء)، صفحات ۱۰ تا ۱۶؛ روڈرک مک فرکوہر، "The Post-Confucian Challenge", Economist ۹ فروری ۱۹۸۰ء، صفحات ۶۷ تا ۷۲؛ کشور محبوبانی، " 'The Pacific Impulse,' " Survival 37 (بہار ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۱۷؛ جیمز ایل رچرڈسن، "Asia-Pacific: The Case for Geopolitical Optimism", National Interest 38 (سرما ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۳۲؛ پال ڈب، "Towards a New Balance" صفحہ ۱۳۔ طاقت کے توازن اور سلامتی کے مخمصے جیسے یورپی تصورات کا ایشیا پر اطلاق نہ ہو سکنے کے بارے میں تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے نکولا بیکر اور لیونارڈ سی سباستین، "The Problem with Parachuting: Strategic Studies and Security in the Asia/Pacific Region", Journal of Strategic Studies 18 (ستمبر ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۵ اور مابعد۔

۳۷۔ Economist، ۲۳ دسمبر ۱۹۹۵ء؛ ۵ جنوری ۱۹۹۶ء، صفحات ۳۹ تا ۴۰۔

۳۸۔ رچرڈ کے بیٹس، Survival 37، "Vietnam's Strategic Predicament" (خزاں ۱۹۹۵ء)، صفحات ۶۱ اور مابعد، ۷۶۔

۳۹۔ New York Times، ۱۲ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۶؛ ۲۴ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ A12؛ International Herald Tribune، ۸ نومبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱؛ مائیکل اوکسن برگ، Washington Post، ۳ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ C1۔

۴۰۔ جنت سو سوشیاما، "The End of the Alliance? Dilemmas in the U.S.—Japan Relations" (غیر مطبوعہ مقالہ، ہارورڈ یونیورسٹی، جان ایم اولن انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرے ٹیجک اسٹڈیز، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۸ تا ۱۹۔

۴۱۔ آئیون پی ہال، National Interest 38، "Japan's Asia Card" (سرما ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۲۶؛ کشور محبوبانی، "The Pacific Impulse" صفحہ ۱۱۷۔

۴۲۔ "Japan and the Strategic Quadrangle" مائیکل مینڈلبام کی مرتب The Strategic Quadrangle: Russid, China, Japan, and the United States in East Asia (نیویارک: کونسل آن فارن ریلیشنز، ۱۹۹۵ء)، صفحات ۱۳۰ تا ۱۳۹؛ Asahi Shimbon کا پول جو Christian Science Monitor، ۱۰ جنوری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۷ پر چھپا۔

۴۳۔ Financial Times، ۱۰ ستمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۶؛ ثمینہ یاسمین، "Pakistan's Cautious Foreign Policy", Survival 36 (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۲۱، ۱۲۷ تا ۱۲۸؛ بروس وان، "Shifting Geopolitical Realities Between South, Southwest and Central Asia", Central Asian Survey 13 (نمبر ۲، ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳۱۳؛ اداریہ Hamshahri، ۳۰ اگست ۱۹۹۴ء، صفحات ۱، ۴، FBIS-NES-94-173، ۲ ستمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۷۷۔

۴۴۔ گراہم ای فلر، "The Appeal of Iran", National Interest 37 (خزاں ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۹۵؛ معمر القذافی، خطبہ، طرابلس، لیبیا، ۱۳ مارچ ۱۹۹۴ء FBIS-NES-94-049، ۱۴ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ ۲۱۔

۴۵۔ فرائیڈن فشارا کی، ایسٹ ویسٹ سنٹر، ہوائی، بحوالہ New York Times، ۳ اپریل ۱۹۹۴ء، صفحہ E۳۔

۴۶۔ اسٹیون جے بلینک، Challenging the New World Order: The Arms Transfer Policies of the russian Republic (کارلسلی بیرکس، پنسلوانیا: یوایس آرمی وار کالج، اسٹرے ٹجک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۳ء)، صفحات ۵۳ تا ۶۰۔

۴۷۔ International herald Tribune، ۲۵ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۵۔

۴۸۔ جے موہن ملک، "India Copes with the Kremlin's Fall", Orbis 37 (سرما ۱۹۹۳ء)، ۷۵۔

دسواں باب:

۱۔ مہدی المنظرہ، Der Spiegel، ۱۱ فروری ۱۹۹۱ء، بحوالہ در المنظرہ، "Cultural Diversity: Key to Survival in the Future" (مطالعہ مستقبلات پر پہلی میکسیکن کانگریس، میکسیکو سٹی، ۲۶ تا ۲۷ ستمبر ۱۹۹۴ء)، صفحات ۳، ۱۱۔

۲۔ ڈیوڈ سی ریپوپورٹ، "Comparing Militant Fundamentalist Groups" مارٹن ای مارٹی اور آر اسکاٹ ایپل بی کی مرتب Fundamentalisms and the State: Remarking Polities, Economies, and Militance (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۹۳ء)، صفحہ

۴۴۵۔

۳۔ ٹیڈ گیلن کارپینٹر، "The Unintended Consequences of Afghanistan", *World Policy Journal 11*، (بہار ۱۹۹۴ء)، صفحات ۷۸ تا ۷۹، ۸۱، ۸۲؛ انٹنی بے مین، "Arab Inovolvement in the Afghan War", *Beirut Review 7* (بہار ۱۹۹۴ء)، صفحات ۷۸، ۸۲؛ میری این ویور، "Letter from Pakistan: Children of the Jihad", *New Yorker 12* جون ۱۹۹۵ء، صفحات ۴۴ تا ۴۵؛ *Washington Post*، ۲۴ جولائی ۱۹۹۵ء، صفحہ A1؛ *New York Times*، ۲۰ مارچ ۱۹۹۵ء، صفحہ ا؛ ۲۸ مارچ ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۴۔

۴۔ ٹم ویز، "Blowback from the Afghan Battlefield", *New York Times Magazine*، ۱۳ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ ۵۴۔

۵۔ ہیری سن جے گولڈن، *New York Times*، ۲۸ اگست ۱۹۹۲ء، صفحہ A۲۵۔

۶۔ جیمز پسکاٹوری، "Religion and Realpolitik: Islamic Responses to the Gulf War" جیمز پسکاٹوری کی مرتبہ *Islamic Fundamentalisms and the Gulf* (شکاگو: فنڈامنٹلزم پروجیکٹ، امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنسز، ۱۹۹۱ء)، صفحات ۱، ۲ تا ۷۔ مزید دیکھئے فاطمہ مرنیسی *Islam and Democracy: Fear of the Modern World* (ریڈنگ، میساچوسیٹس: ایڈیسن ویسلی)، صفحات ۱۶ تا ۱۷۔

۷۔ رامی جی خوری، "Collage of Comment: The Gulf War and the Mideast Peace; The Appeal of Saddam Hussein", *New Perspectives Quarterly 8*، (بہار ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۵۶۔

۸۔ این موسلے لیش، "Contrasting Reactions to the Persian Gulf Crisis: Egypt, Syria, Jordan, and the Palestinians", *Middle East Journal 45*، (سرما ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۴۳؛ *Time*، ۳ دسمبر ۱۹۹۰ء، صفحہ ۷۰؛ کنان ماکیہ، *Cruelty and Silence: War, Tyranny, Uprising and the Arab World* (نیویارک: ڈبلیو ڈبلیو نورٹن، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۲۴۲ اور مابعد۔

۹۔ ایرک ایونز، "Arab Nationalism and the Persian Gulf War", *Harvard Middle Eastern and Islamic Review 1*، (فروری ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۲۸؛ ساری نسل بے، محولہ *Time*، ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۰ء، صفحات ۵۴ تا ۵۵۔

۱۰۔ کیرن حجاج، "One Year After the Storm", *Civil Society 5* (قاہرہ)، (مئی ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۱۲۔

۱۱۔ *Boston Globe*، ۱۹ فروری ۱۹۹۱ء، صفحہ ۷؛ سفار الحوالی، محولہ مامون فندی، *New York Times*،

۲۴ نومبر ۱۹۹۰ء، صفحہ ۲۱؛ شاہ حسین، محولہ در ڈیوڈ ایس لینڈز، "Islam Dunk: The Wars of Muslim Resentment", New Republic 8، اپریل ۱۹۹۱ء، صفحات ۱۵ تا ۱۶؛ فاطمہ مرنیسی، *Islam and Democracy*، صفحہ ۱۰۲۔

۱۲۔ سفارالحوالی، "Infidels, Without, and Within," *Perspectives Quarterly* 8 (بہار ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۵۱۔

۱۳۔ *New York Times*، یکم فروری ۱۹۹۱ء، صفحہ A7؛ *Economist*، ۲ فروری ۱۹۹۱ء، صفحہ ۳۲۔

۱۴۔ *Washington Post*، ۲۹ جنوری ۱۹۹۱ء، صفحہ A10؛ ۲۴ فروری ۱۹۹۱ء، صفحہ B1؛ *New York Times*، ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء، صفحہ ۴۔

۱۵۔ محولہ *Saturday Star* (جوہانس برگ)، ۱۹ جنوری ۱۹۹۱ء، صفحہ ۳؛ *Economist*، ۲۶ جنوری ۱۹۹۱ء، صفحات ۳۱ تا ۳۴۔

۱۶۔ سہیل ایچ ہاشمی، محمد ہیکل کے مضمون "Illusions of Triumph", *Harvard Middle Eastern and Islamic Review 1*، (فروری ۱۹۹۴ء) کا جائزہ، صفحہ ۱۰۷؛ مرنیسی، *Islam and Democracy*، صفحہ ۱۰۲۔

۱۷۔ شبلی تلہامی، "Arab Public Opinion and the Gulf War", *Political Science Quarterly 108*، (خزاں ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۴۵۱۔

۱۸۔ *International Herald Tribune*، ۲۸ جون ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۰۔

۱۹۔ رائے لک لائیڈر، "The Consequences of Negotiated Settlements in Civil Wars, 1945–93", *American Political Science Review 89* (ستمبر ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۶۸۵، جس نے فرقہ وارانہ جنگوں کو ''تشخص کی جنگیں'' قرار دیا ہے اور سیموئیل پی ہنٹنگٹن، "Civil Violence and the Process of Development"، اس کتاب میں: *Civil Violence and the International System* (لندن: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرے ٹجک اسٹڈیز، ایڈلفی پیپر نمبر ۸۳، دسمبر ۱۹۷۱ء)، صفحات ۱۲ تا ۱۴، جس میں فرقہ وارانہ جنگوں کی پانچ اہم خصوصیات یہ بیان کی گئی ہیں: بہت زیادہ محاذ آرائی، نظریاتی دورنگی، مخصوص واقعات پر زور، تشدد کے کثیر واقعات اور طویل دورانیہ۔

۲۰۔ یہ تخمینے اخباری رپورٹوں اور ٹیڈ رابرٹ گر اور باربرا ہارف کی کتاب *Ethnic Conflict in World Politics* (بولڈر: ویسٹ ویو پریس، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۶۰ تا ۱۶۵ سے لیے گئے ہیں۔

۲۱۔ رچرڈ ایچ شلز جونیئر اور ولیم جے اولسن، *Ethnic and Religious Conflict: Emerging Threat to U.S. Security* (واشنگٹن ڈی سی: نیشنل اسٹرے ٹجی انفارمیشن سنٹر)، صفحہ ۱۷ اور مابعد؛ ایچ ڈی ایس گرین وے، *Boston Globe*، ۳ دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۹۔

۲۲۔ رائے لک لائیڈر، "Settlements in Civil Wars"، صفحہ ۶۸۵؛ گر اور ہارف، *Ethnic*

Conflict صفحہ ۱۱؛ ٹرینٹ این ٹامس، "Global Assessment of Current and Future Trends in Ethnic and Religious Conflict"رابرٹ ایل فالٹز گراف جونیر اور رچرڈ ایچ شلز جونیر کی مرتبہ *Ethnic Conflict and Regional Instability: Implications for U.S. Policy and Army Roles and Missions* (کارلسلی بیرکس، پنسلوانیا: اسٹرےٹجک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ، یوایس آرمی وار کالج، ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۳۶۔

۲۳۔ دیکھیے شلز اور اولسن، *Ethnic and Religious Conflict*، صفحات ۳ تا ۹؛ سجاتا بوس، "Factors Causing the Proliferation of Ethnic and Religious Conflict"فالٹز گراف اور شلز کی مرتبہ *Ethnic Conflict and Regional Instability* صفحات ۴۳ تا ۴۹؛ مائیکل ای براؤن، "Causes and Implications of Ethnic Conflict"مائیکل ای براؤن کی مرتبہ *Ethnic Conflict and International Security* (پرنسٹن، نیو جرسی: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء)، صفحات ۳ تا ۲۶۔ اس کی مخالفت میں یہ موقف کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد نسلی تنازعات میں اضافہ نہیں ہوا، اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے: "Global Assessment of Current and Future Trends in Ethnic and Religious Conflict"صفحات ۳۳ تا ۴۱۔

۲۴۔ رتھ لیگرڈ سیورڈ، *World Military and Social Expenditures 1993* (واشنگٹن ڈی سی: ورلڈ پرائرٹیز انکارپوریٹیڈ، ۱۹۹۳ء)، صفحات ۲۰ تا ۲۲۔

۲۵۔ جیمز ایل پین، *Why Nations Arm* (اوکسفرڈ: بی بلیک ول، ۱۹۸۹ء)، صفحہ ۱۲۴۔

۲۶۔ کرسٹوفر بی اسٹون، "Westphalia and Hudaybiyya: A Survey of Islamic Perspectives on the Use of Force as Conflict Management Technique" (غیر مطبوعہ مقالہ، ہارورڈ یونیورسٹی)، صفحات ۲۷ تا ۳۱، اور جوناتھن ولکن فیلڈ، مائیکل بریچر اور شیلا موسر کی مرتبہ *Crises in the Twentieth Century* (اوکسفرڈ: پرگیمن پریس، ۱۹۸۸ء تا ۱۹۸۹ء)، جلد دوم، صفحہ ۱۵، ۱۶۱۔

۲۷۔ جیری فلر کی تحریر "The Demographic Backdrop to Ethnic Conflict: A Geographic Overview" سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کی *The Challenge of Ethnic Conflict to National and International Order in the 1990's: Geographic Perspectives* (واشنگٹن ڈی سی: سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی، آر ٹی ٹی ۹۵-۱۰۰۳۹، اکتوبر ۱۹۹۵ء) میں، صفحات ۱۵۱ تا ۱۵۴۔

۲۸۔ *New York Times*، ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳؛ *Economist*، ۵ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳۲۔

۲۹۔ اقوام متحدہ کا اقتصادی و معاشرتی معلومات اور پالیسی تجزیے کا شعبہ، آبادی ڈویژن، *World Population Prospects: The 1994 Revision* (نیویارک: اقوام متحدہ، ۱۹۹۵ء)، صفحات

۲۹، ۵۱؛ ڈینس ڈریگونسکی، "Threshold of Violence", *Freedom Review* 26 (مارچ اپریل ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۱۔

۳۰۔ سوسین وڈورڈ، *Balkan Tragedy: Chaos and Dissolution after the Cold War* (واشنگٹن ڈی سی: بروکنگز انسٹی ٹیوشن، ۱۹۹۵ء)، صفحات ۳۲ تا ۳۵؛ برانکا ماگاس، *The Destruction of Yugoslavia: Tracking the Breakup* (لندن: ورسو، ۱۹۹۳ء)، صفحات ۶، ۱۹۔

۳۱۔ پال موجزے، *Yugoslavian Inferno: Ethnoreligious Warfare in the Balkans* (نیویارک: کن ٹی نوم، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۹۵ تا ۹۶؛ ماگاس، *Destruction of Yugoslavia* صفحات ۴۹ تا ۷۳؛ آرے نیر، "Kosovo Survives", *New York Review of Books*، ۳ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۲۶۔

۳۲۔ الیسکا ڈیلاس، "A Profile of Slobodan Milosevic", *Foreign Affairs 72* (گرما ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۸۳۔

۳۳۔ وڈورڈ، *Balkan Tragedy*، صفحات ۳۳ تا ۳۵، اعداد وشمار یوگوسلاویہ کی مردم شماریوں اور دیگر ماخذوں سے لیے گئے ہیں؛ ولیم ٹی جونسن، *Deciphering the Balkan Enigma: Using History to Inform Policy* (کارلسلی بیرکس: اسٹریٹجک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۲۵، محولہ *Washington Post*، ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ C2؛ *New York Times*، ۴ نومبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۶۔

۳۴۔ بوگڈن ڈینس ڈیچ، *Ethnic Nationalism: The Tragic Death of Yugoslavia* (منیا پولس: یونیورسٹی آف منےسوٹا پریس، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۰۸ تا ۱۰۹۔

۳۵۔ پین، *Why Nations Arm*، صفحات ۱۲۵ تا ۱۲۷۔

۳۶۔ *Middle East International*، ۲۰ جنوری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۔

گیارہواں باب:

۱۔ رائے لک لائیڈر، "The Consequences of Negotiated Settlements in Civil Wars, 1945–93", *American Political Science Review 89* (ستمبر ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۶۸۵۔

۲۔ دیکھئے بیری آر پوسین، "The Security Dilemma and Ethnic Conflict" مائیکل ای براؤن کی مرتبہ *Ethnic Conflict and International Security* (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء)، صفحات ۱۰۳ تا ۱۲۴۔

۳۔ رونالڈ ڈین روتھر، *Creating New States in Central Asia* (انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرٹیجک اسٹڈیز/براسیز، ایڈلفی پیپر نمبر ۲۸۸، مارچ ۱۹۹۴ء)، صفحات ۳۰ تا ۳۱؛ ژوڈیونی ایتوولو، بحوالہ ارسلہ ڈوروس زوسکا، "The Forgotten War: What Really Happened in Tajikistan", *Uncaptive Minds 6* (خزاں ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۳۳۔

۴۔ *Economist*، ۲۶ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳۳؛ ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ء، صفحہ ۲۱۔

۵۔ *Boston Globe*، ۸ نومبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲؛ برائن مرے، "Peace in the Caucasus: Multi-Ethnic Stability in Dagestan", *Central Asian Survey 13* (نمبر ۴، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۵۱۴، ۵۱۵؛ *New York Times*، ۱۱ نومبر ۱۹۹۱ء، صفحہ A۱۷؛ ۱۷ دسمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۷؛ *Boston Globe*، ۷ ستمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۶؛ ۱۷ دسمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱ اور مابعد۔

۶۔ راجو جی سی ٹامس، "Secessionist Movements in South Asia", *Survival 36* (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحات ۹۹ تا ۱۰۱، ۱۰۹؛ اسٹیفن واگسٹل، "Kashmiri Conflict Destroys a 'Paradise' ", *Financial Times* ۲۳ تا ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۔

۷۔ علی جاہ عزت بیگووچ، *The Islamic Declaration* (۱۹۹۱ء)، صفحات ۲۳، ۳۳۔

۸۔ *New York Times*، ۴ فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴؛ ۱۵ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ A۱۲؛ ۱۶ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ A۱۲۔

۹۔ *Economist*، ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ء، صفحہ ۲۱؛ *New York Times*، ۴ فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴۔

۱۰۔ اسٹوین ادبر ڈوچ، "Tuzla: The Last Oasis", *Uncaptive Minds 7* (خزاں سرما ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱۲ تا ۱۳۔

۱۱۔ فیونا ہل، *Russia's Tinderbox: Conflict in the North Caucasus and Its Implications for the Future of the Russian Federation* (ہارورڈ یونیورسٹی، جان ایف کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ، جمہوری اداروں کے استحکام کا منصوبہ، ستمبر ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۱۰۴۔

۱۲۔ *New York Times*، ۶ دسمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ A۳۔

۱۳۔ دیکھئے موزس، *Yugoslavian Inferno*، باب ۷، "The Religious Component in Wars"؛ ڈنج، *Ethnic Nationalism: The Tragic Death of Yugoslavia* صفحات ۲۹ تا ۳۰، ۷۲ تا ۷۳، ۱۳۱ تا ۱۳۲؛ *New York Times*، ۱۷ ستمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ A۱۴؛ میشا گلینی، "Carnage in Bosnia, for Starters", *New York Times* ۲۹ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ A۲۳۔

۱۴۔ *New York Times*، ۱۳ مئی ۱۹۹۵ء، صفحہ A۳؛ ۷ نومبر ۱۹۹۳ء، صفحہ E۴؛ ۱۳ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ E۳؛ بورس یلسن، بحوالہ بارنیٹ آر ڈوبن، "The Fragmentation of Tajikistan",

Survival 35 (سرما ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۸۶۔

۱۵۔ New York Times، ۷ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱: ۱۲۶ اکتوبر ۱۹۹۵ء، صفحہ A25: ۲۴ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ E3: اسٹینلے جے راجا تمبیا، Sri Lanka: Ethnic Fratricide and the Dismantling of Democracy (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۸۶ء)، صفحہ ۱۹۔

۱۶۔ خالد دوران، محولہ رچرڈ ایچ شلز جونیر اور ولیم جے اولسن، Ethnic and Religious Conflict: Emerging Threat to U.S. Security (واشنگٹن ڈی سی: نیشنل اسٹرے ٹجی انفارمیشن سنٹر)، صفحہ ۲۵۔

۱۷۔ کاچنگ تولولیان، "The Impact of Diasporas in U.S. foreign Policy" رابرٹ ایل فالٹز گراف جونیر اور رچرڈ ایچ شلز جونیر کی مرتبہ Ethnic Conflict and Regional Instability: Implications for U.S. Policy and Army Roles and Missions (کارلسلی بیرکس، پنسلوانیا: اسٹرے ٹجک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ، یو ایس آرمی وار کالج، ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۵۶۔

۱۸۔ New York Times، ۲۵ جون ۱۹۹۴ء، صفحہ A6: ۷ اگست ۱۹۹۴ء، صفحہ A9: Economist، ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۳۸: ۱۹ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳۲: Boston Globe، ۱۶ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۲: ۳ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۲۔

۱۹۔ Economist، ۲۷ فروری ۱۹۸۸ء، صفحہ ۲۵: ۸ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳۴: ڈیوڈسی راپوپورٹ، "The Role of External Forces in Supporting Ethno-Religious Conflict" فالٹز گراف اور شلز کی کتاب Ethnic Conflict and Regional Instability صفحہ ۶۴۔

۲۰۔ راپوپورٹ، "External Forces" صفحہ ۶۶: New York Times، ۱۹ جولائی ۱۹۹۲ء، صفحہ E3: کیرولن فلائیر لوبن، "Protracted Civil War in the Sudan: Its Future as a Multi-Religious, Multi-Ethnic State", Fletcher Forum of World Affairs16 (گرما ۱۹۹۲ء)، ۷۳۔

۲۱۔ اسٹیون آر وائز مین، "Sri Lanka: A Nation Disintegrates", New York Times Magazine، ۱۳ دسمبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۸۵۔

۲۲۔ New York Times، ۲۹ اپریل ۱۹۸۴ء، صفحہ ۶: ۱۹ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ A3: ۲۴ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۹: Economist، ۱۱ جون ۱۹۸۸ء، صفحہ ۳۸: ۲۶ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۹: ۲۰ مئی ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳۵: ۴ نومبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳۹۔

۲۳۔ بارنیٹ روبن، "Fragmentation of Tajikistan" صفحات ۸۴، ۸۸: New York Times، ۲۹ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۱: Boston Globe، ۴ اگست ۱۹۹۳ء، صفحہ ۴۔ تاجکستان میں جنگ کی

تفصیلات کے لیے میں نے زیادہ تر اس مضمون سے استفادہ کیا ہے: بارنیٹ آر روبن، "The Fragmentation of Tajikistan", *Survival 35* (سرما ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۴ء)، صفحات ۷۱ تا ۹۱؛ رونالڈ ڈین روتھر، *Creating New States in Central Asia* (انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرے ٹجک اسٹڈیز، ایڈلفی پیپر نمبر ۲۸۸، مارچ ۱۹۹۴ء)؛ حفیظ اللہ عمادی، "State, Ideology, and Islamic Resurgence in Tajikistan", *Central Asian Survey 13* (نمبر ۴، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۵۶۵ تا ۵۷۴؛ اور اخباری رپورٹیں۔

۲۴۔ ارسلا ڈوروسکا، "Caucasus Wars", *Uncaptive Minds 7* (سرما بہار ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۸۶۔

۲۵۔ *Economist*، ۲۸ نومبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۵۸؛ ہل، *Russia's Tinderbox* صفحہ ۵۰۔

۲۶۔ *Moscow Times*، ۲۰ جنوری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴؛ ہل، *Russia's Tinderbox*، صفحہ ۹۰۔

۲۷۔ *Economist*، ۱۴ جنوری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴۳ اور مابعد؛ *New York Times*، ۲۱ دسمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ A18؛ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۴ء، صفحات A1، A10؛ ۳ جنوری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱؛ یکم اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳؛ ۱۱ دسمبر ۱۹۹۵ء صفحہ A6؛ وکن شٹرین، "Chechnya and the Transcaucasian Republics", *Swiss Review of World Affairs*؛ فروری ۱۹۹۵ء، صفحات ۱۰ تا ۱۱؛ *Boston Globe* ۵ جنوری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱ اور مابعد؛ ۱۲ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۔

۲۸۔ ویرا ٹولز، "Moscow and Russia's Ethnic Republics in the Wake of Chechnya"، سنٹر فار اسٹرے ٹجک اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز، *Post-Soviet Prospects 3* (اکتوبر ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۲؛ *New York Times*، ۲۰ دسمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ A14۔

۲۹۔ ہل، *Russia's Tinderbox*، صفحہ ۴؛ ڈیمیٹری ٹیمن، Decision Time for Russia", *Moscow Times*، ۳ فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۸۔

۳۰۔ *New York Times*، ۷ مارچ ۱۹۹۲ء، صفحہ ۳؛ ۲۴ مئی ۱۹۹۲ء، صفحہ ۷؛ *Boston Globe*، ۵ فروری ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱؛ باہری یلماز، "Turkey's New Role in International Politics", *Aussenpolitik 45* (جنوری ۱۹۹۴ء)، ۹۵؛ *Boston Globe*، ۷ اپریل ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲۔

۳۱۔ *Boston Globe*، ۴ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲؛ ۵ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲؛ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ A7؛ *New York Times*، ۴ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۵؛ ۵ ستمبر ۱۹۹۳ء صفحہ ۱۹؛ ۱۰ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ A3۔

۳۲۔ *New York Times*، ۱۲ فروری ۱۹۹۳ء، صفحہ A3؛ ۸ مارچ ۱۹۹۲ء، صفحہ ۲۰؛ ۵ اپریل ۱۹۹۳ء، صفحہ A7؛ ۱۵ اپریل ۱۹۹۳ء، صفحہ A9؛ ٹامس گولٹز، "Letter from Eurasia: Russia's Hidden Hand", *Foreign Policy 92* (خزاں ۱۹۹۳ء)، صفحات ۹۸ تا ۱۰۴؛ ہل اور جیوٹ، *Back in the USSR* صفحہ ۱۵۔

۳۳۔ فیونا ہل اور پامیلا جیوٹ، *Back in the USSR: Russia's Intervention in the*

Internal Affairs of the Former Soviet Republics and the Implications for the United States Policy Toward Russia (ہارورڈ یونیورسٹی، جان ایف کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ، اسٹرن تھنگ ڈیموکریٹک انسٹی ٹیوشنز پروجیکٹ، جنوری ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۰۔

۳۴۔ *New York Times*، ۲۲ مئی ۱۹۹۲ء، صفحہ A۲۹؛ ۴ اگست ۱۹۹۳ء، صفحہ A۳؛ ۱۰ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ E۴؛ *Boston Globe*، ۲۵ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۸؛ ۲۳ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحات ۱، ۲۳۔

۳۵۔ فلورا لوئیس، "Between TV and the Balkan War", *New Perspectives Quarterly 11*، (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۴۷؛ ہنز ڈبلیو مال، "Germany in the Yugoslav Crisis", *Survival 37* (سرما ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۶ء)، صفحہ ۱۱۲؛ وولف گینگ کریگر، "Toward a Gaullist Germany? Some Lessons from the Yugoslav Crisis", *World Policy Journal 11* (بہار ۱۹۹۴ء)، صفحات ۳۱ تا ۳۲۔

۳۶۔ میشا گلینی، "Yugoslavia: The Great Fall", *New York Review of Books*، ۲۳ مارچ ۱۹۹۳ء، صفحہ ۶۱؛ پیری بیہر، "Central Europe: The New Lines of Fracture", *Geopolitique 39* (خزاں ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۴۴۔

۳۷۔ پیری بیہر "Central Europe and the Balkans Today: Strengths and Weaknesses", *Geopolitique 35*، (خزاں ۱۹۹۱ء)، صفحہ ۳۳؛ *New York Times*، ۲۳ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ A۹؛ *Washington Post*، ۱۳ فروری ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۶؛ جینوس بوگیسکی، "The Joy of War", *Post-Soviet Prospects* (سنٹر فار اسٹرٹیجک اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز)، ۱۸ مارچ ۱۹۹۳ء، صفحہ ۴۔

۳۸۔ ڈوورونن، *The Origins of Ethnic Conflict: Lessons from Yugoslavia* (آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی، ریسرچ اسکول آف پیسفک اسٹڈیز، ورکنگ پیپر نمبر ۱۵۵، نومبر ۱۹۹۴ء)، صفحات ۲۳ تا ۲۴؛ بوگیسکی، "Joy of War" صفحہ ۳۔

۳۹۔ *New York Times*، یکم اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ A۶؛ ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۵ء، صفحات ۱، ۵؛ ۵ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴؛ *Economist*، ۱۱ نومبر ۱۹۹۵ء، صفحات ۴۸ تا ۴۹۔

۴۰۔ *Boston Globe*، ۴ جنوری ۱۹۹۳ء، صفحہ ۵؛ ۹ فروری ۱۹۹۳ء، صفحہ ۶؛ *New York Times*، ۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۷؛ ۳۰ نومبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۳؛ ۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ A۶؛ ۲۲ جون ۱۹۹۳ء، صفحہ A۲۳؛ جینوس بوگیسکی، "Joy of War" صفحہ ۴۔

۴۱۔ *Boston Globe*، یکم مارچ ۱۹۹۳ء، صفحہ ۴؛ ۲۱ فروری ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۱؛ ۵ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۰؛ *Times* (لندن)، ۲ مارچ ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۴؛ *Washington Post*، ۶ نومبر ۱۹۹۵ء، صفحہ A۱۵۔

۴۲۔ *New York Times*، ۲ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۰؛ ۳۰ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴؛ ۳۰ جولائی ۱۹۹۵ء، صفحہ

۱۹:۸ نومبر ۱۹۹۵ء، صفحہ A۱۵۔

۴۳۔ New York Times، ۹ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ A۱۲؛ ۱۰ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ A۱؛ ۷ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ A۱؛ Boston Globe، ۹ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲۵؛ Europa Times، مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۶؛ اینڈریاس پاپانڈریو، "Europe Turns Left", *New Perspectives Quarterly 11* (سرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۵۳۔

۴۴۔ New York Times، ۱۰ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۲؛ ۱۳ ستمبر ۱۹۹۵ء؛ صفحہ A۱۱؛ ۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ A۶؛ Boston Globe، ۸ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲؛ ۱۲ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱؛ ۱۰ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۸۔

۴۵۔ Boston Globe، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۸؛ New York Times، ۹ جولائی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۲۔

۴۶۔ مارگریٹ بلنڈن، "Insecurity on Europe's Southern Flank", *Survival 36* (گرما ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۱۴۵؛ New York Times، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ A۷۔

۴۷۔ فواد عجمی، "Under Western Eyes: The Fate of Bosnia" (کارنیگی انڈاؤمنٹ فار انٹرنیشنل پیس اور دی ایسپن انسٹی ٹیوٹ کے انٹرنیشنل کمیشن آن دی بالکنز کے لیے تیار کردہ رپورٹ، اپریل ۱۹۹۶ء)، صفحہ ۵ اور مابعد؛ Boston Globe، ۱۴ اگست ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲؛ Wall Street Journal، ۱۷ اگست ۱۹۹۲ء، صفحہ A۴۔

۴۸۔ یلماز، "Turnkey's New Role" صفحات ۹۴، ۹۷۔

۴۹۔ جینوس بوگیسکی، "Joy of War"، صفحہ ۴؛ New York Times، ۱۴ نومبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۵؛ ۵ دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱؛ ۱۵ نومبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱؛ ۱۸ فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳؛ یکم دسمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ A۱۴؛ ۳ دسمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱؛ ۱۶ دسمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۶؛ ۲۴ جنوری ۱۹۹۶ء، صفحات A۱، A۶؛ سوسین وڈورڈ، *Balkan Tragedy: Chaos and Dissolution After the Cold War* (واشنگٹن ڈی سی: بروکنگز انسٹی ٹیوشن، ۱۹۹۵ء)، صفحات ۳۵۶ تا ۳۵۷؛ Boston Globe، ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۷؛ ۱۳ جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ ۱۰؛ ۲۴ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ ۹؛ ۲۲ دسمبر ۱۹۹۵ء، صفحات ۱، ۱۵؛ بل گرٹز، Washington Times، ۲ جون ۱۹۹۴ء، صفحہ A۱۔

۵۰۔ Jane's Sentinel، محولہ در ۶ اگست ۱۹۹۴ء، صفحہ ۴۱؛ Economist، ۱۲ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۲۱؛ New York Times، ۱۰ ستمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ A۶؛ ۵ دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۶؛ ۲۶ جنوری ۱۹۹۳ء، صفحہ A۹؛ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء، صفحہ A۱۴؛ ۱۴ مئی ۱۹۹۴ء، صفحہ ۶؛ ۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ ۳؛ ۱۵ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ A۱۲؛ ۳ فروری ۱۹۹۶ء، صفحہ ۶؛ Boston Globe، ۱۴ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲؛ Washington Post، ۲ فروری ۱۹۹۶ء، صفحہ ۱۔

۵۱۔ New York Times، ۲۳ جنوری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱؛ Boston Globe، یکم فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۸۔

۵۲۔ مسلمانوں کو اسلحے کی ترسیل پر امریکی چشم پوشی کے بارے میں دیکھیے New York Times، ۱۵ اپریل

۱۹۹۵ء، صفحہ ۳؛ ۳ فروری ۱۹۹۶ء، صفحہ ۶؛ *Washington Post*، ۲ فروری ۱۹۹۶ء، صفحہ ۱؛ *Boston Globe*، ۱۴ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۔

۵۳۔ ربیکا ویسٹ، *Black Lamb and Grey Falcon: The Record of a Journey through Yugoslavia in 1937* (لندن: مک ملن، ۱۹۴۱ء)، صفحہ ۲۲ محولہ در چارلس جی بوائیڈ، "Making Peace with the Guilty: the Truth About Bosnia", *Foreign Affairs 74* (ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۲۲۔

۵۴۔ محولہ در ٹموتھی گارٹن ایش، "Bosnia in Our Future", *New York Review of Books*، ۲۱ دسمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۲۷؛ *New York Times*، ۵ دسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۔

۵۵۔ *New York Times*، ۳ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ ۶E؛ *Boston Globe*، ۱۱ مئی ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴۔

۵۶۔ دیکھئے انسٹی ٹیوٹ آف پیس، *Sudan: Ending the War, Moving Talks Forward* (واشنگٹن ڈی سی: یو ایس انسٹی ٹیوٹ آف پیس اسپیشل رپورٹ، ۱۹۹۴ء)؛ *New York Times*، ۲۶ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۔

۵۷۔ جان جے میرسکا، *War in the Caucasus* (واشنگٹن: یونائیٹڈ اسٹیٹس انسٹی ٹیوٹ آف پیس، اسپیشل رپورٹ، تاریخ درج نہیں)، صفحہ ۴۔

۵۸۔ رابرٹ ڈی پٹنام، "Diplomacy and Domestic Politics: The Logic of Two-Level Games", *International Organization 42* (گرما ۱۹۸۸ء)، صفحات ۴۲۷ تا ۴۶۰؛ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، *The Third Wave: Democratization in the Late Twentieth Century* (نورمن، اوکلاہوما: یونیورسٹی آف اوکلاہوما پریس، ۱۹۹۱ء)، صفحات ۱۲۱ تا ۱۶۳۔

۵۹۔ *New York Times*، ۲۷ جنوری ۱۹۹۳ء، صفحات A6؛ ۱۶ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۔ فروری ۱۹۹۴ء کے روسی اقدامات کی تفصیل کے لیے دیکھئے لیونارڈ جے کوہن، "Russia and the Balkans: Pan-Slavism, Partnership and Power", *International Journal 49* (اگست ۱۹۹۴ء)، صفحات ۸۳۶ تا ۸۴۵۔

۶۰۔ *Economist*، ۲۶ فروری ۱۹۹۴ء، صفحہ ۵۰۔

۶۱۔ *New York Times*، ۲۰ اپریل ۱۹۹۴ء، صفحہ A12؛ *Boston Globe*، ۱۹ اپریل ۱۹۹۴ء، صفحہ ۸۔

۶۲۔ *New York Times*، ۱۵ اگست ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۳۔

۶۳۔ ہل اور جیوٹ، *Back in the USSR* صفحہ ۱۲؛ پال ہنز، *Georgia and Armenia—Toward Independence* (سانٹا مونیکا، کیلیفورنیا: رینڈ پی ۴۹۲۴-۷، ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۹؛ *Boston Globe*، ۲۲ نومبر ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۴۔

بارھواں باب:

۱۔ آرنلڈ جے ٹائن بی، A Study of History (لندن: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۲ جلدیں، ۱۹۳۴ء تا ۱۹۶۱ء)، جلد ہفتم، صفحات ۷ تا ۱۷؛ Civilization on Trial: Essays (نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۴۸ء)، صفحات ۱۷ تا ۱۸؛ Study of History جلد نہم، صفحات ۴۲۱ تا ۴۴۲۔
۲۔ میتھیو میلکو، The Nature of Civilizations (بوسٹن: پورٹر سارجنٹ، ۱۹۶۹ء)، صفحہ ۱۵۵۔
۳۔ کیرول کوئیگلی، The Evolution of Civilizations: An Introduction to Historical Analysis (نیویارک: مک ملن، ۱۹۶۱ء)، صفحہ ۱۴۶ اور مابعد۔
۴۔ کوئیگلی، Evolution of Civilizations، صفحات ۱۳۸ تا ۱۳۹، ۱۵۸ تا ۱۶۰۔
۵۔ مِٹی ڈوگن، "The Decline of Religious Beliefs in Western Europe", International Social Science Journal 47 (ستمبر ۱۹۹۵ء)، صفحات ۴۰۵ تا ۴۱۹۔
۶۔ رابرٹ وتھنو کا مضمون "Indices of Religious Resurgence in the United States" رچرڈ ٹی اینٹون اور میری ایلین ہیگلینڈ کی مرتبہ Religious Resurgence; Contemporary Cases in Islam, Christianity and Judaism (سائراکیوز: سائراکیوز یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۷ء) میں، صفحات ۱۵ تا ۳۴؛ Economist 8 (جولائی ۱۹۹۵ء)، صفحات ۱۹ تا ۲۱۔
۷۔ آرتھر ایم شلیسنگر جونیئر، The Disuniting of America: Reflections on a Multicultural Society (نیویارک: ڈبلیو ڈبلیو نورٹن، ۱۹۹۲ء)، صفحات ۶۶ تا ۶۷، ۱۲۳۔
۸۔ محولہ در شلیسنگر، Disuniting of America، صفحہ ۱۱۸۔
۹۔ گنر مرڈل، An American Dilemma (نیویارک: ہارپر اینڈ برادرز، ۱۹۴۴ء)، جلد اول، صفحہ ۳۔ رچرڈ ہوفسٹیڈر محولہ در ہنز کوہن، American Nationalism: An Interpretive Essay (نیویارک: مک ملن، ۱۹۵۷ء)، صفحہ ۱۳۔
۱۰۔ تاکیشی اومے ہارا، "Ancient Japan Shows Post-Modernism the Way", New Perspectives Quarterly 9 (بہار ۱۹۹۲ء)، صفحہ ۱۰۔
۱۱۔ جیمز کرتھ، "The Real Clash", National Interest 37 (خزاں ۱۹۹۴ء)، صفحات ۳ تا ۱۵۔
۱۲۔ میلکم رفکنڈ، تقریر، پلگرم سوسائٹی، لندن، ۱۵ نومبر ۱۹۹۴ء (نیویارک: برٹش انفارمیشن سروسز، ۱۶ نومبر ۱۹۹۴ء)، صفحہ ۲۔
۱۳۔ International Herald Tribune، ۲۳ مئی ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۳۔
۱۴۔ رچرڈ ہولبروک، "America: A European Power", Foreign Affairs 74 (مارچ اپریل ۱۹۹۵ء)، صفحہ ۴۹۔
۱۵۔ مائیکل ہاورڈ، America and the World (سینٹ لوئی: واشنگٹن یونیورسٹی، سالانہ لیون لکچر، ۵ اپریل

۱۹۸۴ء)، صفحہ ۶۔

۱۶۔ شلیسنگر، *Disuniting of America*، صفحہ ۱۲۷۔

۱۷۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ان مفادات کا ایک بیان ملاحظہ کیجیے "Guidance for Defense Planning the Fiscal Years 1994–1999"، مسودہ، ۱۸ فروری ۱۹۹۲ء، *New York Times*، ۸ مارچ ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۴۔

۱۸۔ زیڈ اے بھٹو، *If I Am Assassinated* (نئی دہلی: وکاس پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۹ء)، صفحات ۱۳۷ تا ۱۳۸، بحوالہ در لوئیس ڈیلووی، "The Islamization of Pakistan's Foreign Policy", *International Journal 51* (سرما ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۶ء)، صفحہ ۱۳۳۔

۱۹۔ مائیکل والزر، *Thick and Thin: Moral Argument at Home and Abroad* (نوٹرے ڈیم: یونیورسٹی آف نوٹرے ڈیم پریس، ۱۹۹۴ء)، صفحات ۱ تا ۱۱۔

۲۰۔ جیمز کیو ولسن، *The Moral Sense* (نیو یارک: فری پریس، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۲۲۵۔

۲۱۔ سنگاپور حکومت، *Shared Values* (سنگاپور: ۱۹۹۱ء کا کمانڈ پیپر نمبر ۱، ۲ جنوری ۱۹۹۱ء)، صفحات ۲ تا ۱۰۔

۲۲۔ لیسٹر پیئرسن، *Democracy in World Politics* (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۵ء)، صفحات ۸۳ تا ۸۴۔

اشاریہ

ا

اتاترک، مصطفیٰ کمال: ۸۸، ۱۷۷، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴ تا ۱۸۵، ۲۲۱

اٹلی: ۵۲، ۵۳، ۱۳۶، ۱۶۶، ۱۹۵

احمد، اکبر: ۳۳۱

اخوان المسلمون: ۱۳۷، ۱۴۱

ارجنٹینا: ۵۲، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۷

اردن: ۱۴۱، ۲۳۷

اریٹیریا: ۱۶۹، ۳۴۴، ۳۶۸

ازبکستان: ۷۵، ۱۶۴

اسپینگلر، اوسوالڈ: ۴۵، ۴۷، ۵۰، ۶۳، ۶۴، ۹۱، ۹۹

اسپین: ۲۸، ۵۷، ۱۳۶، ۱۶۷، ۱۸۵، ۱۹۵، ۲۳۸

اسٹالن، جوزف: ۱۷۳، ۲۲۸، ۳۹۴

اسٹانکوچ، سرگئی: ۱۷۶

اسٹریٹس ایکس چینج فاؤنڈیشن: ۲۱۳

اسرائیل: ۸۵، ۱۰۹، ۱۴۱، ۱۵۷، ۱۶۴، ۱۸۳، ۱۹۴، ۲۲۶، ۲۳۱

اسلام (نیز دیکھئے اسلامی تہذیب): ۴۷، ۵۴، ۱۵۹، ۱۹۸، ۲۴۷، ۲۵۹، ۲۶۰، ۴۰۱

اسلامی احیا: ۷۷ تا ۷۹، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۲۵، ۱۳۳ تا ۱۴۹، ۱۶۹، ۱۷۷، ۲۱۷، ۲۳۹؛ کا سیاسی اظہار: ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۳۸ تا ۱۴۲، ۱۸۱ تا ۱۸۵؛ کا معاشرتی اظہار: ۱۳۵، ۱۳۶ تا ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۸۱ تا ۱۸۵، ۲۶۱

اسلامی تہذیب: ۲۱، ۳۶، ۴۵، ۵۲، ۸۳، ۱۷۶، ۱۷۷، ۳۹۴؛ میں ثقافتی شناختیں اور اقدار: ۱۹، ۲۹، ۸۳، ۱۲۳، ۱۳۵ تا ۱۴۸، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۹ تا ۱۷۰، ۲۲۷، ۳۱۴، ۳۱۷ تا ۳۳۲؛ میں جمہوریت: ۳۰، ۲۶۳

تا ۲۶۷؛ میں رخنہ تنازعات: ۳۰۸ تا ۳۱۴، ۳۱۸
تا ۳۲۲، ۳۳۴ تا ۳۴۰، ۳۵۲ تا ۳۶۵؛ سے
نقل مکانی: ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۱، ۲۵۲،
۲۵۸؛ میں مقامیت: ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۳، ۱۸۱
تا ۱۸۵؛ کا قرابت دار ملک کی حمایت کرنا: ۳۴۰،
۳۴۴ تا ۳۶۵، ۳۸۷؛ میں زبان کا استعمال:
۷۵، ۷۶، ۸۸، ۸۹؛ میں فوجی صلاحیت: ۲۲۶،
۲۳۱ تا ۲۳۴، ۲۳۶؛ اور جدیدیت: ۸۷ تا ۸۹،
۹۱ تا ۹۴، ۱۲۱، ۱۴۲، ۲۱۷، ۲۲۰؛ کا سیاسی
ڈھانچا: ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۹۲، ۱۹۳ تا ۱۹۴،
۲۱۶ تا ۲۲۲، ۲۲۷؛ میں آبادی کا اضافہ: ۲۰،
۱۰۱، ۱۰۳، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۳، ۱۴۲ تا ۱۴۸؛ کے
وسائل اور اثرورسوخ: ۵۷، ۱۲۵، ۱۳۳ تا ۱۴۸،
۲۲۵، ۲۶۰ تا ۲۶۹، ۳۰۷ تا ۳۱۴، ۳۱۸ تا
۳۲۲، ۳۹۱؛ کے صینی تہذیب سے تعلقات:
۲۲۷، ۲۳۱ تا ۲۳۴، ۲۴۰ تا ۲۴۲، ۳۰۰،
۳۰۴ تا ۳۰۵؛ میں سماجی تحریک: ۱۲۵، ۱۳۵، ۱۳۶
تا ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۴۲؛ میں روحانی وزمانی حاکمیت:
۸۳، ۸۵، ۱۱۳، ۲۶۰ تا ۲۶۳؛ کا برتری کا دعویٰ:
۱۲۵، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۹، ۳۰۷،
۳۸۸؛ میں تشدد: ۳۱۹ تا ۳۲۳، ۳۵۷ تا ۳۵۹؛
کے مغرب سے تعلقات: ۷۸، ۹۸، ۱۲۵، ۱۳۵ تا
۱۴۸، ۱۵۴، ۱۷۷ تا ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۹۷، ۲۰۷،
۲۲۰، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۸، ۲۵۹
تا ۲۷۲، ۲۹۷ تا ۲۹۹، ۳۰۸ تا ۳۱۴، ۳۵۵،
۳۹۱؛ میں نوجوان آبادی کی کثرت: ۱۴۲ تا ۱۴۶،
۱۴۸، ۱۸۳

اسلامی کانفرنس کی تنظیم(OIC): ۱۶۹، ۲۱۸، ۲۱۹، ۳۴۲، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۹۸

افریقی اتحاد کی تنظیم(OAU): ۳۹۸

افریقی تہذیب: ۵۱، ۵۴، ۵۸، ۶۷، ۲۲۵، ۲۲۶ تا ۲۲۷، ۲۳۷؛ میں ثقافتی شناختیں اور اقدار: ۳۶، ۷۷، ۱۵۷، ۲۳۹، ۲۴۱؛ میں مقامیت: ۱۱۴ تا ۱۱۵، ۱۲۵؛ جدیدیت اور: ۸۹، ۹۲؛ کا سیاسی ڈھانچا: ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۹۶؛ کی آبادی: ۱۰۲

افغانستان: ۱۳۸، ۱۶۴، ۲۰۹، ۲۱۹، ۲۶۱، ۲۶۷، ۳۰۸، ۳۱۱، ۳۱۹، ۳۳۵، ۳۴۰، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۷، ۳۶۰

اقتصادی تعاون تنظیم (ECO): ۱۶۴

اقوام متحدہ: ۳۴، ۲۰۱، ۲۳۹، ۲۵۸، ۳۶۰، ۳۸۳، ۳۹۲، ۳۹۷

البانیہ: ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۷۰، ۳۱۹، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۵۶، ۳۶۰، ۳۹۵

الترابی، حسن: ۱۱۸، ۱۲۲، ۱۳۶، ۲۱۹

الجزائر: ۱۰۹، ۱۱۴، ۱۲۳، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۵۴، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۷، ۲۳۱، ۲۴۱، ۲۴۴، ۲۴۷، ۲۴۹، ۲۶۶، ۲۶۷، ۳۱۲، ۳۴۲، ۳۵۸، ۳۶۰، ۳۹۵

الچی بے، ابوالفیض: ۳۵۱

الحوالی، سفار: ۳۱۱، ۳۱۲

المغرب (شمالی افریقہ): ۱۴۳، ۱۴۸، ۲۶۴،

۳۱۲،۲۶۸
الیگزینڈر دوم، زار روس: ۱۷۳
امریکی ریاستوں کی تنظیم (OAS): ۳۹۸
انڈونیشیا: ۱۰۸، ۱۱۵، ۱۲۶، ۱۳۶، ۱۴۴، ۱۴۹، ۱۷۰، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۵، ۲۲۰، ۲۳۹
انسانی حقوق: ۸۳، ۸۴ تا ۸۶، ۱۱۱، ۱۸۰، ۱۸۹، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۷ تا ۲۴۵، ۲۶۳، ۲۷۴، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۳، ۲۸۵، ۳۰۰، ۳۰۴، ۳۵۵، ۳۸۲، ۳۸۷
انقلاب ایران: ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۵، ۲۶۸
انقلاب روس: ۶۰، ۱۳۴ن، ۱۸۴، ۲۰۴
انقلاب فرانس: ۶۰، ۱۳۴ن
انگریزی زبان: ۶۸ تا ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۸۷، ۲۱۶، ۲۵۰، ۲۸۷، ۳۰۰، ۳۰۱
انگولا: ۳۲۱
اوزال، ترگت: ۱۴۲، ۱۸۰، ۱۸۲
اولمپک کھیل: ۴۳، ۲۷۷
اپٹر، ڈیوڈ ای: ۹۲
ایتھوپیا: ۱۶۸
ایران: ۲۹، ۴۲، ۴۳، ۹۲، ۹۹، ۱۱۵، ۱۳۷، ۱۴۰، ۱۴۵، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۶۴، ۲۱۸، ۲۲۰، ۲۲۶، ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۳۷
ایسپن، لیس: ۲۳۰، ۲۳۵
ایسپوسٹو، جان ایل: ۱۳۵
ایسٹ ایشین اکنامک کاکس (EAEC): ۱۶۳
ایسٹونیا: ۷۵، ۱۷۰، ۱۷۹، ۱۹۷
ایشیا: ۳۵، ۵۷، ۹۲، ۳۰۲؛ سے آسٹریلوی تعلقات: ۱۸۶ تا ۱۹۱، ۲۸۳، ۲۹۲؛ میں چینی بالادستی: ۲۷۱ تا ۲۹۷، ۳۹۴؛ کے اندر تصادم: ۲۸، ۱۵۵، ۱۶۰، ۱۶۲، ۲۷۱، ۲۸۴ تا ۲۹۷؛ میں ثقافتی اقدار سے وابستگی: ۳۴، ۳۵، ۳۶؛ میں اقتصادی ترقی: ۱۲۵ تا ۱۳۴، ۱۶۰، ۱۶۲ تا ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۸۶ تا ۱۹۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۸، ۲۸۳، ۲۹۶، ۳۷۸؛ کی پھیلتی ہوئی قوت: ۲۰، ۲۱، ۳۰، ۳۶، ۹۷، ۹۸ تا ۱۰۰، ۱۰۸، ۱۱۲، ۱۲۵ تا ۱۳۴، ۱۴۸، ۲۳۹ تا ۲۴۱، ۲۷۱ تا ۲۹۷، ۳۹۰؛ میں نقل مکانی: ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۴؛ میں فوجی صلاحیت: ۴۲، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۲۲۶، ۲۲۸ تا ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۷۰؛ کی آبادی: ۱۰۲ تا ۱۰۴؛ کا برتری کا دعویٰ: ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۱ تا ۱۳۴، ۲۷۸، ۳۸۰، ۳۸۸؛ سے مغربی روابط: ۱۲۵ تا ۱۳۴، ۲۷۱ تا ۲۹۷، ۳۸۴
ایلیٹ، ٹی ایس: ۱۱۲
اینڈین پیکٹ: ۱۵۶، ۱۶۱، ۱۶۵، ۲۹۹
اینگلز، فریڈرک: ۱۷۵
ایونز، گیرتھ: ۱۸۷، ۱۹۰، ۱۸۷، ۱۸۹

آ

آبادیات (نیز دیکھئے نقل مکانی): ۲۹؛ اور آبادی کی نمو: ۲۰
آذربائیجان: ۷۵، ۱۸۰

آرباٹوف، جارجی: ۲۲۶
آرتھوڈوکس روسی تہذیب (نیز دیکھئے روسی فیڈریشن): ۳۰، ۵۱، ۵۲، ۶۱، ۱۷۲، ۲۲۵، ۲۴۴، ۲۷۲، ۳۰۸، ۳۲۴، ۳۲۸؛ میں ثقافتی شناختیں اور اقدار: ۸۳، ۱۷۲، ۱۷۳؛ میں اقتصادی اور سیاسی ترقی: ۳۰، ۱۷۲ تا ۱۷۷؛ کا سیاسی ڈھانچا: ۸۳، ۱۶۶، ۱۷۶، ۱۹۲؛ کے مغرب سے تعلقات: ۲۹، ۳۴، ۴۱، ۴۲، ۵۸، ۵۹، ۱۱۰، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۵۴، ۱۷۰، ۱۷۱ تا ۱۷۷، ۱۸۰ تا ۱۸۲، ۱۹۰، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۹، تا ۲۰۱، ۲۰۵ تا ۲۰۷، ۲۲۷، ۲۴۱، ۲۴۲، ۳۰۱ تا ۳۰۳، ۳۹۱، ۳۸۵، ۳۶۸، ۳۵۵
آرتھوڈوکسی: ۸۳، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۵۹، ۱۶۶
آرمینیا: ۴۲، ۷۵، ۱۵۵، ۲۰۱، ۲۰۲
آسٹرو ہنگرین سلطنت: ۱۹۷، ۲۰۵، ۳۲۸
آسٹریا: ۲۸، ۱۷۹، ۱۹۵
آسٹریلیا: ۴۳، ۵۳، ۱۰۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۷۱، ۱۸۶ تا ۱۹۰
آفاقی تہذیب: ۴۶، ۶۱، ۶۵ تا ۹۴
آئرلینڈ: ۱۹۵
آئزن شٹاٹ، شموئیل: ۴۵، ۵۶، ۹۲

ب

بازنطیم: ۵۷، ۸۳، ۱۱۵، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۹۸
بالشویک انقلاب: ۱۷۳ تا ۱۷۶، ۲۰۴
بدھ مت: ۵۳ تا ۵۵، ۵۶، ۹۱، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۲۰، ۱۲۵، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۷۰، ۲۱۸، ۲۴۰، ۲۷۲، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۵، ۳۴۴، ۴۰۱
برازیل: ۵۴، ۱۰۶، ۱۲۱، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۷
براوڈل، فرنینڈ: ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۵۰، ۶۴، ۸۱
برطانیہ: ۲۸، ۵۳، ۷۴، ۱۰۷، ۱۲۶، ۱۵۴، ۱۶۶، ۱۹۵، ۲۲۹
بریزنسکی، زبگنیو: ۳۹
بش انتظامیہ: ۳۳، ۱۰۸، ۲۳۵، ۲۳۸
بشیر، تحسین: ۲۱۷
بطروس غالی، بطروس: ۱۹۳، ۳۶۰
بلغاریہ: ۱۵۵، ۱۹۵، ۱۹۸، ۲۰۲
بل، ہیڈلے: ۶۳، ۹۴، ۱۰۰
بندرانائیکے، سولومن: ۱۱۳ تا ۱۱۴
بنگلہ دیش: ۱۴۱، ۱۹۴، ۲۱۸، ۳۰۹، ۳۵۹
بنیاد پرستی (نیز دیکھئے اسلامی احیا): ۳۴، ۸۷، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۳۶؛ کا ابھرنا: ۴۱، ۷۵، ۱۱۴، ۱۱۶ تا ۱۱۸، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۳۵، ۱۳۷ تا ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۶
بوز مین، ایڈا: ۴۵، ۴۹، ۹۱
بوزن، بیری: ۱۰۰
بوسنیا: ۲۹، ۳۰، ۷۶، ۱۴۵، ۱۵۴ تا ۱۵۶، ۱۷۰، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۶، ۲۴۲، ۲۶۳، ۳۰۱، ۳۱۳، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۱، ۳۲۶ تا ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۴، ۳۳۶ تا ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۸۶، ۳۹۵؛ اور

وینٹن معاہدہ: ۳۶۰، ۳۶۳، ۳۶۵، ۳۷۰، ۳۷۳، ۳۷۴؛ اور قرابت دار ملکوں کا اجتماع: ۳۴۰، ۳۵۲ تا ۳۷۲، ۳۷۳ تا ۳۷۴

بھارت (نیز دیکھئے ہندو تہذیب): ۳۰، ۵۰، ۵۶، ۵۷، ۷۳، ۷۵، ۸۵، ۹۱، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۱۵، ۱۴۹، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۶۹، ۲۳۰؛ کے اتحادی: ۴۳؛ میں ثقافتی شناختیں اور اقدار: ۳۶، ۵۴، ۷۲، ۱۱۴؛ میں اقتصادی و سیاسی ترقی: ۹۹، ۱۲۶، ۱۳۴؛ میں زبان کا استعمال: ۷۲، ۷۳ تا ۷۵

بھٹو، بے نظیر: ۲۹۷، ۳۱۰

بھٹو، ذوالفقار علی: ۳۹۷

بیروک، پال: ۱۰۵

بیکر، جیمز: ۲۳۸

بیگ بی، فلپ: ۴۵، ۴۹، ۵۰

بیلا ڈر، ایڈورڈ: ۱۹۵

بیلا روس: ۱۵۵، ۱۹۷، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳

بیلجیئم: ۱۶۰، ۱۹۵، ۲۴۸

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ: ۱۲۲، ۲۲۶، ۲۵۰

بیمر، پیری: ۱۹۸

پ

پاپانڈریو، اینڈریاس: ۳۵۷

پارکر، جیوفری: ۵۸

پاز، اوکٹیویو: ۱۸۴

پاسکا، چارلس: ۲۴۹

پاکستان: ۴۳، ۷۵، ۱۰۹، ۱۳۸، ۱۵۷، ۱۶۴، ۱۹۴، ۲۱۸، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۶۴، ۲۶۷، ۲۷۷، ۲۹۷، ۳۰۳، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۵، ۳۳۰، ۳۹۳، ۳۹۷ ؛ رخنہ تنازعات میں: ۴۳، ۳۳۵، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۵۹، ۳۶۰

پامر، آر آر: ۶۰

پانامہ: ۱۶۸

پائپس، ڈینیل: ۸۶، ۸۸، ۹۳

پائی، لوسین: ۵۰

پٹنام، رابرٹ: ۳۶۹

پرتگال: ۵۷، ۸۵، ۱۸۵، ۱۹۵، ۲۳۸

پولینڈ: ۴۴، ۵۷، ۱۴۰، ۱۵۴، ۱۶۵، ۱۹۵، ۱۹۸

پیلو پونیشین جنگ: ۲۵۹

پیٹر اعظم، زار روس: ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۸

پیری، میتھیو گالبرائتھ: ۸۶

پیریز، شمعون: ۱۶۴

پیئرسن، لیسٹر: ۴۴

ت

تاجکستان: ۷۵، ۱۵۵، ۳۰۲، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۸، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴ تا ۳۴۷،

۳۴۸، ۳۶۸

تائیوان، جمہوریہ چین: ۹۳، ۱۵۶، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۹۴، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۴۰

تبت: ۵۴

ترکمانستان: ۷۵، ۱۸۰

ترکی: ۲۹، ۴۲، ۵۸، ۷۶، ۸۸، ۱۳۵، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۵۴، ۱۶۰، ۱۶۴، ۱۷۱، ۱۷۶، ۱۸۶، ۱۹۴، ۲۱۸، ۲۲۱؛ کی ثقافتی شناخت: ۱۵۴ تا ۱۵۶، ۱۶۰، ۱۷۷ تا ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۰؛ بطور منقطوع ملک: ۱۷۱، ۱۷۷ تا ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۰

تنزانیہ: ۱۶۹

تنظیم آزادی فلسطین: ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۴۴، ۳۷۴

تہذیبی شناختیں/تشخص: رخنہ جنگوں میں: ۳۳۳ تا ۳۴۰؛ کی وسعت: ۴۸، ۱۵۶؛ اور منقطوع ممالک (نیز دیکھئے تہذیبی شناختیں/تشخص): ۱۶۹، ۱۹۱، ۳۸۳، ۴۰۰

تہذیبیں/تہذیبوں: کے درمیان طاقت کا توازن: ۲۰، ۵۴ تا ۶۴، ۱۵۳، ۱۵۸ تا ۱۹۲، ۲۲۵ تا ۲۵۶، ۲۸۷ تا ۲۹۶، ۳۰۰؛ تہذیب بمقابلہ: ۴۵ تا ۴۷، ۴۰۱ تا ۴۰۳؛ کے مشترکہ خواص: ۳۹۸ تا ۴۰۳؛ کی جامعیت: ۴۵ تا ۴۷، ۶۵ تا ۶۷؛ کا زوال: ۳۷۷ تا ۳۸۶، ۳۸۹؛ کی تعریف: ۴۵ تا ۵۰؛ کا سنہری دور: ۳۷۸ تا ۳۸۰، ۴۰۱ تا ۴۰۳؛ تنہا ممالک بطور: ۱۶۶ تا

۱۶۹؛ بڑی: ۴۹ تا ۵۶

تھائی لینڈ: ۵۴، ۱۱۷، ۱۲۶، ۱۹۴، ۲۰۸، ۲۱۰

تیانن مین اسکوائر: ۱۲۹، ۲۱۱، ۲۴۰

تیونس: ۱۲۳، ۱۳۵، ۱۴۶، ۱۵۴، ۲۱۸

ٹ

ٹائن بی، آرنلڈ: ۴۵، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۶۳، ۶۴، ۸۷

ٹجمین، فرانکو: ۳۵۴، ۳۷۲

ٹرومین، ہیری: ۳۱

ٹیر پٹروشین، لیون: ۳۷۳

ث

ثقافت: ۶۶؛ کی کشش: ۱۱۱ تا ۱۱۳؛ سے تہذیبوں کا تعین: ۴۶ تا ۴۸، ۲۵۸؛ اور طاقت: ۱۱۰ تا ۱۱۲، ۱۵۶، ۱۵۸، ۲۶۳، ۳۸۸؛ اور علاقائیت: ۹۸، ۱۰۸، ۱۶۰ تا ۱۶۶، ۱۹۳، ۲۳۵

ج

جاپان، جاپانی تہذیب: ۳۵، ۳۶، ۵۱، ۵۴، ۹۳، ۱۰۹، ۱۱۵، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۵۴، ۱۶۳، ۱۹۴، ۲۰۸، ۲۱۲، ۲۴۰؛ کی اقتصادی طاقت: ۴۲، ۸۱، ۱۰۰، ۱۲۹ تا ۱۳۲، ۱۴۸، ۱۶۲، ۱۶۴ تا ۱۶۶، ۲۱۰، ۲۱۲؛ کی ثقافتی شناخت: ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۶۲ تا ۱۶۴؛ کی قوت میں اضافہ: ۲۹، ۹۷، ۹۸، ۱۰۳، ۱۲۶، ۱۲۹ تا ۱۳۲؛ میں مقامیت: ۱۱۲ تا ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۳۰؛ کی تنہا ملک

کی حیثیت: ۱۶۵ تا ۱۶۸، ۱۹۳؛ اور جدیدیت: ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۹۲، ۱۲۸، ۱۹۰؛ کا سیاسی ڈھانچا: ۸۳، ۱۶۶؛ کے مغرب سے تعلقات: ۴۲، ۸۰، ۱۲۵ تا ۱۳۳، ۱۶۴ تا ۱۶۷، ۱۹۴
جارجیا: ۲۰۴
جان پال دوم، پوپ: ۱۴۰، ۳۵۴، ۳۶۷
جرمنی، متحدہ: ۲۹، ۴۳، ۷۴، ۱۲۷، ۱۵۶، ۱۷۹
جمہوریت (نیز دیکھئے سرد جنگ): ۳۰، ۴۲، ۱۳۹، ۱۸۵، ۱۸۹، ۲۱۴، ۲۶۳ تا ۲۶۶، ۲۹۴؛ اور اتحاد: ۳۷، ۱۹۹، ۲۰۰؛ کی کشش: ۱۱۱ تا ۱۱۳، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۴۰، ۱۷۵، ۲۲۵؛ کے ساتھ کمیونسٹ تنازعات: ۲۱، ۳۸ تا ۴۰، ۵۹ تا ۶۱، ۱۷۵، ۲۶۹، ۲۹۷؛ اور انسانی حقوق: ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۳۶ تا ۲۴۵، ۲۸۰؛ لبرل: ۶۰، ۱۴۰، ۱۶۰، ۲۴۶، ۲۶۳، ۳۶۹، ۳۷۸، ۳۸۳؛ کا مخمصہ: ۱۱۳، ۱۸۶، ۳۰۹؛ کی مفروضہ فتح: ۳۳، ۵۹ تا ۶۱، ۱۷۵، ۲۲۵ تا ۲۲۷، ۲۳۸، ۲۴۴
جناح، محمد علی: ۱۱۳
جنگ افیون: ۸۶
جنگ خلیج: ۱۴۱، ۱۷۸، ۱۸۳، ۲۱۸، ۲۲۹
جنگ عظیم اول: ۳۴
جنگ عظیم دوم: ۳۴، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۲۹، ۱۴۵، ۲۱۷، ۲۳۱
جنوبی افریقہ: ۵۴، ۱۱۵ تا ۱۱۶، ۱۵۴، ۱۶۸
جوہری عدم پھیلاؤ کا معاہدہ: ۲۳۷، ۲۴۰
جوہری ہتھیار: ۴۱، ۴۲، ۱۰۹، ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۲۸، ۲۲۹ تا ۲۳۷
جیانگ زیمن: ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۹۸
جیمز، ولیم: ۳۱

چ

چاڈیف، پوئٹر وائی: ۱۷۴
چچنیا: ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۹۲، ۲۱۷، ۲۱۹، ۳۰۲، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۵، ۳۳۰، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۸ تا ۳۴۰، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵ تا ۳۴۹، ۳۵۲، ۳۶۶، ۳۷۳، ۳۸۷
چرکن، وٹالی: ۱۷۳
چلر، تانسو: ۱۷۹، ۱۸۳، ۱۸۴، ۳۵۰
چلی: ۱۳۳، ۱۶۷، ۳۵۲، ۳۶۷
چی انگ خاندان: ۸۸، ۱۲۸
چیک جمہوریہ: ۴۴، ۱۵۴، ۱۶۵، ۱۷۹، ۱۹۵، ۱۹۹
چیکوسلواکیا: ۴۱، ۱۹۷
چین، عوامی جمہوریہ: ۲۱، ۳۲، ۶۰، ۱۰۴، ۱۰۹، ۱۱۵، ۱۲۶، ۱۵۴، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۷۰، ۱۹۲ تا ۱۹۳، ۲۱۹، ۳۰۰، ۳۲۲، ۳۹۶، ۴۰۲؛ کے اتحادی: ۴۳، ۴۴، ۱۷۶، ۲۰۸ تا ۲۱۶، ۲۲۷، ۲۹۷ تا ۲۹۹، ۳۰۳، ۳۰۹؛ کا ہم خوشحالی دائرہ: ۲۰۸ تا ۲۱۶، ۲۷۱، ۲۹۷؛ میں ثقافتی شناختیں: ۳۶، ۴۸، ۱۵۴، ۱۷۰، ۲۰۹ تا ۲۱۰؛ کی معیشت: ۷۴، ۷۸، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۲۷، ۱۶۵، ۲۱۰ تا ۲۱۳، ۲۷۳، ۲۸۴،

۲۸۶، ۲۸۷، ۲۹۳، ۳۰۲، ۳۱۹؛ میں انسانی حقوق: ۲۲۶، ۲۳۹ تا ۲۴۱، ۲۷۳، ۲۷۷، ۲۷۹، ۲۸۳؛ کا بڑھتا ہوا اثبات: ۳۳، ۳۴، ۴۳، ۹۸ تا ۱۰۰، ۲۰۸ تا ۲۱۶، ۲۷۱ تا ۲۹۷، ۳۹۱ تا ۳۹۴؛ میں مقامیت: ۱۱۲ تا ۱۱۴، ۱۱۵؛ کی فوجی صلاحیت: ۲۳۱ تا ۲۳۴، ۲۷۳، ۲۸۴ تا ۲۸۷، ۳۴۴، ۳۹۲، ۳۹۴؛ سے مغرب کے تعلقات (نیز دیکھئے ایشیا، چینی تہذیب): ۲۰، ۳۰، ۴۲، ۵۸، ۷۸، ۲۳۴، ۲۵۷، ۲۶۷، ۲۷۱ تا ۲۹۷، ۳۸۶، ۳۹۱ تا ۳۹۴

ح

حافظ الاسد: ۳۱۲
حسن، شاہ مراکش: ۱۴۱
حسین، شاہ اردن: ۱۴۱
حسین، صدام: ۱۷۹، ۲۱۹، ۲۲۹، ۳۰۸ تا ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۳۵
حکمت یار، گلبدین: ۳۰۸
حکومت: سے کلیسا کے تعلقات: ۸۳، ۸۵، ۱۱۴، ۱۳۳ تا ۱۴۸، ۱۷۱؛ کی ذمے داریاں: ۵۰، ۲۲۶؛ کا ڈھانچا: ۸۳ تا ۸۵، ۱۷۱، ۱۷۲

خ

خلیج تعاون کونسل: ۳۱۴
خمینی، آیت اللہ روح اللہ: ۱۱۰، ۱۳۶، ۱۴۰، ۲۶۹

د

دودائیف، زوکر: ۳۳۴، ۳۳۶
دوسری جنگ عظیم (دیکھئے جنگ عظیم دوم)
دیسوکی، علی ای ہلال: ۱۳۵
دیلیو، ژاق: ۲۹
دیمرل، سلیمان: ۱۷۹، ۱۸۱، ۱۸۴

ڈ

ڈاسن، کرسٹوفر: ۴۵، ۴۷، ۵۴
ڈبڈن، مائیکل: ۲۰
ڈرکھائیم، ایمائیل: ۴۵، ۴۷
ڈور، رونالڈ: ۶۹، ۱۱۳، ۱۲۳
ڈومیناش، یاں میری: ۲۴۷
ڈوئش، کارل ڈبلیو: ۸۴، ۸۵
ڈی لا میڈرڈ، میکیول: ۱۸۵
ڈینی لیفسکی، نکولے وائی: ۱۷۴
ڈیبرے، ریجس: ۱۲۳
ڈینچ، بوگڈن: ۳۲۸
ڈینگ زیاؤپنگ: ۱۱۰، ۲۱۳، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۸۵، ۲۹۶

ر

راسپیل، ژاں: ۲۵۲
رائے، آلیور: ۱۳۹
رفسنجانی، اکبر ہاشمی: ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۹۷
رفکنڈ، میلکم: ۳۸۵

رواندا: ۲۹

روبن، بارنیٹ: ۳۴۶

روڈنسن، میکسمین: ۹۳

روزویلٹ، تھیوڈور: ۳۸۳

روزویلٹ، فرینکلن ڈی: ۳۴، ۳۱۰

روزویلٹ، کرمٹ: ۱۰۳

روس (دیکھئے سوویت یونین)

روسی زبان: ۷۰، ۷۳، ۷۴، ۸۳، ۲۰۵

روسی فیڈریشن: ۱۹، ۱۰۵، ۱۱۴، ۱۹۷، ۲۵۹، ۳۱۴، ۳۲۵، ۳۸۸، ۳۹۶؛ کے اتحادی: ۲۹، ۴۲، ۴۳، ۱۹۳، ۲۰۱ تا ۲۰۵، ۲۵۷، ۳۹۳ تا ۳۹۵؛ اور چینی بالادستی: ۲۷۱ تا ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۸۴، ۳۰۰، ۳۰۲؛ کی ثقافتی شناخت: ۴۱، ۱۱۹، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۲، ۲۲۲، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۴، ۳۳۵، ۳۳۸ تا ۳۴۰، ۳۶۷، ۳۸۶؛ میں انتخابات: ۴۳، ۱۷۶ تا ۱۷۸؛ کا قرابت دار ملک کی حمایت کرنا: ۳۴۰، ۳۴۳، ۳۴۴ تا ۳۴۹، ۳۵۰ تا ۳۵۲، ۳۵۵ تا ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۸، ۳۶۹ تا ۳۷۲، ۳۸۷؛ کی فوجی صلاحیت: ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۲۲۸، ۲۳۰، ۳۰۱، ۳۵۱؛ کی منقطوع کے طور پر ثقافتی شناخت: ۱۷۰، ۱۷۱ تا ۱۷۸، ۱۸۶، ۱۹۰

رومانیہ: ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۳، ۳۵۵ تا ۳۵۷

رومن تہذیب: ۸۲، ۸۳، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۷۱ تا ۱۷۳، ۱۹۵، ۱۹۸، ۳۷۷

ریاست ہائے متحدہ امریکا: ۱۹، ۲۱، ۳۴، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۵۷ تا ۵۸، ۸۰، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۶۰، ۱۸۸، ۲۶۹، ۳۰۴، ۳۲۲، ۳۵۵، ۳۶۱؛ کے اتحادی: ۳۷، ۱۲۸، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۷۸، ۱۸۵ تا ۱۸۷، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۸، ۲۲۷، ۲۵۷، ۲۶۵؛ کی طاقت: ۲۹، ۹۸، ۹۹، ۱۰۷، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۶۶، ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۲۰، ۲۲۵ تا ۲۲۷، ۲۲۸ تا ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۳۶، ۲۳۸ تا ۲۴۱، ۲۷۱ تا ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۸، ۳۷۷ تا ۳۸۶، ۳۸۸، ۳۸۹

ریگن انتظامیہ: ۱۱۰، ۲۸۴، ۳۰۷

ز

زائر: ۲۹

زرونووسکی، ولادیمیر: ۱۷۶، ۱۷۷، ۲۰۴

زن جیانگ: ۲۸۶، ۳۱۹

س

سارک: ۱۶۱

ساگاں، اسکاٹ: ۳۹۷

ساوٹسکی، پیٹر: ۱۷۶

سخاروف، آندرے: ۱۷۵

سداحمد، محمد: ۲۶۴

سربیا: ۲۸، ۴۲، ۶۸، ۷۵، ۱۴۶، ۱۵۵، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۳۰۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۴، ۳۲۵ تا ۳۲۹، ۳۳۰،

۳۳۵ تا ۳۳۸، ۳۳۹ تا ۳۴۱، ۳۸۷،
۳۹۵؛ کے گرد قرابت دار ملکوں کا اکٹھا ہونا:
۳۴۰، ۳۵۲ تا ۳۶۶، ۳۷۰ تا ۳۷۲، ۳۷۳
سرد جنگ: ۳۰، ۹۹، ۱۰۶، ۱۰۷، ۲۶۴، ۲۶۹،
۳۱۷ تا ۳۱۹؛ میں اتحاد: ۱۵۴، ۲۲۷، ۲۴۳ تا
۲۴۵، ۲۵۷، ۲۶۶، ۲۷۱، ۳۰۴، ۳۴۱؛ کا
آغاز: ۳۴، ۱۹۹؛ میں دوقطبی سیاست: ۲۱، ۲۳ تا
۲۵، ۳۱، ۳۵، ۳۶، ۴۳، ۵۹ تا ۶۱، ۷۸، ۹۸،
۱۴۰، ۱۵۷، ۱۶۶، ۱۷۰، ۱۸۶، ۱۹۳، ۱۹۴،
۱۹۵، ۲۰۸، ۲۷۱، ۲۸۹، ۲۹۶، ۳۰۵، ۳۱۸،
۳۸۷؛ کا خاتمہ: ۲۱، ۲۹، ۳۳ تا ۳۴، ۷۵،
۷۹، ۱۱۴، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۳،
۱۷۸، ۱۸۱، ۱۸۵، ۲۰۸، ۲۷۲، ۲۷۸، ۲۸۳،
۳۰۰، ۳۰۳، ۳۰۷، ۳۲۸، ۳۸۸، ۳۹۱؛ میں
نظریاتی اختلافات: ۲۷۲ تا ۲۷۴، ۲۷۵؛ میں
جوہری ہتھیار: ۲۲۹، ۲۳۴، ۲۳۶، ۲۷۹
سری لنکا: ۳۰، ۵۴، ۱۱۵، ۱۶۹، ۱۹۴
سعودی عرب: ۱۹، ۲۹، ۹۳، ۱۳۸، ۱۴۵، ۱۴۶،
۲۱۷، ۲۱۸ تا ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۷، ۲۳۱
سعید، ایڈورڈ: ۳۶
سلاجک، حارث: ۳۳۴، ۳۳۸
سلطنت عثمانیہ: ۵۸، ۵۹، ۷۶، ۸۸، ۱۷۳،
۱۸۲، ۲۲۰، ۲۶۰، ۳۲۵، ۳۲۸،
۳۲۹، ۳۳۶، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۸،
۳۶۰، ۳۷۷
سلوواکیا: ۴۴، ۱۵۴، ۱۶۵، ۱۹۵، ۱۹۹
سلووینیا: ۲۰۰
سنگاپور: ۹۳، ۱۰۸، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۳۰، ۱۵۴،
۱۷۰، ۲۰۸، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵،
۲۱۶، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۷۲، ۲۷۴، ۲۹۲،
۲۹۶، ۳۹۸ تا ۴۰۱
سوڈان: ۳۰، ۴۳، ۱۳۹، ۱۶۹، ۱۹۴، ۲۱۸،
۲۱۹، ۲۴۰، ۲۶۷، ۲۶۸، ۳۰۹، ۳۱۱،
۳۱۶، ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۳۱؛ اور رخنہ
تنازعات: ۳۳۴، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴،
۳۴۷، ۳۶۰، ۳۶۸
سوشلزم: ۶۰، ۱۲۱، ۱۲۸، ۱۷۵، ۱۷۷، ۳۰۷
سولزینٹیسن، الیکسینڈر: ۱۷۵، ۱۷۶
سوویت افغان جنگ: ۳۰۷ تا ۳۰۹، ۳۴۴
سوویت یونین (نیز دیکھئے آرتھوڈوکس روسی
تہذیب): ۲۹، ۳۴، ۱۰۹، ۱۵۴، ۱۶۰،
۱۷۳ تا ۱۷۷، ۲۱۷، ۲۷۶، ۳۸۶،
۴۰۲؛ کے اتحادی: ۲۱، ۳۷، ۱۷۷، ۱۹۴،
۲۰۸، ۳۰۴، ۳۴۲ تا ۳۴۴؛ کی تحلیل: ۱۹، ۲۹،
۳۰، ۳۱، ۳۹، ۴۲، ۶۰، ۷۵، ۷۹، ۹۷، ۱۰۰،
۱۱۲، ۱۲۸، ۱۴۰، ۱۶۲، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۵،
۱۸۰، ۱۹۴، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۴، ۲۳۸، ۲۵۸،
۲۶۰، ۲۶۷، ۳۲۸، ۳۴۳، ۳۴۸، ۳۴۹،
۳۵۱، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۷، ۳۸۹؛ میں رخنہ
تنازعات: ۲۵۸، ۳۲۴، ۳۴۴، ۳۴۸؛ کی
فوجی طاقت اور جارحیت: ۱۰۰، ۱۱۲، ۱۷۴، ۱۹۹،
۲۳۴ تا ۲۳۶، ۲۷۰، ۲۷۳، ۲۷۸، ۲۸۰،

۲۸۵، ۲۸۹
سوئٹزرلینڈ: ۶۷، ۲۴۶، ۳۶۰
سوئیڈن: ۱۵۴، ۱۶۰، ۱۷۳، ۱۷۹، ۱۹۴، ۲۰۰، ۲۴۰، ۳۶۸، ۳۸۲
سوہارتو، جنرل: ۱۴۲، ۲۱۲
سیپٹنیک، ایلوئی زیبے: ۳۵۴
سیلیناس، کارلوس: ۱۸۴ تا ۱۸۶
سیورڈ، رتھ لیگر: ۳۲۲

ش

شام: ۱۵۴، ۲۲۸، ۲۳۱، ۲۳۷
شیوشنیکوف، یوگینی: ۳۵۰
شلیسنگر، آرتھر ایم جونیر: ۳۸۲، ۳۹۰
شمالی امریکا (نیز دیکھئے کینیڈا، امریکا): ۵۲، ۵۷، ۱۰۱، ۱۶۰؛ کے میکسیکو سے تعلقات: ۱۵۶، ۱۶۴، ۱۷۱، ۱۸۴، ۱۸۵ تا ۱۸۶
شوارٹز، بنجمن: ۵۶
شوئیلر، رینڈل: ۲۸۸
شیراک، ژاق: ۲۴۹، ۳۴۰
شیسنائی، ژاں کلاو: ۲۵۲
شیورڈ ناڈزے، ایڈورڈ اے: ۲۰۴

ص

صقلیہ: ۲۶۰
صومالیہ: ۲۹، ۶۸، ۳۲۰
صیہونیت: ۲۳۲
صینی تہذیب (نیز دیکھئے چین، عوامی جمہوریہ): ۴۵، ۵۱، ۱۶۶، ۳۹۸ تا ۴۰۱؛ میں بدھ مت: ۵۳ تا ۵۶، ۵۷، ۹۱، ۱۷۰؛ میں ثقافتی شناختیں اور اقدار: ۲۹، ۳۵، ۵۹، ۷۷، ۹۲، ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۶۲، ۱۷۰، ۲۰۹ تا ۲۱۱، ۲۱۵، ۲۲۷، ۳۱۵؛ کا اثرورسوخ: ۳۳، ۳۴، ۴۲، ۵۷، ۶۷، ۸۳، ۱۰۱، ۱۱۵، ۲۰۸ تا ۲۱۶، ۲۲۵، ۲۳۹؛ کے اسلامی تہذیب سے تعلقات: ۲۲۷، ۲۳۱ تا ۲۳۵، ۲۴۰ تا ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۷۲، ۲۹۶ تا ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۳ تا ۳۰۶؛ اور جدیدیت: ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۹۰، ۹۲، ۱۲۸؛ کا سیاسی ڈھانچا: ۱۶۶، ۱۹۲ تا ۱۹۴، ۲۰۸ تا ۲۱۶؛ کے مغرب سے تعلقات: ۲۰، ۳۰، ۴۲، ۵۸، ۷۸، ۱۱۵، ۱۲۵ تا ۱۳۴، ۲۱۰ تا ۲۱۳، ۲۲۷، ۲۳۴، ۲۳۹ تا ۲۴۴، ۲۵۱، ۲۵۷، ۲۵۹، ۲۶۶، ۲۷۱ تا ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۰، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۹۱ تا ۳۹۳

ض

ضیاالحق، محمد: ۱۴۲

ع

عالمی ادارہ صحت: ۲۸۳
عالمی بینک: ۱۲۲، ۱۲۶، ۲۵۸
عبداللہ، سعودی ولی عہد: ۱۴۶
عجمی، فواد: ۷۸، ۱۴۰، ۳۵۹
عراق: ۴۲ تا ۴۳، ۱۰۹، ۱۸۳، ۲۱۷، ۲۲۶، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۷

عرب لیگ: ۲۱۸، ۳۰۹، ۳۱۲، ۳۴۲
عربی زبان: ۷۰، ۷۲، ۷۳، ۸۳، ۳۳۷
عزت بیگووچ، علی جاہ: ۳۳۴، ۳۳۷، ۳۳۸
علاقائی تعاون برائے ترقی (RCD): ۱۶۴
علی، بن: ۱۴۲، ۳۱۲
علی، محمد: ۸۸
علیف، گیدر: ۳۵۱

غ

غانوشی، شیخ: ۲۶۶
غرناطہ: ۲۶۱

ف

فرانسیسی زبان: ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳
فرانس: ۵۳، ۷۴، ۸۵، ۹۷، ۱۰۸، ۱۵۸، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۸۲، ۲۲۹
فرائیڈ برگ، آرون: ۲۷۴، ۲۹۶
فرد پسندی: ۸۴ تا ۸۶
فروبی نیس، لیو: ۹۱
فریڈ مین، لارنس: ۲۳۰
فشمین، جوشوا: ۷۲
فلپائن: ۱۲۶، ۱۷۰، ۱۹۴، ۲۰۸، ۲۳۸
فلر، گراہم: ۲۹۷
فلر، گیری: ۳۲۵
فلسطین: ۱۴۶، ۲۱۹
فن لینڈ: ۱۵۴، ۱۷۹، ۱۹۵
فوجی صلاحیت: ۵۸، ۸۵، ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۷۲، ۱۹۹، ۲۱۵، ۲۱۹؛ کا عدم پھیلاؤ: ۲۲۶، ۲۲۷ تا ۲۳۷؛ جوہری: ۴۱، ۴۲، ۱۰۸، ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۲۸، ۲۲۹ تا ۲۳۷؛ کی منتقلی: ۹۸، ۹۹، ۱۵۵، ۲۲۱، ۲۲۷، ۲۲۸ تا ۲۳۷؛ پر اخراجات: ۱۰۷ تا ۱۱۰، ۲۲۹، ۲۳۴ تا ۲۳۶
فوکویاما، فرانسس: ۳۵

ق

قازقستان: ۱۶۴، ۲۰۲
قانون: ۸۴، ۱۱۲، ۱۷۱، ۲۲۶، ۳۸۲، ۳۹۰، ۴۰۲؛ بین الاقوامی: ۵۹، ۳۵۵؛ اسلامی: ۱۳۵، ۱۴۱ تا ۱۴۵، ۱۷۷
قائد اعظم: ۱۱۳
قبرص: ۱۹۹، ۲۰۲، ۲۰۳
قذافی، معمر: ۲۶۹، ۲۹۸
قرآن: ۸۵، ۹۲، ۱۳۷، ۳۳۰
قومی ریاستیں/ریاستوں: ۶۵، ۱۲۶، ۳۱۵؛ کے درمیان طوائف الملوکی کا تعلق: ۳۵ تا ۴۰، ۴۱؛ توازن بمقابلہ تقلید: ۲۸۷ تا ۲۹۳، ۳۹۳؛ کی سرحدیں: ۳۸، ۴۱، ۳۰۹، ۳۳۹؛ کے زوال پذیر اثرات: ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۰۲؛ کی شناختیں: ۲۱، ۴۸، ۵۸، ۱۵۳ تا ۱۵۵، ۲۱۷، ۳۸۲، ۳۸۳؛ کے متعدد مفادات: ۳۵ تا ۳۹؛ کا اہم کردار: ۲۱، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۲۱۶

ک

کاراجک، رادوون: ۳۳۹، ۳۷۳

کچما، لیونڈ: ۲۰۶
کراوچک، لیونڈ: ۴۳، ۲۰۵
کرتھ، جیمز: ۳۸۴
کرسٹوفر، وارن: ۴۳، ۲۳۱
کرغزستان: ۷۵
کروشیا: ۲، ۴۲، ۷۵، ۱۵۵، ۱۷۰، ۱۹۳، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۶۳، ۳۱۶، ۳۱۹، ۳۲۴، ۳۲۵ تا ۳۳۹، ۳۴۰ تا ۳۴۱، ۳۸۷، ۳۹۱، ۳۹۵؛ میں قرابت دار ملکوں کا اجتماع: ۳۴۰، ۳۵۲ تا ۳۶۶، ۳۷۰ تا ۳۷۳، ۳۷۴
کریسن، ایڈتھ: ۲۴۹
کریمیا: ۲۰۷
کسنجر، ہنری: ۲۹
کشمیر: ۴۳
کلاسیکی تہذیب: ۶۱، ۶۲، ۸۱ تا ۸۴، ۹۰ تا ۹۳، ۱۱۰، ۱۷۱ تا ۱۷۳، ۳۷۸
کلنٹن انتظامیہ: ۴۳، ۱۰۸، ۲۰۰، ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۸، ۲۳۹
کلیساؤں کی عالمی کونسل: ۳۶۸
کلیساؤں کی کل افریقی کونسل: ۳۶۸
کلیمنشو، ژارز: ۱۱۰
کمال ازم: ۸۷ تا ۹۰، ۱۱۲، ۱۲۸، ۱۷۱، ۱۹۰
کمل نیتسکی، بوڈن: ۲۰۵
کمیونزم (نیز دیکھئے سرد جنگ): ۲۸، ۷۷، ۷۸، ۱۲۹، ۲۷۲، ۳۳۲؛ کی کشش: ۱۱۱، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۶۸، ۱۷۳ تا ۱۷۶؛ کا انہدام/خاتمہ: ۳۲، ۳۸ تا ۴۱، ۱۲۱، ۱۷۰، ۱۹۵، ۲۰۱، ۲۲۵، ۲۶۲؛ کے ساتھ جمہوری تنازعات: ۲۱، ۳۸ تا ۴۱، ۵۹ تا ۶۱، ۱۷۵، ۲۶۷، ۲۹۷؛ (نیز مختلف ممالک کی ذیل میں دیکھئے)
کنفیڈریشن آف دی پیپلز آف کاکے کس (KNK): ۳۴۷
کنفیوشزم (نیز دیکھئے صینی تہذیب): ۵۳، ۵۴، ۱۱۴ تا ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۳۳، ۱۹۳، ۲۰۸، ۳۳۰، ۴۰۰، ۴۰۱
کوٹی ڈی آئیوری: ۱۶۷
کوریا، جنوبی: ۷۷، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۶۲، ۱۶۵، ۱۹۴، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷
کوریا، شمالی: ۴۳، ۱۰۹، ۱۵۶، ۱۹۴، ۲۰۸، ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۳۹؛ کی فوجی صلاحیت: ۲۲۷، ۲۲۸ تا ۲۳۰، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷
کوزیریف، آندرے: ۳۴۰، ۳۵۷، ۳۷۱
کولمبیا: ۱۵۶
کونسل آف یورپ: ۲۷۳
کوئیگلی، کیرول: ۴۵، ۴۹، ۵۰
کوہل، ہلمٹ: ۱۱۰، ۲۴۹
کوہن، ٹامس: ۳۱، ۳۲
کوہ، ٹومی: ۱۲۸
کویت: ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۶۷، ۲۷۵، ۳۰۹، ۳۱۳، ۳۷۲
کیپل جلس: ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۲۳
کیتھرین دوم، ملکہ روس: ۱۷۳

کیتھولک مسلک: ۵۲، ۸۱، ۸۳، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۸۵، ۱۹۵، ۱۹۷، ۲۳۸، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۹۹، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۴، ۳۳۷، ۳۳۹ تا ۳۴۱، ۳۵۲، ۳۵۳ تا ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۷۲، ۳۸۷

کیٹنگ، پال: ۱۸۷، ۱۸۹

کیریبین کمیونٹی (CARICOM): ۱۶۱، ۱۶۴

کیلی، جان بی: ۱۴۳

کینیا: ۱۶۹

کینیڈا: ۳۷، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۶۹، ۱۹۰

کیوبا: ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۹۴، ۲۳۸

گ

گاندھی، راجیو: ۳۴۵

گراچیف، پافل: ۳۰۳

گریز کا اصول: ۳۹۷

گرین وے، ایچ ڈی ایس: ۳۱۸

گر، ٹیڈ رابرٹ: ۳۲۰ تا ۳۲۲

گلینی، مشا: ۳۳۹

گورباچیف، میخائل: ۱۱۴، ۱۷۳

گولڈاسٹائن، ایوری: ۲۹۱

گولڈسٹون، جیک: ۱۴۵

گیڈس، جان لوئیس: ۳۱

گیسکارڈ دیستاں، ویلری: ۲۴۹

گیلنر، ارنسٹ: ۱۳۹

ل

لارڈ، ونسٹن: ۲۸۲

لارنس، بروس: ۱۲۲

لاطینی امریکی تہذیب: ۳۵، ۴۹، ۵۲، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۴۰، ۱۶۷، ۱۷۲، ۲۲۷، ۳۵۴، ۳۹۷، ۴۰۲

لاطینی زبان: ۷۰ تا ۷۲، ۷۳، ۸۲، ۸۳، ۸۹

لائیڈ جارج، ڈیوڈ: ۱۱۰

لاؤس: ۵۴، ۱۶۲

لبنان: ۴۷، ۸۰، ۱۲۲

لوئیس، فلورا: ۱۱۹

لی تنگ ہوئی: ۱۳۰، ۲۱۵

لی کوآن یو: ۱۱۲ تا ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۲، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۸۹، ۲۱۱، ۲۱۶

لیبیا: ۲۹، ۴۲، ۱۰۹، ۲۱۷، ۲۲۸، ۲۳۱، ۲۳۷

لیپڈس، ایرا: ۲۱۶

لیتھونیا: ۲۰۵

لیٹویا: ۷۵، ۱۷۰، ۱۷۹، ۱۹۷

لیلاوشے، پیری: ۲۵۱ تا ۲۵۴

لینن، وی آئی: ۵۹ تا ۶۱، ۱۷۲، ۲۲۲، ۲۶۳

لیوی، برنارڈ ہنری: ۳۶۵

م

مارکسسٹ لینن ازم: ۵۹ تا ۶۱، ۱۲۱، ۱۲۸، ۱۳۶، ۱۵۹، ۱۷۵، ۲۶۰، ۳۸۳، ۳۸۸؛

کی ناکامی: ۳۳، ۳۷، ۶۱، ۱۲۸ تا ۱۳۰، ۱۷۰

ماریطانیہ: ۳۰۹
مالٹا: ۱۹۹
مالڈووا: ۱۵۵، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۴
ماؤزے تنگ: ۵۹ تا ۶۰، ۸۱
ماؤس، مارسل: ۴۷
متحدہ عرب امارات: ۳۶۰
متراں، فرانکوئی: ۱۱۰، ۲۴۹
محبوبانی، کشور: ۶۸
مذہب (نیز دیکھئے مختلف مذاہب کی ذیل): ۲۱، ۷۶ تا ۷۹، ۱۷۱؛ سے تہذیبوں کا تعین: ۵۳ تا ۵۶، ۶۸، ۷۸، ۲۱۵ تا ۲۲۲، ۲۳۴ تا ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲؛ کی بنیاد پر تقسیم: ۲۹ تا ۳۱، ۴۷، ۴۸، ۷۶، ۱۵۳، ۲۱۷، ۲۶۰ تا ۲۷۱؛ کا احیا: ۳۰۸ تا ۳۱۵، ۳۱۶ تا ۳۱۸، ۳۲۲ تا ۳۳۲؛ اور ریاستی اقتدار: ۸۳، ۸۵، ۱۱۳، ۱۳۴ تا ۱۴۸، ۱۷۱، ۲۶۰ تا ۲۶۳
مراکش: ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۶، ۱۵۴، ۲۱۸
مرڈل، گنر: ۳۸۳
مرکوسر: ۱۵۶، ۱۶۱، ۱۶۵، ۲۹۹
مرنیسی، فاطمہ: ۲۶۵، ۳۱۱، ۳۱۳
مزروئی، علی: ۸۹، ۱۶۰، ۲۳۲
مسلم ورلڈ لیگ: ۲۱۸
مسیحیت، مغربی: ۲۹، ۴۷، ۵۲ تا ۵۴، ۸۲، ۸۳، ۲۱۹، ۲۹۷، ۳۸۹، ۳۹۷، ۴۰۱؛ اور ثقافتی شناختیں: ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۱۸، ۳۱۰، ۳۱۷، ۳۴۴، ۳۴۸، ۳۵۱، ۳۵۴ تا ۳۵۶، ۳۵۹، ۳۸۷؛ اور اقتصادی و سیاسی ترقی: ۳۰، ۱۱۱ تا ۱۱۳، ۱۶۲، ۲۳۸، ۲۴۲ تا ۲۴۴، ۲۹۵، ۳۲۱، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۸۲؛ کا پھیلنا (نیز دیکھئے مغربی تہذیب): ۷۷ تا ۷۹، ۸۵، ۸۶، ۹۰، ۱۱۶، ۱۱۹ تا ۱۲۴، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۴۰، ۱۶۸، ۲۶۰ تا ۲۶۳، ۳۱۰
مشرق وسطیٰ: ۶۸
مشرقی تیمور: ۲۷۴، ۳۱۶، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۳۹
مشرقی یورپ (نیز دیکھئے مختلف ممالک کی ذیل) کی سرحد: ۱۹۵ تا ۱۹۹؛ میں اقتصادی و سیاسی ترقی: ۳۰، ۱۹۴ تا ۲۰۲، ۲۳۸، ۲۶۷
مصر: ۱۲۳، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۳، ۱۴۶، ۱۶۶، ۲۱۹، ۲۳۷
معاہدہ نانکنگ: ۲۸۵
معاہدہ وارسا: ۱۰۷، ۱۵۴، ۱۹۴، ۳۸۸
مغربی تہذیب (نیز دیکھئے مختلف ممالک کی ذیل): ۵۲، ۵۳، ۷۹ تا ۸۱؛ کے خواص: ۸۱ تا ۸۶، ۱۷۲؛ کے زوال پذیر اثرات: ۲۰ تا ۲۲، ۶۰ تا ۶۲، ۷۴، ۹۷ تا ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱؛ جدید دور کے اوائل میں: ۲۱، ۲۲ تا ۲۳، ۵۷ تا ۶۰؛ میں اقتصادی خوشحالی: ۴۴، ۵۸، ۵۹، ۶۷، ۷۸، ۱۰۲ تا ۱۰۷، ۲۱۱ تا ۲۱۲؛ کے ہندو تہذیب سے تعلقات: ۷۸، ۲۲۷؛ میں انسانی حقوق کے معیار: ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۳۷ تا ۲۴۵؛ کی سامراجیت: ۲۱، ۴۴، ۵۷ تا ۶۰، ۷۴ تا ۷۷، ۹۹، ۱۱۰، ۱۶۶، ۱۷۱، ۲۲۶؛

کے اسلامی تہذیب سے تعلقات: ۲۰، ۴۲، ۴۳، ۵۷، ۵۸، ۶۸، ۷۸، ۹۸، ۱۳۴ تا ۱۳۸، ۱۷۷ تا ۱۸۰، ۱۹۷، ۲۰۷، ۲۲۰، ۲۲۶؛ کے جاپانی تہذیب سے تعلقات: ۴۲، ۸۱، ۱۲۵ تا ۱۳۴، ۱۶۵ تا ۱۶۶، ۱۹۴، ۲۲۷؛ کے لاطینی امریکی تہذیب سے تعلقات: ۵۷ تا ۵۹، ۱۲۵، ۱۷۱، ۲۲۶ تا ۲۲۷؛ کی لنگوا فرینکا: ۶۸ تا ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۸۷؛ کی فوجی صلاحیت: ۵۸، ۹۸، ۹۹، ۱۰۶ تا ۱۱۰، ۲۲۶؛ کے آرتھوڈوکس روسی تہذیب سے تعلقات: ۲۹، ۳۴، ۴۱، ۴۲، ۵۸، ۵۹، ۱۱۰، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۵۴، ۱۷۰، ۱۷۱ تا ۱۷۸، ۱۸۰ تا ۱۸۱، ۱۹۰، ۱۹۴، ۱۹۷، ۱۹۹ تا ۲۰۰، ۲۰۴، ۲۰۵ تا ۲۰۸، ۲۲۷، ۲۲۲؛ کا سیاسی ڈھانچا: ۱۶۶، ۱۹۲، ۱۹۴ تا ۲۰۲، ۲۰۴، ۲۱۸؛ کا احیا: ۵۷ تا ۶۱، ۹۷ تا ۹۹؛ کا عروج: ۵۸ تا ۶۱، ۹۷ تا ۹۹؛ کے صینی تہذیب سے تعلقات: ۲۰، ۳۰، ۴۲، ۵۹، ۷۸، ۱۱۵، ۱۲۵ تا ۱۳۴، ۲۱۰ تا ۲۱۳، ۲۲۷؛ کی ٹیکنیکی برتری: ۵۹، ۹۳، ۹۴؛ کی آبادی و علاقہ: ۱۰۰ تا ۱۰۴، ۱۱۰؛ کے آفاقیت کے دعوے: ۲۰ تا ۲۱، ۴۲، ۵۸ تا ۶۱، ۶۳، ۶۴، ۶۶ تا ۶۸، ۷۸ تا ۷۹، ۲۲۵ تا ۲۲۸؛ میں جنگیں: ۲۱، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۹۸

مغربی یورپی یونین: ۲۷۳

مغربیت کا قبول کرنا: ۸۶ تا ۸۹، ۱۷۷ تا ۱۷۹، ۱۸۳ تا ۱۸۷، ۲۲۵؛ کا جدیدیت سے ملاپ: ۲۰، ۵۳، ۸۰، ۸۶، ۸۷ تا ۸۹، ۹۰، ۹۳ تا ۹۴، ۱۱۱ن، ۱۷۷ تا ۱۷۹، ۳۷۸؛ کا استرداد: ۸۶ تا ۸۸، ۸۹ تا ۹۰، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۵، ۲۲۵ تا ۲۳۷؛ اور مقطوع ممالک: ۱۷۱ تا ۱۸۱، ۱۸۳ تا ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹ تا ۱۹۱، ۳۰۰

مقبول عرب اور اسلامی کانفرنس (PAIC): ۲۱۹

مقدونیہ: ۱۷۰، ۲۰۱، ۳۵۶

مک نیل، ولیم ایچ: ۴۵، ۵۰، ۱۱۲، ۱۱۹

مکاؤ: ۲۱۲، ۲۱۵

ملاڈک، ریٹکو: ۳۵۸

ملائشیا: ۵۱، ۱۰۸، ۱۱۵، ۱۲۵، ۱۴۹، ۱۶۳، ۱۶۹، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۵، ۲۳۷

منٹز، سڈنی: ۱۶۸

منسک گروپ: ۳۶۸، ۳۶۹

منگولیا: ۵۴

مواصلات (نیز دیکھئے زبان): ۷۲ تا ۷۳، ۱۴۲، ۱۵۸، ۲۷۸؛ کی ٹیکنالوجی: ۶۶ تا ۶۹، ۷۹، ۸۶، ۹۳، ۱۵۸، ۱۶۰، ۲۱۲، ۲۱۸، ۲۴۶، ۲۵۴، ۳۱۷، ۳۴۴

مورٹیمر، ایڈورڈ: ۶۱

مورو فلپائن تنازع: ۳۳۳ تا ۳۳۵، ۳۴۲، ۳۴۳

موریسن، جان: ۲۰۸

مور، کلیمنٹ ہنری: ۱۳۹

موئنی ہان، ڈینیل پیٹرک: ۳۹

مہاتیر محمد: ۱۳۴، ۱۶۳، ۱۸۸ تا ۱۸۹

میک فرکوہر، روڈرک: ۲۹۱

میازاوا، کچی: ۲۴۰
میانمار: ۱۶۳، ۲۴۰
میجی ریسٹوریشن: ۸۶، ۱۲۸
میکسیکو: ۴۲، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۷۱
میلاسووچ، سلوبوڈن: ۳۲۷، ۳۶۲، ۳۷۳، ۳۷۴
میلکو، میتھیو: ۴۸، ۴۹، ۵۰
مینڈارین: ۷۰، ۷۱، ۷۳، ۷۴، ۸۳، ۱۱۴، ۲۱۶
میئرز ہائمر، جان: ۴۱، ۴۲

ن

نارتھ امریکن فری ٹریڈ ایگریمنٹ (NAFTA): ۱۵۶، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۵
ناروے: ۱۷۹
نائیجیریا: ۳۰، ۱۳۶، ۱۶۷، ۱۶۹، ۲۳۷
نائے، جوزف: ۱۱۱
نکسن انتظامیہ: ۲۰۸، ۲۴۰
نگورنو کاراباخ: ۱۷۰
نوجوان: ۹۹، ۱۰۲؛ تبدیلی میں قائدانہ کردار: ۱۲۶، ۱۳۷ تا ۱۳۹، ۱۴۲ تا ۱۴۸، ۱۸۲، ۲۱۷ تا ۲۱۹، ۲۶۲، ۳۰۱، ۳۲۴ تا ۳۲۷، ۳۳۱، ۳۳۴، ۳۹۳
نے پال: ۶۵، ۷۸
نیٹو: ۱۹، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۳؛ میں رکنیت: ۱۹۷، ۱۹۹ تا ۲۰۱

نیدرلینڈز: ۱۵۸، ۱۹۵
نیشنل انڈاؤمنٹ فار ڈیموکریسی: ۲۳۸
نیوزی لینڈ: ۵۳، ۱۰۱، ۱۶۲، ۱۹۰

و

والٹ، اسٹیون: ۲۸۷ تا ۲۸۹
والزر، مائیکل: ۳۹۹
وائنر، مائرن: ۲۴۵
وائیگل، جارج: ۱۱۷
وائیڈن بام، مرے: ۲۱۲
ویٹکن: ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۷
ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ: ۳۶۰
ورلڈ اکنامک فورم: ۶۷
ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن: ۲۷۷، ۲۸۴
ورلڈ مسلم کانگریس: ۲۱۸
وسط امریکی مشترکہ منڈی: ۱۵۶، ۱۶۵
وسط یورپی آزاد تجارتی خطہ: ۱۶۵
وسیع تر رابطے کی زبان (Language of Wider Communication): ۶۹ تا ۷۵، ۲۸۷
ولاہوس، مائیکل: ۶۸
ولسن، پیٹ: ۲۵۱
ولسن، وڈرو: ۱۱۰
وینیز ویلا: ۱۵۶، ۱۶۷
وی کم وی: ۴۰۰
ویبر، میکس: ۴۵، ۵۴، ۱۳۰

ویت نام: ۵۴، ۶۰، ۱۲۶، ۱۶۲، ۱۹۲ تا ۱۹۴، ۲۰۸
ویسٹ فیلیا کا معاہدہ: ۳۸، ۵۹، ۶۱
ویسٹ، ربیکا: ۳۶۴
ویلرسٹائن، ایمانوئیل: ۴۵، ۴۷

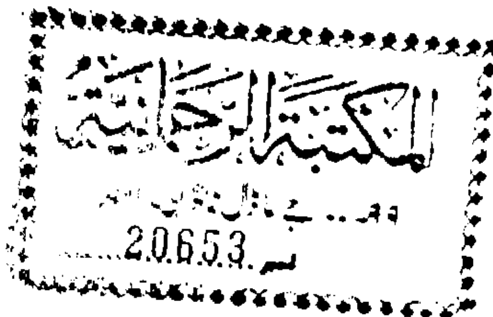
ہ

ہاشمی، سہیل ایچ: ۳۱۳
ہاک، رابرٹ: ۱۹۰
ہانسیاٹک لیگ: ۱۶۴
ہانگ کانگ: ۴۷، ۱۰۱، ۱۲۴، ۱۵۶، ۱۶۳، ۱۶۵، ۲۰۸، ۲۱۲، ۲۴۰
ہاورڈ، مائیکل: ۱۹۷
ہٹلر، ایڈولف: ۲۲۸، ۲۸۸
ہل، فیونا: ۳۴۸
ہندو تہذیب: ۳۶، ۴۵، ۵۱، ۵۹، ۱۲۵، ۱۶۶، ۲۲۵، ۲۳۱، ۲۷۱، ۳۲۴، ۳۹۶، ۳۹۷؛ میں ثقافتی شناختیں: ۱۶۶، ۱۶۹، ۱۷۰، ۲۱۸، ۳۱۵، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۳۵، ۳۴۴؛ اور جدیدیت: ۸۶، ۹۰، ۹۲، ۱۲۱؛ کا سیاسی ڈھانچا: ۸۳، ۱۱۳، ۱۲۶، ۱۶۹، ۱۹۳؛ کی طاقت اور اثرورسوخ: ۶۷، ۱۰۱، ۱۳۳؛ کے مغرب سے تعلقات: ۷۸، ۱۲۵، ۲۲۷، ۲۳۸، ۳۱۲ تا ۳۱۴
ہندومت: ۵۴، ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۲۳، ۱۵۹، ۱۶۰، ۲۱۹، ۳۳۰، ۴۰۱
ہنگری: ۴۴، ۵۷، ۱۵۴، ۱۶۵، ۱۷۹، ۱۹۷، ۱۹۹
ہورووٹز، ڈونالڈ: ۸۰
ہوسوکاوا، موری ہیرو: ۲۸۳
ہوفسٹیڈر، رچرڈ: ۳۸۴
ہوفمین، اسٹینلے: ۲۴۲
ہیٹی: ۵۸، ۱۶۴، ۱۶۸
ہیول، واکلاف: ۶۶

ی ے

یلسن، بورس: ۴۳، ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۲۲، ۱۷۶، ۱۷۷، ۲۰۳
یمن: ۲۱۸
یوپے، ایلین: ۱۹۵
یورپ میں سلامتی و تعاون کی تنظیم: ۱۶۱، ۲۷۳
یورپ (نیز دیکھئے مغربی تہذیب؛ مختلف ممالک کی ذیل میں): ۴۳، ۵۳، ۵۶، ۹۹، ۱۳۶، ۱۴۰، ۲۶۷ تا ۲۷۳، ۲۷۹، ۲۸۸ تا ۲۹۲، ۳۸۴ تا ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۹۱، ۳۹۴، ۴۰۲، ۴۰۳؛ میں ثقافتی شناختیں: ۱۵۴، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰ تا ۱۶۳، ۱۹۴؛ میں نقل مکانی: ۲۴۵ تا ۲۵۰، ۲۵۱ تا ۲۵۴، ۳۸۲؛ میں بین الاقوامی معاشرہ: ۲۷۳، ۲۸۹ تا ۲۹۲، ۲۹۶؛ میں نشاۃ ثانیہ: ۵۷، ۱۷۱، ۲۷۱، ۳۸۴؛ میں مغرب کی سرحد: ۱۹۴ تا ۲۰۲، ۲۰۴، ۲۷۱، ۳۰۹، ۳۷۱
یورپی برادری: ۲۴۶
یورپی پارلیمنٹ: ۲۴۳

یورپی عدالت انصاف: ۲۰۱
یورپی یونین: ۳۰، ۳۸، ۶۲، ۱۰۹، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۷۸، ۱۸۲ تا ۱۸۳، ۱۸۸، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۷ تا ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۸، ۲۳۹، ۲۵۰، ۲۷۲، ۳۰۱، ۳۵۳، ۳۵۶، ۳۶۹، ۳۸۶، ۳۹۱، ۳۹۹
یوکرین: ۳۰، ۴۱، ۴۲، ۷۵، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۷۰، ۱۹۷، ۲۰۴ تا ۲۰۹
یوگنڈا: ۲۹
یوگوسلاویہ: ۴۱، ۴۷، ۱۷۰
یونانی تہذیب، قدیم: ۴۷، ۵۹، ۶۱، ۷۲، ۸۱، ۸۲، ۹۰ تا ۹۳، ۲۵۹
یونان: ۱۴۶، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۹۴، ۲۰۰ تا ۲۰۲
یہودی تہذیب، یہودیت: ۵۵ن



Credits

All artwork is courtesy of the author except for the following:

1.1, 1.2, 1.3: © Hammond Incorporated, Maplewood, New Jersey.

2.1: Reprinted with the permission of Simon & Schuster from The Evolution of Creation: An Introduction to Historical Analysis by Carroll Quigley. Copyright © 1961 by Carroll Quigley; copyright renewed 1989 by Lillian F. Quigley.

7.1: Map by Ib Ohlsson for Foreign Affairs.

7.2: © 1994 The Economist Newspaper Group, Inc. Reprinted with Permission. Further reproduction prohibited.

8.1: Rodger Doyle © 1995 for U.S. News & World Report.

10.1: From Gary Fuller, "The Demographic Backdrop to Ethnic Conflict: A Geographic Overview" in Central Intelligence Agency, The Challenge of Ethnic Conflict to National and International Order in the 1990's: Geographic Perspectives (Washington, D.C.: C.I.A., 1995).

Other credits as noted with the artwork.

تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو

The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order

تصنیف: سیموئیل پی ہنٹنگٹن ترجمہ: سہیل انجم

تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو میں کمیونزم کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والی نئی عالمی سیاسی صورتحال پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ سیموئیل ہنٹنگٹن نے بتایا ہے کہ عصر حاضر کی عالمی سیاست میں اقوام اور نظریات کی جگہ ''تہذیبوں'' نے لے لی ہے۔ کتاب میں دنیا کے غیر مستحکم سیاسی ڈھانچے کی موجودہ فضا اور مستقبل کے امکانات کا گہرا تجزیہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب گزشتہ دس برس میں شائع ہونے والی مشہور ترین اور متنازع کتابوں میں سے ایک ہے۔ ترجمے میں خیال رکھا گیا ہے کہ مصنف کا موقف اور مفروضات من وعن اردو قارئین تک پہنچ سکیں تاکہ وہ خود براہ راست مطالعے سے اس حساس موضوع پر اپنی رائے قائم کر سکیں۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن ہارورڈ یونیورسٹی میں 'البرٹ جے ویدر ہیڈ تھرڈ یونیورسٹی پروفیسر' ہیں اس کے علاوہ وہ جان ایم اولن انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرے ٹجک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر اور ہارورڈ اکیڈمی فار انٹرنیشنل اینڈ ایریا اسٹڈیز کے چیئرمین بھی ہیں۔ وہ کارٹر انتظامیہ میں نیشنل سیکورٹی کونسل کے ڈائریکٹر آف سیکورٹی پلاننگ، فارن پالیسی کے بانی اور شریک مدیر اور امریکن پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کے صدر رہ چکے ہیں۔

'مغربی دنیا کے انتہائی ممتاز عالم سیاسیات سیموئیل ہنٹنگٹن نے اکیسویں صدی میں عالمی سیاست کے حقائق کو سمجھنے کے لیے بہت شاندار نظریاتی ڈھانچا تشکیل دیا ہے۔ تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو سرد جنگ کے بعد آنے والی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔' —ہنری اے کسنجر

OXFORD
UNIVERSITY PRESS


ISBN 0-19-579896-1
9 780195 798968

www.oup.com

Rs 325.00